جاسوسی ڈائجسٹ

جون 2012

چینی نکتہ چینی — 11 — مدیراعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں، کج ادائیاں، نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

بے ثمر — 18 — محی الدین نواب
نسب نمائی کی پُرپیچ خواہشوں میں بل کھاتی ہوئی ایک فکرانگیز کہانی

کارنامہ — 141 — تنویر ریاض
ایک بے بس شخص کا قصہ جو زمانہ ستم کی بے مہری کا شکار ہو گیا

للکار — 152 — طاہر جاوید مغل
ان عاشق پروانوں کا ماجرا، خاص جو للکار سنتے اور للکارنے کے دھنی تھے

قطرۂ خون — 63 — سلیم انور
خون کی دستیابی کی تلاش میں سرگرداں ایک سراغ رساں کی کوششیں

فیشن گزیدہ — 67 — سیرینا راض
کبھی کبھی خوش نصیبی حادثوں کی صورت میں وارد ہوتی ہے... ایسے ہی خوش نصیبوں کا ملاپ

خونی کارٹون — 198 — مختار آزاد
خوابوں کی بُنت اور تکمیل... تعبیر سے تخریب کا سفر مسلسل

تحفہ — 195 — جمال دستی
انوکھے آغاز اور اختتام کی منفرد و مختصر تحریر

نادیدہ قاتل — 81 — میمونہ عزیز
عمر کی نقدی ختم ہونے سے پہلے وقت اور شوق کی دیرینہ تکمیل

گرداب — 92 — اسما قادری
تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

فریب کار — 224 — سلیم فاروقی
ایک نئے محاذ کے مرکزِ توجہ بننے کا سنسنی خیز احوال... اس ماہ کا خاص سرورق

معاوضہ — 216 — عکس فاطمہ
دو لکھاریوں کے مابین طے پا جانے والے معاملے کی جزئیات

انجام — 131 — بابر نعیم
اپنے کام میں ماہر ایک سراغ رساں کی قابلِ ستائش کارکردگی

موقع شناس — 139 — کنزیٰ یونس
جانے انجانے لمحوں میں شناسائی رکھنے والوں کا اندھا وار

تراش خراش — 000 — ادارہ و قارئین
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے، سب کچھ آپ کی تفریحِ طبع اور تواضع کے لیے

اجل شناس — 258 — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ان دوستوں کا فسانہ جن کی دوستی کے پیچ زر و جواہر کے انبار استادہ تھے

جلد 42 • شمارہ 06
جون 2012 • زرِ سالانہ 600 رو
قیمت فی پرچا پاکستان 50 رو
خط و کتابت کا پتا:
پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 200
فون: 35895313 (021) فیکس 35802551
ail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول۔
مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن
ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ،
کراچی 75500 پرنٹر: جمیل حسن •
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ
پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

نکتہ چینی

عزیزانِ من.... السلام علیکم!

جون 2012ء کا شمارہ آپ کی نذر ہے...

بیسویں صدی کا سب سے بڑا بحران دو عالمی جنگیں تھیں۔ کروڑوں انسان لقمۂ اجل بنے اور دو بار کم و بیش پورا یورپ تہس نہس ہوا... مگر آج کا یورپ دیکھ لیں۔ بربادی کے آثار انہوں نے بخوبی سنبھالے صرف اور صرف اپنی نسلوں کو تاریخ کا آئینہ دکھلانے کے لیے اور رہی ترقی... تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، سب جانتے ہیں۔ اپنے ایشیا کے جاپان کو دیکھیں... چڑھتے سورج کی سرزمین پر جوہری بموں کی آگ نے سورج کو ہی چراغ دکھا دیا تھا۔ اُس روز موت بے حساب بٹی تھی مگر آج جاپان ساختہ مصنوعات... کامیابی کی ضمانت ہے۔ عصرِ حاضر پر نظر ڈالیں... کہا جا رہا ہے کہ ساٹھ پینسٹھ برس پہلے کا عالمی جنگ گزیدہ یورپی یونین دنیا کی اگلی ممکنہ عالمی قوت ہے، وہ بھی قوتِ معاش کے بل بوتے پر۔ ہمارے ہمسائے میں چین ہے۔ اس کے پچھلے تیس چالیس سال کی تاریخ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ مشرقِ بعید میں کوریا اور اسلامی ملک ملائشیا... یورپ سے مشرق اور پھر بعید مشرق تک... ایک بات بالکل صاف ہے کہ ملک آزاد ہوئے... اور پھر اگلے پچیس تیس برسوں میں اُن کی ترقی کے راستے متعین ہو گئے۔ عالمی برادری میں عزت ملی... نیک نامی حاصل ہوئی اور باشندے قوم بن گئے۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو ان سب نے یہ سب کچھ شروع کے پچیس تیس برسوں میں حاصل کیا، اس کے بعد ہر میدان میں وسعت و ترقی اختیار کرتے چلے گئے۔

اب ہم اپنی بات کرتے ہیں... بیش بہا معدنی وسائل، متنوع موسم، پہاڑ، سمندر، دریا، اہم جغرافیائی ہیئت اور آزادی کی ساتویں دہائی کے آخری چند سالوں تک کی عمر مگر مقام... انتشار، بھاری عالمی قرض، ترقی کا گراف نیچے کی طرف، ملک بنانے والی قوم نسلی تفرقے میں تقسیم، راہنما دامن پہ داغ لیے، ہیجان کی کیفیت چار سو..... ہر فرد نفسیاتی دباؤ کا شکار... اُس پر دعویٰ کہ آزادی کے ساٹھ، ستر برس قوموں کی زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ویسے یہ سچ ہی ہے۔ ساٹھ ستر برسوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اہم تو شروع کے وہ پچیس تیس سال ہوتے ہیں جب قومیں پنپتی ہیں... بنتی ہیں... یا بگڑتی ہیں... جو ہم بڑے سکون سے ضائع کر چکے ہیں۔

جون کا مہینا، امداد و نثار کے دن اور شادیانے بجاتے حکمران... اس میزانیہ کی صورت تمام مسائل کا حل پیش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص سر پکڑے فکر میں جتا ہے کہ مدعوں کیا اور ہم زوں کیا... جناب! میزانیہ چھوڑیے اور ملک کی فکر کیجیے۔ ترقی کے لیے سازگار ترین سال ضائع کیے اور مزید اتنے ہی سال خرابات کی نذر کیے... اب کس کا انتظار ہے! آپ بھی سوچیے... اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس دفعہ آپ لوگ کیا فرما رہے ہیں... اپنے مکتوبات کی صورت میں...

ننکانہ صاحب سے اختر عباس چٹھہ کی ناپسندیدگی "جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت 18 سال سے زیرِ مطالعہ ہیں لیکن خط لکھنے کی جسارت پہلی دفعہ کر رہا ہوں۔ جاسوسی 2 مئی کو دستیاب ہوا، سرورق جاذبِ نظر اور دل آویز ہے۔ دوشیزۂ سرورق کسی کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے یا مسکرا کر دیکھ رہی ہے... چلتے ہیں چڑیلوں کے خوف ناک محلے میں... جہاں کرسیٔ صدارت چڑیلوں کی ملکہ نہایت ڈراؤنے انداز میں براجمان... بے پر کی ہانک رہی ہیں۔ خیر، ہم نے تو ماہا ایمان کا کیس تفسیر عباس بابر کے حوالے کیا ہوا ہے۔ وزارت کی کرسی پر اعجاز احمد راحیل، آپ سے تو ہمیں دلی ہمدردی ہو رہی ہے۔ ایسے صدر کا وزیر ہونے سے تو بہتر تھا آپ لاری اڈے پر املی آلو بخارے کا شربت بیچنے بیٹھ جاتے۔ بہرحال، محتاط رہیے۔ سب سے پہلے رنگ و سنگ پڑھی، کافی اچھی اور دلچسپ اسٹوری تھی نیناں کے خوب صورت نینوں کا کمال تھا کہ کامران اس کے اشاروں پر ناچتا رہا۔ مریم کے خان کی منفرد تحریر انتقام کا تجسس آغاز تا اختتام برقرار رہا۔ للکار بوریت اور یکسانیت کا شکار ہو رہی ہے جبکہ گرداب کو خواہ مخواہ طول دیا جا رہا ہے۔ منظر امام کا پہلا رنگ غلام گردشیں حقیقت سے ذرا ہٹ کر لگا لیکن ہوتا ہے شب و روز تماشا کے مصداق... فی زمانہ کچھ بھی ممکن ہے۔ شرافت کے اجلے لباس کی آڑ میں میاں صاحب کا شیطانی نیٹ ورک اور نفسانی خواہش... توبہ کا مقام ہے... انجام یہی ہوتا ہے ہر فرعونِ وقت کا... زیبی اور کامران بال بال بچے اور بال بچوں والے بھی ہو گئے... چلو کچھ تو اچھا ہوا... انڈر ورلڈ سے کاشف زبیر کی دلچسپ اور اثر انگیز تحریر... دائرے... جرم اور مجرم جتنا بھی طاقتور ہو، کبھی پنپ نہیں سکتا۔ یہی قانونِ فطرت ہے۔ مختار آزاد کی رقیب بجلی بھی کافی دلچسپ رہی۔ دیر آید، دور اندیش، سوغات اور بگلا بھگت بھی اچھی رہیں۔ کترنوں میں تفسیر عباس بابر اور ماہا ایمان کی شرارتیں بوجھل لمحوں کے لیے... اچھی کوشش ثابت ہوئی۔"

کشمیر سے انضمام راجا کی دلداری "جاسوسی کا ہوں پرانا قاری، پر خط لکھ رہا ہوں پہلی بار۔ امید ہے آپ شامل کریں گے ہماری عرض داری۔ مئی کا شمارہ 3 مئی کو موصول ہوا۔ جاسوسی کا ٹائٹل دیکھ کر لگتا ہے کہ دونوں انکل صاحبان صنفِ مخالف کی ایجنسی کے لیے کام کرتے ہیں اور اپنی ہی صنف سے ناانصافی کر رہے ہیں۔ خیر، اللہ پوچھے گا آپ کو۔ اشتہار پھلانگ کر چینی، نکتہ چینی میں پہنچے تو ماہا ایمان کو وکٹری اسٹینڈ پر پایا۔ تبصرہ واقعی جان دار تھا۔ ماہا ایمان آپ لفاظی بہت خوب کرتی ہیں۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی شان دار تھے۔ ہمایوں سعید آپ کہاں کھو گئے۔ آپ کے تبصرے ہمیں کافی پسند ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ للکار پڑھی۔ ثروت کے دوبارہ ملنے سے کہانی میں ٹوئسٹ آ گیا ہے جبکہ جلالی صاحب کی صورت میں ایک جلالی کریکٹر کا مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ اسما صاحبہ کہانی کو بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ شہریار کی سی ایف پی میں شمولیت پر خوشی جبکہ شہزادی کی موت افسردہ کر گئی۔ ویسے آپ نے ماہ بانو کی شادی اسلم کے ساتھ کر کے اچھا نہیں کیا۔ (آپ سے کرا دیتیں؟) پہلے صفحات پر سارا شاہد کی رنگ و سنگ شوبز کی دنیا کی ایک اچھی تحریر تھی۔ مختصر کہانیوں میں دیر آید، سوغات اور بگلا بھگت اچھی تحریریں تھیں۔ پہلا رنگ غلام گردشیں میں میاں بشیر کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔

کہانی نے اختتام تک جکڑے رکھا جبکہ دوسرے رنگ میں شارق غلط راستے سے دوبارہ صراطِ مستقیم پر آ گیا۔ کرم حسن کے کردار نے کافی متاثر کیا۔"

چشتیاں سے آصفہ صداقت کی ریل "سرورق کو ایک نظر دیکھا اور اسپیڈ بریکرز پر ہچکولے کھاتے سیدھے نکتہ چینی میں پہنچے۔ اس دفعہ ماہا وکٹری اسٹینڈ پر۔ ڈھیر ساری مبارک باد۔ جن دوستوں کو ہمارا تبصرہ اچھا لگا ان کے لیے ڈھیروں شکریے کے گلدستے اور جنہوں نے ناک بھوں چڑھائی، ان کے لیے صرف اتنا کہ بھئی تسی ہو کون؟ علی رضا آتش کے لیے پچھوں کی ملیاں سے مشورہ مفت آیا ہے۔ جب گرمیاں آتی ہیں تو اپنا نام تبدیل کرلیا کریں۔ علی رضا آتش سے علی رضا ٹھنڈر کھ لیا کریں۔ بھئی کول کول رہیں گے۔ ایویں سوکھے انگارے چباتے رہتے ہو۔ ڈیئر ماہ تاب ایف ایم جوائن کرنے کی ڈھیر ساری مبارک باد۔ گلاب جامنوں کا ڈبا تو اب آپ کی طرف بنتا ہے کیوں انکل جی؟ (اور کیا...) پیارے انکل تفسیر جی! تسی کدھر کو غائب ہو گئے؟ میدان تو چھوڑ کر نہ بھاگا کریں، واپس آجائیں اور رواج صاحب کو بھی لے آئیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ہمارا خیال ہے چینی، نکتہ چینی میں کافی املی اور مرچ مسالے ڈال لیے اب ذرا واپس سرورق کی طرف نظرِ کرم کرتے ہیں۔ ہمارے پیارے ذاکر انکل جی! بڑے ادب سے گزارش ہے۔ ذرا رحم کیجیے جاسوسی ڈائجسٹ کو تاریخی ڈائجسٹ نہ بنایا کیجیے۔ ارے بھی تو ماڈرن اسلحہ دکھایا کریں۔ دل تو کرتا ہے کہ سب ڈائجسٹوں کے سرورق اتار کر رکھ لیں اور کچھ عرصے بعد بچوں کو دکھا کر کہا کریں گے، بچو! یہ دیکھو دنیا میں ایسی بھی بندوق ہوا کرتی تھی۔ فہرست میں کاشف صاحب کا نام پڑھ کر بھاگم بھاگ اینڈ پر پہنچے۔ حرام وحلال اور غلط صحیح میں تمیز کرتی طرح دار تحریر تھی۔ اندازِ بیاں میں دلکشی اور برجستگی ہمیشہ کی طرح تھی، بس شگفتگی کی کمی تھی۔ اس بار منظر امام غلام گردشیں لے کر آئے۔ کافی عرصہ پہلے غلام قادر صاحب نے بھی اسی نام پر ایک کہانی جاسوسی میں لکھی تھی۔ نام تو ایک ہے مگر کہانی مختلف ہے۔ بادِ صبا کی طرح شروع ہونے والی کہانی کو منظر صاحب نے دو چار پیچ کے بعد آندھی کے جھکڑوں کی طرح چلایا کہ ہم بھی گردش میں آ گئے۔ کہانی پڑھ بھی لی مگر چکر ختم نہ ہوئے۔ بس اتنا کہیں گے، ہیں کوا کب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ تو بہ... پہلی کہانی تک پہنچے۔ آپ کا نام بہت اچھا ہے سارا جی۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ جتنا اچھا اپنا نام اتنا ہی اچھا کہانی کا نام بھی تھا مگر کہانی سو سو رہی۔ ہیرو، پروین کے ساتھ بس ایک لاش۔ بھئی کوئی دو چار بندے تو پھڑکاتیں۔ پلاٹ اچھا تھا، گرفت بھی تھی مگر پتا نہیں کہیں کی سی محسوس ہوتی رہی۔ سچائی کو فیس کرنے کے بجائے راہِ فرار وقت اور مصلحت کے عین مطابق تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ گرداب میں غوطہ لگایا اور جان کر دل کو سکون واطمینان حاصل ہوا کہ اپنے اے سی صاحب بال بال بچ گئے۔ لگتا ہے نیا بہروپ بھرنے کے بعد اے سی صاحب کچھ نئے ایڈونچرز لے کر آئیں گے۔ اساجی! میجر ذیشان کو بھی تھوڑا ہیرو شیرو بنائیں۔ جمال دتی صاحب بھی تو کہانی کا انجام بخیر کر دیا کریں۔ اب سیلی بے چارہ کیا کرے گا۔ وہ تو گیا کام سے۔ مریم جی ہم تو آپ کے فین ہو گئے۔ ہر بار الگ اندازِ بیاں اور مضبوط گرفت۔ گو کہ موضوع نیا تو نہ تھا مگر کہانی مزہ دے گئی۔ سوغات بھی مزے کی تحریر تھی۔ بگلا بھگت سر کے اوپر سے گزر گئی۔ کسی قدر خشک موضوع اور بور کرنے والی کہانی تھی اس لیے خشک سا تبصرہ کرنے سے بہتر ہے بندہ نہ ہی کرے۔ سلیم انور کی دور اندیش چھوٹا پیکٹ بڑا دھماکا تھی۔ ایک پل میں جانچ کر فیصلے کی دھار پر کیفرِ کردار تک پہنچانے والی بہترین داستان تھی۔ مختار صاحب اس بار عجیب سے نام والی کہانی لے کر آئے مگر کہانی عجیب نہیں غریب ضرور تھی۔ اب آپ پوچھیں گے وہ کیسے بھئی۔ طمع، حرص، لالچ، خودغرضی پر مشتمل کہانی غریب ہی ہوتی ہے۔ بہر حال جو جس کے ساتھ ہوا اسی کا حق دار تھا۔"

ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل کا تبصرہ "ماہِ مئی کا شمارہ میری آنکھوں کے سامنے ہے، سرورق مجموعی طور پر پسند آیا۔ بہر حال مسکراتی ہوئی حسینہ کی آنکھیں شاید کچھ کہنے کی کوشش میں تھیں گویا:

پیغامِ شوق کو اتنا طویل مت کرنا قاصد
بس مختصر ان سے کہنا کہ آنکھیں ترس گئی ہیں!

پتا نہیں کیوں بچھڑے ہوئے لوگوں کا خیال زندگی بھر ساتھ کیوں نہیں چھوڑتا۔ ہر آہٹ پر انہی کا گمان ہونا شاید یہی زندگی کا حاصل ٹھہرتا ہے۔ سب سے پہلے اپنی محفل میں حاضری دی۔ ماہا ایمان صاحبہ کو ونر سیٹ پر موجود پایا۔ رسمِ محفل کے طور پر مبارک باد۔ ماہاجی، جب توجہ کا مرکز اپنی ذات کی خوبیاں ہوں تو انسان اپنی اصلاح میں ست اور دوسروں پر تنقید کرنے میں چست ہو جاتا ہے، بہر حال تفسیر بھائی کو انکل کہنے سے پہلے اپنی آنٹی سے پوچھ لیا ہوتا۔ محمد کبیر عباسی کا تبصرہ اچھا لگا۔ اوکاڑہ سے حمکی حمکی تصویر العین کا تازہ دم تبصرہ بھی زبردست رہا۔ پشاور سے پیاری سسٹر طاہرہ گلزار کی آمد اچھی لگی۔ بہر حال بہنا! ہماری صنف پر رحم کیا کریں۔ چکوال سے انفال اور صبا مرزا کا تبصرہ ٹھیک لگا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ابتدائی صفحات پر موجود رنگ وسنگ اپنا تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہی۔ کامران کی محبت اور کرن ورما کی دولت کی ہوس سے یہ ثابت ہوا کہ انسان اپنی چاہت اور دولت کے حصول کے لیے اپنی ہر چیز حتیٰ کہ جان تک قربان کرنے کو تیار ہے۔ للکار اس دفعہ کافی الجھی ہوئی تھی۔ پتا نہیں یہ جلالی صاحب بھی کیا چیز نکلتے ہیں۔ بہر حال، قسط مزہ دے گئی۔ گرداب اس دفعہ کافی تیز رہی۔ شہر یار کی سی ایف پی میں شمولیت سے کہانی کی شروعات اب ہوئی ہے۔ شہزادی کی موت کا دکھ بہر حال، اسما قادری کی اس دفعہ قلم پر گرفت مضبوط رہی۔ سرورق کی پہلی کہانی غلام گردشیں خودغرض اور انا پرست انسانوں پر لکھی گئی اسٹوری حقیقت کے قریب لگی۔ واصف کا کردار زبردست لگا۔ کاشف زبیر کی دائرے دولت کے محور کے گرد گھومتی کہانی پسند آئی۔ یہ سچ ہے کہ دولت کی ہوس بعض اوقات ایسے کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ انسان ہر حد کراس کر جاتا ہے مگر دولت تو اسی دنیا میں رہ جاتی ہے مگر اس کی ہوس ایسی ہی کہانیاں ترتیب دیتی ہے کہ انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کرم حسن اور شارق کا کردار زبردست رہا۔ مختصر کہانیوں میں انسانی نفسیات پر لکھی گئی کہانی انتقام پسند آئی۔ جرم کبھی بھی نہیں چھپ سکتا۔ انجام بخیر یہ تاثر دینے میں کامیاب رہی۔ رقیب بجلی، بگلا بھگت، دور اندیش بردست رہیں۔ مجموعی طور پر مئی کا شمارہ اچھا لگا۔"

معراج محبوب عباسی، ہری پور ہزارہ سے پہلی دفعہ لکھتے ہیں "مئی کا شمارہ طویل انتظار کے بعد اور گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں نام درج کرا کر بالآخر دس مئی کو موصول ہوا۔ سرورق پر خوبرو حسینہ ہونٹوں پر مسکان لیے دنیا کو امن وآشتی کا پیغام دے رہی تھی۔ بہر حال ہم سیدھے فہرست میں پہنچے اور

آخری صفحات پر کاشف زبیر کی کہانی دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مگر دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ شہر یار کی خیریت معلوم کیے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ اس لیے سیدھا اساجی کی محفل میں پہنچا اور پہلا صفحہ پڑھتے ہی عجیب سی خوشی ہوئی۔ آخر میں مشابرم خان نے شہر یار کے مشن کو ادھورا چھوڑ دیا اور چودھری کے بچ نکلنے پر افسوس ہوا۔ للکار میں عمران کی وجہ سے نصرت کے علاج کا بندوبست بھی ہو گیا مگر ساتھ ہی ایک نیا موڑ آ گیا جس کی حقیقت جاننے کے لیے بیس دن انتظار کی سولی پر لٹکنا پڑے گا مگر انتظار کا بھی اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ دائرے میں کاشف زبیر نے آج کی دنیا کی سب سے بڑی برائی کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ منظر امام کی غلام گردشیں بھی دلچسپ تحریر تھی۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔"

کراچی سے ادریس احمد خان کی تعریفیں "جاسوسی میں پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں۔ (خوش آمدید) ٹائٹل ذاکر صاحب کی فن مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ٹائٹل اور اداریے کے بعد چینی، نکتہ چینی میں داخل ہوئے جہاں ماہا ایمان پہلے نمبر پر نظر آ رہی تھیں، بہت بہت مبارک ہو۔ ٹائٹل گرل ان جانے خیال سے خود بخود مسکرا رہی ہے جبکہ منظر اور پس منظر میں خوفناک چہرے ٹائٹل گرل کو ڈرانے کی ناکام سعی کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے فیورٹ کہانی للکار پڑھی جو بہت بہترین سلسلہ ہے۔ اس کے بعد گرداب شروع کی۔ للکار اور گرداب دلچسپ سلسلے ہیں جو قلمکار اپنے قلم کی شعلہ فشانیوں کے ساتھ ڈوب کر لکھتے ہیں۔ تابش اور عمران کی جوڑی ہٹ ہے اور گرداب میں بھی شہر یار، ماہ بانو کے کردار جان دار ہیں۔ رنگ وسنگ محبت کے جذبوں سے مزین اچھی تحریر تھی جہاں سازشیں دم توڑ جاتی ہیں اور محبت جیت جاتی ہے۔ انجام بخیر کا انجام بھی اچھا ہوا، انتقام بھی اچھا تاثر لیے تھی۔ سوغات، بگلا بھگت اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ رقیب بجلی اور دور اندیش بہتر لگیں۔ بیچ بیچ میں تراشوں نے بہت محظوظ کیا۔ صفحہ آخری دونوں کہانیاں دلچسپ ترین تھیں جن کو ایک ہی نشست میں پڑھنے میں بہت مزہ آیا۔"

بنوں سے ہمایوں سعید کے جوابات "اس دفعہ سرورق بے حد متاثر کن تھا مگر ہمیں جلدی تھی۔ (کہاں جانے کی جلدی تھی؟) لہٰذا متاثر ہونے کا ارادہ ملتوی کر کے محفل کی جانب بھاگے۔ نام نہاد ماہا ایمان صاحبہ! میں جن لڑکیوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، وہ آپ جیسی تجربہ کار اور منجھی ہوئی نہیں ہوتیں، اس لیے ناکام نہیں ہوتا۔ (یہ تعریف ہے یا نا اہلی...) اور دل مرمت کرنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ اصل میں ہمارا شمار توڑنے والوں میں ہوتا ہے۔ (کیا اوصاف ہیں؟) اختر اینڈ ظفر برادرز! میں تفسیر جیسا منافق نہیں ہوں کہ خود پچھلی نصف صدی سے ہر لڑکی کو نظروں ہی نظروں میں گھر تک چھوڑنے جاتا ہے اور جب بات کرتا ہے تو یوں جیسے یہ ان کی ناپسندیدہ مخلوق ہو۔ اگر آپ سب کو اس صنف میں کسی بھی طرح کا انٹرسٹ نہیں ہے تو آپ کے تبصرے انھی کے اردگرد گھومنے کی وجوہات جاننے سے قاصر ہوں۔ (جواب دیں تمام حضرات!) طاہرہ گلزار صاحبہ! میں نے کسی کی تعریف کے پل نہیں باندھے، ہاں یہ قصور سرزد ہوا ہے کہ سب کے ساتھ تمیز سے مخاطب ہوا ہوں ورنہ یہ کون سا مشکل کام ہے کہ کسی کو دادی نانی بناؤ۔ کسی کو نظر کا چشمہ لگاؤ۔ کسی کی بتیسی گراؤ۔ کسی کا نام بگاڑو اور کسی کو اوپری پورشن خالی ہونے کی خوش خبری دوں۔ (یاد کرلیں کچھ القابات رہ تو نہیں گئے) کاظمی صاحب! ویلکم بیک۔ ہاں یہاں کسی کو اخلاق سے مخاطب مت کرنا۔ فری ایڈوائس ہے لینا ہے تو لو نہیں تو جانے دو۔ ماہ تاب گل! مبارک ہو۔ ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کے آپ کا پروگرام سنیں گے۔ علی رضا آتش! اگر ایسی بات ہے پھر تو آپ آتش بھی اس لیے لگاتے ہوں گے کہ آپ سارا دن اولڈ بک ہاؤس میں مکھیاں مارنے کے بعد شام کو ذرا آتش پکوڑے پکا کر بیچتے ہیں۔ اعجاز احمد! میں نے یہ عرض کیا تھا کہ مرد کی سرشت میں وفا کا عنصر نا پید ہوتا ہے۔ آپ مجھے بتائیے کیا دنیا کا کوئی مرد ایسا ہے جس نے یہ کہہ کر کسی خوب صورت لڑکی کو ٹھکرایا ہو کہ میری وفاؤں پر کسی اور کا حق ہے جبکہ عورت ایسا ضرور کرے گی بشرطیکہ ان کا شمار ان دس فیصد میں نہ ہوتا ہو۔ کاشف زبیر آخری صفحات پر پوری شان سے براجمان تھے۔ پرانے کانسپٹ کی کہانی کو ایک دم نیا اور زبردست انداز دیا۔ کرم حسن کا کردار غیر فطری لگا۔ شارق نے واقعی حرام دولت کو ٹھکرا کے دنیا کا سب سے مشکل کام کیا جس کا اللہ نے اسے صلہ دیا۔ گرداب بلاشبہ اپنے عروج کی جانب گامزن ہے۔ شہر یار کا اے سی کے لبادے سے باہر آنا اور سی ایف پی جوائن کرنا ہمیں بے حد اچھا لگا۔ انجام بخیر غیر متاثر کن رہی۔ منفی سرگرمیوں میں ملوث لوگوں کی گرد پانا بھی کسی رائٹر کے لیے ممکن نہیں۔ دور اندیش انسانی فطرت کی عکاسی لگی۔ بے شک انسان کبھی کبھار اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ایسے کام کر جاتا ہے جس کے نتیجے میں صرف پچھتاوے ہاتھ آتے ہیں۔ رقیب بجلی مغربی معاشرے کی ترجمانی کرتی سفاک تحریر تھی جہاں شریکِ حیات اور محبوب بدلنے میں دیر ہرگز نہیں لگائی جاتی۔ دیر آید درست آید اور مریم کے خان کی انتقام ہمارے معیار پر پوری نہیں اتری۔"

مبشر حسن کا تبصرہ ہیڈ بکائی سے "مئی کا شمارہ ہمیشہ سے ہٹ کر جلدی مل گیا۔ چینی، نکتہ چینی کی محفل میں گئے۔ کرسی صدارت پر ماہا ایمان جان دار تبصرے کے ساتھ براجمان تھیں۔ پتا نہیں لڑکیاں ہی کیوں زیادہ لکھتی ہیں۔ تبصرہ اچھا لگا، مبارک باد قبول کریں بہن جی۔ پھر ماہ تاب گل کا تبصرہ پڑھا، یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے ایف ایم جوائن کر لیا ہے لیکن پتا کیسے چلے گا کہ آپ کا پروگرام کتنے بجے شروع ہوتا ہے، جلدی سے بتائیں شکریہ۔ علی رضا آتش، تصویر العین، انفال مرزا، صبا مرزا اور صبا گل کے تبصرے اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اسما قادری کی گرداب پڑھی۔ شہر یار کو جس طرح ماہ بانو کو اہم مقام پر لائی ہیں اس پر اسما قادری کو شاباش۔ گرداب بھی خوب تھی، مزہ آیا۔ باقی کہانیوں میں مختار آزاد کی رقیب بجلی، غلام گردشیں، دائرے، رنگ وسنگ نے مزہ دیا۔ مئی کا جاسوسی بہت اچھا لگا، ہر چیز اچھی تھی۔"

صوابی سے مشائم کا تبصرہ "مئی کا شمارہ 5 تاریخ کی ایک سہانی نہیں بلکہ گرم شام کو ملا۔ سرورق پر جو ایک نظر کرم کی، دوسری ڈالنا بھول گئے کیونکہ چیز خاصی تو بہ تھی مطلب حسینہ، نازنینا۔ ذاکر انکل کا ایک اور خوب صورت شاہکار۔ سانولی سلونی سی حسینہ کا جل بھری آنکھوں اور خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ ایسی لگی جیسے کانٹوں کی کوکھ میں کھلتا گلاب۔ سرورق کے پوسٹ مارٹم کے بعد انکھیوں کے جھروکوں سے اپنی ست رنگی محفل میں جھانکا اور بے قرار نظروں سے خود کو تلاشا۔ اپنا تبصرہ دیکھ کر تو ہم پر شادیٔ مرگ طاری ہو گیا۔ انکل کے لیے دل سے ڈھیر ساری دعائیں نکلیں۔ تھینک یو سو یچ انکل۔ محفل میں وکٹری اسٹینڈ پر ہماری فیورٹ ماہاجی شاندار تبصرے کے ساتھ براجمان تھیں۔ ڈھیروں ڈھیر مبارک باد قبول کیجیے گا۔ حسبِ معمول سب سے پہلے گرداب میں کود پڑے۔ گرداب ہمیں اداسی کی دھند میں لپٹی نظر آئی۔ اساجی! امید نمبر ایک کا تو پہلے آپ نے خون کر دیا ماہ بانو کی اہلم سے شادی کر کے اور اب دوسرے

کا بھی کرنے والی ہیں ان کو باہر بھجوا کر۔ ہمیں ماہ بانو کی اے سی صاحب سے ملاقات کی جو تھوڑی بہت امید تھی وہ بھی ختم ہوئی۔ ویسے اے سی صاحب اب واقعی میں ہیرو ہو جائیں گے اور وہ بھی قومی ہیرو۔ للکار میں آخرکار تابش، ثروت کو منانے میں تھوڑا بہت کامیاب ہوئے۔ اب آگے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ ہیرو بھائی نے حسبِ معمول بہت ہنسایا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ مختصر کہانیوں میں جمال دستی کی انجام بخیر نے خوب ہنسایا۔ اتنا بے وقوف قاتل۔ مریم کے خان کی انتقام ایک جاندار تحریر تھی۔ انجام بالکل غیر متوقع تھا۔ ہم تو قاتل کسی اور کو سمجھ رہے تھے۔ مریم کے خان مختصر لکھتی ہیں پر پُراثر۔ بابر نعیم کی سوغات ایک فضول تحریر تھی۔ تنویر ریاض کی دیر آید ایک خوفناک تحریر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ہارر موو ی دیکھ رہے ہیں۔ سلیم انور کی دور اندیش اور مختار آزاد کی رقیب بجلی زبردست تھی۔ سرورق کے دونوں رنگ زیرِ مطالعہ ہیں اس لیے نو تبصرہ۔"

بھوانہ سے جعفر حسین کی تجاویز "یہ ذاکر انکل کے تخیل کی پرواز کچھ اونچی ہوگئی ہے یا پھر ہمارے حسنِ نظر کا کرشمہ ہے کہ سرورق کی ہر لڑکی اب ہمیں قلوپطرہ کے مانند نظر آتی ہے۔ نیچے تفسیر انکل واسکوڈے گاما سے مستعار لی گئی گن سے اپنے بھائی راج بھیا کے دانت صاف کرنے کی سعی حاصل کر رہے تھے۔ ماہا ایمان کو اوّل آنے پر مبارک باد، محترمہ کا کہانیوں پر تبصرہ جاندار تھا۔ کبیر صاحب آپ اپنی عرفیت شہزادہ محفل نہ ہی رکھیں تو بہتر ہے، آپ مری کے محکمہ شاہ رنگیلا کے روپ میں بہت سوٹ کرتے ہیں۔ ماہ تاب گل صاحبہ! میرے دوست لطفی نے 17 مارچ کو آپ کا پروگرام سنا، اسے بہت پسند آیا۔ پیش گوئی کر رہا تھا کہ بہت جلد ریڈیو کا شمار آثارِ قدیمہ میں ہوگا۔ ڈاکٹر مرزا صاحب! آپ کی تعلیمی قابلیت جان کر بے حد خوشی ہوئی، کوئی ڈگری رہ گئی ہو تو دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں، اگلی بار سہی۔ طاہرہ صاحبہ! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ دو تجاویز ہیں جس پر دل چاہتا ہے کہ ادارہ ایک دفعہ غور ضرور کرے، محفل میں شائع ہونے والے خطوط میں سے 6 ماہ یا سال بعد ہر لحاظ سے بہترین خط کو واضح طور پر ری پرنٹ کر کے تبصرہ نگار کی حوصلہ افزائی کی جائے، دوسری یہ کہ رائٹرز کے انٹرویوز شائع کرنا ادارے کے لیے عملاً ممکن نہیں ہے۔ اگر ہو سکے تو ہر کہانی کے شروع میں متعلقہ مصنف کی تصویر اور اس کا مختصر تعارف شائع کر دیا جائے۔ مختصر کہانیوں میں منفرد انداز کی حامل انجام بخیر نے محظوظ کیا۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے کی عکاس انتقام ہمیشہ کی طرح مریم کے خان کا بہترین انتخاب رہا۔ سوغات مغربی فیملی سسٹم پر لطیف پیرائے میں گہرا طنز تھا۔ بگلا بھگت نے بور کیا۔ دور اندیش سب کو دعوت فکر دے [illegible] جب طلب حادی ہو جائے تو ہوس بن جاتی ہے جبکہ خود غرضی اور بے وفائی کی موجودگی زہرِ قاتل کا کام کرتی ہے۔ اسی حقیقت کو اجاگر کرتی رقیب [illegible] کی کارزارِ حیات کا احوال لیے، دیر آید قدرت کی ان مصلحتوں کو عیاں کر رہی تھی جن کو سمجھنا ہمارے [illegible] رنگ و سنگ متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ تحریر کی بے جا طوالت اور بے رنگ سے طرزِ تحریر نے [illegible] واقعات کے لحاظ سے بہترین رہیں۔ للکار اور اس سے ملتی جلتی دوسرے مصنفین کی تحریریں ہمارے [illegible] کرتی ہیں کہ بڑے مصنف اپنے لیے فن پارے تخلیق کرتے ہیں جبکہ چھوٹے ہمارے لیے۔ منظر امام صاحب بلاشبہ بہت اچھے مصنف ہیں مگر جس انداز میں وہ اپنی فکر کو ڈیلیور کرتے ہیں، وہ ہمیں مایوس کر دیتا ہے۔ سرورق کے پہلے رنگ نے بھی پہلے پریشان کیا پھر حیران کر دیا۔ کاشف صاحب جب بھی لکھتے ہیں کمال کر جاتے ہیں۔ مسلسل لکھنا اور معیاری لکھنا دو متضاد باتیں ہیں مگر کاشف صاحب یہ کام بخوبی کر رہے ہیں۔"

ایم اے ہاشمی ڈسٹرکٹ بونیر سے تبصرہ فرماتے ہیں "مئی 2012ء کا جاسوسی کا شمارہ ایک سنہری ٹائٹل کے ساتھ 4 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق کی آنکھوں کو دیکھ کر بے ساختہ یہ شعر ذہن میں ابھر آیا کہ "ہے کدے بند کریں لاکھ زمانے والے، دنیا میں کم نہیں آنکھوں سے پلانے والے" وہ بھی اپنی بے نیازی سے ہمیں مدہوش کر رہی تھی پر ہم مدہوش ہونے والے کب تھے لہٰذا ورق ہلکا اور اوراق پلٹ کر نکتہ چینی ملاحظہ کی۔ مدیرِ اعلیٰ کی باتیں پڑھ کر اندر سے ایک افسوس بھری سانس خارج ہوئی۔ جاسوسی کی سیج پر ایک دفعہ پھر صنفِ نازک کا وار چل گیا تھا۔ یہ غور کرنے کا مقام ہے۔ بہرحال، ماہا ایمان کو مبارک باد جن کے خط میں بھائیوں کی ٹانگیں کھینچنا اور جگہ جگہ اعتراضات کچھ زیادہ ہی نظر آئے۔ [illegible] تفسیر عباس صاحب سے متعلق آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ ساہیوال سے اعجاز احمد کا خط بھی اچھا تھا۔ بھئی آپ راحیل کب سے ہو گئے؟ مالاکنڈ سے محترمہ صبا گل کے گھر والوں کی طرف سے یہ درخواست ہے ادارے اور قارئین کے لیے کہ آپ لوگ صبا گل کے ساتھ چھیڑ خانی سے گریز کریں اور اس کے خط کو بروقت شائع کیا کریں ورنہ پھر وہ پٹری سے اتر جاتی ہیں اور گھر میں توڑ پھوڑ سے لے کر اپنے بال نوچنے تک سب کچھ کر گزرتی ہیں۔ تو آپ مہربانی فرما کر اس پر غور کریں۔ (یہ باتیں صبا نے آپ کو بتائی ہیں؟) دیگر خطوط میں شہزادہ کبیر عباسی اور شکیل کاظمی صاحبان کے خطوط بہت اچھے تھے۔ گرداب بڑا ہی خوب صورت انداز لیے ہوئے تھی۔ یہ قسط بے حد شاندار تھی۔ یہی رائٹر کے ہاتھوں کا کمال ہے کہ اس قدر جادوئی انداز میں لکھتی ہیں کہ پڑھنے والا خود کو تمام حالات و جزئیات میں موجود پاتا ہے۔ اب بات ہو جائے جاسوسی کے سب سے بڑے للکارنے والے مغل صاحب کی جو ایک جادوئی تماشا [illegible] رنگ بدلتی ہوئی مغل صاحب کی یہ تحریر للکار اپنے حسن و چاشنی کے ذریعے قارئین کے دلوں کو گرماتے ہوئے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ [illegible] صفحات پر رنگ و سنگ سمارا شاہد جو کہ ایک جانا پہچانا سا نام ہے، کی ایک پُرتجسس تحریر تھی۔ پوری کہانی کے حالات، تجسس، تھرل [illegible] گریاں نظر آئے۔ کامران کی چالاک اداکاری اور پلاننگ نے متاثر کیا۔ شیراز علی کو اپنے کیے کی بدترین سزا ملی۔ اس کی [illegible] ایک نام نہاد محبت پر لعنت بھیجنے کو دل چاہتا ہے جس میں محبوب کی خوشیوں کے بجائے صرف اپنے جذبات کا احساس ہو جائے [illegible] تجسس اور رومانس جیسے مثبت پہلو کے ساتھ ساتھ دھوکا، فریب، جھوٹ، نفرت اور تعصب جیسے منفی جذبات و اعمال کی بھی بھرپور [illegible] اس انداز میں اختتام پذیر ہوئی جیسے ادھوری رہ گئی ہو۔ پہلا رنگ بس گزارے لائق تھا۔ دوسرا رنگ دائرے کا [illegible] ہر ایک کو اپنے کیے کی سزا پانی ہے۔ چالاکی دکھانے والے دولت کے پجاری، بختیار اینڈ کمپنی [illegible] چھوٹی کہانیوں میں مریم کے خان کی انتقام اور سوغات اچھی کہانیاں تھیں۔ باقی زیرِ مطالعہ ہیں۔"

اوکاڑہ سے تفسیر عباس بابر کی محبتیں "مئی کا دلکش اور ایکشن سے بھرپور شمارہ 6 مئی کو دستیاب ہوا۔ سرورق الجھے ہوئے ریشم کی طرح تھا۔ صنفِ نازک و صنفِ وجاہت کے درمیان... دانتوں کی نمائش کا دلچسپ مقابلہ۔ ظاہر ہے جیت قوم یاجوج ماجوج... یعنی خواتین کی ہی ہوگی کہ ان کی زبان اور دانت دونوں تیز ہوتے ہیں۔ (دونوں سے مستفید ہیں؟) چینی، نکتہ چینی میں حسبِ روایت آپ کی اثر انگیز گفت و شنید نے دعوتِ فکر کا اہتمام کیا۔ حافظ آباد سے ماہا ایمان، مسندِ صدارت کے نیچے چھپ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ عقل نہیں تے موجاں ای موجاں۔ رسی جل گئی مگر بل نہ گئے اور ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں جو آپ نے عملی مظاہرہ کر کے بتا دیا کہ کھسیانی بلی کس جوش و خروش سے کھمبا نوچتی ہے اور بلی بھی... مخبوط الحواس اور بوڑھی۔ ساہیوال سے بہت پیارے دوست اعجاز احمد راحیل نے جو کچھ عرض کیا ہے، کیا خوب عرض کیا ہے۔ او بھولے میاں! اگر میر صادق غداری کا تمغہ حاصل کر سکتا ہے تو... آصفہ صداقت... صداقت یعنی سچائی سے دستبردار کیوں نہیں ہو سکتیں؟ شاید حافظ آباد کا پانی پی بیٹھی ہیں... اور علی آتش سیاسی چالیں چل رہے ہیں۔ آزاد امیدوار یہی کرتا ہے جو پارٹی جیت جاتی ہے، اس کے ڈیرے پر مٹھائی لے کر پہنچ جاتا ہے... گجرات سے مصدق محمود دانش... عزت افزائی، حوصلہ افزائی اور اظہارِ محبت کے لیے ازحد نوازش۔ راجن پور سے ماہ تاب گل آپ کو تو خیر... مبارک باد لیکن ایف ایم سننے والوں سے ہمیں دلی ہمدردی ہے... اللہ ہی خیر کرے۔ مالاکنڈ سے صبا گل نے یقیناً تبصرہ اس وقت لکھا جب کسی بزرگ ہم عمر نے ان کی درست عمر بتا کر... ساتھ ہی آئینہ بھی دکھا دیا۔ ظاہر ہے غصہ آنا لازمی بات ہے۔ تلہ گنگ سے محمد وقار اعظم کی خواہش... پر کیا کریں ہزاروں خواہشیں ایسی کہ... ہر خواہش پر دم نکلے۔ قصور سے علی آتش، اس محفل میں کند ذہن خواتین و حضرات کا داخلہ ممنوع ہے۔ طاہر جاوید مغل کی لازوال تحریر للکار نے حسبِ روایت میلا لوٹ لیا۔ ثروت اور تابش کی تجدیدِ محبت کے امکاں... روشن ہوئے تو ہیں۔ عمران نہایت دلچسپ، شان دار اور سدا بہار کردار ہے۔ اسما قادری کی گرداب... کہانی کا پانسا پلٹ گیا ہے۔ شہزادی اپنے لختِ جگر سمیت... جبر و بربریت کا شکار ہو گئی۔ چوہدری افتخار مکافاتِ عمل کے اٹل قانون سے کب تک بچے گا۔ شہریار کی جان بچی سو لاکھوں پائے... جسے اللہ رکھے... اسے کون چکھے؟ خاص صفحات کی پہلی تحریر سمارا شاہد کی رنگ و سنگ... بس ٹھیک ہی تھی۔ کہانی کی بنیاد میں کافی جھول تھے۔ بہرحال، بحیثیت نو وارد کوشش ناکام نہیں ہے۔ منظر امام کا پہلا رنگ غلام گردشیں، غلام گردشوں میں جنم لینے والے دل دوز و عبرت اثر واقعات۔ زہی کے مظلوم و منفرد کردار نے متاثر کیا۔ کامران کی اسٹک تنگ و دو قابلِ داد ہے۔ کاشف زبیر کا دوسرا رنگ دائرے، قلزمِ ہستی میں تنکوں کے مانند بکھر جانے والوں کا عبرت ناک انجام۔ راہوں کا تعین غلط ہو تو زندگی کا انجام بھی غلط اور باعثِ عبرت ہوتا ہے۔ جمال دستی کی انجام بخیر نے بھی بور نہیں کیا۔ مریم کے خان کی پُرتجسس اور سنسنی سے بھرپور تحریر انتقام، انسانی جبلت اور نفسیاتی مسائل کی اثر انگیز عکاسی۔ مختصر کہانیوں میں سوغات، بگلا بھگت، دور اندیش، رقیب بجلی اور دیر آید پسند آئیں۔"

کنڈیارو سے ثمن سیال کے خیال "نمک چینی کے دوستوں کو سلام عرض ہے۔ ماہ تاب گل جی، آپ کا لک تو بہت ہی گڈ لک ہے۔ مبارک ہو ایک تو ہم نے درجنوں کے حساب سے درخواستیں دیں لیکن جواب ندارد، اگر آپ کے پاس کوئی فارمولا ہے تو ہمیں بھی بتا دیں... افسوس رہے گا کہ ہمارے پاس ایف ایم 104 نہیں چلتا ورنہ آپ کی پیاری سریلی آواز سے مستفید ہو سکتے۔ اب آتے ہیں اس دفعہ کی کہانیوں کی طرف۔ سمارا شاہد کی رنگ و سنگ ٹھیک تھی۔ منظر امام کی کہانی غلام گردشیں میں تو بہت چکر تھے۔ مغرب کے رنگ بھی پسند آئے لیکن جس کہانی کو میں نے 100 نمبر دیے ہیں، وہ ہے جناب کاشف زبیر صاحب کی سرورق کی دوسری کہانی دائرے، یہ کہانی آخر تک رائٹر کی گرفت میں تھی۔ میرے ناقص خیال کے مطابق سارے شمارے میں اوّل نمبر کی حق دار دائرے ہی تھی کیونکہ یہ کہانی سسپنس کے ساتھ سبق آموز بھی تھی۔ جناب مہر اے ڈی سیال! کیا آپ جھنگ احمد پور سیال سے تو نہیں اگر دوستی کرنا چاہیں تو خوب بنے گی۔"

ہنگو سے انجینئر عمیر شہزاد کی داستان "اس دفعہ مہینے کے شروع ہی سے مصروفیت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور اوپر سے پیپرز... مصروفیت کیا تھی بس آپ پوچھو ہی مت۔ (چلیں نہ بتائیں) اف اللہ! ایک ننھی سی جان اور اس پر اتنا ظلم... اس لیے یہ پتا ہی نہیں چلا کہ جاسوسی کب آیا۔ خدا کا شکر کہ 8 مئی کو کسی نہ کسی طریقے سے جاسوسی حاصل کیا اور سب سے پہلے معمول کی طرح سرورق پر نظر پڑی تو حسینہ کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر ساری تھکن ختم ہوئی لیکن جب ہوش میں آیا اور پیچھے دیکھا تو ایک آدم خور مجھے دیکھ کر گھور رہا تھا۔ پتا نہیں ذاکر انکل نے کس سوچ کے تحت اسے بنایا۔ میرا تو سارا موڈ آف کر دیا اور تیزی سے دروازے کو پھلانگتے ہوئے اندر چینی، نکتہ چینی کی محفل میں داخل ہوا جہاں پر سب دوستوں نے چینی کم ہی ڈالی تھی کیونکہ سب کو احساس تھا کہ زیادہ چینی مضرِ صحت اور باعثِ شوگر ہے۔ یہاں پر سب سے پہلے میں نے اپنے خط کا سراغ لگانا شروع کیا لیکن کہیں بھی کوئی سراغ نہ ملا۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ میرے خط کا قتل ایڈیٹر انکل نے کیا ہوگا لیکن تحقیقات کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر اس نے کیا ہوگا تو اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی نشان ضرور چھوڑا ہوگا کیونکہ ان میں اتنی عقل ہی کہاں۔ اتنی صفائی سے کام صرف محکمہ ڈاک والے ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد جھانسی کی رانی ماہا ایمان کو دیکھتا رہا جنہوں نے صرف قلم کے ذریعے ہی سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ شکر ہے کہ ان کے ہاتھ میں تلوار نہیں تھی۔ ورنہ اللہ خیر۔ ماہ تاب گل کو ایف ایم جوائن کرنے پر بہت بہت مبارک باد۔ کبیر عباسی صاحب آپ سے گزارش ہے کہ آپ کسی امتحان کے پیپر نہ چیک کرو ورنہ طالب فیل۔ سید شکیل حسین کاظمی صاحب کا تبصرہ پڑھ کر خوشی ہوئی اور آپ سے گزارش ہے کہ آئندہ بھی ہمیں خوشی کا موقع دو گے۔ رانا حبیب الرحمٰن نے اپنے دکھ درد کی داستان سنا کر رلا ہی دیا۔ طاہرہ گلزار بہن کیسی ہو آپ؟ تصویر العین صاحبہ! تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ باقی تبصروں میں اعجاز احمد راحیل، مصدق محمود دانش، مشائم صوابی اور صبا گل کے پسند آئے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف پتا نہیں یہاں سب لوگ ماہ بانو کی شادی کے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں۔ اسلام میں بھی عورت کو اپنی مرضی کا حق ہے پھر آپ لوگ ماہ بانو کو اپنا حق استعمال کرنے کیوں نہیں دیتے ہو۔ (صحیح) کہانیوں میں سمارا شاہد کی رنگ و سنگ میں اپنے پڑوسی ملک کے حالات کے بارے میں بہت عرصے بعد ہی پڑھنے کو ملا۔ جس میں بالی ووڈ کے راز افشاں ہوئے۔ باقی امتحان کی وجہ سے اور کہانیاں نہ پڑھ سکا اس لیے مختصر سا تبصرہ لکھا۔"

قمر ستی، کہوٹہ راولپنڈی سے حاضر ہیں "بالآخر تین ماہ بعد پہلی بار جاسوسی 5 مئی کو موصول ہوا۔ ٹائٹل نسبتاً بہتر تھا۔ محفل میں پہنچے تو پہلا خط دیکھتے ہی

بے حد غصہ آیا۔ ماہا ایمان کو برداشت کرنا اب میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ (ایسا کیا کردیا انہوں نے؟) محترمہ کا خط ہے یا نان اسٹاپ رگبی کنٹری؟ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اعجاز احمد راحیل! علی آتش نے تفسیر عباس کے بارے میں سچ لکھا ہے، اس لیے آپ کو اور تفسیر عباس کو ہضم نہیں ہو رہا۔ مصدق محمود دانش! آپ مدت بعد واپس آئے ہو اس لیے آرام سے... ایسا نہ ہو کہیں گر جاؤ اور اٹھنے کے قابل نہ رہو۔ ایک اور بات تمام دوستوں کو بتا تا چلوں کہ نہ میں صنفِ نازک کا حمایتی ہوں، نہ صنفِ کرخت کا۔ ناصر آسی کی ای میل پڑھ کر آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے کہ کیا میں ای میل بھی بھیج سکتا ہوں؟ جواب ضرور دیجیے گا۔ (جی ہاں...) کہانیوں میں سب سے پہلے شوبزنس سے متعلق رنگ و سنگ پڑھی۔ کہانی فلاپ تھی۔ ایک ایکٹر اور کام ایک کمانڈو جیسے کر رہا تھا۔ شوبزنس کے موضوع پر جتنی بھی کہانیاں اور فلمیں بنی ہیں، سوائے چند ایک کے سب فلاپ ہوئی ہیں۔ بے شک ہسٹری اٹھا کر دیکھ لیں۔ للکار اس بار ایک ہی مرکزی پوائنٹ پر گھومتی رہی یعنی نصرت کی بیماری۔ گرداب اس بار اپنا حق ادا کرنے میں کامیاب رہی مگر پچھلی پانچ، چھ اقساط سے آفتاب اور کشور کو زبردستی منظر سے ہٹایا جا رہا ہے۔ غلام گردشیں اس بار اسٹوری آف دی منتھ رہی۔ منظر امام لوٹ کے آئے اور خوب آئے۔ دائرے، بس ٹائم پاس تھی۔ کہانی میں نہ زیادہ سسپنس تھا نہ جاسوسی مواد۔ کترنیں شان دار تھیں۔"

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی سرشاری ''مئی 2012ء کا خوب صورت شمارہ پورا ختم کر کے تبصرہ لکھنے بیٹھی ہوں تو الفاظ جیسے کم پڑ رہے ہیں۔ سرورق حسبِ سابق دو نمونوں اور ایک ماہ جبینہ پر مشتمل ہے۔ حسینہ کے حسن میں تو کوئی کلام نہیں ہے لیکن یہ تفسیر عباس بابر انکل کیوں دانت پیس رہے ہیں، یہ سمجھ نہیں آئی۔ محفل میں خود کو اول نمبر پر پا کے جلنے والوں کو خوب جلایا۔ میں خود اپنا تبصرہ پڑھ کے خوب محظوظ ہوئی اور حیران بھی کہ یہ میں نے کیا کیا لکھا تھا کیونکہ جس وقت میں نے وہ تبصرہ لکھا تھا، میری طبیعت خاصی خراب تھی۔ سب سے پہلے ماہ تاب گل رانا کو بہت مبارک ایف ایم چینل جوائن کرنے پر۔ محسن علی صرف باتیں ہی بگھارو گے یا خود کو اہل بھی ثابت کرو گے کرسیِ صدارت کا۔ رانا حبیب الرحمان کی آہ وزاریاں اور دکھ پڑھ کے تو میں گھنٹوں گھنٹوں ہمدردی میں ڈوب چکی ہوں۔ سب دکھوں پر بھاری دکھ یعنی زنداں سے اللہ آپ کو رہائی دلائے۔ شکیل حسین کاظمی کی کسرِ نفسی اور خودشناسی پسند آئی۔ انفال اینڈ صبا میں آپ سے ناراض ہوں، بوجھو کیوں۔ مشائم ویلکم اینڈ آپ کا پہلا خیال سو فیصد درست ہے۔ کبیر عباسی یہ غضب مت کیجیے گا۔ ورنہ شہزادے برا مان جائیں گے اور اپنے شہزادے ہونے پر شرمندہ ہوں گے اور یہ ہمیں گوارا نہیں۔ اختر عباس تمراج! کیا کہنے تمہاری چچہ گیری کے۔ تحریروں میں سب سے پہلا نشانہ گرداب ٹھہری۔ اے سی صاحب اپنی کلف لگی کرسی سے نیچے اترنے کو تیار ہو گئے نہ صرف یہ بلکہ اپنی شخصیت بدلنے پر بھی تیار ہو گئے۔ اس فیصلے کے پیچھے جو وجہ ہے وہ بہت خوب صورت ہے۔ سو ہم دل سے قدر کرتے ہیں اس فیصلے کی۔ للکار میں اس دفعہ عمران کی شوخیاں اور ذکر بالکل نہ تھا۔ نصرت کی بیماری کا ذکر کرتے کرتے تحریر بالکل ہی ایک غیر متعلقہ ڈگر پر چل پڑی ہے۔ پہلی طویل تحریر سارا شاہد کی رنگ و سنگ تھی جو کہ شاید نئی رائٹر ہیں۔ درمیانے درجے کی تحریر تھی۔ سرورق کے رنگوں میں کاشف زبیر چھائے رہے۔ دائرے بہت عمدہ تحریر تھی۔ پہلا رنگ منظر امام کا غلام گردشیں تھا۔ معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ مجھے منظر امام صاحب کا اندازِ تحریر پسند نہیں ہے، سو میں انہیں پڑھنے سے گریز ہی کرتی ہوں۔ مختصر تحریروں میں مریم کے خان کی تحریر انتقام اول نمبر پر رہی۔ بابر نعیم کی سوغات کا اینڈ واضح نہیں تھا کہ آیا شاخ کس لیے استعمال ہوئی تھی۔ بہرحال، کہانی بچے کی ہوشیاری کی وجہ سے دلچسپ تھی۔ بگلا بھگت سراغ رسانی پر مشتمل اچھی تحریر تھی۔ مختار آزاد کی رقیب بجلی اس ماہ کی سب سے بیسٹ تحریر تھی۔ نینا کے انجام پر خوشی ہوئی اور لنڈا کا فیلڈ گرانٹ سے شادی کرنے کا پسند آیا۔ دیر آید میں اینجل نے اپنی پامالی کا بدلہ تمام بوڑھوں کو مار کر لیا۔ یہ بھی عمدہ تحریر تھی۔"

گجرانوالہ سے سید محی الدین اشفاق کی رائے ''ناول گرل اپنے قریب ترین ٹک ڈمل کے آدمی کی موجودگی میں بھی مسکرا رہی تھی۔ مدیرِ اعلیٰ آپ نے بالکل درست فرمایا کہ آج کل فرصت کی وجہ سے سب سے پہلے کتب خریدنا بند کردیا جاتا ہے تاہم میرا خاندان یہ اعزاز رکھتا ہے کہ جب ہمارے شہر میں چند ایک ڈائجسٹ جاسوسی، سسپنس اور دو تین اخبارات آتے تھے، اس وقت بھی میرے والد صاحب ان کو پڑھتے تھے۔ (بہت اچھی عادت ہے) محفل میں ماہا ایمان صاحبہ بڑے اچھے تبصرے کے ساتھ موجود تھیں، مبارک باد۔ اور ہاں، اپنے دستِ مبارک پر اتنا ناز کیوں جی؟ آپ کے ہاتھوں میں ہیرے جواہرات لگے ہوئے ہیں؟ اصل میں ہمارا جاسوسی ہے ہی ایسا کہ جن ہاتھوں میں جائے ان ہاتھوں کو خود پر ناز ہونے لگتا ہے۔ (اور کیا...) یار ہمایوں سعید راج! اتنا غصہ اچھا نہیں، آپ نے شاید آئینہ دیکھتے ہوئے مجھ پر تبصرہ لکھ دیا۔ میں ایک باڈی بلڈر ٹائپ لڑکا ہوں جس کے ماتھے پر گرے آنکھوں کو چھوتے بالوں کو سب بہت پسند کرتے ہیں۔ بہرحال، انسان اپنے قلم اور تحریر سے پہچانا جاتا ہے۔ صبا گل جی! ماہ بانو کے دکھ میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ گرداب نے گرداب میں ڈال دیا ہے۔ فیورٹ للکار میں اس دفعہ سستی نظر آئی۔ ثروت، تابش کے قریب ہوتی جا رہی ہے۔ سہراب جلالی کے آنے اور عمران اینڈ تابش کے اکٹھے ہو جانے سے پھر تیزی آئی ہے۔ دیکھتے ہیں اس باکس میں کیا ہے؟ منظر امام نے غلام گردش کے نام سے اچھی تحریر لکھی تاہم ان کی تحریروں کا اسٹائل مشکل کر دیتا ہے۔ باقی جاسوسی زیرِ مطالعہ ہے۔"

کراچی سے اقرا بانو ناگوری کی گزارش ''میں جاسوسی کی ایک خاموش قاری ہوں اور آج پہلی بار چپ کا روزہ توڑ کر چینی، نکتہ چینی میں شریک ہونے کا اعزاز حاصل کر رہی ہوں۔ (مبارک ہو) سب سے پہلے بات کرتے ہیں گرداب کی جو کہ کئی ماہ سے ٹھنڈی لگ رہی ہے۔ اے سی اور چودھری کے درمیان روایتی رسہ کشی اور پھر اس میں ایک نئی تنظیم سی ایف پی کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنا لیکن اسما قادری صاحبہ، کشور اور آفتاب کی طرف بھی تو نظر دوڑائیں۔ دوسری طرف انکل طاہر جاوید مغل مسلسل دشمنوں کو للکار رہے ہیں۔ ہر بار اک نیا ہنگامہ، ہر بار نئی کہانی، ہر قدم پر نئے کردار، ہر قسط میں نیا قصہ۔ سطر سطر سنسنی اور ہر صفحہ پر تجسس، سسپنس اور انوکھا پن۔ انکل مغل ویلڈن۔ کاشف زبیر اس بار دائرے لے کر آئے اور کہانی کو نہایت روانی کے ساتھ دل کی دھڑکنوں کو تیز کرتے ہوئے ایک متوقع انجام سے ہمکنار کیا۔ بس اتنا ہی، اگلے ماہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ آپ کے اس ماہنامہ کے ذریعے

میں اپنی دوستوں صبا اسلم، اقرا شوکت اور فائزہ اور نشاء کو بتانا چاہوں گی کہ وہ بھی جاسوسی پر تبصرہ کریں کیونکہ وہ پڑھتی تو خوب ہیں مگر تبصرہ نہیں کرتیں...''

رحیم یار خان سے عمران شاہ ہاشمی کی شکایت اور بے چینی ''مئی کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ سوچ رہا ہوں دل کا حال لکھوں کہ نہ لکھوں۔ جاسوسی ڈائجسٹ سے تعلق اتنا پرانا ہے کہ شکایت لبوں تک آتے آتے دم توڑ جاتی ہے لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو کہنے کو من مچلتا ہے۔ (تو کہیں نا) پہلے رسالہ ہر ماہ کیم تاریخ کو مل جایا کرتا تھا، اب پانچ تاریخ تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ امید ہے آپ اس تاخیر کی وضاحت ضرور فرمائیں گے (کئی مسائل درپیش ہوتے ہیں) جب رسالہ ہمارے ہاتھوں میں آتا ہے تو دل خوش بھی ہوتا ہے اور گھبراہٹ بھی ہوتی ہے کہ نہ جانے اس مرتبہ محترمہ اسما قادری کی کہانی گرداب اپنی لفظی بازی گری سے نکل کر کسی منطقی انجام تک پہنچی ہوگی یا نہیں۔ (آپ کو کیا جلدی ہے... وقت آنے پر یہ کہانی بھی اختتام پذیر ہو جائے گی) باقی کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ خصوصاً للکار میں جو سنسنی ہے، وہ پورا مہینا بے چین رکھتی ہے۔'' (شکر ہے کچھ تو پسند ہے۔)

مظفر گڑھ سے شاہد سلیم لغاری کا اختصاریہ ''کافی عرصے بعد دوبارہ شرکت کر رہا ہوں آپ کی محفل میں، جس کی وجہ ایک بار پھر جاسوسی ڈائجسٹ کی لاجواب کہانیاں کی وجہ سے خاص طور پر للکار اور گرداب۔ للکار تو واقعی لاجواب کہانی ہے لیکن اب گرداب بھی اس سے کم نہیں۔ اس کے علاوہ سرورق کی کہانیاں بھی بہترین ہوتی ہیں۔ ہمیں نواب صاحب کی کہانیوں کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے امید ہے یہ شکوہ بھی جلد دور ہو جائے گا۔'' (لیجیے آپ نے کہا اور ہم نے پورا کردیا)

پتوکی، ضلع قصور سے مقصود الحسن طاہر کی مصروفیت ''مئی کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے اور ٹائٹل دیکھ کر بھی ٹھنڈک کا احساس نہیں ہوا۔ سمجھ نہیں آئی کہ ڈاکر انکل بھی اس دفعہ گرمی کے ستائے ہوئے لوگوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ بہرحال نئی رتوں کی امید لیے آگے بڑھے کہ مایوسیوں کے اندھیروں سے روشنی کی ایک کرن ضرور ہمارے دروازوں پر دستک دے گی۔ جو ہمارے اس معاشرے کو گلاب کے پھول کی طرح کھلا کر رکھ دے گی اور پروین شاکر کے اس شعر کی طرح... وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا۔ وہ روشنی بھی پورے پاکستان میں بکھر جائے گی۔ انشاءاللہ۔ اپنی پیاری محفل میں پہنچے تو ماہا ایمان ہمارے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ کتنی خوشی ہوئی مجھے۔ بس اور کچھ نہ پوچھیے گا۔ (نہیں پوچھتے... رہنے دیں) ان سب دوستوں اور بہنوں کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کروں گا کہ جنہوں نے مجھے اپنی محبتوں میں یاد رکھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی للکار سے ابتدا کی۔ طاہر صاحب! آپ نے عمران اور تابی کو پورا لاہور گھمادیا لیکن داتا گنج بخش علی ہجویری کے مزارِ پُرانوار پر حاضری لگوا دیتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ مصروفیت کے باعث ابھی تک صرف للکار ہی پڑھ سکا ہوں۔ سوات کی ٹھنڈی پر فضا ہوائیں آج کل ہماری عسکری مصروفیات میں شامل ہیں۔ موسم کی خوب صورتی کا اندازہ آپ خود لگا لیں۔''

ڈاکٹر مرزا انتظار اور نذیر مغل کی رائے بھٹیاں سے ''جاسوسی 5 مئی کو ملا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے سرورق پر محترمہ ماہا کامل ترین ایمان مسکراہٹ کے ساتھ موجود تھیں۔ ان کی خوشی کا واحد راز کرسیِ صدارت پر براجمان ہونا تھا اور ان کے پیچھے اعجاز احمد راحیل ساہیوال والے غم و غصے و قہر سے چیخ چلا رہے تھے۔ سرورق سے سیدھا پہنچا جاسوستان کی چینی کی کان پر، اس دفعہ کرسیِ صدارت ہمارے ضلع حافظ آباد کے حصے میں آئی۔ سینہ فخر سے بلند اور سر اونچا ہو گیا۔ بہت بہت مبارکاں ماہا ایمان کو۔ چکوال سے انفال اور صبا مرزا کا مجھے خوش آمدید کہنے کا شکریہ۔ لیکن باقی دوستوں کو شاید میری آمد ناگوار گزری ہے۔ (یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟) مری سے کوہساروں کے شہزادے کبیر عباس کا متحن اور پیپر چیکر کے انداز میں تبصرہ سب سے خوب صورت تھا۔ راجن پور کی ماہ تاب گل کو ایف ایم 104 جوائن کرنے پر مبارک باد۔ محترمہ برائے مہربانی دورانِ کمپیئرنگ پیارے جاسوسی و سسپنس اور ان کے نکتہ چین ساتھیوں کے بھی ذکرِ خیر سے اہالیان راجن پور کو نوازیں۔ اعجاز احمد راحیل صاحب آپ نے موم اور آتش والی بات خوب کہی۔ سائنس اور ادب پسند لوگوں نے آپ کی بات کو خوب سراہا ہے۔ اس دفعہ للکار مغلیہ بہت اچھی رہی۔ عمران نے نصرت کے علاج کے لیے جلالی صاحب کے گھر بطور باورچی رہنا پسند فرمایا۔ ثروت کی تابش سے پرانی یادیں تازہ کرنا بہت خوش گوار تھا لیکن اس سے خوش گوار ڈاکٹر مہناز کا جلالی سے بے غرض پیار، محبت، عشق تھا۔ گرداب میں اے سی صاحب کو بچانے پر اسما قادری صاحبہ کا شکریہ اور افتخار عالم شاہ صاحب کی فیکٹریوں پر چھاپے پر کرنل توحید اور اس کے ساتھیوں کا شکریہ۔ سی ایف پی کا شہریار کو بظاہر مردہ یا کومے میں ظاہر کر کے ملک دشمنوں کے خلاف کھل کر کام کرنے کا منصوبہ دل کو بھا گیا۔ اسٹوری آگے جا کر مزید دھوم مچائے گی۔ (یقیناً) منظر امام نے غلام گردشیں میں اچھا منظر دکھایا لیکن کہانی کھوکھلی سی تھی۔ کسی خاص تاثر سے عاری۔ پھر محبوبہ کا بہن نکل آنا اور پاگل والدہ کا یک دم دوست ہونا جیسی انہونیاں مصنف کی مہارت کا پتا دیتی تھیں۔ دوسرا رنگ نہایت شان دار تھا۔ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا یہی حشر ہونا چاہیے۔ استقبالیہ اسٹوری رنگ و سنگ سارا شاہد کی اچھی اسٹوری تھی۔ سب ساتھیوں کو سلام... اور ہاں، میری ڈیٹ آف برتھ پانچ جون ہے لہٰذا مجھے مبارک باد دینے کا سنہری موقع ہے۔ اس سے سب فائدہ اٹھائیں۔'' (بجا فرمایا... ہم فوراً ہی فائدہ اٹھا لینا چاہتے ہیں... شدید گرمی میں ٹھنڈی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

مصدق حسین مغل، ضلع ننکانہ صاحب۔ راجہ امجد سعید ناز، ضلع سرگودھا۔ علی آتش، ضلع قصور۔ سعدیہ، گڑھ مہاراجہ۔ سفیان ہاشمی، کراچی۔ ناصر محمود، کوہستان ہزارہ۔ انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ محسن علی موم، بالاکوٹ۔ محمد کبیر عرف شہزادہ کوہسار، مری۔ طارق اسلام، کامرہ۔ صبا گل، بالاکنڈ۔ تصویر العین، اوکاڑہ۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ تحریم تلوکر، خوشاب۔ مصدق محمود دانش، ضلع گجرات۔ ماہ تاب گل رانا، ضلع راجن پور۔ محمد حاضر بلوچ، ڈیرہ اسماعیل خان۔

بے ثمر

محی الدین نواب

شجرِ سایہ دار سے سب فیض یاب ہوتے ہیں... یہی افتخار شجرِ ثمردار کو حاصل ہوتا ہے... بعض اوقات ایک پیڑ میں دوسرے کا پیوند لگایا جاتا ہے اور یوں ایک درخت سے دو ذائقوں کے پھل حاصل ہوتے ہیں لیکن جب اصل شجر ہی بے ثمر ہو تو پیوند بھی ضائع ہوجاتا ہے... پیوند نہ صرف بے ثمر رہتا ہے بلکہ افزائش کے بجائے سوکھ کر کانٹا ہوجاتا ہے... یہ قانونِ قدرت ہے... بالکل سچا اور اٹل... اسے انسان کی کوئی تدبیر نہیں بدل سکتی...وہ بھی کچھ ایسی ہی مشکل کا شکار تھا... اسے اپنے لاولد ہونے کا دکھ تھا... مگر جلد ہی اسے اپنی خواہش کا ثمر مل گیا... انسان کب قدرت کی ان عنایتوں کا شکرگزار ہوتا ہے... وہ ناشکرا حساب کتاب اور حسب نسب کے چکر میں پڑگیا اور اپنے لیے وہ سب سمیٹ بیٹھا جس سے بچنے کے لیے اس نے پاپڑ بیلے تھے۔

نسب نمائی کی پر پیچ خواہشوں میں بل کھاتی ہوئی ایک فکر انگیز کہانی

کسی جاگیردار کا ذکر کرنا چاہو تو یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ وہ کتنا ظالم، جابر اور غیر انسانی فطرت کا حامل ہوگا۔ ہماری دنیا میں ایسے کردار بھی ہیں جن کے نام لیے جائیں تو کچھ کہے سنے بغیر ہی ان کا کچا چٹھا سامنے آجاتا ہے۔

طالش تیموری ایک ایسا ہی جاگیردار تھا۔ وہ ہمیشہ آسمان پر بیٹھ کر زمین کو دیکھتا تھا۔ اسے اپنے سامنے چلتے پھرتے لوگ ایسے لگتے تھے جیسے کیڑے مکوڑے مٹی میں رینگ رہے ہوں۔ وہ عام لوگوں سے بولتا نہیں تھا۔ بصد مجبوری صرف سرکاری افسران کو منہ لگاتا تھا۔

اس کی زمینیں بیس میل کے طول و عرض تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسے انسانوں سے زیادہ گھوڑوں سے لگاؤ تھا۔ اس نے تقریباً چار میل کے رقبے پر گھوڑوں کا اصطبل اور ریس کورس کا میدان بنایا تھا۔ ہر اتوار کو ریس کورس میں گھوڑے

دوڑائے جاتے۔ امیر کبیر لوگ شہر سے آتے تھے۔ لاکھوں روپے کا جوا کھیل کر کبھی ہارتے اور کبھی برائے نام جیت کر جاتے تھے۔

طالش تیموری کبھی نہیں ہارتا تھا۔ کیونکہ وہ جوا کھلاتا تھا اور جوا کھلانے والا کبھی نہیں ہارتا۔ وہ اپنی زندگی کے بیشتر معاملات میں بھی ہارنا نہیں جانتا تھا۔ کبھی ہارنے کا اندیشہ ہوتو جیتنے والے کو بڑی رازداری سے اوپر پہنچا دیتا تھا۔

اس نے جوانی میں ایک شادی کی، باقی کنیزوں کی بربادی کی۔ حویلی کے ایک حصے میں بیگم عارفہ طالش رہتی تھی۔ باقی حصوں میں وصال اور جدائی کی طرح کنیزیں آتی جاتی رہتی تھیں۔

اپنے جاگیردارانہ شجرے کو خالص رکھنے کے لیے اس نے ایک ہی شریکِ حیات پر اکتفا کیا۔ تاکہ خالص نسل ایک ہی سے چلے۔ دو چار بیویوں سے دھوکا ہو جاتا ہے۔ دن رات کی مصروفیات اور مسائل سے نمٹنے کے دوران میں بیویوں پر نظر رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ بیگم عارفہ کو حویلی کے ایک حصے میں قیدی بنا کر رکھتا تھا۔

بیگم عارفہ اس لحاظ سے خوش نصیب تھی کہ اس کی کوئی سوکن نہیں تھی۔ آئندہ بھی کسی سوکن کے مسلط ہونے کا امکان نہیں تھا۔ لیکن وہ طالش تیموری کا ایک اہم مطالبہ پورا نہیں کر رہی تھی اور وہ مطالبہ تھا اولادِ نرینہ کا...

بیگم نے آٹھ برسوں میں تین خوبصورت بیٹیوں کا تحفہ دیا تھا۔ طالش نے تیسری بیٹی کی صورت نہیں دیکھی۔ سیدھا بیگم کے پاس آکر اسے ایک زوردار طمانچہ جڑتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہم سونے کا نوالہ نہیں کھلاتے ہیں؟ کیا چاندی کا لباس نہیں پہناتے ہیں؟ تو ہماری جس زمین پر قدم رکھتی ہے، وہاں تجھ پر پھول برسائے جاتے ہیں۔ اتنی دولت، عزت، شہرت اور شاہانہ برتری تجھے راس نہیں آرہی ہے؟''

اس نے دوسرا تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک بیٹا... صرف ایک بیٹا نہیں دے سکتی پھر تیری ضرورت کیا ہے؟''

وہ روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''میں کیا کروں؟ آپ دوا کرتے ہیں، میں دعا کرتی ہوں۔ تعویذ گنڈے پہنتی ہوں پھر بھی بیٹا نہیں ہو رہا ہے۔ میں کہاں جاکر سر پھوڑوں؟''

''تیرا سر ہم پھوڑیں گے۔ نئی لائیں گے پرانی کو دفنائیں گے۔''

وہ سہم کر بولی۔ ''میں نے وفاداری اور خدمت گزاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ کا مطالبہ قدرتی طور پر پورا ہو سکتا ہے پھر بھی مجھے ایک موقع اور دیں۔''

''ہم یہ موقع کسی دوسری کو دیں گے۔''

وہ اس کے قدموں میں گر کر بولی۔ ''آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ مجھے صرف ایک موقع دیں۔ اس بار بیٹے کے نام سے روزے رکھوں گی۔ وہ ضرور اس دنیا میں آئے گا۔ نہیں آئے گا تو آپ کے ہاتھوں مرنے سے پہلے ہی مر جاؤں گی۔''

وہ اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ''تیرے نصیب میں تھوڑی سانسیں ہیں۔ ہم دوسری کو چپ چاپ شادی کے بغیر آزمائیں گے۔ جس دن الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ کہے گی کہ وہ بیٹا پیدا کرنے والی ہے، اسی دن اس سے نکاح پڑھوا لیں گے اور تیری چھٹی کر دیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ جانے لگا پھر دروازے پر رُک کر بولا۔ ''لوگ انڈے بچے دینے والی مرغیاں پالتے ہیں۔ جو انڈے نہ دے اسے ذبح کر کھا لیتے ہیں۔''

وہ اسے دہشت زدہ کر کے حویلی کے دوسرے حصے میں آگیا۔ اس نے کسی ماہرِ نفسیات سے سنا تھا کہ کسی ناکام ہونے والے کو بری طرح دہشت زدہ کرو تو وہ اپنی سلامتی کے لیے ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔

اس نے بیگم پر یہ نفسیاتی نسخہ آزمایا تھا۔ ویسے اس نے کھوکھلی دھمکی نہیں دی تھی۔ فطرتاً قسائی تھا۔ بیٹا نہ ہونے پر اس ہستی کو مٹی میں ملانے والا تھا جس کے ساتھ برسوں سے کھیلتا آیا تھا۔

اسے قریب سے جاننے والے وفادار کارندے دبی زبان میں کہتے تھے کہ وہ دماغی مریض ہے۔ شاید اس پر کسی قسم کا دورہ پڑتا ہے۔ کوئی اس کے مزاج کے خلاف کچھ کر گزرے تو وہ اسے دنیا سے گزار دیتا ہے۔ اسے بڑی رازداری سے ہلاک کرکے یوں آسودہ ہو جاتا ہے جیسے اسے نیا خون نئی زندگی مل گئی ہو۔

اس نے خواب گاہ میں آکر الماری سے تصویروں کی ایک البم نکالی [illegible] مختلف ملکوں کے بروکر، مارکیٹ میں آنے والی نئی [illegible] کی تصویریں بھیجتے رہتے تھے۔ ایسی [illegible] البم اس کی خواب گاہ میں رہتے تھے۔ [illegible] ایک حسینہ نے اسے سحر زدہ کر رکھا تھا۔ [illegible] کی مختلف تصویروں کے ساتھ اس کی [illegible] کر مکمل کوائف لکھے تھے۔ [illegible] کر نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر [illegible] ''خادم حاضر ہے۔ حکم کریں...؟'' [illegible] ''تم نے ساحرہ کے جو مطالبات پیش [illegible] ہیں۔ کمیشن کی رقم ابھی تمہارے بینک

اکاؤنٹ میں پہنچ جائے گی۔ ہم باقی معاملات ساحرہ جمالی سے طے کریں گے۔''

بروکر نے دو گھنٹے بعد کہا۔ ''شکریہ۔ میری رقم مجھے مل گئی ہے۔ ساحرہ ماڈلنگ میں مصروف ہیں۔ آپ اسے رات دس بجے کال کریں۔''

جہاں دولت ہو، وہاں خواہشات کے آگے کوئی دیوار کھڑی نہیں ہوتی۔ اس نے رات دس بجے فون پر ساحرہ کی آواز سنی۔ وہ بول رہی تھی۔ ''میں اپنا نام نہیں بتاتی۔ کہتے ہیں میری آواز کا رس بھرا ترنم سحر جگاتا ہے اور سننے والے بے اختیار مجھے ساحرہ کہہ دیتے ہیں۔''

وہ مست ہو کر بولا۔ ''واہ کیا بات ہے۔ کیا اندازِ گفتگو ہے۔ نام نہیں بتایا۔ سلیقے سے نام کی صفت بیان کر دی۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ملاقات ہو اور تمام معاملات روبرو طے ہو جائیں؟''

وہ بولی۔ ''ابتدائی معاملات فون پر طے ہو جائیں۔ معلوم تو ہو، آپ کتنے دنوں کی رشتے داری چاہتے ہیں؟''

''مجھے کچھ وضاحت سے یہ کہنا ہوگا کہ میری تین بیٹیاں ہیں۔ میں ایک بیٹے کے لیے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ جانتے ہیں کہ ہمارے پیشے میں شادی کرنا سراسر ہماری بربادی ہے۔ جب ہم دونوں ہاتھوں سے کما سکتے ہیں تو ایک ہاتھ کو مفلوج کرنے کی نادانی نہیں کرنا چاہیے۔''

''چلو شادی اور پابندی نہ سہی۔ کم از کم چھ ماہ تک پابندی قبول کر سکتی ہو؟ تمہیں منہ مانگی رقم ملے گی۔ میں چھ ماہ تک پردہ کراؤں گا۔ کسی مرد سے بات کرنے کی اجازت بھی نہیں دوں گا۔''

''ایسی پردہ داری اور پابندیاں نکاحی عورتیں برداشت کرتی ہیں۔''

''چھ ماہ نہ سہی۔ تم کتنے ماہ کی پابندی قبول کر سکتی ہو؟''

''آپ میری ماڈلنگ پر بھی پابندی عائد کریں گے۔ اس لیے آپ کے ساتھ صرف ایک ہفتہ گزار سکتی ہوں۔ سات لاکھ کی پیمنٹ کے بعد...''

وہ ذرا سوچ کر بولا۔ ''ایسا کرو۔ میں پہلے ایک دن کی پیمنٹ کر رہا ہوں۔ ہم کم از کم بارہ گھنٹے اچھا وقت گزاریں گے اور آئندہ کے معاملات بھی طے کریں گے۔''

وہ راضی ہوگئی۔ ملاقات کے لیے دوسرا دن طے ہو گیا۔ طالش نے فون بند کرنے کے بعد سوچا۔ ''یہ بہت مہنگی پڑے گی۔ پھر شادی نہیں کرے گی اور اولاد تو اس لیے پیدا نہیں کرے گی کہ ماں بنتے ہی حسن اور اس کی سازی کشش ماند پڑ جائے گی۔

عقل نے سمجھایا... دو چار دن کی مہنگی عیاشی اپنی جگہ ہے اور اولاد کی ضرورت اپنی جگہ ہے۔ دولت ضائع کیے بغیر بھی کوئی عورت نکاح پڑھوا کر ایک بیٹا دے دے گی۔

دوسری شام ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ساحرہ سے ملاقات ہوئی۔ طالش نے ڈنر کے دوران میں اپنی بدنصیبی بیان کی۔ یہ بتایا کہ وہ اولادِ نرینہ سے محروم ہے اور اس کے لیے ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے جو اس کے لیے ایک بیٹا پیدا کرے۔ وہ ایسی عورت کو مالا مال کر دے گا۔

ساحرہ نے پوچھا۔ ''شادی سے پہلے کیسے معلوم ہوگا کہ وہ عورت بیٹا پیدا کر سکے گی یا نہیں؟''

''وہ عورت نکاح کے بغیر میرے ساتھ رہے گی۔ جیسے ہی الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ کہے گی کہ بیٹا ہونے والا ہے، میں اس عورت سے نکاح پڑھوا لوں گا۔''

''آپ جسے لاکھوں روپے دیں گے، وہ نکاح سے پہلے پاؤں بھاری کرنے پر راضی ہو جائے گی۔ آپ کے لیے میرا ایک مشورہ ہے کہ کسی ایسی عورت سے شادی کریں، جو بیوہ یا مطلقہ ہو اور وہ پہلے شوہر سے بیٹا پیدا کر چکی ہو۔ ایسی عورت ضرور آپ کے لیے بھی بیٹا پیدا کر سکے گی۔''

''بہت اچھا مشورہ ہے۔ یہ ایک طرح کی ضمانت ہوگی کہ ایک بار بیٹا پیدا کرنے والی دوسری بار بھی بیٹا جنم دے گی۔''

ساحرہ نے کہا۔ ''اگر میں اس بات کی ضمانت دوں کہ میری بہن ایک بیٹا پیدا کرے گی تو آپ اسے کیا دیں گے؟''

''یہ تو قدرتی معاملات ہیں۔ تم کیسے ضمانت دو گی؟''

''میری چار بہنیں ہیں۔ تین کی شادیاں ہو گئی ہیں۔ ان تینوں نے بیٹے ہی بیٹے جنم دیے ہیں۔''

''تمہاری بہنوں نے تو کمال کیا ہے۔''

''جو آپ کے لیے کمال ہے وہ ہمارے لیے زوال ہے۔ ہمارے پیشے میں بیٹے غیر ضروری ہوتے ہیں۔ ہم بیٹیوں کے لیے ترستے ہیں اور آپ بیٹے والی کے خریدار ہیں۔ میری بہن فاخرہ سے معاملات طے کریں۔ وہ ضرور بیٹا دے گی۔''

ساحرہ نے دوسرے دن فاخرہ سے ملاقات کرائی۔ طالش تیموری نے اس سے کہا۔ ''تمہاری بہن نے میری ضرورت تمہیں بتائی ہوگی۔''

فاخرہ نے کہا۔ ''ہاں میں سن چکی ہوں۔ جب تک آپ کے بیٹے کو جنم نہیں دوں گی، تمام پابندیاں برداشت کروں گی۔ کسی دوسرے مرد کی پرچھائیں بھی اپنے اوپر

پڑنے نہیں دوں گی لیکن آپ کی طرف سے ادائیگی بھی اسی حساب سے ہوگی۔''

''جب تک خوش خبری نہیں سناؤ گی۔ تب تک ہر ماہ ایک لاکھ روپے ادا کروں گا۔ جس دن بیٹے کی پیدائش ہوگی۔ اس دن تم سے نکاح پڑھاؤں گا۔ تمہیں ماہانہ دو لاکھ روپے ادا کروں گا۔ ایک علیحدہ شاندار کوٹھی میں تمہاری رہائش ہوگی۔''

''بیٹا ہونے کے بعد بیوی بن کر پابندیوں میں نہیں رہوں گی۔ آپ پیمنٹ کریں گے۔ اپنا بیٹا لیں گے پھر ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے۔''

''مجھے منظور ہے۔''

دونوں کے درمیان خوش اسلوبی سے معاملات طے ہو گئے۔ پیشگی رقم کی ادائیگی ہو گئی۔ وہ حویلی میں رہنے کے لیے آ گئی۔ طالش نے حویلی کا دوسرا حصہ اس کے لیے مختص کر دیا۔

بیگم عارفہ کو فکر لاحق ہو گئی۔ پڑوس میں ایک سوکن بیٹا پیدا کرنے آ گئی تھی۔ بیگم عارفہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھی۔ سوکن کے آتے ہی اور زیادہ عبادت میں مصروف ہو گئی۔ تہجد کی نماز بھی پڑھنے لگی۔ دن رات دعائیں مانگنے لگی۔ ''اے میرے معبود! میں سوکن کا برا نہیں چاہتی۔ اسے جو چاہے دے مگر مجھے ایک بیٹا دے دے۔ جس روز بیٹے کی خوش خبری ملے گی، اس روز سجدے سے سر نہیں اٹھاؤں گی۔''

فاخرہ کو یقین تھا کہ وہ ایک بیٹا دے کر وہاں سے اچھی خاصی رقم لے جائے گی۔ پھر یہ کہ بیٹا ہونے تک ہر ماہ ایک معقول رقم وصول کرتی رہے گی۔ طالش ..... فاخرہ کی دلربا اداؤں کا اسیر ہو گیا تھا۔ وہ ہر مہنگی چیز خرید لینے کی ہوس اور غرور میں اس سے معاہدہ کر چکا تھا۔ بعد میں اس نے سوچا۔ ''بیٹا ہوگا تو ایک طوائف کے بطن سے ہوگا۔ وہ نجیب الطرفین نہیں کہلائے گا۔ دنیا کہے گی کہ وہ باپ کی طرف سے اشراف اور ماں کی طرف سے بازاری ہے۔

اس نے فی الحال یہ بات چھپائی کہ فاخرہ کو بازار سے لایا گیا ہے۔ یہ بات پھیلائی کہ وہ اپنے ہی خاندان کی ایک عزیزہ ہے۔ اس سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے آئی ہے۔

اصلیت کو چھپانا آسان تھا کیونکہ ایسی سخت پردہ داری تھی کہ حویلی کی خواتین کو وہاں کے ملازم بھی دیکھ نہیں پاتے تھے۔ فاخرہ وہاں نقاب میں آئی تھی اور کسی دن نقاب میں ہی واپس جانے والی تھی۔

ایک پلڑے پر بیگم عارفہ اور دوسرے پر فاخرہ تھی۔ ان میں سے جو بیٹے کا وزن ڈالتی، وہی بھاری پڑتی۔ دوسری ہلکی ہو کر حویلی سے یا زندگی کی قید سے باہر نکل جاتی۔

وہ مجازی خدا بیگم عارفہ کو اپنی فطرت اپنا ارادہ بتا چکا تھا کہ وہ ناکارہ گھوڑی کو گولی مار دیتا ہے۔ فاخرہ کے سلسلے میں بھی اس کے خیالات نیک نہیں تھے۔ وہ بازاری کو بازار میں واپس جانے کی اجازت دینے والا نہیں تھا اور اپنے بیٹے کی طوائف ماں کو اپنے شجرے میں برداشت کرنے والا نہیں تھا۔

دن اور رات ہفتے اور مہینے گزرنے لگے۔ عارفہ دعائیں مانگ رہی تھی اور فاخرہ کو یقین تھا کہ اسے دعاؤں کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹا ہوتا یا نہ ہوتا۔ اس کا کچھ نہ جاتا۔ وہ طوائف بن کر خوب کما رہی تھی۔

ایسی عورتیں کبھی ماں بننا نہیں چاہتیں۔ خدا کی قدرت بھی عجیب ہے۔ جو نہ چاہے اسی کو ملتا ہے۔ دس ماہ بعد حویلی کی لیڈی ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی کہ فاخرہ ماں بننے والی ہے۔

طالش نے کہا۔ ''جب تک بیٹے کی خبر نہ ملے یہ خوش خبری نہیں ہے۔ البتہ یہ اچھی خبر ہے۔''

اس نے فاخرہ سے کہا۔ ''الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ کے بعد جشن منایا جائے گا یا تمہاری چھٹی کر دی جائے گی۔''

فاخرہ پہلی بار بجھ سی گئی۔ بیٹا نہ ہونے کی صورت میں وہ لاکھوں کی رقم ہارنے والی تھی۔

زندگی ایک جوا ہے۔ کبھی جیت کبھی ہار سے گزرنا پڑتا ہے۔ بیگم عارفہ بند کمرے میں منہ ڈھانپ کر رو رہی تھی۔ رونا اس بات کا تھا کہ نئی آنے والی کہ پاؤں بھاری ہو گئے تھے اور وہ ابھی تک سوکھے پتے کی طرح ہلکی بیٹھی تھی۔ بدنصیبی کہہ رہی تھی کہ میڈیکل رپورٹ کے بعد اس کی شامت آنے والی ہے۔

پھر ایک دن رپورٹ آ گئی۔ تہلکہ مچ گیا۔ میڈیکل رپورٹ کے الفاظ میں بیٹے نے چیخ کر کہا۔ ''بابا جانی! میں آ رہا ہوں...''

طالش...... نے خوش ہو کر اسی وقت فاخرہ کو ایک ہیرے کی انگوٹھی پہنائی پھر کہا۔ ''ہم آج ہی تم سے نکاح پڑھائیں گے۔ دنیا والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری منکوحہ بیوی نے بیٹا پیدا کیا ہے۔''

فاخرہ نے کہا۔ ''ہمارے درمیان یہ طے ہو چکا ہے کہ بیٹے کی پیدائش کے بعد آزاد ہو جاؤں گی۔ آپ سے طلاق

''ہمیں یاد ہے۔ جو طے ہو چکا ہے وہی ہوگا۔''

وہ تھوڑی دیر بعد بیگم عارفہ کے پاس آ کر حقارت سے بولا۔ ''لعنت ہے تجھ پر۔ سالی بیٹیوں کا مینا بازار لگائے رکھتی ہے۔ تیرے نصیب میں جو نہیں ہے، وہ تجھے کبھی نہیں ملے گا۔ چل اب یہاں سے رخصت ہونے کی تیاری کر...''

وہ دوڑتی ہوئی آ کر قدموں میں گر پڑی۔ گڑگڑانے لگی۔ ''مجھ بدنصیب پر رحم کریں۔ اب میں شریکِ حیات نہیں ایک معمولی کنیز بن کر آپ کے قدموں میں رہوں گی۔ اپنا کوئی حق مانگنا تو دور کی بات ہے۔ ایک وقت کی روٹی بھی نہیں مانگوں گی۔''

وہ اسے ٹھوکر مار کر دور کرتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا دانہ پانی یہاں سے اٹھ چکا ہے۔ اپنے میکے جاؤ اور باقی زندگی وہاں گزارو۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں جانتی ہوں آپ زندگی نہیں دیں گے۔ میں نے پچھلے دس برسوں میں ایسے وفادار ملازموں اور کنیزوں کی لاشیں دیکھی ہیں، جو آپ کے لیے ناکارہ یا غیر ضروری ہو گئے تھے۔ آپ نے اپنے والد محترم کو بھی بڑی رازداری سے...''

بات پوری ہونے سے پہلے ہی منہ پر ایک زبردست ہاتھ پڑا پھر تو ہاتھ اور لاتیں پڑتی گئیں۔ مار کھانے کے دوران میں چیخنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر منہ سے آواز نکلتی تو گھوڑی بنا کر چابک رسید کی جاتی۔ یہ ایک مرد کی نفسیاتی کمزوری تھی۔ اسے عورت کا ڈر جانا، رو رو کر رحم کی بھیک مانگنا اچھا لگتا تھا۔ بڑی عجیب سی خواہش پوری ہوتی تھی۔

وہ حویلی کی مالکہ تھی۔ تیموری شجرے کی ایک اہم شاخ تھی۔ بڑے عیش و آرام سے شاہانہ انداز میں زندگی گزارتی تھی اور شامت آ جائے تو ایک کتیا کی طرح جوتے بھی کھاتی تھی۔ ایسے وقت اس تیموری آقا کا ذہنی مرض واضح ہو جاتا تھا۔ وہ صرف لاتیں جوتے ہی نہیں مارتا تھا، کچھ ایسا غیر انسانی سلوک بھی کرتا تھا، جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ایسے لوگ بظاہر نارمل دکھائی دیتے ہیں مگر حقیقتاً چھپے ہوئے خطرناک ایب نارمل مریض ہوتے ہیں۔ اپنے مزاج اور منفی ذہنی افتاد کے مطابق سوچ سمجھ کر ایسی واردات کرتے ہیں کہ کبھی قانون کی گرفت میں نہیں آ پاتے۔ اپنی دولت اور طاقت سے ثابت کرتے ہیں کہ معاشرے کے معزز اور بے ضرر نارمل انسان ہیں۔

گئی۔ اس نے فیملی ڈاکٹر کو حکم دیا۔ ''اسے ہوش میں لاؤ اور جلد ہی چلنے پھرنے کے قابل بناؤ۔''

پھر زنان خانہ کی منتظمہ کو حکم دیا۔ ''اس کا سامانِ سفر باندھو۔ یہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے تو اس کے میکے والوں کو اطلاع دو۔ وہ آ کر اسے لے جائیں گے۔''

وہ اپنے بیڈ روم میں آ کر ٹہلنے لگا۔ ایک بیٹے کی خوش خبری مل چکی تھی۔ اس کے باوجود دوسری اس کا منہ چڑا رہی تھی جیسے کہہ رہی تھی، تمہیں تو کبھی بیٹا نہیں دوں گی۔

اس نے ایک الماری کھولی۔ اس میں بہترین جدید ساخت کی پسندیدہ اور منتخب رائفلیں، شاٹ گن، ریوالور اور چھوٹے بڑے پستول رکھے ہوئے تھے۔ وہ سب ایک ذہنی مریض کی دوائیں تھیں۔ وہ بیماری کے دوران ان دواؤں کی ایک آدھ خوراک لے کر شفا حاصل کرتا تھا۔

بیگم عارفہ نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا تھا کہ اسے سزائے موت دی جاتی لیکن فرعونی عدالت میں اس پر الزام تھا کہ اس عورت نے دس برس تک طالش تیموری کا نمک کھایا اور ایک بھی بیٹا نہیں دیا۔ ایسی نمک حرام عورت قابلِ گردن زدنی ہے۔

وہ پرانا شکاری تھا۔ شکار کھیلنے کی پلاننگ پہلے ہی کر چکا تھا۔ عارفہ میکے جانے والی تھی اور وہ اس کے میکے کا پورا جغرافیہ جانتا تھا۔ وہاں کسی دن بھی رازداری سے جا کر اسے گہری نیند سلا کر آ سکتا تھا۔

خدا کی قدرت بھی کیا کھیل تماشے دکھاتی ہے۔ بندہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور یہ کہاوت کسی شک وشبے کے بغیر درست ہے کہ ''جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔'' کاتبِ تقدیر نے لکھ دیا تھا کہ ابھی وہ موت کا ذائقہ چکھنے والی نہیں ہے۔

مغرب کی نماز کے وقت لیڈی ڈاکٹر نے آ کر کہا۔ ''بیگم صاحبہ کی طبیعت سنبھل گئی ہے۔ آپ شاید انہیں میکے بھیجنے کا ارادہ بدل دیں گے۔''

وہ غرانے کے انداز میں بولا۔ ''ہم نے ارادہ نہیں کیا ہے۔ حکم دیا ہے اور ہمارا حکم پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''کبھی کاتبِ تقدیر بھی ہاتھ کی لکیر بدل دیتا ہے۔ پلیز آپ بھی بدل دیں۔ بیگم صاحبہ ماں بننے والی ہیں۔''

طالش نے چونک کر اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ بڑے یقین سے بولی۔ ''میں نے اچھی طرح معائنہ کیا ہے۔''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا اور پاؤں پٹخ کر بولا۔ ''ماں بننے سے

’’میں ڈاکٹر ہوں، دوا کرتی ہوں۔ آج سے دعا بھی کروں گی۔ آپ دعا نہ کریں، غصہ بھی نہ کریں۔ الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ کا انتظار کرلیں۔ خدا مہربان ہے۔ آپ کے نصیب سے ایک کے بعد دوسرا بیٹا بھی ہوسکتا ہے۔‘‘

اس نے پھر سوچا۔ ’’وہ ماں بننے والی ہے۔ ہوسکتا ہے، میں ایک مانگ رہا ہوں، مجھے دو مل جائیں۔ میڈیکل رپورٹ تک انتظار کرلینا چاہیے۔‘‘

وہ قائل ہوکر بولا۔ ’’ہوں... ہم ایک چاہتے ہیں۔ ہمیں دو مل سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کریں گے۔‘‘

بیگم عارفہ نے سنا تو سجدے میں گر پڑی۔ روتے ہوئے گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگی۔ ’’یا اللہ...! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میری قضا ٹل گئی ہے۔ تو قادرِ مطلق ہے۔ مجھے بیٹا دے گا... مجھے زندگی دے گا۔‘‘

اب تو وہ جیسے سجدے سے سر اٹھانے والی نہیں تھی۔ دن رات عبادت میں مشغول رہتی۔ فاخرہ نے سنا کہ سوکن بھی ماں بننے والی ہے تو ذرا بجھ سی گئی۔ وہ تنہا بیٹا دے کر اپنا بھاؤ بڑھانا چاہتی تھی۔ بازاری ہتھکنڈوں سے طالش تیموری کو ایک بیٹے کے پیچھے دوڑا دوڑا کر زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنا چاہتی تھی۔ اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ عارفہ کو گالیاں دینے لگی۔

طالش اس کی خواب گاہ میں آیا تو وہ گالیوں کو مٹھاس بنا کر بولی۔ ’’مبارک ہو۔ دوسرا بیٹا بھی آنے والا ہے۔‘‘

وہ ناگواری سے بولا۔ ’’دوسرے کی بات نہ کرو۔ عارفہ ہمیشہ مایوس کرتی رہی ہے۔‘‘

’’ہوسکتا ہے، وہ اس بار خوش کردے۔‘‘

’’خوش کرے گی تو اپنا ہی بھلا کرے گی۔‘‘

وہ بڑے پیار سے اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ’’دوسرا بیٹا ہوگا تو میرے بیٹے کی اہمیت کم ہوجائے گی۔‘‘

’’ہرگز کم نہیں ہوگی۔ وہ دونوں میرے دو بازو بن کر رہیں گے۔‘‘

سب ہی اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ آئندہ کیا ہوگا؟ جو بھی بھلا یا برا ہوتا ہے، وہ سامنے ہی آتا ہے۔ پھر بھی آدمی مضطرب اور فکر میں مبتلا رہنے سے باز نہیں آتا۔ خود کو روگ لگائے رکھتا ہے۔ بہرحال میڈیکل رپورٹ نے سب ہی کو فکر و تجسس سے نکال دیا۔ ایک اور بیٹے کی نوید مل گئی۔

بیگم عارفہ خوشی سے پاگل ہوگئی۔ وہ ہنستی روتی سجدے پر سجدے کرنے لگی۔ طالش اس کے کمرے میں آیا تو دوڑتی ہوئی آکر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس نے پہلی بار اسے محبت سے تھام کر اٹھایا، سینے سے لگایا تو وہ خوشی کے مارے چکرا گئی۔

طالش نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر بیڈ پر لا کر لٹایا۔ پھر کہا۔ ’’نہ رونا ہے نہ پاگلوں کی طرح ہنسنا ہے۔ اپنی صحت بناؤ۔ میں صحت مند بیٹا چاہتا ہوں۔‘‘

بے شک وہ ظالم اور بے رحم تھا۔ اسے اپنے وفاداروں پر بھی رحم نہیں آتا تھا لیکن پہلی بار اس کا رویّہ ذرا بدل گیا تھا۔ ایک بیٹا پیدا کرنے والی بیوی اسے اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔

تیموری میں یہ عجیب سی تبدیلی آئی کہ فاخرہ سے کچھ ناگواری پیدا ہوئی۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ اس نے ایک طوائف سے بیٹا لینے میں جلدی کی ہے۔ ایک بازاری عورت کو اپنے خاندان کا اہم حصہ بنانے کی غلطی کررہا ہے۔

حرفِ غلط کو مٹایا جاتا ہے۔ وہ آئندہ غلطی درست کرنے والا تھا۔ فی الحال وقت گزر گیا۔ انتظار کی گھڑیاں بیت گئیں۔ پہلے فاخرہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کا نام جواد طالش رکھا گیا۔ اُدھر عارفہ کی زچگی میں دیر تھی۔ وہ دو یا تین ماہ میں ماں بننے والی تھی۔

اور اِدھر ننھا جواد ماں کے بغیر رہنے والا تھا۔ طالش نے اسے تیس لاکھ کا چیک دیتے ہوئے کہا۔ ’’میں پہلے بھی تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ تم بیٹے کو بالکل بھول جاؤ گی۔ کبھی کسی سے یہ نہیں کہو گی کہ تم نے یہاں رہ کر ہمارے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے اور یہ ہماری حویلی میں پرورش پا رہا ہے۔‘‘

وہ بولی۔ ’’میں اپنی زبان پر قائم رہوں گی۔ یہ صرف میری بہنیں جانتی ہیں۔ باقی دنیا کبھی نہیں جان سکے گی۔‘‘

وہ بیٹے کو دے کر اپنی پیمنٹ لے کر آگئی۔ اس نے کچھ روز آرام کیا پھر اپنے دھندے سے لگ گئی۔ وہ صرف ہفتے کی رات مجرا کرتی تھی اور دھوم مچا دیتی تھی۔ پھر وہی سلسلہ شروع ہوگیا۔

مشہور و معروف شخصیات اور معزز کہلانے والے امیر کبیر لوگ مجرا سننے کوٹھے پر نہیں آتے تھے۔ اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرکے اسے اپنی عیش و عشرت کی محفلوں میں بلایا کرتے تھے۔ پچھلے دنوں وہ تقریباً گیارہ ماہ تک بازار سے غائب رہی تھی۔ کسی اچھے مال کو بازار میں آنے سے وقتی طور پر روک دیا جائے پھر اچانک اسے لایا جائے تو ڈیمانڈ اور سپلائی کے اصولوں کے مطابق اس کی قیمت پہلے سے بڑھ جاتی ہے۔ فاخرہ کے دیوانوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔

اُدھر عارفہ نے دو ماہ بعد ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کا نام حماد طالش رکھا گیا۔ وہ جو موت کا منہ دیکھنے والی تھی، زندگی کی رونقیں دیکھنے لگی۔ اس کی قدر و اہمیت پہلے سے بڑھ گئی۔ موجودہ حالات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آئندہ بدنصیبی اسے نہیں رُلائے گی۔ ایک ہی بیٹا اسے تاحیات مسرتیں دیتا رہے گا۔

بازاری حسیناؤں کو یہ تجسس بے چین کررہا تھا کہ وہ مہینوں کہاں غائب رہی تھی اور کیسا جادو منتر سیکھ کر آئی ہے کہ اس کا دھندا پہلے سے زیادہ چمکنے لگا ہے۔

فاخرہ کی چار بہنیں اندر کی بات جانتی تھیں۔ ان کے پیشے میں حتی الامکان یہ بات چھپائی جاتی ہے کہ مجرا کرنے والی کنواری اور اَن چھوئی کہلانے والی ایک بچے کی ماں بن چکی ہے۔ ان چار بہنوں نے کسی کو اپنی بہن کا یہ راز نہیں بتایا لیکن گھر کے اندر کبھی کبھی اس موضوع پر باتیں ہوتی تھیں۔ ایسے وقت ملازم اور خادمائیں آتے جاتے سن لیتے تھے۔ اس طرح یہ کہاوت درست ہوجاتی تھی کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

فاخرہ ایک رات مراد کی کوٹھی میں گئی تھی۔ وہاں اس نے مجرا کیا۔ ملنگی کا دل خوش کیا۔ ایسے وقت ملنگی نے کہا۔ ’’اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم آج بھی حسین اور پُرکشش ہو جبکہ ایک بچے کے بعد عورت ڈھل جاتی ہے۔ تم تو ویسی کی ویسی ہی ہو۔‘‘

وہ ناراض ہوکر بولی۔ ’’آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا میں بچے والی ہوں؟‘‘

وہ مسکرا کر بولا۔ ’’نہیں ایسا کوئی نہیں کہے گا۔ کسی کو معلوم ہوگا، تب کوئی کہے گا۔ یہ تو بس ہم جانتے ہیں کہ بچہ طالش تیموری کو دے کر آئی ہو۔‘‘

وہ ذرا حیران ہوئی، پریشان ہوئی پھر غصّے سے بولی۔ ’’یہ جھوٹ ہے۔ میں بچے والی ہوں تو مجھے بلایا کیوں ہے؟‘‘

’’بھئی غصہ نہ کرو۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ ڈھل گئی ہو۔ قسم سے پہلے سے زیادہ قیامت بن گئی ہو۔ تب ہی تو منہ مانگا معاوضہ دیا ہے۔ چلو مسکراؤ...‘‘

یہ دھندے کا تقاضا تھا کہ ہر حال میں مسکراؤ۔ وہ مسکرانے لگی۔ مراد نے کہا۔ ’’ہم آج ہی صبح تمہیں پانچ لاکھ روپے دے کر رخصت کریں گے۔ تم ایک کاغذ لکھ دو کہ طالش تیموری کے بیٹے کو تم نے رازداری سے جنم دیا ہے۔‘‘

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ’’پانچ لاکھ روپے...؟ ایک کاغذ لکھنے کے...؟ آپ کیوں لکھوانا چاہتے ہیں؟‘‘

’’ہمارے درمیان پرانی عداوت ہے۔ اس طالش کو اپنے شجرے پر بڑا ناز ہے۔ بڑے غرور سے ہمیں کمتر سمجھتا ہے۔ ایک محفل میں اس نے ہماری توہین کی تھی۔ اُلٹے سیدھے دلائل سے خود کو برتر اور ہمیں انتہائی کمتر ثابت کیا تھا۔ ہم اس کا سارا غرور خاک میں ملادیں گے۔‘‘

’’اگر میں نے کاغذ لکھا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔‘‘

وہ سر ہلا کر بولا۔ ’’ہاں۔ یہ دبی زبان سے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک جنونی قاتل ہے۔ کاش کہ یہ سچ ہو اور اس کے خلاف کوئی ثبوت مل جائے۔‘‘

وہ بولی۔ ’’آپ اپنی عداوت میں مجھے نہ گھسیٹیں۔ آپ کے پانچ لاکھ مجھے بہت مہنگے پڑیں گے۔‘‘

’’کیا تم نے اسے زبان دی ہے کہ اپنے بیٹے کو اس کی حویلی میں ایک راز بنا کر رکھو گی؟‘‘

’’ہاں، میں زبان پر قائم رہوں گی تو وہ مجھ سے عداوت نہیں کرے گا۔ وہاں وہ معصوم بچہ بھی سلامت رہے گا۔‘‘

’’چلو کوئی بات نہیں۔ ہم کوئی دوسری بات کریں۔‘‘

اس نے موضوع ایسے بدل دیا جیسے واقعی کوئی بات نہ ہو۔ فاخرہ کے لیے پانچ لاکھ روپے بہت تھے۔ بس ایک کاغذ ہی لکھنا تھا۔ لیکن وہ امیر کبیر لوگوں کی دشمنی میں سینڈوچ بن کر دانتوں تلے نہیں آنا چاہتی تھی۔ دوسری صبح مراد سے معذرت کرکے گھر آگئی۔

اس نے تیسرے دن اخبار میں پڑھا کہ کسی نے بڑے ہی پراسرار طریقے سے مراد کو قتل کردیا ہے۔ یہ خبر پڑھتے ہی وہ لرز گئی۔ اس یقین کے ساتھ لرزہ طاری ہوا کہ وہ طالش تیموری کی دشمنی میں مارا گیا ہے۔

اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پانچ لاکھ کے لالچ میں اس نے کوئی کاغذ لکھ کر نہیں دیا ہے۔ لکھ دیتی تو اس کی بھی شامت آجاتی۔

وہ دوسرے دن ایک نئے چاہنے والے کے ساتھ ساحلِ سمندر پر گئی تو چند نامعلوم افراد نے اسے گن پوائنٹ پر اغوا کرلیا۔ اس کے منہ اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر لے گئے۔ پتا نہیں کتنی دور لے گئے تھے؟ کئی گھنٹے بعد اسے گاڑی سے نکال کر کہیں گھاس پر ڈال دیا گیا۔

پھر گاڑی کی آواز سے پتا چلا کہ وہ وہاں سے چلی گئی ہے۔ اس کے ہاتھ پشت کی طرف دونوں پیروں سے باندھ دیے گئے تھے۔ وہ اپنے منہ اور آنکھوں سے پٹیاں نہیں ہٹا سکتی تھی۔ یہ دیکھ نہیں سکتی تھی کہ اسے کہاں لاکر پھینکا گیا ہے؟

وہ ملائم گھاس پر دم سادھے پڑی تھی۔ بند آنکھوں کے پیچھے تاریکی ہی تاریکی تھی نہ ٹریفک کا شور نہ کسی بچے

قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ یہ اندازہ ہوا کہ اسے انسانی آبادی سے دور لا کر پھینکا گیا ہے۔ وہاں کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس پر یہ ظلم کیوں کیا جارہا ہے؟

وہ رونے لگی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی بھیگنے لگی۔ تب اچانک ہی اسے اپنی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''آپ اپنی عداوت میں مجھے نہ گھسیٹیں۔ آپ کے پانچ لاکھ مجھے مہنگے پڑیں گے...''

پھر مراد ملنگی کی آواز سنائی دی۔ ''کیا تم نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اپنے بیٹے کو اس کی حویلی میں ایک راز بنا کر رکھو گی...؟''

یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ اس کے اور مراد ملنگی کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی، اس کی ریکارڈنگ اسے سنائی جارہی ہے۔

اسے پھر اپنی آواز سنائی دی۔ ''ہاں۔ زبان پر قائم رہوں گی تو وہ مجھ سے عداوت نہیں کرے گا۔ وہاں میرا بچہ بھی سلامت رہے گا...''

ریکارڈ کی ہوئی آواز بند ہو گئی۔ اچانک ہی دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ طالش کی بھاری بھرکم سرگوشی سنائی دی۔ ''تم بہت اچھی ہو، اپنی زبان پر قائم رہیں۔ شاباش تم نے کاغذ نہیں لکھا۔ لیکن...

''لیکن افسوس... زبان سے جو کہا، اسے مراد ملنگی ریکارڈ کرتا رہا تھا۔ اس دشمن نے اس ریکارڈنگ کی یہ آڈیو کیسٹ مجھے کوریئر سے بھیجی تھی۔ اس نے ایک پرچی میں لکھا تھا۔ ''جس شجرے پر غرور کرتے ہو، وہ ڈھول کا پول ہے۔ تمہارے اعلیٰ خاندان میں جو بیٹا ہے، وہ بازاری عورت سے ہے اور اس کا ثبوت یہ ریکارڈنگ ہے۔''

وہ 'اوں اوں' کی آوازیں نکالتی ہوئی کچھ بولنے کے لیے تڑپنے لگی۔ وہ بولا۔ ''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم نے کوئی کاغذ نہیں لکھا۔ کسی کے بھی سامنے ہمارے شجرے کو کمزور نہیں بنایا لیکن انجانے میں غلطیاں ہو جاتی ہیں اور وہ تم سے ہو گئیں۔

''کیا کیا جائے۔ دو افراد تنہائی میں یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی انہیں نہ دیکھ رہا ہے نہ سُن رہا ہے۔ دیکھ لو کہ ایک ریکارڈر نے سن لیا۔

''یہ ریکارڈر بستی بستی تو گونجے گا ہی، اس ویرانے میں بھی گونج رہا ہے اور جب تک تم زندہ رہو گی تب تک تمہاری غفلت.... اور نادانیوں سے اور کئی آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ ہوتی ہی رہیں گی۔

''تمہاری ایک غلطی سے ہم ایک بیٹا ہار گئے۔ جواد کو کبھی اپنی اولاد نہیں کہہ سکیں گے۔ کبھی اپنے شجرے میں اس کا نام نہیں لکھ سکیں گے۔ افسوس... وہ ہمارے شجرے سے گیا۔ تم دنیا سے جاؤ۔''

وہ اندھی اور گونگی تھی۔ نہ دیکھ سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر ایک ٹھنڈی سی چیز محسوس کی۔ وہ لوہا تھا... ریوالور کی نال تھی۔

اس نے بڑی سفاکی سے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ موت ہے۔ کیسا لگتا ہے... جب جان جانے والی ہو تو کیسا لگتا ہے...؟

''ہاہا... مجھے تو اچھا لگتا ہے۔ ایسا مزہ کسی اور کھیل میں نہیں آتا۔ لو ذرا یہ آواز سنو...''

ہلکی سی ایک کِلک کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ ''آواز سمجھ میں آئی؟ ہاہاہا... میں نے سیفٹی کیچ ہٹایا ہے۔''

وہ لرز رہی تھی۔ تڑپنے کا انداز بتا رہا تھا کہ رحم کی بھیک مانگ رہی ہے۔ وہ واقعی ایک خطرناک ذہنی مریض تھا۔ سفاکی اور بے رحمی کا انداز ایسا تھا کہ وہ موت سے پہلے دہشت سے مر رہی تھی۔

آخر اس ویرانے میں فائر کی ایک آواز گونجی پھر دوسری آواز پھر تیسری... ایک ہی گولی کافی تھی۔ لیکن ایک ہی سے جنون کی تسلی نہیں ہوتی۔ ویرانہ تڑاتڑ کی آوازوں سے چیختا، گونجتا اور تھراتا رہا۔ اس کے جنون کو تھپکتا اور شانت کرتا رہا پھر خاموشی تب ہوئی، جب جسم کی طرح ریوالور کے بدن سے روح خالی ہو گئی۔

☆☆☆

محض ایک جنون کو ٹھنڈا کرنے کی بات تھی۔ ورنہ ایک طوائف کی ہلاکت سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ حقیقت چھپنے والی نہیں تھی۔ وہ اپنے شجرے میں جواد طالش کو نجیب الطرفین ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

بازار سے لایا ہوا سامان سب کی نظروں میں آتا ہے۔ فاخرہ کی چار بہنیں اور اس کے خاندان والے بہت کچھ جانتے تھے اور وہ منہ بند کرنے کے لیے سب ہی کو ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ پہلے بہت خوش تھا کہ دو بیٹے ہیں۔ دو بازو بن کر رہیں گے۔ لیکن وہ دونوں بے جوڑ ہو گئے تھے۔ ایک شریف زادہ اور دوسرا طوائف زادہ کہلانے والا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جواد کو شریف زادے حماد سے دور رکھے گا۔

اس نے سوچا کہ اسے کسی ملازم کے حوالے کر دیا جائے۔ اس ملازم کو اچھی خاصی رقم دی جائے گی۔ وہ وہاں سے دور اپنی مادری اوقات کے مطابق پرورش پاتا رہے گا۔

اس کے بھائی دانش تیموری نے کہا۔ ''بھائی جان!

فارفہ بھابی نے آپ کو ایک بیٹا دیا ہے۔ یہ دوسرا بھی آپ ہی کا ہے۔ اسے مجھے دے دیں۔ میں اس کی پرورش کروں گا۔ ایسی تعلیم و تربیت دوں گا کہ آپ دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔''

طالش نے کہا۔ ''اسے بہت زیادہ تعلیم یافتہ خاندانی لڑکا نہیں بنانا ہے۔ کسی داشتہ یا کنیز سے ہونے والی اولاد کو منہ نہیں لگایا جاتا ہے۔ ایسی اولاد کی ضرورتیں دور دور ہی سے پوری کی جاتی ہیں۔''

دانش نے کہا۔ ''آپ درست فرماتے ہیں۔ میں یہی کروں گا۔ میں اسے لے پالک بیٹا بنا کر رکھوں گا تو کوئی اسے ہمارے خون سے نہیں جوڑے گا۔ اس طرح آپ کا یہ بیٹا میرا اپنا بن کر رہے گا۔''

''ہوں۔ ٹھیک ہے۔''

دانش اسے اپنی کوٹھی میں لے آیا۔ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح اولادِ نرینہ کے لیے ترس رہا تھا۔ بھائی نے بیٹے کو اپنی شفقت سے محروم کیا تو دل نے کہا، یہ بھائی کا خون ہے اسے اپنی جان سے لگا کر رکھے گا۔ اپنی محرومی دور کرے گا لیکن طالش کے احکامات کے آگے سب کی زبانیں بند ہو جاتی تھیں۔ سب کے دلی جذبات سرد پڑ جاتے تھے۔ وہ چپ چاپ اسے اپنے گھر لے آیا۔ آئندہ بھائی کے احکامات کے مطابق اس کی پرورش کرنے والا تھا۔

انسان خود کو دوسروں سے برتر اور نمایاں رکھنے کا عادی ہے۔ دماغ میں یہ خناس بھرا رہتا ہے کہ جیسے ہم افضل و اعلیٰ ہیں ویسا کوئی دوسرا نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ اگر دوسرا بھی یہی دعویٰ کرتا ہے تو اسے اس کی سطح سے گرانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ یا سمجھوتا کیا جاتا ہے کہ ہم چند ہی اعلیٰ نسل کے اعلیٰ خاندان والے آسمانی ہیں۔ باقی سب زمینی کیڑے مکوڑے ہیں۔

پچیس برس گزر گئے۔ وقت اچانک نہیں گزرتا۔ یہ تو چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ سست ہوتا ہے لیکن جب گزر جاتا ہے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے کل جوان تھے، آج بوڑھے ہو گئے ہیں۔ بڑھاپے نے اچانک ہی آ کر طالش کو جکڑ لیا۔ نوّے فیصد افراد کو یقین نہیں آتا کہ وہ بوڑھے ہو رہے ہیں۔ طالش نے اپنے بالوں کی سفیدی کو دیکھ کر خود کو تسلی دی کہ یہ چاندی نزلے کے باعث ہے۔ وہ خضاب لگا کر مطمئن ہو گیا۔

اب شکار کھیلنے کے لیے کسی درندے یا دشمن کے پیچھے دوڑتا تھا تو ہانپنے لگتا تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ ''ابھی تو ہم جوان ہیں۔ یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔ اس لیے ہانپ رہے ہیں۔''

مذاکرات

مطب میں ڈاکٹر اور مریض کے درمیان کچھ یوں گفتگو ہو رہی تھی۔

''ہاں بھئی...! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''پہلے سے زیادہ خراب ہے۔''

''تم نے دوا کھالی تھی؟''

''خالی نہیں تھی، بھری ہوئی تھی۔''

''میرا مطلب ہے تم نے دوا لے لی تھی؟''

''جی ہاں، آپ ہی سے تو لی تھی۔''

''بے وقوف آدمی! دوا پی لی تھی؟''

''پیلی نہیں، وہ تو ہلکی گلابی تھی۔''

''ابے... میں پوچھ رہا ہوں، دوائی کو پی لیا تھا؟''

''جی نہیں... دوائی کو نہیں، پپلیا تو مجھے ہوا تھا۔''

''گدھے! دوائی کو کھول کر منہ میں رکھ لیا تھا؟''

''جی نہیں... آپ ہی نے تو کہا تھا کہ اسے فریج میں رکھنا!''

''اب بکواس کی تو میرے ہاتھ سے مار کھائے گا۔''

''جی... میں آپ کے ہاتھ سے دوائی کھاؤں گا۔''

''نکل باہر یہاں سے... تو مجھے پاگل کر دے گا۔''

''جارہا ہوں... اب پھر کب آؤں آپ کے پاس؟''

''قیامت کے بعد!''

''ڈاکٹر صاحب! قیامت کے کتنے دن بعد آنا ہے مجھے؟''

بلڈ پریشر کی زیادتی سے ڈاکٹر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

کراچی سے دریشم کی سوغات

اس نے شراب کم کر دی۔ معجون کھانے لگا اور اپنے بیٹے حماد کی جوانی دیکھ کر سوچنے لگا' وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ عیش و عشرت سے جتنے بھی دن گزار سکتے ہیں گزار لیں۔ پھر ہم نہ رہے تو نہ یہ دنیا رہے گی۔ نہ یہ رنگ رلیاں رہیں گی۔

اسے مشہور و معروف شکاری کہلانے کا شوق تھا۔ اس نے ایشیا اور افریقہ کے جنگلوں میں شکار کھیلتے ہوئے اپنی تصویریں اُتروائی تھیں۔ ان تصویروں کو اپنے شکاری کارناموں کے ساتھ کئی رسالوں اور کتابوں میں چھپوایا تھا۔

اس کی ایک بہت بڑی تصویر حویلی کے بڑے ہال کی دیوار پر لگی تھی۔ اس تصویر میں وہ ایک مردہ شیر پر پاؤں

رکھے، دونوں ہاتھوں میں بڑی سی رائفل اُٹھائے کھڑا تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ اس نے تنہا سندر بن میں بنگال ٹائیگر سے مقابلہ کرنے کے بعد اسے گولی ماری ہے۔

اس کی دلی آرزو تھی کہ بیٹا بھی اس کے نقشِ قدم پر چلے۔ شیر کا شکار کھیلنے یا دشمنوں کا لہو بہانے کے سلسلے میں باپ دادا کی ہسٹری دہراتا رہے۔ لیکن وہ خاموش اور سنجیدہ نوجوان اپنے باپ سے مختلف تھا۔

اسے کتابوں سے دلچسپی تھی۔ وہ دن رات کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر گلوبل ویلج کی سیر کرتا رہتا۔ باپ کی طرح کسی سے سخت لہجے میں گفتگو نہیں کرتا تھا۔ کسی ملازم کو تھپڑ مارنا تو دور کی بات ہے وہ منہ سے گالی بھی نہیں نکالتا تھا۔

طالش نے ایک دن جھنجلا کر پوچھا۔ ”کیا تم اس طالش تیموری کے بیٹے ہو، جس کا نام سن کر دشمن دہل جاتے ہیں اور دوست سنبھل کر بولنے لگتے ہیں؟“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”بابا جانی! آپ باپ ہو کر ایسا کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”ہم سے کیا پوچھتے ہو؟ خود ہی جواب دو، ہمارے جیسے کیوں نہیں ہو؟“

”آپ کئی بار نصیحتیں کر چکے ہیں۔ آپ نے غصے سے بھی سمجھایا ہے کہ کسی سے مسکرا کر نہ بولوں۔ اپنی گفتار سے اپنی رفتار سے رعب اور دبدبہ طاری رکھوں۔ کسی کو خاطر میں نہ لاؤں۔ دوسروں کو اپنا احسان مند، محکوم اور تابعدار بنائے رکھنے کی روش پر چلتا رہوں۔ آپ کی طرح ہتھیار اور مسلح باڈی گارڈز لے کر چلا کروں۔ سوری بابا جانی! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔“

”دیکھو حماد! ہمیں غصہ نہ دلاؤ۔ تم ہمارا خون ہو۔ ہمارے نقشِ قدم پر چلو۔ یہ ازل سے ہوتا آیا ہے، جب تک دہشت اور رعب و دبدبہ طاری نہ کیا جائے، دنیا گھٹنے نہیں ٹیکتی۔“

”آپ کیوں چاہتے ہیں کہ دنیا ہمارے آگے جھکے؟ دنیا کو صرف خدا کے آگے جھکنے دیں۔“

”بکواس مت کرو۔ انسانی فطرت کو سمجھو۔“

اچانک فون کی کالنگ ٹون سنائی دی۔ طالش نے اسکرین پر نمبر دیکھ کر ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا۔ پھر کہا۔ ”ہاں دانش! بولو؟“

دانش تیموری کی آواز اسپیکر سے سنائی دی۔ وہ پریشانی سے چیخ کر بولا۔ ”بھائی جان! میری بیٹی کو کسی نے اغوا کرلیا ہے۔ ابھی اِس نامعلوم شخص نے فون پر اطلاع دی ہے۔“

طالش...... نے گرج کر کہا۔ ”یہ کس کی موت آئی ہے؟ تم نے اس کی آواز سے کچھ اندازہ لگایا؟“

”اغوا کی خبر سنتے ہی میرے تو ہوش اُڑ گئے۔ میں کیا اندازہ لگاتا؟ اس سے چیخ چیخ کر پوچھتا رہا کہ وہ کون ہے؟ مگر جواب نہیں ملا اور کال کاٹ دی گئی۔“

”کیا تم نے نازیہ کے فون پر خیریت معلوم کی ہے؟“

”اس کی ماں بار بار اسے کال کر رہی ہے۔ دوسری طرف کال جاتی ہے پھر بند ہو جاتی ہے۔“

”دانش! تمہاری یہ بیٹی بہت شریر ہے۔ ایک بار تم نے اس کی کوئی ضد پوری نہیں کی تھی۔ اس نے ایک سہیلی کے ذریعے اطلاع دی تھی کہ وہ جھیل میں ڈوب کے مر گئی ہے۔“

حماد اپنے باپ اور چچا کی باتیں سن رہا تھا۔ چچا کہہ رہا تھا۔ ”ہاں۔ اس نے شرارت کی تھی مگر آج وہ ہم سے ناراض نہیں تھی۔ ہنستی بولتی کالج گئی تھی۔ وہ شرارت نہیں کر رہی ہے۔ اسے سچ مچ اغوا کیا گیا ہے۔“

حماد نے فون کی طرف جھک کر کہا۔ ”آج اپریل کی پہلی تاریخ ہے۔ ہنسی مذاق اپنی جگہ ہے۔ اسے ایسا خطرناک مذاق نہیں کرنا چاہیے۔“

طالش نے کہا۔ ”میرا بیٹا درست کہہ رہا ہے۔ تم نے بیٹی کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے۔ فوراً پرنسپل کو فون کرو۔ معلوم کرو، وہ کالج پہنچی ہے یا نہیں؟“

اسی وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ دانش نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا تو نازیہ کی چیخ سنائی دی۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”ڈیڈ! مجھے بچائیں۔ یہ لوگ پتا نہیں مجھے کہاں لے آئے ہیں۔ یہ مجھے...“

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کا منہ بند کر دیا گیا ہے۔ پھر ایک ہانپتی ہوئی بوڑھی سی آواز سنائی دی۔ ”میری عمر زیادہ نہیں ہے۔ صرف اسّی سال ہے۔ آج شام کو تمہاری بیٹی سے نکاح پڑھاؤں گا۔ اس عمر میں سولہ برس کی مل رہی ہے۔ پوری رات گزار کر صبح فون کروں گا۔ وہ جگہ بتاؤں گا، جہاں سے نازیہ کو لے جا سکو گے۔“

”ہیلو... دیکھو فون بند نہ کرنا۔ اتنا بتا دو ہم سے دشمنی کیوں کر رہے ہو؟“

جواب ملا۔ ”ایک جوان تمہاری بیٹی پر عاشق ہو گیا تھا۔ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن تمہارے ظالم بھائی طالش تیموری نے اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس بے چارے کا قصور اتنا ہی تھا کہ وہ ایک معمولی خاندان کا فرد تھا۔ بہت نیک اور ایماندار تھا۔ کیا نامی گرامی خاندان نہ ہو تو نیکی اور ایمانداری کو قتل کر دیا جاتا ہے؟“

دانش نے کہا۔ ”ہم آپ کی شکایت دور کر دیں گے۔ آپ ہماری بیٹی کو واپس لے آئیں یا ہمیں بلائیں۔ ہم آپ کا تمام نقصان بھریں گے۔ ہم سے سمجھوتا کریں۔“

”طالش جیسا شخص انگاروں پر بیٹھ کر بھی وعدہ کرے کہ وہ اچھے اور سچے لوگوں سے سمجھوتا کرے گا اور کسی عام شخص کی عزت کرے گا اور کسی کی زندگی نہیں چھینے گا تو اس بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔“

وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ”میں دمے کا مریض ہوں۔ چل چلاؤ کا وقت ہے۔ تم لوگوں کو ایک نیک نوجوان اپنی بیٹی کے لیے پسند نہیں آیا۔ اب اس ہانپتے ہوئے بوڑھے کو تمہاری بیٹی برداشت کرے گی۔“

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ دانش نے دوسرے فون پر طالش سے کہا۔ ”ایک بوڑھا باتیں کر رہا تھا۔ آپ نے میری باتیں سن کر اندازہ کیا ہوگا؟“

وہ بھائی کو اور وضاحت سے بتانے لگا۔ طالش نے سن کر کہا۔ ”یہ بکواس ہے کہ ایک بوڑھے نے ہماری نازیہ کو اغوا کیا ہے۔ اس واردات کے پیچھے ہمارے کسی دشمن کا ہاتھ ہے۔“

حماد نے کہا۔ ”مجرم کوئی بھی ہو۔ بوڑھا ہو یا جوان؟ نازیہ کو اغوا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے کسی نوجوان کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ اب میری بہن اس کی سزا بھگت رہی ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیا اسے نازیہ سے عشق کرنے اور ہمیں بدنام کرنے کے لیے زندہ چھوڑ دیتے؟“

”اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے قتل کرنا لازمی نہیں تھا۔ صلح اور صفائی کے اور بھی کئی راستے تھے۔“

”لعنت ہے تم پر... تم میرے بیٹے ہو...؟ بزدل اور گری ہوئی حیثیت کے لوگوں کی طرح صلح صفائی کی باتیں کر رہے ہو۔“

وہ غصے سے فون پر نمبر پنچ کرتا ہوا بول رہا تھا۔ کرائے کے قاتلوں سے رابطہ کر رہا تھا۔ انہیں حکم دے رہا تھا کہ وہ آدھے گھنٹے کے اندر مسلح ہو کر آ جائیں۔ اُدھر سے دانش نے پوچھا۔ ”بھائی جان! آپ کہاں جائیں گے؟ کیا وہاں ہماری نازیہ ہوگی؟“

”ہم سراغ لگا رہے ہیں۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔“

پھر اس نے اپنے موبائل فون پر کہا۔ ”ہیلو دلاور شاہ...!“

دلاور شاہ نے کہا۔ ”ہاں۔ میں بول رہا ہوں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔ اب میری طرف ضرور آئے گا اور تم آ گئے۔“

طالش نے کہا۔ ”جس جوان نے میری بھتیجی سے عشق کرنے کی غلطی کی تھی، تم اس کے بہت طاقتور حمایتی تھے۔“

”ہاں میں نے کوشش کی تھی کہ تم اسے قتل نہ کرو۔“

”بکواس کرتے ہو۔ ہم ایک امن پسند شریف خاندان کے بزرگ اور سرپرست ہیں۔ ہم نے کبھی ایک چیونٹی بھی نہیں ماری اور تم ذاتی عداوت کے باعث ہمیں کسی نوجوان کا قاتل کہہ رہے ہو۔“

دلاور شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”طالش تم بہت مکار ہو۔ تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔ میں ابھی فون پر ہونے والی باتیں ریکارڈ کر رہا ہوں۔ تم کبھی اقرار نہیں کرو گے کہ اس نوجوان کو ہلاک کیا تھا۔“

”تمہارے فون سے جو ریکارڈنگ ہو رہی ہے، اسے قانون کے محافظوں کو سناؤ۔ ہم یقین سے کہہ رہے ہیں کہ تم نے ہماری بھتیجی نازیہ کو اغوا کیا ہے۔ ہم ابھی تمہارے خلاف قانونی کارروائی کرنے جا رہے ہیں۔ ایک پُرامن شہری قانون کا احترام کرتا ہے اور قانون کے ہی ذریعے تمہارے جیسے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہے۔“

وہ ٹیلیفون بند کر کے دانش سے بولا۔ ”تم یہاں آ جاؤ۔ مجرم ہماری نظروں میں آ گیا ہے۔“

پھر اس نے فون کے ذریعے اپنے مخبروں اور جنگجو وفاداروں کو حکم دیا کہ دلاور شاہ کے جتنے خفیہ اڈے ہیں، ان کی سن گن لو۔ اس نے نازیہ کو وہیں کسی اڈے میں چھپایا ہو گا۔

پھر اس نے بیٹے سے کہا۔ ”چلو اُٹھو۔ تیار ہو جاؤ۔ تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہے۔ آئندہ دشمنوں سے نمٹتے وقت تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو گے۔ اسی طرح ہمارے جانشین بن سکو گے۔“

انسانی لہو کی ارزانی اور خون ریزی حماد کے مزاج کے خلاف تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جہاں اسے لے جایا جا رہا ہے، وہاں گولیاں چلیں گی اور کتنے ہی لوگ جان سے جائیں گے۔ وہ باپ کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نازیہ اس کی چچازاد بہن تھی۔ اس کی بازیابی کے لیے جانا اس کا فرض تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔

طالش... ٹیلیفون اور موبائل فون کے ذریعے جنگ لڑنے کے حربے آزما رہا تھا۔ اسے وقفے وقفے سے رپورٹ مل رہی تھی کہ اس کے مخبر اور جنگجو وفادار کیا کرتے پھر رہے ہیں؟ اس نے حکم دیا۔ "دلاور شاہ کے کسی ایک اڈّے کو بم سے اُڑا دو۔ ہو سکے تو اس کے کسی بچے کو اغوا کرو۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے آئے ہیں اور ابھی یہی ہوگا۔"

ایک گھنٹے بعد کئی چینلز کی نیوز بریک میں یہ خبر آئی کہ دلاور شاہ کے ایک اناج کے گودام کو بم سے اُڑا دیا گیا ہے۔ طالش نے فون کی سم بدل کر دلاور شاہ سے کہا۔ "یہ شروعات ہے..."

بس اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ دشمنوں کو بھڑکانا اور تڑپانا خوب جانتا تھا۔ دلاور شاہ نے فوراً ہی کال بیک کی۔ "ابھی تم نے ہی دوسرے نمبر سے فون کر کے مجھے چیلنج کیا ہے۔ میرے گودام میں ایک کروڑ سے زیادہ کا مال تھا۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔ میں نے تمہاری بھتیجی کو اغوا نہیں کرایا ہے۔"

طالش نے فون بند کر دیا۔ وہ اسے اہمیت نہ دیتے ہوئے اس سے کھیل رہا تھا۔ دلاور شاہ نے پھر کال کی۔ "پلیز فون بند نہ کرنا۔ میری پوری بات سن لو۔"

وہ سرد لہجے میں بولا۔ "دوسرے دھماکے سے پہلے میری بھتیجی کو یہاں پہنچا دو۔"

"میں نازیہ کے بارے میں ہی بول رہا ہوں۔ ایک شخص نہ جانے کہاں سے آ گیا ہے۔ نازیہ کو ہم سے چھین کر لے جانا چاہتا ہے۔ ہم نے اس کا راستہ روک رکھا ہے۔ لیکن اسے زیادہ دیر تک روک نہیں سکیں گے۔ اس نے اب تک میرے تین بندے مار دیے ہیں۔"

دانش نے تڑپ کر پوچھا۔ "کون میری بیٹی کو لے جانا چاہتا ہے؟ فوراً بتاؤ میری بیٹی کہاں ہے؟"

"تم جانتے ہو، میرا فارم بیچ سے آگے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم یہیں ہیں۔ فارم کے احاطے میں ہیں۔ فارم ہاؤس کے اندر نہیں جا سکتے۔ نازیہ اس کے قبضے میں ہے۔ ہم فائرنگ کرتے ہوئے اندر جائیں گے تو نازیہ بھی ماری جائے گی۔"

"اسے روکے رکھو۔ ہم آ رہے ہیں۔"

دونوں بھائی رابطہ ختم کر کے اُٹھ گئے۔ حماد نے کہا۔ "ہمیں دھوکا ہو سکتا ہے۔ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ دشمن نے وہاں جال بچھایا ہے؟"

"دشمن اپنے ہی فارم ہاؤس میں، اپنے ہی گھر میں بلا کر ایسی دشمنی نہیں کرے گا کہ قانون کی گرفت میں آ جائے۔ بیٹے! اپنے باپ کے ساتھ چلو اور دیکھو کہ جنگی حکمت عملی کیا ہوتی ہے۔"

وہ پہلی بار ایسی مہم میں شریک ہو رہا تھا۔ جب اپنے باپ اور چچا کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوا تو ان کے آگے پیچھے مسلح افراد سے بھری ہوئی دس گاڑیاں تھیں۔ وہ فارم ہاؤس کے قریب پہنچتے ہی دائیں بائیں تقسیم ہو کر اس کا محاصرہ کرنے لگیں۔

طالش نے فون پر کہا۔ "دلاور شاہ! تم دیکھ رہے ہو گے۔ ہم آ گئے ہیں۔ احاطے سے باہر آؤ۔"

وہ بولا۔ "ہم احاطے میں ہیں۔ وہ ہمیں چار دیواری کے اندر جانے سے روک رہا ہے۔ نازیہ کو وہاں سے نکالنے کی کوشش میں میرے تین بندے مارے گئے ہیں۔"

"آخر کون ہے وہ...؟ تمہارے مسلح آدمیوں کی موجودگی میں یہاں کیسے گھس آیا؟"

"یہاں کرائے کا قاتل بن کر آیا تھا۔ میں نے اس کی خدمات قبول کیں اور دھوکا کھا گیا۔"

دلاور شاہ فون پر بول رہا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس جوان نے نازیہ کو اپنی گرفت میں لینے کے بعد کہا تھا کہ وہ اس کا عاشق ہے۔ اس کا رشتہ مانگے گا تو اسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔ اس لیے وہ اسے گن پوائنٹ پر لے جائے گا۔

طالش نے کہا۔ "وہ مرنے کے لیے آیا ہے۔ اس سے کہو، ہم سے بات کرے۔"

اسی وقت دانش کے فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو۔ کون...؟"

وہ جواباً بیٹی کی آواز سن کر اُچھل پڑا۔ چیخ کر بولا۔ "نازیہ! میری بچی! تم خیریت سے ہو نا؟"

وہ بولی۔ "میں بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ بڑے ابو سے بولیں کہ وہ دشمنوں سے ہتھیار چھین لیں۔ انہیں نہتا کر دیں پھر میں آپ کے پاس آ سکوں گی۔"

"کیا وہ بدمعاش تمہیں آنے دے گا؟"

"ابھی کوئی سوال نہ کریں۔ پہلے مجھے باہر آنے دیں۔"

طالش نے پوچھا۔ "وہ کیا کہہ رہی ہے؟ فون مجھے دو۔"

"بھائی جان! وہ ابھی یہاں آ سکتی ہے۔ کہہ رہی ہے، پہلے آپ ان دشمنوں کو نہتا کریں۔"

"وہ کیسے آئے گی۔ جبکہ اس بدمعاش کی گرفت میں ہے؟"

"وہ آئے گی تو معلوم ہوگا۔ آپ فوراً دلاور سے کہیں۔"

طالش نے بلند آواز سے کہا۔ "دلاور! ہم احاطے میں آئیں گے۔ تم ہتھیار پھینک کر باہر آؤ۔"

اس نے جواب دیا۔ "ہم ہتھیار پھینکنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ بیٹی کو جس طرح سے بھی لے جا سکتے ہو لے جاؤ۔ ہم گولی نہیں چلائیں گے۔"

"اور ہم تمہارے جیسے مسلح کمینے سے خیر کی توقع نہیں کریں گے۔ ہم پانچ منٹ تک انتظار کریں گے۔ اس کے بعد دیکھو گے کہ تمہارے کسی آدمی کو بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔ فارم ہاؤس کے چاروں طرف میرے مسلح وفاداروں نے مورچا بنا رکھا ہے۔"

احاطے کے اندر بھگدڑ مچ گئی۔ وہ لوگ اِدھر اُدھر چھپتے ہوئے اپنی سلامتی کے لیے مورچے بنا رہے تھے۔ دلاور شاہ نے کہا۔ "طالش یہ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ گولیاں چلیں گی تو دونوں طرف کے بندے مارے جائیں گے۔ دانش مندی یہ ہے کہ ہم احاطے میں دور چلے جاتے ہیں۔ تم آ کر اپنی بھتیجی کو لے جاؤ۔"

"کیا دور سے گولی آ کر نہیں لگتی؟ تم ہتھیار نہ پھینکو۔ ہم تمہارے ہاتھوں سے گرائیں گے۔"

اس نے اپنے وفاداروں کو فائرنگ کا حکم دیا۔ حکم کے مطابق پہلے ایک طرف سے گولیاں چلیں۔ دلاور کے آدمیوں نے جوابی فائر کیے تو دوسری تیسری سمتوں سے حملے ہونے لگے۔

احاطے کی دیواریں نیچی تھیں اور وہاں کہیں کہیں چھپ کر مقابلہ کرنے کی جگہ نہ تھی۔ باہر چاروں طرف سے بہ آسانی گولیاں آ رہی تھیں۔ کسی کو زخمی کر رہی تھیں۔ کسی کو موت کے گھاٹ اُتار رہی تھیں۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی فائرنگ کی گرم بازاری ٹھنڈی پڑ گئی۔ احاطے کے اندر کئی لاشیں گریں۔ جو زندہ بچے وہ فارم ہاؤس سے نکل بھاگنے کی کوششیں کرنے لگے۔ آخر طالش کا پلڑا بھاری ہو گیا۔

کچھ دیر بعد دلاور شاہ نے مجبور ہو کر کہا۔ "طالش! رُک جاؤ۔ فائرنگ بند کرو۔ مجھے اپنے آدمیوں کے ساتھ یہاں سے جانے دو۔"

"ہتھیار پھینکنے کے بعد یہاں سے جا سکو گے۔ ورنہ موت تو پکی ہو چکی ہے۔"

دلاور شاہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ اپنی مدد کے لیے

پولیس فورس کو طلب کرتا تو نازیہ گواہی دیتی کہ وہ اسے اغوا کر کے وہاں لایا ہے۔ وہ معزز کہلانے والا سرمایہ دار آہنی سلاخوں کے پیچھے جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہتھیار پھینک کر احاطے کے باہر طالش تیموری کے سامنے آ گیا۔ اس کے وفادار اور کرائے کے قاتلوں نے بھی ہتھیار پھینک دیے۔

دانش نے فوراً ہی فون پر بیٹی سے کہا۔ "دشمنوں نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ باہر نکلو، ہم بھی آ رہے ہیں۔"

اُدھر طالش غصے میں تھا۔ وہ دلاور شاہ کو ٹھوکریں مارتے ہوئے، احاطے کے اندر لاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تو نے ہمارے خاندان کی عزت کو ہاتھ لگانے کی جرأت کیسے کی؟ کیا یہ ہاتھ اب تیرے پاس رہیں گے؟"

وہ سب احاطے کے اندر فارم ہاؤس کے دروازے کے سامنے آئے۔ باپ نے بیٹی کو آواز دی۔ تب وہ دروازہ کھول کر باہر آئی۔ وہ تنہا نہیں تھی۔

اس کے پیچھے ایک قدآور نوجوان تھا۔ اس نے صرف ایک جینز پہنی ہوئی تھی۔ اوپر سے بدن ننگا تھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں پتھر کی طرح سخت ابھری ہوئی تھیں۔ سینہ چٹان کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں رائفل پکڑی ہوئی تھی۔

وہ رائفل دکھانے کے لیے نہیں چلانے کے لیے تھی۔ اس نے باہر آتے ہی دلاور شاہ کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "تو میری نازیہ کو ہاتھ لگا کر اپنے ہاتھوں سے گیا..."

اس نے دو فائر کیے۔ دو گولیاں ایک ایک بازو میں آ کر پیوست ہو گئیں۔ وہ اُچھل کر زمین پر گرا اور تکلیف سے چیختے ہوئے تڑپنے لگا۔ اس نوجوان نے کہا۔ "جو میری ہے، اس کی تمنا میں موت تیری ہے..."

اس نے تیسری گولی اس کے سینے میں اُتار دی۔ وہ ایک ذرا تڑپ کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔ طالش تیموری اور دانش تیموری حیرانی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ جواد تیموری تھا۔

طالش کا رد کیا ہوا، نظر انداز کیا ہوا، خاندان سے باہر پھینکا ہوا بیٹا تھا۔ اس نے جواد کو اس کے چچا کے حوالے کیا تھا۔ چچا دانش نے اس کی پرورش ایک لے پالک بچے کی حیثیت سے کی تھی۔ اسے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ان کے ہی لہو کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس خاندان کا پہلا چشم و چراغ ہے۔

وہ دلاور شاہ کو گولی مار کر تن کر کھڑا ہوا تھا۔ رائفل کی نال سے ہلکا سا دھواں نکل رہا تھا۔ ایسے وقت باپ اور چچا

کے دلوں سے بھی دھواں نکل رہا تھا۔ ایک طوائف زادے نے ان عزت داروں کی بیٹی کی آبرو بچائی تھی۔

دانش نے حیرانی سے پوچھا۔ ”جواد! تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟“

وہ اپنی رائفل کو تھپکتے ہوئے بولا۔ ”آپ جانتے ہیں، بچپن ہی سے ہتھیار میرے دوست ہیں۔ ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے کبھی کبھی دشمنوں کے ساتھ کھیلتا ہوں۔ جتنا کھیلو، اتنا ہی نشانہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔“

وہ طالش کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرا اور آپ کا ایک ہی مزاج اور ایک ہی اُصول ہے کہ گولی ہے تو ضائع نہ جائے، کسی پر چلنی چاہیے۔ کیوں بابا جانی...؟“

وہ ایک لے پالک بیٹے کی حیثیت سے دانش کو بابا اور طالش کو بابا جانی کہا کرتا تھا۔ طالش نے پوچھا۔ ”تم یہاں آکر اس دشمن کے جنگجو وفادار کیسے بن گئے؟“

وہ بولا۔ ”معاوضہ لے کر واردات کرنے والوں کے نام اور پتے جس طرح آپ جانتے ہیں، میں بھی جانتا ہوں اور ان سے رابطہ رکھتا ہوں۔ ان سے ہی معلوم ہوا کہ ایک لڑکی کو اغوا کرنے کے لیے دلاور شاہ کو کرائے کے وارداتیوں کی ضرورت ہے۔ اس طرح میں اس کم بخت کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ وہ اغوا کی ہوئی لڑکی ہماری نازیہ ہے۔“

وہ فخر سے سینہ تان کر بولا۔ ”بابا جانی! میں آپ کے جیسا ہوں۔ دشمن کے گھر میں گھس کر اس کی چھاتی پر چڑھ کر اسے مٹی میں ملا دیتا ہوں اور میں آپ کی طرح تمام پرانا... اور نیا اسلحہ استعمال کرنا جانتا ہوں۔ میری خواہش ہے، کبھی آپ مجھے اپنے ساتھ شکار کھیلنے لے جائیں۔“

طالش نے اپنے دوسرے بیٹے حماد کو دیکھا۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ کتابوں اور کمپیوٹر کی دنیا میں رہتا تھا۔ بندوق چلانا تو دور کی بات ہے، اس کے ہاتھ میں کبھی کچن کا چاقو بھی نہیں دیکھا گیا۔ اس کے برعکس جواد کا مزاج اور فطری عادات ایسی تھیں کہ ان کے پیش نظر وہ صحیح معنوں میں طالش کا جانشین لگتا تھا۔

وہ اپنی پجیرو میں حویلی کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ”جسے ہم نے دل اور اپنے خاندان سے نکال دیا، وہ بالکل ہمارے جیسا ہے اور جس بیٹے کو پیدائش کے دن سے اپنی سرپرستی میں کلیجے سے لگا کر رکھا، وہ نچلے طبقے کے سیدھے سادے جوانوں جیسا بن گیا ہے۔ غریب اور مسکین سا لگتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دنیا میں شریف آدمی محض ذلتیں اُٹھانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔

”یہ... یہ حماد ہمیں ذلیل کرے گا۔ ہمارا سر جھکائے گا اور... اور جواد...؟“

پہلی بار ایک باپ کا دل دربدر ہونے والے بیٹے کی طرف کھنچنے لگا۔ اور کیوں نہ کھنچتا...؟ اپنا لہو تھا۔ وہ چہرے سے، مردانہ انداز سے، رعب اور دبدبے سے سفاک، بے رحم جاگیردار دکھائی دیتا تھا۔

”واہ...! کیسا شیر جوان ہے۔ اب ہم کیا کریں؟“

اب وہ تھوکے ہوئے کو چاٹ نہیں سکتا تھا۔ لے پالک اولاد کہلانے والے کو بیٹا نہیں کہہ سکتا تھا۔ نہ ہی تنہائی میں اسے سینے سے لگا سکتا تھا۔ اور دل تڑپ کر کہہ رہا تھا کہ کچھ نہیں ہو سکتا نہ ہو، اسے اپنے قریب تو رکھا جا سکتا ہے۔ ایسے بیٹے آئینہ ہوتے ہیں۔ جن میں باپ اپنا عکس دیکھتے ہیں۔

اس نے بھائی سے کہا۔ ”دانش! تم نے اس کی ایسی پرورش کی ہے۔ ایسی تربیت دی ہے کہ وہ بالکل ہمارے جیسا ہو گیا ہے۔ ہم اسے اپنے قریب رکھنا چاہتے ہیں۔“

”بھائی جان! بڑی مشکل ہے۔ آپ کس رشتے سے قریب رکھیں گے؟“

”کوئی رشتہ ضروری نہیں ہے۔ ہم اسے باڈی گارڈ بنا کر دن رات اپنے ساتھ رکھیں گے۔“

”اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ آپ کا لہو اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اور وہ آپ کے ساتھ دن رات دوڑتا رہے گا۔ باپ بیٹے کو ساتھ دیکھ کر مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوگی۔“

”اسے کہہ دو کہ وہ کل سے حویلی میں رہا کرے گا۔“

دانش نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہمیں چھوڑ کر حویلی میں رہنا نہیں چاہے گا۔ مجھے، بلقیس کو اور میری بیٹیوں کو دل و جان سے چاہتا ہے۔“

بیٹیوں کو چاہنے کی بات پر طالش ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے کہا۔ ”دانش...! جواد فارم ہاؤس میں تمہاری بیٹی کو میری نازیہ کہہ رہا تھا۔ سب کے سامنے کہہ رہا تھا۔ معاملہ کیا ہے؟“

”کیا ہو سکتا ہے بھائی جان! جو آپ سوچ رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ میری دوسری بیٹیوں کو میری آپا، میری باجی کہتا ہے۔ نازیہ عمر میں چھوٹی ہے اس لیے اسے میری نازیہ کہتا ہے۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔ آج ہم نے ایک عرصے بعد نازیہ کو دیکھا ہے۔ ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے۔ ہم اسے اپنی بہو بنائیں گے۔“

وہ بھائی کے گھٹنوں کو چھو کر بولا۔ ”آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ میرے سر سے بوجھ اُتار دیا ہے۔ ابھی جا کر بلقیس کو یہ خوش خبری سناؤں گا۔“

بلقیس اس کی شریکِ حیات تھی۔ اس نے نازیہ سے پہلے تین بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ جو بدنصیبی بیگم عارفہ کے ساتھ تھی، وہی اس کے ساتھ تھی۔ وہ بھی اپنے شوہر دانش کو ایک بیٹے کا باپ نہیں بنا پائی تھی۔

کچھ عرصہ پہلے دونوں بھائی اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ طالش بیٹا نہ ہونے پر عارفہ پر ظلم ڈھاتا تھا اور وہ بیچاری برداشت کر لیتی تھی۔ بلقیس بھی ظلم سہہ لیتی تھی مگر طعنے ضرور دیتی تھی۔ عارفہ کی طرح شوہر سے ڈرتی تھی لیکن منہ زوری سے باز نہیں آتی تھی۔

ایک بار اس نے دانش سے کہا۔ ”یہ طبی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ بیٹے یا بیٹی کی تخلیقی صلاحیت صرف مرد کے لہو میں ہوتی ہے۔“

اس بات پر دانش نے اس کی پٹائی کی اور کہا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔ میں نے ایسی طبی تحقیقات کے بارے میں نہ پڑھا ہے نہ سنا ہے۔ اگر آئندہ بیٹا نہ ہوا تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔“

پھر ان ہی دنوں بیگم عارفہ نے حماد کو جنم دیا۔ تب دانش نے بلقیس سے کہا۔ ”تم طعنے دیتی تھیں کہ ہم بھائیوں میں اولادِ نرینہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اب بولو، بھائی جان ایک نہیں دو بیٹوں کے باپ بن گئے ہیں۔“

وہ تنبیہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولا۔ ”اب تو تمہاری طلاق پکی ہو گئی۔ اپنی بہتری چاہتی ہو تو اب کی بار بیٹا پیدا کرو۔“

وہ اپنی ٹانگ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”یہ مجرب نسخہ ہے کہ عورت کو خوب دہشت زدہ کرو۔ اس کی گردن میں طلاق کا پھندا ڈالو تو وہ ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔ بھائی جان نے یہی نسخہ آزمایا تھا۔ تب ہی عارفہ بھابی نے بیٹے کو جنم دیا ہے۔“

وہ پھر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”اب تمہاری باری ہے۔ بیٹا پیدا کرو یا طلاق لے کر یہاں سے منہ کالا کرو۔“

وہ دھمکی دے کر چلا گیا۔ بلقیس سمجھ رہی تھی کہ یہ محض دھمکی نہیں ہے۔ وہ طلاق دینے میں اس لیے دیر نہیں کرے گا کہ اس کے بعد ایک نئی نویلی آجائے گی۔

وہ جیتے جی سولی پر لٹک گئی۔ نیند اُڑ گئی۔ یہ فکر دن رات کھانے لگی کہ آئندہ حاملہ ہوگی تو کیا ہوگا...؟

کیا ایک اور بیٹی آکر اس کا سہاگ اُجاڑ دے گی...؟

ان حالات میں زمین سے دوائیں کی جاتی ہیں اور آسمان سے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ وہ پچھلی تین بیٹیاں پیدا کرنے سے پہلے ڈھیر سارے تعویذ گنڈے پہن چکی تھی اور سب ہی کو بے اثر ہوتے دیکھا تھا۔ ان سب پر سے اس کا ایمان اُٹھ گیا تھا۔

پھر یہی بات صادق آتی ہے کہ انسان مرتا کیا نہ کرتا۔ اسے موت گوارا تھی۔ وہ طلاق کی ذلت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ تین بیٹیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ ان حالات میں وہ ایسی مجبور ہو گئی کہ اس کے اندر شیطان بکنے لگا۔

پچھلی بار دانش نے اس کہا تھا۔ ”بیٹا پیدا کرو یا طلاق لے کر یہاں سے منہ کالا کرو...“

منہ کالا کرنے والی بات اس کے دل کو لگی۔

وہ ایسے مقام پر تھی جہاں منہ کالا کر کے زندگی کی تاریکیاں روشن کر سکتی تھی۔

اس نے چور دروازہ کھول دیا۔ رانگ کال کے ذریعے ایک بیٹے کو کال کرنے لگی۔ کبھی بے تکے نمبر پنچ کرو تو اتفاقاً بات بن جاتی ہے۔ اور یہ تو ہے کہ چور دروازے سے چوری کا ہی سامان گھر میں آتا ہے۔ چھ ماہ بعد ہی ضروری سامان آ گیا۔

یہ طالش تیموری اور دانش تیموری خاندان کی ایک مختصر سی جھلک تھی۔ ان کا یہ المیہ تھا کہ ان سے بیٹے پیدا نہیں ہوتے تھے۔ اور جب ہوئے تو ایک طوائف کے بطن سے آیا۔ دانش کا بیٹا چور دروازے سے آ گیا۔ صرف ایک حماد ہی نجیب الطرفین تھا۔ ان کی لاعلمی میں صرف ایک ہی بیٹا خالص تھا۔

...لیکن کچھ گڑبڑ تھی۔ وہ فطرتاً باپ سے مختلف تھا۔

☆☆☆

دانش کا بیٹا پندرہ برس کا تھا۔ اس سے پہلے چار بیٹیاں تھیں۔ ان میں سب سے چھوٹی نازیہ تھی۔ ان کے علاوہ جواد لے پالک بیٹا تھا۔ بلقیس بیگم اس لے پالک کی پرورش بڑی محبت اور ممتا سے کرتی رہی تھی اور ایسا ہی ایک بیٹا اپنی کوکھ سے پیدا کرنے کی دعائیں مانگتی رہی۔ دعائیں قبول نہ ہوئیں تو بڑے گھرانے کی، بڑے شجرے والی کی حکمتِ عملی کام آ گئی۔

دانش نے بیگم کو اور بیٹیوں کو سختی سے تاکید کی تھی کہ اس کی اصل ولدیت اسے کبھی نہ بتائی جائے۔ خواتین احکامات کی پابند رہیں۔ انہوں نے اب تک جواد کو تاریکی میں رکھا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ نازیہ اور جواد ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے۔ یہ دلچسپی رفتہ رفتہ عشق میں بدل گئی۔ بلقیس اور بڑی بہنیں خوش ہوگئیں۔ وہ سب ہی جواد کو جی جان سے چاہتی تھیں۔ لیکن اس خوشی کے پیچھے یہ تشویش ہوئی کہ طالش اور دانش ایک طوائف زادے سے نازیہ کا رشتہ نہیں کریں گے۔

بلقیس نے کہا۔ ''فی الحال یہ بات چھپائی جائے گی۔''

نازیہ نے کہا۔ ''ہم کوئی جرم نہیں کر رہے ہیں۔ ابو کو معلوم ہونا چاہیے۔ تب ہی بات آگے بڑھے گی۔''

ماں نے کہا۔ ''بات آگے نہیں بڑھے گی۔ ختم ہو جائے گی۔ تمہارے ابو بھائی جان کی انگلیوں پر ناچتے ہیں اور بھائی جان نے اپنے ہی بیٹے کو کھوٹا کہہ دیا ہے۔ اسے تمہارے ابو کبھی کھرا نہیں مانیں گے۔''

بلقیس نے سمجھایا۔ ''بیٹی! ابھی تمہیں تعلیم مکمل کرنی ہے۔ جب شادی خانہ آبادی کی بات چلے گی۔ تب دیکھا جائے گا۔''

وہ بولی۔ ''دیکھنا کیا ہے؟ اگر ابو نے اور بڑے ابو نے جواد کو قبول نہ کیا تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔''

''تم جانتی ہو کہ دونوں بھائی کتنے ظالم ہیں؟''

''میں ان ہی ظالموں کے لہو سے ہوں۔ میں ٹوٹنا جانتی ہوں، جھکنا نہیں جانتی۔''

ماں اور بیٹیاں فکرِ فردا میں مبتلا ہوگئیں۔ سوچتی رہیں کہ کیا ہوگا؟ اور کیا ہونا چاہیے؟

آخر بات بڑھنے کا وقت آگیا۔ دانش نے گھر آکر بلقیس اور بیٹیوں کو خوش خبری سنائی۔ ''مبارک ہو بلقیس! بھائی جان نے تو آج میرے منہ کی بات کہہ دی۔ وہ نازیہ کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔''

ماں بیٹیاں خوش ہوگئیں۔ بہو بنانے والی بات سے ایسا ہی لگا جیسے طالش نے جواد کے لیے نازیہ کو مانگا ہے۔ پھر ان کے ذہنوں کو جھٹکا سا لگا۔ یاد آیا کہ جواد تو معتوب ہے۔ لہو کے ٹھوس حوالے کے باوجود اسے بیٹا تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ فوراً ہی یہ بات سمجھ میں آئی کہ طالش نے حماد کے لیے نازیہ کو مانگا ہے۔

پھر بھی بلقیس نے پوچھا۔ ''بھائی جان نے بڑے بیٹے کے لیے رشتہ مانگا ہے نا؟''

''بڑا بیٹا...؟'' دانش نے گھور کر پوچھا۔ ''یہ بڑا بیٹا کہاں سے آگیا؟ بھائی جان کا ایک ہی بیٹا ہے۔''

''آپ اور ہم جانتے ہیں۔ حماد سے دو ماہ پہلے جواد پیدا ہوا تھا۔''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''جو بھائی جان کی گنتی میں نہیں ہے۔ اس کا حساب کیوں کر رہی ہو؟ ان کا ایک ہی بیٹا ایک ہی وارث ہے اور نازیہ کا رشتہ اسی سے ہوگا۔''

''وہ شادی نہیں کرے گی۔ میرا مطلب ہے، وہ حماد کو بھائی مانتی ہے۔''

''جو آج چچا زاد بھائی بہن ہیں، وہ شادی کے بعد میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ کیا وہ نادان ہے؟ اتنی سی بات نہیں سمجھتی ہے؟''

بڑی بیٹی نے کہا۔ ''ابو! آپ جواد کو بیٹے کی طرح چاہتے ہیں۔ اسے داماد بنائیں۔ وہ جواد کو چاہتی ہے۔''

''اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ ایک لے پالک کا کوئی خاندانی پس منظر نہیں ہوتا۔ ہم اعلیٰ خاندان والوں سے کیا کہیں گے کہ جواد کس خاندان سے آیا ہے؟ اس کے باپ دادا کا شجرہ کیا بتائیں گے؟''

دوسری بیٹی نے کہا۔ ''جب آج تک جھوٹ بولتے آرہے ہیں تو آگے بھی ایک جھوٹا شجرہ پیش کر کے اسے داماد بنا سکتے ہیں۔''

''بھائی جان کبھی نہیں مانیں گے۔''

بلقیس نے کہا۔ ''آپ بھائی جان سے بات تو کریں۔''

دانش نے اسی دن بھائی سے بات کی۔ اسے بتایا کہ نازیہ اور جواد رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا چاہتے ہیں۔ طالش نے کہا۔ ''جواد کو دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے لیکن کیا کیا جائے ہم اسے کسی اعلیٰ خاندان کا فرد ثابت نہیں کر سکیں گے۔''

''اس کا کوئی فرضی شجرہ بنایا جا سکتا ہے۔''

''کیسے بناؤ گے؟ کسی اعلیٰ خاندان کے بزرگوں کا اور اہم افراد کا وجود ہونا چاہیے۔ ہم ایسے افراد کہاں سے پیدا کریں گے؟ یہ بات دماغ سے نکال دو کہ اس سے کوئی دوسرا رشتہ جوڑ کر پھر اسے اپنے خاندان کا ایک فرد بنا سکیں گے۔''

وہ مسترد کیے ہوئے بیٹے کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ ایسی چاہت کے باوجود اسے اور نازیہ کو شادی کرنے کی تو کیا محبت کرنے کی بھی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے دور رکھا جائے۔

نازیہ نے فون پر حماد سے کہا۔ ''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا تم بھائی سے کچھ کہنے کی اجازت حاصل کر رہی ہو؟''

''آپ مجھے اپنی بہن سمجھتے ہیں نا؟''

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ بہن کو بہن نہیں سمجھوں گا تو اور کیا سمجھوں گا؟''

''وہ۔ بات یہ ہے کہ بڑے ابو ہمارا رشتہ بدل رہے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے؟''

''بخدا نہیں جانتا۔ ابھی تم سے سن رہا ہوں۔''

''بھائی! میں جواد کو چاہتی ہوں۔''

''وہ بہت اچھا ہے، میں بھی اسے پسند کرتا ہوں۔ تمہاری پسند بہت اچھی ہے۔ میں ابو سے تمہاری وکالت کروں گا۔''

''حماد بھائی! آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ نے میرے دل سے ایک بوجھ اتار دیا ہے۔''

حماد نے باپ کے پاس آکر پوچھا۔ ''کیا آپ نازیہ کو بہو بنانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں۔ ہم نے کل ہی فیصلہ کیا ہے۔ عنقریب نازیہ کی سالگرہ پر اس رشتے کا اعلان کریں گے۔''

''ابو! نازیہ میری بہن ہے۔ بہن ہی رہے گی۔ آپ یہ رشتہ نہ کریں۔ پھر یہ کہ مجھے شادی، ازدواجی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں اپنے طور پر تنہا اور آزاد رہنا چاہتا ہوں۔''

باپ نے اسے گھور کر دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا ساری عمر تنہا رہو گے؟ کبھی تو شادی کرو گے؟''

وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''نہیں کروں گا۔ مجھے عورتیں صرف ماں اور بہن کے روپ میں اچھی لگتی ہیں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ عورت بیوی اور محبوبہ کے روپ میں سب سے زیادہ پُرکشش ہوتی ہے۔''

''ہوتی ہوگی۔ یہ شعر و شاعری، یہ عشق و محبت، شادی اور بیوی بچے کیا ہوتے ہیں؟ مسائل کا گڑھ ہوتے ہیں۔ انسان جان بوجھ کر مسائل کے گڑھے میں گرتا ہے۔''

طالش نے حیرانی سے بیٹے کو دیکھا پھر کہا۔ ''جوان ہو کر بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ سب تمہاری طرح سوچیں گے تو نہ شادی ہوگی، نہ اولادیں پیدا ہوں گی اور نہ آبادی قائم رہے گی۔ یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔''

''میں دنیا کی نہیں صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔ میں شادی نہیں کروں گا۔''

''ارے کبھی تو کرو گے۔ ابھی بتاؤ، کب کرو گے؟''

''کبھی نہیں...'' وہ مختصر سا جواب دے کر فوراً ہی پلٹ کر چلا گیا۔ طالش نے حیرانی اور پریشانی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اسے رُکنے کا حکم دے سکتا تھا لیکن شدید حیرت سے سوچتا ہی رہ گیا۔

بیٹے کا نیا روپ سامنے آیا تھا۔ وہ شادی کرنے اور ازدواجی زندگی گزارنے سے انکار کر رہا تھا۔

کیوں انکار کر رہا تھا؟

باپ یاد کرنے لگا۔ بیٹا جب سے جوان ہوا تھا۔ تب سے اب تک اس نے کسی لڑکی سے دوستی نہیں کی تھی۔ نہ کسی کے ساتھ اس کا کوئی اسکینڈل سنا گیا تھا۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں، عید برات میں وہ لڑکیوں سے دور رہتا تھا۔

باپ کے دماغ میں یہ سوال گونجنے لگا۔ ''کیوں لڑکیوں سے کتراتا ہے؟

مرد اور عورتیں قدرتی طور پر ایک دوسرے کی طرف کھنچے جاتے ہیں۔ پھر وہ کسی صنفِ نازک میں کشش کیوں نہیں محسوس کرتا ہے؟

وہ بیٹے کے بارے میں سوچ کر اُلجھ رہا تھا۔ اس نے بیٹے کو فون کیا۔ ''حماد! منہ پھیر کر کیوں چلے گئے؟ ہمارے اندر بہت سے سوالات چیخ رہے ہیں۔ اگر رُوبرو بول نہیں سکتے تو فون پر بتا دو۔''

''کیا کہوں...؟''

باپ نے ذرا سوچ کر پوچھا۔ ''کیا تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے؟''

''نہیں ہے۔''

''تمہاری عمر میں ہماری درجنوں گرل فرینڈز تھیں۔ ہمارے چاروں طرف حسینوں کا مینا بازار لگا رہتا تھا۔''

''عورت بازار لگانے کے لیے نہیں، شرم و حیا کی ایک دنیا آباد کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔''

''پھر ہم دنیا آباد کرنے کے لیے اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے بہو لائیں گے۔''

وہ چپ رہا۔ باپ نے پوچھا۔ ''چپ کیوں ہو؟''

''آپ بہو لانے کی بات نہ کریں۔ مجھے ازدواجی زندگی گزارنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''تمہاری دلچسپی گئی جہنم میں۔ ہم کل ہی نازیہ سے تمہارا نکاح پڑھائیں گے۔''

''میں نکاح قبول نہیں کروں گا۔''

وہ غصے سے بولا۔ ”تمہارا باپ بھی قبول کرے گا۔ تمہاری اتنی جرأت کہ ہمارے حکم سے انکار کرو...“

”میں آپ ہی کا بیٹا ہوں۔ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں مانوں گا۔“

وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر غصے سے تنتناتا ہوا حویلی کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا اس کے دروازے پر آیا پھر ایک زوردار جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

وہ بیڈ پر ماں کے زانو پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ فون کان سے لگا ہوا تھا۔ اچانک دروازہ کھلتے ہی فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ باپ نے گرجتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بکواس کررہے تھے؟ ہم تمہارا نکاح پڑھوائیں گے اور تم قبول نہیں کروگے؟“

حماد فون کو بستر پر پھینک کر کھڑا ہوگیا اور عاجزی سے بولا۔ ”آپ میرے والد ہیں، بزرگ، سرپرست اور ان داتا ہیں۔ آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر... مگر شادی نہیں کروں گا۔“

باپ نے تڑاخ سے ایک تھپڑ رسید کیا۔ پھر دوسرا، تیسرا ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”ہم سرکشی کرنے والے وفاداروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ہم بیٹا سمجھ کر تمہیں معاف نہیں کریں گے۔ جان سے بھی نہیں ماریں گے۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر اپاہج بنا کر رکھیں گے۔ جب شادی نہیں کروگے۔ ہماری نسل آگے نہیں بڑھاؤ گے تو ہاتھ پاؤں سے معذور ہوکر حویلی کے دروازے پر بیٹھے رہوگے۔“

بیٹا چپ چاپ مار کھا رہا تھا۔ ماں سے برداشت نہ ہوسکا۔ وہ اسے بچانے کے لیے سامنے آکر ڈھال بن گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”خدا کے لیے جوان بیٹے پر ہاتھ نہ اُٹھائیں۔ یہ آپ کے خاندان کا ایک ہی چشم و چراغ ہے۔“

طالش نے ایک اُلٹا ہاتھ عارفہ کو رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گری۔ اس نے دوسرا ہاتھ مارنا چاہا تو ہاتھ شکنجے میں آگیا۔ اس نے چونک کر سر گھما کر بیٹے کو دیکھا۔ بوڑھی کلائی جوان بیٹے کی گرفت میں تھی۔

وہ غصے سے کھول گیا اور چیخ کر بولا۔ ”تم ہمارا ہاتھ روک رہے ہو؟ یہ جرأت تمہیں مہنگی پڑے گی۔ چھوڑو ہمارا ہاتھ...“

اس نے ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کی۔ حماد نے کہا۔ ”میں ساری عمر آپ سے مار کھاتا رہوں گا لیکن امی کی توہین برداشت نہیں کروں گا۔“

”کیا ہے تیری ماں کی اوقات؟ یہ تو ہمارے..... رحم و کرم پر رہتی آئی ہے۔ ہم کہتے ہیں، ہاتھ چھوڑ دے ہمارا...“

”چھوڑ دوں گا۔ آپ کو آپ کی ماں کی قسم ہے، میری ماں کی عزت کریں۔“

وہ اسے دوسرے ہاتھ سے مارنا چاہتا تھا۔ حماد نے اس ہاتھ کو بھی پکڑ لیا۔ وہ غصے سے تلملا گیا۔ پورے جسم کی قوت سے جھٹکے دے کر خود کو چھڑانے کی بھرپور کوششیں کرنے لگا۔ دونوں ہاتھ جکڑے ہوئے تھے۔ وہ لاتیں مارنے لگا۔ بیٹے کی جوانی سمجھا رہی تھی۔ ”بس کرو بڑے میاں! تمہاری جوانی اور توانائی کا دور گزر چکا ہے...“

عارفہ نے بیٹے کے ایک بازو کو پکڑ کر جھنجوڑ کر کہا۔ ”کیا کررہے ہو؟ چھوڑو اپنے ابو کو۔ یہ گستاخی ہے۔ بدتمیزی ہے۔“

وہ بولا۔ ”امی! آپ یہاں سے جائیں۔ ہم باپ بیٹے ہیں۔ دشمن نہیں ہیں۔ ابھی سب ٹھیک ہوجائے گا۔ پلیز یہاں سے جائیں۔“

وہ پریشانی سے باپ بیٹے کو دیکھتے ہوئے پیچھے کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی حماد نے اس کے ہاتھوں کو چھوڑ دیا۔ وہ آزاد ہوتے ہی پھر اس کی پٹائی کرنے لگا۔ وہ مار کھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ مجھے جان سے مار ڈالیں۔ میں ہاتھ پکڑوں گا نہ رحم کی بھیک مانگوں گا۔ ہاں مگر فیصلہ اٹل ہے۔ شادی نہیں کروں گا۔“

وہ ہاتھ چلاتے چلاتے تھک گیا۔ ہانپتے ہوئے پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”ارے کتے یہ تو بتا شادی کیوں نہیں کرے گا؟“

”تعجب ہے، اب تک آپ کی سمجھ میں نہیں آیا...“

وہ شکست خوردہ سے لہجے میں بولا۔ ”میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔“

طالش کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ بے یقینی اور حیرت سے منہ کھل گیا۔ حماد نے کہا۔ ”میں بیشک مرد ہوں۔ صرف ازدواجی معاملات میں فطری خواہشات سے محروم ہوں۔“

یہ بات طالش کو ایسے لگی جیسے منہ پر جوتا پڑا ہو۔ وہ دھپ سے گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹے کو یوں دیکھنے لگا جیسے اس میں اپنی عیاشی اور مردانگی ڈھونڈ رہا ہو۔

حماد نے کہا۔ ”میں ڈاکٹر فاروق کو رازدار بنا کر مہینوں اس سے علاج کراتا رہا۔ لیکن کسی دوا نے اثر نہیں کیا۔ نفسیاتی طریقۂ علاج سے بھی بات نہیں بنی...“

وہ سر جھکا کر بولا۔ ”آخری میڈیکل رپورٹ یہی ہے کہ میں قدرتی بے حسی کے باعث کبھی کسی سے ازدواجی رشتہ

قائم نہیں کرسکوں گا۔“

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ طالش شرم اور ذلت کے احساس سے ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ وہ عورتوں کو بکاؤ مال کہتا رہا۔ ان کی آبرو کی دھجیاں اُڑاتا رہا۔ اب بیٹا یہ شیطانی عمل جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ ان لمحات میں اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا کی تمام عورتیں باپ بیٹے کا منہ چڑا رہی ہیں۔ ان پر ہنس رہی ہیں۔ انہیں چیلنج کررہی ہیں کہ آؤ۔ بیٹے سے بولو، ہمارا کچھ بگاڑے...

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ”تم نے ڈاکٹر فاروق کو رازدار کیوں بنایا؟ پتا نہیں وہ تمہاری اس کمزوری کو کہاں کہاں اُچھال رہا ہوگا۔“

”میں نے رازداری کی قیمت ادا کی ہے۔ وہ کبھی کسی کے سامنے منہ نہیں کھولے گا۔“

وہ بیٹے کو گھور کر دیکھنے لگا۔ ان لمحات میں یہ خیال پکنے لگا کہ وہ غیر ضروری ہوگیا ہے۔ جو نسل آگے نہ چلائے، وہ بیٹا کیا؟

وہ زندہ رہے گا۔ شادی نہیں کرے گا تو دنیا ہنسے گی۔ باپ کا سر جھکا رہے گا۔

پھر اس نے دوسرے پہلو سے سوچا۔ یہ بیٹا نہ رہا تو اس کے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ پہلے ہی ایک بیٹے کو ہارنے کی غلطی کرچکا ہے۔ لاولد کہلانے سے بہتر ہے کہ حماد شو پیس کے طور پر رہے۔ شاید اس کا علاج ہوجائے۔

بہرحال اس وقت غصہ میں یہی جی کررہا تھا کہ اس نامراد کو زندہ زمین میں گاڑ دے۔ اس کے منہ پر تھوک دے۔

اس نے اٹھ کر ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ ”لعنت ہے تم پر۔ میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ آئندہ اجازت کے بغیر میرے سامنے نہ آنا۔“

وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ حویلی کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے بیٹے کی میت دیکھ کر آرہا ہو۔ اولاد کے سلسلے میں جو خسارہ ہورہا تھا، وہ برداشت نہیں ہورہا تھا۔ جی چاہتا تھا جو سامنے آئے اسے گولی مار دے۔

اور جواد سامنے آگیا۔ وہ دوسرے بیٹے کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ بیٹا ایک باڈی گارڈ کی حیثیت سے فرائض انجام دینے آیا تھا۔ اس نے طالش کو دیکھتے ہی فوجی انداز میں سیلوٹ کیا۔ اسے دیکھ کر اور چرکا لگا۔ اور کیوں نہ لگتا؟ وہ شادی کرنے، ازدواجی زندگی گزارنے اور اولادیں پیدا کرنے والا بیٹا تھا۔

دل سے ایک آہ نکلی۔ آج یہ اپنا ہوتا تو ابھی اس کی شادی... دھوم دھام سے ہوتی۔ پوتی پوتے گود میں کھیلتے۔ شجرہ پھلتا پھولتا سایہ دار ہوتا چلا جاتا... اور ایسا کچھ نہیں ہونے والا تھا۔

اس نے سوچا تھا، جب جواد آئے گا تو اسے غصہ دکھائے گا اور حکم دے گا کہ نازیہ سے شادی کا خیال دل سے نکال دے۔ اونچی پرواز کرے گا تو ایک ہی گولی اسے آسمان سے گرا کر مٹی میں ملا دے گی۔

اب وہ بڑا بول نہیں بول سکتا تھا۔ حماد اس کا غرور خاک میں ملا رہا تھا۔ جواد نے پوچھا۔ ”بابا جانی! کوئی حکم...؟“

اس نے بیٹے کو دیکھا، سوچا پھر کہا۔ ”نہیں، جاؤ۔ آرام کرو۔“

وہ پلٹ کر جانے لگا پھر بولا۔ ”بابا جانی! آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔“

”آں...؟ نہیں تو... کیا تم قیافہ شناس ہو؟“

”قیافہ شناس تو نہیں ہوں۔ وہ میں نے بازیاں ہارنے والوں کے چہرے دیکھے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر... کچھ ایسا لگا...“

طالش نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”کیا میں ہارا ہوا بازی گر دکھائی دے رہا ہوں؟“

وہ سخت لہجہ اختیار کرکے اپنی ہار کو چھپا رہا تھا۔ جواد نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں بابا جانی! آپ بھلا کب کسی سے ہارتے ہیں؟ آپ انسانوں کو تو کیا تقدیر کو بھی مات دے دیتے ہیں۔“

بیٹے کے اس تعریفی فقرے نے دل خوش کردیا۔ وہ ابھی ایک بیٹے سے زخم کھا کر آیا تھا۔ دوسرے کے تعریفی فقرے نے اک ذرا زخم پر مرہم رکھ دیا تھا۔

اسی وقت دانش نظر آیا۔ وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا حویلی کے احاطے میں آیا... پھر اس نے قریب آکر کار سے اترتے ہوئے باپ بیٹے کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ”جواد! جب تک تم ڈیوٹی پر رہو گے، تب تک صرف ایک باڈی گارڈ رہو گے... کیوں بھائی جان! یہ ڈیوٹی کے دوران آپ کو بابا جانی کہہ سکتا ہے؟“

طالش نے کہا۔ ”اصولی باتیں رہنے دو۔ یہ جو چاہے کہہ سکتا ہے۔ اندر چلو۔ تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

جواد باہر رہ گیا۔ وہ دانش کے ساتھ ڈرائنگ روم

میں آتے ہوئے بولا۔ ”دانش! ہم بہت خسارے میں ہیں۔ ایک ایسی بد نصیبی سے دو چار ہیں، جو کبھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔“

وہ بولا۔ ”آپ مایوس نہ ہوں۔ زندگی میں آنے والی بڑی بڑی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔“

”یہ نہیں ٹلے گی۔“

وہ دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ طالش بالکل قریب ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ اسے بڑی ندامت سے حماد کے متعلق بتانے لگا۔ دانش دیدے پھاڑ کر حیرانی سے سن رہا تھا۔ وہ جس کی کبھی توقع نہیں کر سکتے تھے، وہ بد نصیبی مسلط ہو گئی تھی۔

دانش نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”یہ کیا ہو گیا بھائی جان؟“

طالش نے کہا۔ ”اتنا بڑا خسارہ کسی نے اُٹھایا نہیں ہوگا۔ ہماری تو نسل مر گئی۔“

”ہاں۔ حماد سے اولاد نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ آپ کی نسل یہیں رُک گئی ہے۔ یہ کسی طرح آگے نہیں بڑھے گی۔“

دانش نے دروازے کی طرف یوں دیکھا جیسے باہر جواد کو دیکھ رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔ ”جواد آپ کا اپنا لہو، اپنا بیٹا ہے۔ اس سے اولادیں ہوں گی...“

طالش نے کہا۔ ”لیکن ہم اس کی اولاد کو اپنا نام نہیں دے سکیں گے۔“

وہ تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں کیا معلوم تھا کہ نجیب الطرفین حماد کو پا کر جواد کو طوائف زادہ کہہ کر ٹھکرائیں گے تو آج ہمیں ایسی ٹھوکر لگے گی۔“

”بھائی جان! کچھ تو کرنا ہوگا۔“

”یہ قدرتی معاملات ہیں، ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

”آپ فوراً شادی کریں۔ تین شادیاں کر سکتے ہیں۔ تین کریں۔ کسی سے تو اولادِ نرینہ ہوگی۔“

”ان تینوں سے اولادیں تو ہوں گی لیکن ان کے جوان ہونے تک ہم اس دنیا سے اُٹھ جائیں گے۔ اپنی نسل کو آگے بڑھتے، پھلتے پھولتے نہیں دیکھ سکیں گے۔“

”خدا آپ کو لمبی عمر عطا کرے۔ آپ کی موجودگی یا عدم موجودگی میں نسل تو آگے بڑھ جائے گی۔“

وہ قائل ہو کر سر ہلا کر بولا۔ ”ہم شادی کریں گے۔ اس کے علاوہ ایک تدبیر اور سوجھ رہی ہے۔ اگر ایسا ہو کہ اِدھر حماد کی اور اُدھر جواد کی شادی ہو۔ حماد سے تو کچھ نہ ہوگا۔ جواد کا بیٹا ہو تو اسے حماد سے منسوب کر دیا جائے۔“

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”بڑی رازداری سے ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ جواد سے ہونے والا بھی آپ ہی کا سگا پوتا ہوگا۔ فراڈ کے باوجود آپ ہی کی نسل آگے بڑھے گی۔“

وہ دونوں اس تدبیر کے ہر پہلو کا تجزیہ کرنے لگے۔ اس پر عمل کرنے کے لیے لازمی تھا کہ پہلے جواد اور حماد کو راضی کر کے انہیں اپنا راز دار بنایا جائے۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

دانش نے کہا۔ ”یہ بات دور تک پھیلے گی۔ جواد اور حماد کی بیویوں اور ہماری بیگمات کو بھی راز دار بنانا ہوگا۔ یہ سراسر عورتوں کے معاملات ہیں۔ ہماری بیٹیوں سے بھی یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔“

طالش نے کہا۔ ”پھر تو یہ راز نہیں رہے گا۔ عورتوں کے پیٹ میں بات نہیں رہتی۔ ہمیں گھر کی عورتوں کو راز دار بنانے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔“

وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”ہم کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ حماد کی کوئی کمزوری جواد کو معلوم ہو۔ اس طرح جواد کو ہماری یہ کمزوری معلوم ہوگی کہ ہم ایک ادھورے بیٹے کے باپ ہیں اور اسے مکمل کرنے کے لیے جواد سے اولاد لے رہے ہیں۔ نہیں دانش! ہم نے جس بیٹے کو مسترد کیا ہے، اس بیٹے کے ہاتھ میں اپنی کوئی کمزوری نہیں دیں گے۔“

دانش نے کہا۔ ”پھر بھائی جان! آپ ایک شادی کر لیں۔ آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا اور ہونا کیا ہے؟ ایک بیٹا تو ضرور آئے گا۔“

”ہاں، ہمیں شادی کرنی ہی ہوگی۔“

”بھائی جان! ایک گزارش ہے۔ اب تو آپ نازیہ کو بہو نہیں بنائیں گے۔ کیا اسے جواد سے منسوب کرنے کی اجازت دیں گے؟“

”ہرگز نہیں۔ ہم جواد کو بہت چاہتے ہیں لیکن اسے ایک لے پالک کی اوقات تک ہی رہنے دو۔ لے پالک کی کوئی خاندانی ہسٹری نہیں ہوتی۔ جواد کا بھی کوئی خاندانی پس منظر نہیں ہے۔ اسے داماد بنانے کی بات نہ کرو۔“

تب ہی سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ طالش نے ریسیور اُٹھایا اور کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں بولو...؟“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”حضور! میں آپ کا خادم امداد لنگڑا بول رہا ہوں۔ ہم نے پیرو دادا کو ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ قاسم بستی کے ایک مکان میں چھپا ہوا ہے۔ ہم ابھی اسے پکڑ

سکتے ہیں۔“

وہ حقارت سے بولا۔ ”اس کتے کو پکڑ کر لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہیں گولی مار دو۔ ہمارے آدمی ابھی آ رہے ہیں۔ انتظار کرو۔“

وہ فون بند کر کے دانش کے ساتھ باہر آیا۔ اس نے جواد اور چار وفاداروں کو بلا کر کہا۔ ”پیرو دادا قاسم بستی میں چھپا ہوا ہے۔ فوراً جاؤ۔ اسے بل سے نکالو اور وہیں گولی مار دو۔ ہم اس حرام خور کی موت کی خبر سننا چاہتے ہیں۔“

پھر وہ جواد کو دیکھ کر بولا۔ ”اسے راستے میں بتاؤ کہ پیرو دادا کون ہے؟ یہ پہلی بار ہمارے کام سے جا رہا ہے۔ اسے آگے رکھو۔ ہم اس کے ہاتھوں پیرو کی موت چاہتے ہیں۔“

جواد نے کہا۔ ”بابا جانی! آپ جو چاہتے ہیں وہی ہوگا۔ وہ میرے ہاتھوں ہی مارا جائے گا۔“

وہ مسلح افراد کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس نے راستے میں پوچھا۔ ”یہ پیرو دادا کون ہے؟“

ایک نے جواب دیا۔ ”بہت ہی سفاک قاتل ہے۔ پہلے ہمارے ساتھ کام کرتا تھا۔ آپ کے بابا جانی اس کی جواں مردی کی تعریفیں کرتے تھے۔ اس پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ پھر وہ اچانک ہی ہمارا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا۔“

جواد نے کہا۔ ”جب وہ بابا جانی کا وفادار تھا تو غدار کیوں بن گیا؟ کوئی تو وجہ ہوگی؟“

وفاداروں نے فوراً ہی جواب نہیں دیا، وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ جواد نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

ایک نے کہا۔ ”وہ۔ وہ کوئی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی بندے کا مغز پھر جاتا ہے۔ بس وہ بھی اچانک بغاوت پر اُتر آیا تھا۔“

”کوئی خوامخواہ بغاوت نہیں کرتا۔ کسی بڑی تبدیلی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ تم لوگ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟“

ایک نے کہا۔ ”نہیں جی۔ وہ بات یہ ہے کہ آپ ہم سے نہ پوچھیں۔“

جواد نے سختی سے کہا۔ ”تو پھر گاڑی روکو۔ میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ ابھی تنہا پیرو دادا سے نمٹنے جاؤں گا۔ مجھے کچھ ہو گیا تو بابا جانی تم لوگوں کو اُلٹا لٹکا دیں گے۔“

ایک نے کہا۔ ”آپ غصہ نہ کریں۔ ہم بتا رہے ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ آپ کے بابا (دانش)...“

وہ ذرا چپ ہوا پھر جھجکتے ہوئے بولا۔ ”ان کا دل پیرو دادا کی بیٹی پر آ گیا تھا۔ ہم کیا بولیں۔ آگے آپ سمجھ سکتے ہیں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”پیرو دادا کو معلوم ہوا تو اس نے آپ کے بابا جانی سے شکایت کی۔ بابا جانی نے چاہا کہ وہ بیس پچیس ہزار لے کر صبر کر لے لیکن اس نے کہا کہ اس کی بیٹی کوئی بازاری نہیں ہے کہ قیمت ادا کی جائے۔ آپ کے بابا کو اس سے شادی کرنی ہوگی۔ اسے عزت دینی ہوگی۔“

تیسرے نے کہا۔ ”ہم واردات کرنے والوں کی عزت ہی کیا ہوتی ہے کہ بڑے گھرانے والے اس کی بیٹی کو بہو بنا کر عزت دیتے۔ تمہارے بابا جانی نے اسے دھتکار دیا۔“

”بس اسی دن سے پیرو دادا کا مغز پھر گیا ہے۔“

جواد سر جھکا کر سوچنے لگا۔ ”پیرو دادا کی بغاوت اس پہلو سے درست ہے کہ اس کی بیٹی کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ دوسرے پہلو سے درست نہیں ہے۔ کیونکہ جیسے کو تیسا، وہ کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ قتل اور ڈکیتی کے علاوہ شریف گھرانے کی لڑکیوں کو اغوا کیا کرتا تھا۔ اس کی بیٹی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔“

وہ قاسم بستی پہنچ چکے تھے۔ وہاں طالش کا ایک کارندہ امداد لنگڑا ان کا منتظر تھا۔ اس نے ایک دو منزلہ مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس مکان میں ہے۔ اس کے ساتھ ایک عورت اور دس بارہ برس کا ایک لڑکا ہے۔“

اسی وقت ایک لڑکا اس مکان سے نکل کر سامنے پرچون کی دکان کی طرف جانے لگا۔ امداد لنگڑے نے کہا۔ ”یہی وہ لڑکا ہے۔ عورت کبھی کبھی باہر آتی ہے۔ ورنہ پیرو کے ساتھ اندر ہی رہتی ہے۔ کبھی کبھی کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی ہے۔ وہ دیکھیں، وہ اوپر بالکونی میں کھڑی دور کا جائزہ لے رہی ہے۔“

جواد نے کہا۔ ”بچے کے پاس جاؤ۔ اسے اپنے کنٹرول میں کرو اور دکان دار کو بھی گولی مارنے کی دھمکی دو۔“

بچہ دکان سے کچھ خرید رہا تھا۔ آس پاس سناٹا تھا۔ ویرانی تھی۔ جواد کا ایک ماتحت بچے کو اُٹھا کر دکان کے اندر لے گیا اور دکان دار کو ریوالور دکھا کر بولا۔ ”سلامتی چاہتے ہو تو جو کہا جائے وہ کرو۔ ورنہ بچے کے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔“

دکان دار نے اپنی سلامتی کے لیے اس کے احکامات کی تعمیل کی۔ مطلوبہ گھر کے دروازے پر جاکر دستک دی تو اس عورت نے دروازہ کھول دیا۔ دکان دار نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔ ''صغرا...! ہم مصیبت میں ہیں۔ ذرا بھی شور مچائیں گے یا کسی کو مدد کے لیے بلائیں گے تو تیرے بچے کے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔''

صغرا نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''ہائے میرا بچہ...! کہاں ہے میرا عمو...؟''

اس نے دکان کی طرف دیکھا۔ وہاں بیٹا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے ایک شخص ریوالور لیے کھڑا تھا۔ دکان دار نے کہا۔ ''وہ کہتے ہیں۔ پیرو دادا کو باہر نکالو۔ وہ باہر آئے گا۔ تب ہماری جان بچے گی۔''

وہ روتی ہوئی اندر ایک کمرے میں آئی۔ وہاں پیرو دادا ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور برسوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ صغرا نے روتے ہوئے کہا۔ ''وہ آگئے ہیں انہوں نے میرے عمو کو اٹھالیا ہے۔ کہتے ہیں، تم باہر نہیں جاؤ گے تو وہ میرے بچے کو مار ڈالیں گے۔''

وہ روتے روتے فرش پر بیٹھ گئی۔ پیرو نے کہا۔ ''ایک دن یہی ہونا تھا۔ ہم دوسروں کو موت دیتے رہتے ہیں۔ وہی موت ایک دن ہماری طرف بھی آتی ہے۔ جاؤ، ان سے کہو۔ یہاں آئیں۔ مجھے گولی ماریں اور عمو کو چھوڑ دیں۔''

آخری وقت اس بے رحم سفاک قاتل کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ آنسو موت کے خوف سے نہیں آئے تھے۔ اس کی جوان بیٹی اغوا ہونے اور آبرو لٹ جانے کے باعث اپنی جان پر کھیل گئی تھی۔

بیٹی کی موت اسے رُلا رہی تھی۔ یہ آنسو بڑے ڈھیٹ ہوتے ہیں، جب تک کلیجہ نہ پھٹے، آنکھوں میں نہیں آتے۔ یہ بیٹیاں ہی ہوتی ہیں، جو قسائی باپ کو بھی رُلا دیتی ہیں۔

صغرا نے دروازے پر آکر دکان دار سے کہا۔ ''ان سے کہو، پیرو بہت بیمار ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ میرے بچے کو چھوڑ دیں اور اندر آکر پیرو سے نمٹ لیں۔''

جواد نے دروازے پر آکر کہا۔ ''ہمارا ایک آدمی اندر جائے گا۔ اگر وہ گولی چلائے گا تو ہماری ایک گولی تمہارے بچے کو لگے گی۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''نہیں، وہ گولی نہیں چلائے گا۔ وہ میرے بچے کو مرنے نہیں دے گا۔''

وہ پلٹ کر جاتے ہوئے بولی۔ ''اندر آؤ۔ وہ بیمار ہے۔ لڑنے جھگڑنے کے قابل نہیں ہے۔ خود آکر دیکھ لو۔''

جواد نے ایک کارندے سے کہا۔ ''اندر جاکر دیکھو۔ وہ ہتھیار پھینک دے تو گولی نہ مارنا۔ وہ میرے ہاتھوں مرے گا۔''

کارندہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر آکر بولا۔ ''وہ بہت بیمار ہے۔ اٹھ کر بیٹھنے کے بھی قابل نہیں ہے۔ میں اس کی گن لے آیا ہوں۔''

جواد مطمئن ہوکر اندر آیا۔ پیرو بستر پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اس نے بڑی نقاہت سے کہا۔ ''جواد بابا آپ آئے ہیں۔ میرے نصیب اچھے ہیں۔ آپ سے ایک بار ملنا چاہتا تھا۔ کیا خدا کی شان ہے۔ آپ خود ہی چل کر آگئے...''

اس نے پوچھا۔ ''تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''عمر بھر بُرا ہی بُرا کیا۔ کچھ نیکی کرکے جانا چاہتا ہوں۔ تمہیں یہ راز کی بات کوئی نہیں بتائے گا۔ میں بتا رہا ہوں کہ تم طالش تیموری کے اپنے بیٹے ہو۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''میں اور بابا جانی کا بیٹا...؟''

''ہاں۔ تمہاری ماں فاخرہ کا تعلق بازارِ حسن سے تھا۔ طالش نے اولادِ نرینہ حاصل کرنے کی خاطر فاخرہ بی بی سے نکاح پڑھوایا۔ تم گیارہ ماہ بعد پیدا ہوئے۔ ایک بیٹے کی کمی پوری ہوئی۔ لیکن دو ماہ بعد ہی بیگم عارفہ نے حماد کو جنم دیا گویا ایک شریف زادہ پیدا ہوگیا۔ تمہاری اہمیت گر گئی۔ تمہارے باپ نے تمہیں ایک طوائف زادہ کہہ کر اپنی زندگی سے اپنے خاندان سے نکال دیا۔ دانش تیموری تمہیں ایک لے پالک بیٹا بنا کر تمہاری پرورش کی ہے۔''

وہ حیرانی سے اپنے بارے میں ایسی باتیں سن رہا جن کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''میں کیسے مان لوں کہ تم سچ بول رہے ہو؟''

''میں جانتا ہوں، اب تم سکون سے نہیں رہو گے تحقیقات کرتے رہو گے تو سچ سامنے آجائے گا۔''

اس نے پوچھا۔ ''میری والدہ کا خاندان بازار میں کہاں ہے؟''

اس نے فاخرہ کی بہنوں کے نام اور پتے بتائے ، کہا۔ ''تمہاری والدہ طبعی موت نہیں مری تھیں۔ تمہارے باپ نے اسے قتل کیا تھا۔''

جواد کے ذہن کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس نے تڑپ پوچھا۔ ''کیوں قتل کیا تھا؟''

پیرو دادا، طالش کا دستِ راست تھا۔ اس کی تمام وارادات میں شریک رہتا تھا۔ جس ویرانے میں فاخرہ

ہلاک کیا گیا تھا، وہاں وہ بھی موجود تھا۔

فاخرہ کی بدنصیبی اس وقت شروع ہوئی تھی، جب وہ ایک رات مجرا کرنے مراد ملکی کی کوٹھی میں گئی تھی۔ اس کے کچھ روز بعد اسے اغوا کیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ پیرو دادا ان تمام واقعات کا چشم دید گواہ تھا۔

اس نے جواد کو پوری تفصیل سے بتایا کہ اس کی ماں کو ویرانے میں لے جا کر کس بیدردی سے لمحہ لمحہ اس پر دہشت طاری کر کے مارا گیا ہے۔

جواد مٹھیاں بھینچ کر غصہ برداشت کرنے لگا۔ دانش تیموری نے جواد کو دوسری کہانی سنائی تھی کہ اس کے ماں باپ بہت غریب تھے۔ ان کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ دانش نے ایک بیٹے کی کمی پوری کرنے کے لیے ان سے جواد کو خرید لیا تھا۔ پھر اس کے ماں باپ اپنے تمام بچوں کے ساتھ انڈیا چلے گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے رابطہ نہیں رکھا۔ اب تک لاپتا تھے۔

اس نے پیرو دادا سے کہا۔ ”تمہاری باتیں سن کر میرا دل، دماغ، میرے خیالات اور میرے ارادے بدل رہے ہیں۔ اگر یہ باتیں سچ نکلیں۔ اگر وہ مظلوم اور مقتول عورت میری ماں ثابت ہوئی تو پتا نہیں میں کیا کر گزروں گا؟“

پھر وہ ریوالور سے اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ”یہ نہ سمجھو کہ تم سے اپنی زندگی کا سچ معلوم کرنے کے بعد تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا۔“

وہ بولا۔ ”ہاں مجھے دنیا سے جانے دو۔ جب سے میری بیٹی نے خودکشی کی ہے۔ تب سے مرنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ میں حیران ہوں کہ مجھ جیسے بے غیرت مجرم کی بیٹی شرم والی تھی۔ دانش کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہی چپ چاپ جاں سے گزر گئی۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”گولی مارو۔ ہم جیسے بے حس، بے رحم اور بے غیرت زندہ رہ گئے تو.... لڑکیاں اغوا ہوتی رہیں گی۔“

جواد اسے گولی مار کر چلا آیا۔ پیرو دادا نے اس کے اندر ہلچل پیدا کر دی تھی۔ وہ اپنی صحیح ولدیت اور اپنی زندگی کی ڈھکی چھپی باتیں معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔

وہ اسی رات بازارِ حسن کے ایک کوٹھے پہنچا۔ وہاں مجرا ہو رہا تھا۔ فاخرہ کی بہنوں کی بیٹیاں جوان ہو گئی تھیں۔ پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر اپنی ماؤں کی جگہ رقص و سرور کی محفل جما رہی تھیں۔

جواد نے ایک نائکہ سے پوچھا۔ ”یہاں ساحرہ اور فاخرہ نامی دو بہنیں رہتی تھیں کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“

نائکہ نے پوچھا۔ ”ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں فاخرہ کا بیٹا ہوں۔“

نائکہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”میں فاخرہ کی بڑی بہن ستارہ ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟ تم کہاں سے ہو؟“

”میرا نام جواد ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں، کیا طالش تیموری نے فاخرہ سے نکاح پڑھایا تھا؟ کیا آپ کی بہن فاخرہ نے مجھے پیدا کیا تھا؟ اور کیا طالش تیموری میرا باپ ہے؟“

”تمہارے تمام سوالوں کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے... ہاں۔“

”یعنی میری ماں منکوحہ تھی۔ اس نے مجھے پیدا کیا تھا اور طالش تیموری میرا باپ ہے۔“

”اگر تم وہی ہو، جسے میری بہن نے پیدا کیا تھا تو وہ ظالم مغرور جاگیردار طالش تیموری تمہارا باپ ہے۔“

جواد نے بڑے ہال کی طرف دیکھا۔ وہاں ستارہ کی بیٹی تماش بینوں کے درمیان گھنگھرو چھنکا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”آپ کے دھندے کا وقت ہے۔ میں اور زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس اتنا بتا دیں۔ کیا میری ماں کو ہلاک کیا گیا تھا؟“

اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ہاں۔ پتا نہیں کس ظالم کو میری بہن سے دشمنی تھی۔ اسے گولیاں مار کے چھلنی کر دیا گیا تھا۔“

وہ فوراً ہی جانے کے لیے اُٹھ گیا۔ ستارہ نے دروازے تک آ کر کہا۔ ”ہم نے اس کی ہلاکت پر صبر کیا تھا۔ اور کیا کر سکتے تھے؟ اگر تم قاتل کو سزا دو گے تو ہمیں یقین ہو گا کہ تم ہی فاخرہ کے بیٹے ہو۔ پھر ہم تمہاری نظر اُتاریں گی۔ تمہیں گلے لگا کر پیار کریں گی۔“

وہ سیڑھیاں اُتر کر جانے لگا۔ ستارہ کی آواز اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”باپ کی عالیشان کوٹھی کا دروازہ تمہارے لیے کھلے یا نہ کھلے۔ کوٹھے کا دروازہ کھلا رہے گا۔ جب چاہو، چلے آؤ...“

وہ باہر آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسے ڈرائیو کرتے ہوئے جانے لگا۔ پیرو دادا اور ستارہ جیسے دو اہم چشم دید گواہوں کے مطابق وہ طالش تیموری کا بیٹا ثابت ہو رہا تھا ستارہ اور دوسری بہنیں نہیں جانتی تھیں کہ فاخرہ کو کس نے ہلاک کیا تھا۔ پیرو دادا جائے واردات پر موجود تھا اور اس نے واردات کی ایک ایک تفصیل جواد کو بتائی تھی۔

اب وہ ایک بیٹے کے دل و دماغ سے اپنی ماں کو کسی ویرانے میں بے دست و پا دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں اور منہ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ نہ وہ دیکھ سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ بیٹا اس تصوراتی ماحول میں پہنچا ہوا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ بے زبان ماں اسے مدد کے لیے بلا رہی ہے۔

اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے دانت پیسے اور زیرِلب کہا۔ ”یا خدا... امیری امی کو مارنے سے پہلے کیسی اذیتیں پہنچائی گئی ہیں۔ یہ جو میرا باپ ہے، یہ کیسا جنونی پاگل ہے۔ میں کیا کروں؟ میں تو اُس بابا جانی کے جسم میں ابھی درجنوں گولیاں اُتار سکتا ہوں۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی اپنے باپ سے بہت سے قرضے وصول کرنے ہیں۔ اس کے بعد امی کے لہو کا حساب ضرور لوں گا۔“

وہ دانش کی کوٹھی میں پہنچا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ وہی اس کی رہائش گاہ تھی۔ نازیہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ انتقامی سوچ پیدا ہوئی کہ میری ماں کو بازاری کہہ کر مجھے ٹھکرایا گیا ہے۔ میں اس شریف خاندان کی لڑکی کی دھجیاں اُڑا سکتا ہوں۔

اس نے نازیہ کو پکڑ کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ حیرانی سے بولی۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم نے کہا تھا، شادی ہونے تک ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا۔“

اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ فوراً ہی عقل آ گئی کہ یہ شریف خاندان اس کا اپنا ہی ہے۔ وہ طالش تیموری کا جائز بڑا بیٹا ہے۔ اسے اپنے ہی خاندان میں توڑ پھوڑ نہیں کرنی ہے۔ بڑی حکمتِ عملی سے اپنے جائز حقوق حاصل کرنے ہیں۔

وہ فاصلہ رکھتے ہوئے بولا۔ ”سوری۔ آج میں خود کو بہت تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے بے اختیار سہارے کے لیے تمہیں تھام لیا۔“

بلقیس نے کمرے میں آ کر کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ یہ تمہارے انتظار میں بھوکی رہتی ہے پھر کیوں اتنی دیر سے آئے ہو؟ اس کے ابو کہہ رہے تھے کہ تم حویلی سے شام ہی کو چلے گئے تھے۔ بولو اتنی رات تک کہاں تھے؟“

نازیہ نے کہا۔ ”امی! یہ کچھ اُلجھے ہوئے ہیں۔ ابھی کہہ رہے تھے کہ خود کو بالکل تنہا سمجھ رہے ہیں۔“

بلقیس نے پوچھا۔ ”کیوں بیٹے! ماں باپ ہیں۔ بھائی بہنیں ہیں پھر خود کو تنہا کیوں سمجھ رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”آج شدت سے وہ ماں باپ یاد آ رہے ہیں، جنہوں نے مجھے پیدا کر کے چھوڑ دیا۔ میرا دل نہیں مانتا کہ وہ انڈیا جا کر کہیں گم ہو گئے ہیں۔ وہ یہیں ہیں اور کسی وجہ سے چھپ رہے ہیں۔ میرے سامنے آنے سے کترا رہے ہیں۔“

بلقیس کچھ پریشان ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ”یہ کیسی بے تکی باتیں سوچ رہے ہو؟“

”امی! آپ جانتی ہیں کہ میری امی ابو کون ہیں؟“

وہ ایکدم سے چونک کر بولی۔ ”یہ... یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں کچھ نہیں جانتی۔“

”آپ نے مجھے گود لیتے وقت انہیں دیکھا ہو گا۔“

”میں نے کہا نا، میں کچھ نہیں جانتی۔ نازیہ کے ابو تمہیں ان سے لے کر آئے تھے۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔ منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔“

وہ اس سے کترا کر جانا چاہتی تھیں۔ جواد نے کہا۔ ”میں نہیں کھاؤں گا۔ میں آپ سے ناراض ہوں۔“

وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ بلقیس نے پوچھا۔ ”مجھ سے کیوں ناراض ہو؟“

”آپ نے مجھے ایک ماں کا پیار دینے میں کوئی کمی نہیں کی۔ لیکن بھرپور محبت اور ممتا کے ساتھ دھوکا بھی دے رہی ہیں؟“

”یہ کیا کہہ رہے ہو، میں تمہیں اتنا چاہتی ہوں۔ اتنا چاہتی ہوں کہ بیٹا بنانے کے بعد داماد بھی بنانے والی ہوں۔“

”بیشک۔ یہ آپ کا بڑا پن ہے کہ ایک طوائف زادے کو اپنا داماد بنانا چاہتی ہیں۔“

بلقیس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ نازیہ نے چیخ کر کہا۔ ”جواد! ہوش میں تو ہو، خود کو طوائف زادہ کیوں کہہ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ ہوں۔ امی سے پوچھ لو۔“

بلقیس نے کہا۔ ”ایسا کیوں کہہ رہے ہو بیٹے؟ کیا تم نے کسی سے یہ سنا ہے؟“

”آپ سوال نہ کریں۔ صرف جواب دیں، یہ سچ ہے یا نہیں...؟“

بلقیس نے سر جھکا کر آنچل میں منہ چھپا لیا پھر وہ بولی تو اس کی آواز میں آنسو تھے۔ ”میں اپنا منہ بند نہ رکھتی تو اور کیا کرتی؟ کیا تم نہیں جانتے کہ اس خاندان کی عورتیں بے زبان ہوتی ہیں۔ اپنے شوہروں کے حکم سے بولتی ہیں۔ ورنہ چپ کا زہر پیتی رہتی ہیں۔“

ایک بھید کھل رہا تھا۔ نازیہ حیرانی سے ماں کا منہ تک

رہی تھی۔ جواد نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں اور مانتا ہوں۔ آپ مجبور ہوکر مجھ سے حقیقت چھپاتی رہی ہیں۔ پلیز آپ نازیہ کو میرے والد محترم کا نام بتادیں۔''

وہ بیٹی سے بولی۔ ''یہ تمہارے بڑے ابو کے بیٹے ہیں۔''

نازیہ نے شدید حیرانی سے ماں۔اور جواد کو دیکھا۔ پھر ایکدم سے خوش ہوکر پوچھا۔ ''سچ...؟ امی...! آپ سچ کہہ رہی ہیں...؟''

ماں نے کہا۔ ''یہاں تنہائی ہے۔ کوئی اور سننے والا نہیں ہے۔ اس لیے سچ کہہ رہی ہوں۔ تمہارے ابو اور بڑے ابو کو معلوم ہوگا کہ میں نے بھید کھولا ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

نازیہ نے پوچھا۔ ''ایسی کیا بات ہے کہ سچ کو چھپایا جارہا ہے؟ جواد کو کیوں لے پالک بنایا گیا ہے؟''

اس نے جواد کی پیدائش سے اب تک کی تمام باتیں اسے بتائیں۔ وہ بولا۔ ''میں باباجانی کے دستِ راست اور اپنے ننھیال سے تمام حقائق معلوم کرچکا ہوں۔ صرف آپ کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔''

وہ پریشان ہوکر بولی۔ ''بیٹے! مجھے اور میری تین بیٹیوں کو یہ راز معلوم تھا۔ نازیہ تمہاری طرح انجان تھی۔ کل یہ بات کھلے گی تو ہم ماں بیٹیوں کی شامت آجائے گی۔''

''آپ پریشان نہ ہوں، یہ بیٹا آپ پر آنچ نہیں آنے دے گا۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ میری امی کو کس نے ہلاک کیا تھا؟''

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی۔ جب ہلاکت کی خبر سنی تو تم چھوٹے سے تھے۔ تمہیں کلیجے سے لگائے روتی رہی اور کیا کرسکتی تھی؟''

وہ جواد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''آج تمہیں معلوم ہوا ہے کہ تم ذرہ نہیں آفتاب ہو۔ تمہارے اندر جو ہلچل مچی ہوگی، اس کا اندازہ مجھے ہے۔ مجھے بتاؤ، اب کیا کروگے؟''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''مجھے خاندان سے باہر پھینکنے کا مطلب یہی ہے کہ میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ پہلے تو مجھے اپنی اہمیت منوانی ہوگی۔ ایک ظالم کو ظلم کا احساس دلانا ہوگا۔ اگر احساس مردہ رہے تو پھر زندگی اور موت کا کھیل کھیلنا ہی ہوگا۔''

نازیہ نے کہا۔ ''موت کی نہیں، صرف زندگی کی باتیں کرو۔''

''جو بھی کروں گا، اس کے نتیجے میں تم لوگوں پر آنچ نہیں آئے گی۔''

بلقیس نے کہا۔ ''وعدہ کرو، تم پر بھی آنچ نہیں آئے گی۔''

اس نے سنجیدگی سے مسکرا کر ماں، بیٹی کو دیکھا پھر ایک ہاتھ ماں کے ہاتھ پر اور دوسرا ہاتھ محبوبہ کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ ''شر کے خلاف کبھی نرمی سے اور کبھی گرمی سے جنگ جاری رکھی جاتی ہے۔ حالات جو تقاضا کریں گے، اسی کے مطابق عمل کروں گا۔ چلیں، اُٹھیں بھوک لگ رہی ہے۔''

وہ تینوں اُٹھ کر ڈائننگ روم کی طرف جانے لگے۔

☆☆☆

طالش کھانے کی میز پر بیگم عارفہ اور حماد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم بہت فکرمند ہیں۔'' وہ حماد کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کچھ احساس ہے؟ ہم کیا کریں...؟ بولو، ایک پوتا کہاں سے لائیں؟''

وہ بولا۔ ''میں شرمندہ ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ علاج کے لیے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاؤں گا۔ تب بھی تقدیر کا فیصلہ نہیں بدلے گا۔''

عارفہ نے کہا۔ ''آپ کہہ رہے تھے، شادی کریں گے تو پھر بیٹا ہوسکتا ہے۔ اس بیٹے سے نسل آگے بڑھے گی۔''

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولا۔ ''یہی ایک راستہ ہے لیکن ابھی جو بیٹا ہوگا، اسے جوان ہونے میں برسوں لگیں گے۔ تب تک ہم دنیا سے اُٹھ جائیں گے۔''

وہ بولی۔ ''اللہ نے چاہا تو آپ پوتوں کے پوتے ہونے تک جئیں گے۔''

''اور اللہ نے نہ چاہا تو ابھی بیٹھے بیٹھے سانس رُک جائے گی۔ ہم خود کو تسلیاں دے کر نہیں بہلائیں گے۔ ٹھوس منصوبوں پر عمل کریں گے۔''

حماد نے کہا۔ ''میری نااہلی ایسی ہے کہ سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔''

وہ فضا میں مکا لہراتے ہوئے بولا۔ ''ہم بارہا تقدیر کو تدبیر سے بدل چکے ہیں۔ اگر تم باپ کا ساتھ دوگے، ہماری ہدایات پر عمل کروگے تو جلد ہی ہمارے شجرے میں ایک پوتے کا نام درج ہوجائے گا۔''

ماں بیٹے نے تعجب اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا پھر حماد نے کہا۔ ''پوتا کہاں سے آئے گا جبکہ میں شادی کے اہل نہیں ہوں؟''

اس نے لقمہ چبانے کے بعد ایک گھونٹ پانی پیا پھر کہا۔ ''تمہاری کمزوری کو میں جانتا ہوں، تمہاری ماں جانتی ہے اور ایک دانش جانتا ہے۔ ہم تینوں سے کوئی یہ راز کوئی معلوم نہیں کرسکے گا۔''

وہ کھانا کھاتے ہوئے بولا۔ ''ہم ایک عورت کو... جو یہاں دلہن بن کر آئے گی، اسے رازدار بنائیں گے۔ صرف اس وقت تک، جب تک کہ وہ بیٹا نہ پیدا کرے۔ ہم اسے اپنے شکنجے میں رکھیں گے۔ بیٹا ہونے کے بعد اس رازدار بننے والی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کردیں گے۔''

حماد نے کہا۔ ''آپ تو یہی کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے لیکن اس عورت سے میری اولاد کیسے ہوگی؟''

وہ بڑے حاکمانہ انداز میں بولا۔ ''وہ ہماری اولاد پیدا کرے گی اور نام تمہارا ہوگا۔''

''یعنی وہ میری نہیں، آپ کی منکوحہ ہوگی؟''

''نہیں، وہ تمہاری منکوحہ ہوگی تب ہی تو اس سے ہونے والا بیٹا ہمارا پوتا کہلائے گا۔''

''آپ کچھ عجیب سی باتیں کررہے ہیں۔ صاف صاف کہیں جو کہنا چاہتے ہیں۔''

''گدھے! بیٹا ہم سے ہوگا۔''

ماں اور بیٹے نے چونک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا پھر حماد نے کہا۔ ''آپ کی اولاد ہوگی تو وہ میرا بھائی ہوگا۔ بیٹا نہیں ہوگا۔''

''مگر تمہارا بیٹا کہلائے گا۔ دنیا والوں کے سامنے وہ عورت تمہاری منکوحہ ہوگی۔ اندر کی بات کسی کو معلوم نہیں ہوگی۔''

حماد اپنے سامنے سے کھانے کی پلیٹ کو ایک جھٹکے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کیسی اخلاق سے گری ہوئی بے شرمی کی باتیں کررہے ہیں؟ وہ میری منکوحہ ہوگی اور آپ کی داشتہ...؟''

''صرف دنیا کو دکھانے کے لیے وہ تمہاری نمائشی منکوحہ ہوگی۔''

''دینی قوانین نمائشی نہیں ہوتے۔ یہ قوانین ایمان، شرافت اور شرم و حیا سے زندگی گزارنے کی تاکید کرتے ہیں۔''

ماں بیٹے نے شدید حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر حماد ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہوا تو کرسی پیچھے کی طرف الٹ گئی۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''میں نمائشی نکاح نہیں پڑھاؤں گا۔ اپنے دین کو ڈراما اور کھیل تماشا بنانے نہیں دوں گا۔''

''تمہارا تو باپ بھی وہی کرے گا جو ہم کہیں گے۔ ہمارے حکم سے انکار کا مطلب ہوگا... تمہاری موت... تمہارے جیسے نمائشی مرد کے باپ بن کر ہم کیا کریں گے۔ تمہارا مرجانا ہی بہتر ہوگا۔''

پھر وہ عارفہ سے بولا۔ ''کیا آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی ہے۔ چل اُٹھ۔ جا اس نامراد کے ساتھ اور سمجھا کہ نافرمانی اور حکم عدولی کے بعد موت اس کا مقدر بن جائے گی۔''

اس نے کھانے کی پلیٹ اُٹھا کر عارفہ کو مارنے کے انداز میں پھینکی جسے حماد نے کیچ کرلیا پھر کہا۔ ''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اپنی ماں کی توہین برداشت نہیں کروں گا اور آپ کے حکم سے کوئی گناہ نہیں کروں گا۔''

وہ ماں کا بازو تھام کر وہاں سے جانے لگا۔ طالش نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ، دفع ہوجاؤ۔ بیٹے کی سلامتی چاہتی ہو تو کل صبح تک اسے میرے منصوبے کے مطابق شادی کے لیے راضی کرلو۔ ورنہ کل شام تک اس کی میت دیکھوگی۔''

عارفہ رونے لگی۔ حماد ماں کو تھپکتے ہوئے اسے وہاں سے لے گیا۔ وہ کھانے کی پلیٹوں کے سامنے تنہا بیٹھا غصے سے ہانپ رہا تھا۔ کرسی پر بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ وہ کسی کی نافرمانی برداشت کرنے کا عادی نہیں تھا۔ چونکہ وہ ایک ہی بیٹا تھا اس لیے ذرا ڈھیل دے رہا تھا۔

وہ ..... آہستہ آہستہ چلتا ہوا اور کچھ سوچتا ہوا اپنی خوابگاہ میں آگیا۔ وہ کھانا چھوڑ کر آیا تھا۔ بھوک مرگئی تھی۔ نیند بھی آنے والی نہیں تھی۔ وہ بوتل اور گلاس لے کر بیٹھ گیا۔ جب آدمی غلط ہوتا ہے تو اسی طرح غم غلط کرنے لگتا ہے۔

وہ ایک ایک گھونٹ پیتے ہوئے سوچنے لگا کہ اولاد کے حوالے سے خسارے میں کیوں رہتا ہے؟ اور اب یہ خسارہ اس طرح پورا ہوسکتا تھا بشرطیکہ حماد باپ کے احکامات کی تعمیل کرے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ موبائل فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ نشہ اس پر حاوی ہورہا تھا۔ اس نے آگے پیچھے جھومتے ہوئے فون ریسیو کیا۔ ''کو۔او۔ون ہے؟''

دوسری طرف خاموشی رہی پھر ایک سریلی سی ہائے سنائی دی۔ ''میں بول رہی ہوں...''

وہ نشے کی مستی میں بولا۔ ''بہت ہی رس بھری آواز ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

رات کی خاموشی اور سناٹے میں اس کی سرگوشی ابھری۔ ''فاخ...رہ۔''

''فاخرہ...؟'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ ''کون سی فاخرہ؟ ایک فاخرہ تو کب کی فنا ہو چکی ہے۔ اس کی ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی۔''

پھر سرگوشی ابھری۔ ''ہڈیاں سلامت ہیں۔ میں واپس آ گئی ہوں۔''

وہ ہنسنے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''میری آنکھوں اور منہ پر پٹیاں نہیں ہیں۔ اب میرے ہاتھوں میں بھی ایک ریوالور ہے اور اس میں وہ...گولیاں ہیں، جو میرے جسم میں اُتاری گئی تھیں۔''

نشے کی مستی ذرا اُتر گئی۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہو تم...؟''

وہ چبھتی ہوئی سرگوشی میں بولی۔ ''فاخ...رہ۔''

''بکواس مت کرو۔ وہ مر چکی ہے۔''

''کل میری واپسی کا ثبوت مل جائے گا۔ کل کا دن تم پر بھاری ہے۔ گھر سے باہر نکلو گے تو وہ چھ گولیاں تمہارے بدن کو واپس مل جائیں گی۔''

''آخ...و...'' اس نے بے خیالی میں یا نشے کی حالت میں اپنے فون پر تھوک دیا پھر کہا۔ ''کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربہ۔ آ...سالی! کل میرے سامنے آ...''

''سامنے آؤں گی، پر دکھائی نہیں دوں گی۔ صرف میری گولیاں دکھائی دیں گی۔''

''یہ بتا رہی ہو کہ فاخرہ کی روح ہو۔ کوئی آسیب ہو۔ کیا سمجھتی ہو، میں بچوں کی طرح ڈر جاؤں گا؟ میں معلوم کروں گا کہ یہ کال کہاں سے آئی ہے اور تم کون ہو؟''

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ پتا چلا کہ دوسری طرف سے فون بند ہو گیا ہے۔ اس نے جھنجلا کر اپنے فون کو صوفے پر پھینک دیا۔ غصے میں گالیاں دیتا ہوا گلاس بھرنے لگا۔

وہ پھر سے مدہوش ہونے کے لیے، دنیا کو بھولنے کے لیے اور اپنے بیٹے کی نامرادی پر تھوکنے کے لیے غٹا غٹ پینے لگا۔ گلاس خالی ہوا تو کھوپڑی اُلٹ گئی۔ سارے غم غلط ہو گئے۔ صرف فاخرہ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ اس کے اندر چیخ رہی تھی۔ ''میں واپس آ گئی ہوں...میں واپس آ گئی ہوں۔''

اس نے خالی گلاس کو پٹخنے کے انداز میں میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اے۔ کوت۔ تے۔ کی باچ۔ چی۔ میں آ بھی تجھے کو۔ گو۔ لی۔ مارو۔ اوں گا۔''

وہ اسے گولی مارنے کے لیے اُٹھا تو لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔ کراہتے ہوئے قالین پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''سالی! ٹانگ اَڑاتی ہے۔ دے...کھ...لوں گا۔ تو اُو جھے...''

وہ بڑبڑاتے بڑبڑاتے چپ ہو گیا۔ مدہوشی غالب آ گئی۔ شراب نے اسے گہری نیند سلا دیا۔

☆☆☆

نازیہ اور جواد جاگ رہے تھے۔ انہوں نے پلاننگ کی تھی کہ طالش کو کس طرح اُلجھانا چاہیے اور اسے ذہنی عذاب میں مبتلا کرنا چاہیے؟ پھر انہوں نے یہ طے کیا کہ نازیہ آواز اور لہجہ بدل کر فاخرہ بن کر بولے گی اور فون پر جو کہے گی، اس کے مطابق جواد دوسرے دن عمل کرے گا۔

وہ دونوں پہلی رات منصوبہ بناتے رہے۔ دوسرے دن جواد نے فون کے ذریعے واردات کرنے والے مجرموں سے معاملات طے کیے۔ ان میں سے دو چار مجرم یہ سن کر گھبرا گئے کہ انہیں طالش پر گولیاں چلانی ہوں گی۔ جواد نے انہیں سمجھایا۔ ''طالش کو نہ جان سے مارنا ہے۔ نہ اسے زخمی کرنا ہے۔ صرف گولیاں برسا کر اسے دہشت زدہ کرنا ہے۔''

بہرحال دو مجرموں سے معاملات طے ہو گئے۔ یہ پلاننگ کی گئی کہ طالش حویلی سے باہر جہاں جائے گا وہاں موقع پا کر اسے دہشت زدہ کیا جائے۔ گولیوں کو اس کے آس پاس سے گزرنا چاہیے۔

پلاننگ کے مطابق نازیہ نے دوسری رات فاخرہ بن کر طالش کو فون کیا اور یہ چیلنج کر دیا کہ دوسرا دن اس کے لیے بھاری ہے۔ وہ اپنے قاتل پر گولیاں برسانے والی ہے۔

وہ رات ابھی گزری نہیں تھی۔ بیگم عارفہ اور حماد جاگ رہے تھے۔ بیگم کے اندر شوہر کی دھمکی گونج رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ ''بیٹے کی سلامتی چاہتی ہو تو کل صبح تک میرے منصوبے کے مطابق اسے شادی کے لیے راضی کر لو۔ ورنہ کل شام تک اس کی میت دیکھو گی۔''

یہ تو ماں کا کلیجہ چھلنی کرنے والی بات تھی۔ وہ ماں کو سینے سے لگا کر تھپکتے ہوئے بولا۔ ''میں ابو کو بچپن سے ایک بے رحم قاتل کے روپ میں دیکھتا آ رہا ہوں۔ یہ بھی سنا ہے کہ میرے پیدا ہونے سے پہلے وہ آپ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اب پیدا ہونے کے بائیس برس بعد میری میت اُٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کی نظروں میں اپنے لہو کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ کل وہ مجھے بھی پانی کی طرح بہا دیں گے۔''

وہ بولی۔ ''ان کا کچھ نہیں جائے گا۔ یہ ماں تو جیتے جی

مر جائے گی۔''

''اللہ نے چاہا تو آپ لمبی عمر جئیں گی۔ میں ابو سے کہوں گا، مجھے علاج کے لیے لندن بھیج دیں۔ وہاں علاج کامیاب ہوگا تو شادی کر لوں گا۔''

''وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ ان کی جو ضرورت آج پوری ہو رہی ہے۔ اس کا انتظار کل تک نہیں کریں گے۔ یہی کہیں گے کہ پہلے شادی کرو پھر علاج کراتے رہو۔''

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ''میں اپنے باپ کے لیے غیر ضروری ہو گیا ہوں۔ وہ اتنی ہوشیاری سے مجھے ٹھکانے لگائیں گے کہ میری ہلاکت کا الزام ان پر نہیں آئے گا۔ لعنت ہے۔ اس خاندان میں جینے سے بہتر ہے مر ہی جاؤں مگر آپ کی فکر ہے۔ آپ جوان بیٹے کی ہلاکت برداشت نہیں کر سکیں گی۔''

''بیٹے! میری خاطر ان کی بات مان لو۔''

''امی! بات ماننے کا مطلب ہے، گناہ کی راہ ہموار کرنا۔ جو وہ چاہتے ہیں اسے تو سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

نام نہاد شریف خاندان والے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ان کے اکثر اعمال غریب اور نحیف ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افضل و برتر ہونے کے اصول خود ہی بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں۔ اور یہی ان کے ساتھ ہو رہا تھا۔

ماں نے خاموشی سے بیٹے کے سینے پر سر رکھ دیا۔

طالش دوسرے دن دیر تک سوتا رہا۔ شراب نے اسے غفلت کی نیند سلا دیا تھا۔ پھر کالنگ ٹون کی آواز سن کر وہ نیند میں کسمسایا۔ ابھی آنکھیں نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ لیکن کالنگ ٹون مسلسل ہتھوڑے کی طرح اس کی سماعت پر لگ رہی تھی۔

اس نے جھنجلا کر آنکھیں کھول دیں۔ فون کو کان سے لگا کر غصے سے بولا۔ ''کون ہے...؟''

وہی پچھلی رات کی سریلی سرگوشی سنائی دی۔ ''فاخ۔ رہ...''

وہ ایکدم سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ پچھلی رات کی باتیں یک لخت یاد آ گئیں۔ اُدھر وہ کہہ رہی تھی۔ ''آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔ اُٹھو۔ غسل کرو۔ نماز پڑھو۔ توبہ کرو...''

وہ چیخ چیخ کر فون پر گالیاں دینے لگا۔ اسے پھر رنگ ٹون سنائی دی۔ پتا چلا کہ پہلی کال کٹ گئی تھی۔ اس کی گالیاں ضائع ہو گئی تھیں۔ فاخرہ نے نہیں سنی تھیں۔

اس نے پھر بٹن دبایا۔ فون کان سے لگایا۔ وہ بولی ''حویلی سے باہر آؤ...دیٹس آل۔''

عورت

ایک نظر نہ آنیوالی چیز جس کا نام نغمہ ہے یا دل ہے یا خوب صورتی ہے، اس نظر آنے والی چیز سے مات کھا جاتی ہے جس کا نام روپیا ہے اور نغمہ روپے سے اس لیے کمتر ہے کیونکہ تم اسے بینک میں جمع نہیں کر سکتے اور جذبہ اس لیے کہ تم اس کے عوض بازار سے کچھ خرید نہیں سکتے اور خوب صورتی اس لیے کہ روپے کی طرح وہ کسی لکھ پتی کی مٹھی میں نہیں آ سکتی۔ حیرت ہے کہ یہ کس طرح کی دنیا ہے اور کیسی اس کی قدریں ہیں۔

عورت تو وہ آگ ہے جو دھیمے سلگنے والے فن کو شعلے کی طرح بھڑکا دیتی ہے۔

بشرطیکہ بارش

کرکٹر کی منگیتر نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ ''تم نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ پتا بھی ہے، میں اتوار کے دن اپنے رشتے داروں کے ساتھ چرچ کے گیٹ پر تمہارا انتظار کرتی رہی، دلہن کے لباس میں۔ لوگ مجھے دیکھ کر ہنس رہے تھے اور تم...تم اس وقت مزے سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ بتاؤ، تم کیوں نہیں آئے؟''

''تم کبھی غور سے کسی کی بات سنتی ہو؟'' کرکٹر نے جھلا کر کہا۔ ''میں نے واضح طور پر کہا تھا کہ میں شادی کے لیے آؤں گا، بشرطیکہ بارش ہوئی۔''

کراچی سے بلال احمد کی کرکٹ سے دلداری

اس نے فون کو دیکھا وہ پھر خاموش ہو گیا تھا۔ وہ بُری طرح جھنجلا گیا۔ فون کو بستر پر پھینکتے ہوئے سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ اس نے پچھلی رات نشے کی حالت میں اس کال کو اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ کال پھر چیلنج کر رہی تھی کہ حویلی سے باہر آؤ۔

وہ سوچ رہا تھا۔ ''کوئی دشمن میرے پیچھے پڑ گیا ہے لیکن وہ کون ہے؟ فاخرہ کے نام سے کیوں چیلنج کر رہا ہے؟ یہ کون ہو سکتا ہے؟''

وہ حویلی سے باہر آیا۔ وہاں جواد نے اسے دیکھتے ہی سیلوٹ کیا۔ بیٹے کو دیکھتے ہی پھر فاخرہ یاد آئی۔ وہ قدرے

پریشان ہوکر بولا۔ ”آج ایک نئی بات ہوئی ہے۔ ہمارا کوئی نیا دشمن پیدا ہوگیا ہے۔“

حماد نے مسکرا کر کہا۔ ”میرے باباجانی سے دشمنی کرنے والے کی شامت آگئی ہے۔“

”اس نے چیلنج کیا ہے کہ ہم حویلی سے باہر نہ نکلیں، ورنہ زندہ واپس نہیں آئیں گے۔“

”دشمن تو کچھ زیادہ ہی دلیری جتا رہا ہے۔ آپ کو اندازہ ہے کہ وہ کون ہوسکتا ہے؟“

”نہیں۔ وہ خود نہیں بول رہا تھا۔ ایک عورت کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ وہ عورت ہم سے فون پر بول رہی تھی۔“

”اس نے دشمنی کی کوئی تو وجہ بتائی ہوگی؟“

”وہ بائیس برس پہلے ہماری داشتہ تھی۔ نمک حرام تھی۔ ہم نے اسے اوپر پہنچادیا تھا۔“

جواد نے چپ چاپ مٹھیاں بھینچ لیں۔ وہ اس کی ماں کو نمک حرام کہہ رہا تھا۔ مجبوراً مصلحتاً برداشت تو کرنا ہی تھا۔

طالش کہہ رہا تھا۔ ”وہ عورت بہکانا باتیں کررہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ ہم سے انتقام لینے کے لیے اس دنیا میں واپس آئی ہے۔ یہ سراسر ڈراما کیا جارہا ہے۔“

”پھر تو اطمینان رکھیں، ڈراما کرنے والے سچ مچ گولیاں چلانا نہیں جانتے۔“

”نہیں۔ ہم اسے نظر انداز نہیں کریں گے۔ ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ بائیس برس بعد گڑے مردے کون اُکھاڑ رہا ہے؟“

”کیا آپ حویلی کے احاطے سے باہر جائیں گے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم ایسے بزدل ہیں کہ گھر میں چھپ کر بیٹھے رہیں گے؟“

”نہیں باباجانی! آپ تو دشمنوں کو للکار کر مارتے ہیں۔ شاید پہلی بار کسی دشمن نے آپ کو للکارا ہے۔“

”آج باہر جانا ضروری نہیں تھا مگر ہم جائیں گے۔ ابھی دس بجے ہیں۔ ہم بارہ بجے تک نکلیں گے۔ ہمارے آگے پیچھے مسلح گارڈز کی دو گاڑیاں ہونی چاہئیں۔“

”جی باباجانی! میں مکمل انتظامات رکھوں گا اور آپ کے ساتھ گاڑی میں رہوں گا۔ ایک بھی گولی آپ کی طرف نہیں آنے دوں گا۔“

وہ حویلی کے اندر آیا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر ڈائننگ روم میں آیا۔ بیگم عارفہ اس کے سامنے ناشتا رکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ”ہم نے کل رات حکم دیا تھا۔ اس کی تعمیل ہونی چاہیے لیکن صاحبزادے نظر نہیں آرہے ہیں؟“

”وہ شرمندہ ہے۔ آپ کے سامنے نہیں آئے گا۔“

”ہمیں اس کی شرمندگی سے کچھ نہیں لینا ہے۔ صرف ایک بات کا جواب دو۔ وہ ہماری پلاننگ کے مطابق شادی کرے گا یا نہیں؟“

”اس کی کیا مجال ہے کہ آپ کے حکم سے انکار کرے۔ آپ جو کہیں گے، وہ کرے گا۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”آخر ماں ہو۔ اس کی حرام موت برداشت نہیں کرسکتی تھیں اس لیے راضی کرہی لیا۔“

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولا۔ ”اس معاملے میں یاد رکھو، ہم تین رازدار ہیں۔ چوتھا دانش ہوگا۔ پانچواں کوئی نہ ہو۔“

وہ بولی۔ ”پانچویں وہ عورت ہوگی، جو حماد کی دلہن بن کر آئے گی۔“

”اس سے ہم نمٹ لیں گے۔ وہ مختصر سی زندگی لے کر آئے گی۔ جس طرح فاخرہ بیٹا پیدا کرنے کے بعد جان سے گئی تھی۔ اسی طرح تمہاری بہو بن کر آنے والی بھی ایک بیٹا دینے کے بعد نابود ہوجائے گی۔“

وہ نہایت خوش دلی سے اپنی حکمتِ عملی بتا رہا تھا۔ عارفہ اور حماد کی طرف سے مطمئن ہوگیا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ حویلی سے باہر آگیا۔ وہاں اس کی کار کے آگے پیچھے دو گاڑیوں میں مسلح افراد تھے۔ وہ اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ جواد ایک شاٹ گن اُٹھائے اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر آگیا پھر وہ گاڑیاں وہاں سے روانہ ہوگئیں۔

طالش کھڑکی کے پاس پیچھے کی طرف کھسک کر بیٹھا ہوا تھا۔ یوں باہر سے آنے والی گولیوں سے کسی قدر محفوظ رہ سکتا تھا۔ ڈرائیور اس کے حکم کے مطابق مختلف علاقوں سے گزر رہا تھا۔ یوں ہی پورے شہر میں گھومنے کا ارادہ تھا۔ دیکھنا تھا کہ فون کال کی دھمکی پوری ہوتی بھی ہے یا نہیں؟

وہ خود کو بزدل ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے مردانہ وار نکل آیا تھا۔ اندر سے کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔ دل کو دھڑکا لگا تھا کہ اگلے کسی بھی لمحے میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

دو گھنٹے گزرنے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا۔ دو چار گاڑیوں پر شبہ ہوا کہ وہ تعاقب کررہی ہیں پھر وہ گاڑیاں بھی نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ طالش نے ناگواری سے جواد کو دیکھ کر کہا۔ ”کوئی ہمارا مذاق اُڑا رہی ہے۔ یوں ہمیں سڑکوں پر بھٹکا رہی ہے۔ ہماری بے عزتی کررہی ہے۔“

حماد نے کہا۔ ”وہ بے عزتی نہیں کررہی ہے۔ آپ کی جواں مردی سے گھبرا رہی ہے۔ اس کے آدمی آپ پر حملہ نہیں

کر پارہے ہیں۔“

وہ خوش ہوکر بولا۔ ”ہاں۔ وہ ناکام ہورہی ہے۔ آگے شاپنگ پلازا کے سامنے گاڑی روکو۔ ہم کولڈ ڈرنک پینے کے بہانے گاڑی سے نکل کر دور تک دیکھنا چاہتے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”دشمن کو موقع نہیں مل رہا ہے۔ آپ جان بوجھ کر انہیں موقع نہ دیں۔“

وہ کار شاپنگ پلازا کی پارکنگ میں پہنچ کر رُک گئی۔ طالش نے کہا۔ ”ہمارے گن مین اِدھر آرہے ہیں۔ یہ ہمارے لیے ڈھال بن کر رہیں گے۔“

اس نے بڑے اعتماد سے اپنی طرف کا دروازہ کھولنا چاہا۔ اسی لمحے زوردار دھماکا ہوا۔ وہ اُچھل کر سیٹوں کے درمیان آگرا۔ ایک گولی نے کار کے پچھلے پہیے کو ناکارہ بنادیا تھا۔

اس کے وفاداروں نے گاڑیوں کے پیچھے چھپتے ہوئے دور تک نظریں دوڑائیں۔ فائرنگ کی آواز ابھرتی تو سمت کا اندازہ ہوتا کہ گولی کدھر سے چلائی گئی ہے؟ حملہ آور نے سائلنسر لگے اسلحے سے فائر کیا تھا۔

جواد نے طالش کی طرف جھک کر کہا۔ ”یہ ثابت ہورہا ہے کہ جسے نمک حرام کہہ رہے تھے، وہ مرنے کے بعد واپس آگئی ہے۔“

وہ بولا۔ ”باہر دیکھو اور بتاؤ، ہمارے آدمی گولیاں کیوں نہیں چلا رہے ہیں؟“

”ہوا میں گولیاں کیسے چلائیں؟ وہ نظر آئے گی تو چلائیں گے۔ کیا اس نے کہا تھا کہ وہ روح ہے اور کسی کو نظر نہیں آئے گی؟“

”ہاں اس نے کہا تھا۔ مگر یہ بکواس ہے... وہ۔ وہ نہیں ہے، جو کہہ رہی ہے۔ وہ میرے کسی دشمن کی آلۂ کار ہے۔“

اس نے سر اُٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھنا چاہا۔ ایسے ہی وقت اس کے ایک مسلح کارندے کی چیخ سنائی دی۔ وہ گولی کھا کر گرا تھا۔ اس کا ساتھی اسے گھسیٹتا ہوا گاڑیوں کے پیچھے لے جارہا تھا۔ طالش نے ڈرائیور سے کہا۔ ”گاڑی یہاں سے نکالو...“

”حضور! پہیا بدلنا ہوگا۔“

وہ جھنجلا کر بولا۔ ”لعنت ہے تم لوگوں پر۔ کوئی اسے ڈھونڈ نہیں پارہا ہے۔ ہم پہلے کبھی اس طرح چھپ کر بیٹھنے پر مجبور نہیں ہوئے تھے۔“

آخر پولیس وہاں پہنچ گئی۔ مسلح کارندوں نے انہیں بتایا کہ حملہ آور سمتیں بدل کر سائلنسر لگے ہتھیاروں سے فائر کررہے ہیں اس لیے نظر نہیں آرہے ہیں۔

طالش نے کھڑکی سے جھانک کر انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آصف! خدا کا شکر ہے۔ تم یہاں ڈیوٹی پر ہو۔ میری گاڑی کا پہیا بدلواؤ اور مجھے یہاں سے نکالو اور شام کو حویلی میں ملو آکے۔“

حویلی میں حاضری کا مطلب تھا، بڑی رقم ملے گی۔ اس نے شکریہ ادا کیا۔ دو سپاہیوں کو پہیا بدلنے کا حکم دیا پھر طالش سے کہا۔ ”میں مجرم کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ اسے گردن سے پکڑ کر لاؤں گا۔“

مجرم نظر آتا تو اس کی گردن پکڑی جاتی۔ وہ اپنا کام دکھا کر جاچکا تھا۔ جلد ہی پہیا بدل گیا۔ طالش کی بھی جان چھوٹی۔ گاڑی اس ڈینجرس زون سے نکل گئی۔ پچھلی رات اور صبح کو جو کالیں آئی تھیں، ان کے نمبر محفوظ تھے۔ اس نے غصے سے فون کو دیکھا پھر وہ نمبر پنچ کیے۔

رابطہ ہونے پر وہی سریلی سرگوشی سنائی دی۔ ”بولو میرے قاتل...! کیسی گزر رہی ہے؟ کیا میں تمہیں نظر آئی تھی؟“

وہ جھنجلا کر بولا۔ ”بکواس مت کرو۔ تم کوئی روح نہیں ہو۔ صاف صاف کہو، تم کون ہو؟ اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”ایک ماں کیا چاہتی ہے۔ اپنے بیٹے کی بہتری، نیک نامی اور اس کے جائز حقوق...“

اس نے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے جواد کو دیکھا۔ وہ انجان بنا ہوا ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ وہ فون پر بولا۔ ”میں یقین سے کہتا ہوں، تم فاخرہ نہیں ہو۔“

”میں فاخرہ ہوں یا نہیں۔ میرے اس دنیا میں ہونے یا نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ میرا بیٹا تمہارے سامنے ایک زندہ حقیقت ہے۔ حقیقت کو تسلیم کرو۔ اعلان کرو کہ یہ تمہارا بیٹا ہے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”میں ممکن بنادوں گی۔ تمہیں اپاہج بنا کر حویلی کے دروازے پر بٹھادوں گی۔“

دوسری طرف سے فون بند ہوگیا۔ سامنے جواد کی پشت نظر آرہی تھی۔ وہ اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ بائیس برس پہلے اللہ اللہ کرکے دو بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ اب وہ دونوں ہی مسئلے بنے ہوئے تھے۔

وہ ایک بیٹے حماد سے غلط شادی اور غلط رشتے قائم

کرنے کی بات منوا رہا تھا اور اُدھر جواد کے حقوق منوانے کے لیے اس کی ماں زندہ ہوکر آ گئی تھی۔ اگرچہ موت کے بعد واپسی ایک بچکانا سی بات تھی لیکن ایسا ہو رہا تھا۔ خواہ وہ ڈراما ہی کیوں نہ ہو۔ وہ جواد کی ماں بن کر آنے والی زبردست ثابت ہو رہی تھی۔

دوسرے دن اس نے دانش کو بلوایا... اور اس نئی صورتِ حال سے اسے آگاہ کیا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''بھائی جان! یہ کون ہوسکتی ہے؟''

''وہ جو بھی ہے۔ جواد سے گہرا تعلق رکھتی ہوگی۔''

''ایسی کوئی عورت ہوتی تو ہماری نظروں میں ضرور رہتی۔ مجھے بلقیس اور میری بیٹیوں کو اس کی دن رات کی مصروفیات کا پتا رہتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اور کس سے مل رہا ہے؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں بھائی جان! آپ کا دشمن کوئی اور ہے اور وہ کسی عورت کو فاخرہ بنا کر ہمارے خاندانی شجرے کی ایک کمزوری کو دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہے۔''

''فاخرہ کی اور تین بہنیں تھیں، ساحرہ ماہرہ اور ستارہ۔ کیا یہ بہنیں ہمارے خلاف گڑبڑ کر رہی ہیں؟''

''ان بازار والیوں کی کیا مجال کہ کبھی آپ سے ٹکرانے کی جرأت کریں۔ دشمن کوئی اور ہے۔''

''اور جو بھی ہے، وہ اپنی دولت اور طاقت کے ذریعے ان بہنوں کو ہمارے خلاف استعمال کر رہا ہے۔''

دانش نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ دونوں لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جواد ان سے دور ایک باڈی گارڈ کی طرح ادب سے کھڑا تھا۔ طالش نے کہا۔ ''یہ تمہارا لے پالک بیٹا اور ہمارا باڈی گارڈ بنا ہوا ہے۔ اس بات سے بے خبر ہے کہ آج جو کچھ ہوا ہے اور آئندہ جو ہونے والا ہے، اسی کی خاطر ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔''

دانش نے کہا۔ ''یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ کا بیٹا ہے اور آج سے دشمنی کرنے والی عورت اس کی ماں کا نام استعمال کر رہی ہے۔''

''اسے معلوم بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں، تم فاخرہ کی بہنوں سے جا کر ملو اور معلوم کرو کہ وہ اور ان کی بیٹیاں کن امیر کبیر لوگوں سے قربت رکھتی ہیں۔ ان ہی گاہکوں میں سے کوئی دشمن انہیں ہمارے خلاف استعمال کر رہا ہوگا۔''

''میں آج رات ہی اس بازار میں جاتا ہوں۔ آپ نے حماد کے متعلق کیا سوچا ہے؟ وہ شادی کے قابل نہیں ہے۔ آپ کی نسل آگے کیسے بڑھے گی؟''

وہ دانش کی طرف میز پر جھک کر بولا۔ ''ہم ایک نئے منصوبے پر عمل کرنے والے ہیں۔'' اس نے نہایت ہوشیاری سے اپنی منصوبہ بندی بھائی پر عیاں کردی۔

دانش گم صم سا ہوکر بھائی کا منہ تکنے لگا۔ بھائی بڑی تفصیل سے بتا رہا تھا کہ وہ کیسی بے حیائی کرنے والا ہے۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''بھائی جان! یہ مناسب نہیں ہے اور یہ گناہ ضروری نہیں ہے۔ اس کے بغیر بھی آپ کی نسل آگے بڑھے گی۔''

''کیسے آگے بڑھے گی؟''

''ایک تو یہ کہ ہم ایک ہی باپ دادا کی اولاد ہیں۔ میرے بیٹے رامش نے اولادیں ہوں گی۔ آپ سے نہ سہی، مجھ سے نسل آگے چلے گی۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ صرف تم سے کیوں چلے گی؟ ہم سے کیوں نہیں چلے گی؟ تمہاری نسل سے ہمارا نام نہیں ہوگا۔ کیا ہم اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہیں؟''

''بے شک ہیں۔ آپ دیکھتے آئے ہیں کہ میں نے آپ کی کسی بات پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ لیکن یہ گناہ ہے۔ وہ بہو ہوگی۔ رشتے کا تقدس پامال ہوگا۔ ہمارا خاندانی شجرہ بھی آلودہ ہوجائے گا۔''

اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''گناہ اور ثواب کی باتیں نہ کرو۔ بازاری عورتوں اور کنیزوں کے ساتھ منہ کالا کرتے وقت گناہ کا خیال نہیں آتا۔ تم نے پیرو دادا کی بیٹی کے ساتھ کیا نیکی کی تھی؟ اس نے خودکشی کر کے تمہیں ظالم ثابت کردیا ہے۔''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''بے شک ہم سب گناہ گار ہیں۔ میں تو صرف رشتوں کے تقدس کو برقرار رکھنے کی بات کر رہا ہوں۔ گناہ کا راستہ اختیار کرنے سے بہتر ہے کہ جواد کو گلے لگا لیں۔ وہ خالص اپنا لہو ہے۔''

''وہ جو فاخرہ کی روح بن کر آئی ہے وہ تمہارے اندر گھس گئی ہے۔ تم اس کا مطالبہ دہرا رہے ہو۔ وہ جو چاہتی ہے، وہی تم چاہتے ہو؟''

''آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں جواد کو کیوں چاہتا ہوں؟ ایک تو وہ آپ کا بیٹا ہے۔ دوسری یہ دلی خواہش ہے کہ اسے داماد بناؤں۔''

''جب ہم نے بیٹا نہیں بنایا ہے تو تم داماد کیسے بناؤ گے؟ بات کو دوسری طرف نہ لے جاؤ۔ آج ہمیں کسی نے چیلنج کیا ہے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ جواد کے حقوق کا مطالبہ کرنے والا دشمن کتنے پانی میں ہے؟''

''دشمن تو دشمن ہی ہوتے ہیں۔ خواہ کتنے ہی پانی میں ہوں۔ آپ سے التجا کرتا ہوں کہ جو دشمنی آپ خود سے کر رہے ہیں، اسے سمجھیں۔ گناہ کی دلدل سے ایک بیٹے کو پوتا بنا کر نہ لائیں۔ خدا نے سیدھے راستے سے جواد جیسا بیٹا دیا ہے۔ آپ اسے...''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی طالش نے میز کو جھٹکے سے الٹ دیا۔ اس پر رکھی ہوئی پلیٹیں اور چائے کی پیالیاں دانش کے اوپر آئیں۔ وہ کرسی سے اُچھل کر دور ہو گیا۔

وہ غصے سے دہاڑتے ہوئے بول رہا تھا۔ ''کیا ہم گناہوں کی دلدل میں رہتے ہیں؟ کیا ہماری اولاد گناہوں کی پیداوار ہے؟ تم کتنے پارسا ہو، اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ تم کئی بار جواد کے نام سے مجھ پر پتھر...''

وہ بولتے بولتے یکلخت چپ ہوگیا۔ اس نے سر گھما کر دور کھڑے ہوئے جواد کو دیکھا پھر دہاڑتے ہوئے بولا۔ ''خنزیر کی اولاد...! یہاں کیوں کھڑا ہے؟ جا یہاں سے۔ دفع ہوجا...''

جواد فوراً ہی پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا احاطے سے باہر چلا گیا۔ احاطے کے اندر سیکورٹی گارڈز اور دوسرے ملازم تھے۔ وہ بھی دونوں بھائیوں کی طرف سے منہ پھیر کر اپنا کام چھوڑ کر ان کی نظروں سے دور ہونے لگے۔

جواد نے سیکورٹی گارڈز کے کیبن میں آکر اپنے باپ اور چچا کی طرف دیکھا۔ دانش کا سر جھکا ہوا تھا۔ طالش غصے سے بولتا جا رہا تھا۔ اس کی آواز کیبن تک آکر تحلیل ہو رہی تھی۔ باتیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ جیسے آنکھوں کے سامنے گونگی فلم چل رہی تھی۔

وہ دانش سے کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں اس بات کا گھمنڈ ہے کہ تمہارا بیٹا رامش ہمارے دو بیٹوں سے بہتر ہے۔ نہ وہ حماد کی طرح ادھورا مرد ہے اور نہ ہی جواد کی طرح تمہارے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔ ہماری نسل تو ٹھہر گئی ہے۔ تمہاری کسی رکاوٹ کے بغیر چلتی رہے گی۔''

''نہیں بھائی جان! میں ایسا نہیں سوچتا ہوں۔''

''ایسا ہی سوچتے ہو۔ آج تک ہمارے سامنے جھکے رہے۔ کل فخر سے سینہ تان کر ساری دنیا کو اپنی اولاد دکھاؤ گے اور ہمارے پاس دکھانے کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔''

''آپ شادی کرلیں۔ بیٹے ہوجائیں گے۔''

''ہمیں تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات کی مار کو سمجھو۔ ہمارے دو بیٹے کسی کام نہ آئے تو تمہارا ایک بیٹا بھی ناکارہ ہوسکتا ہے یا نابود ہوسکتا ہے۔ پھر تمہاری اولادِ نرینہ کا سلسلہ بھی یہیں رُک جائے گا۔''

وہ اپنے اکلوتے بیٹے رامش کو جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ بھائی نے کہا کہ رامش بھی ناکارہ یا نابود ہوسکتا ہے تو وہ اندر سے کانپ اُٹھا۔ فوراً ہی بھائی کے آگے گھٹنے ٹیک کر بولا۔ ''خدا کے لیے ایسی باتیں زبان سے نہ نکالیں۔ میرا بیٹا سلامت رہے گا۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔''

جواد ایسے خاندان میں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اپنے طور پر چالیں چل رہا تھا۔ ایسی چال چلنے کا ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ طالش تیموری کا سکون برباد ہوگیا تھا۔ اسے یہ یقین ہوگیا تھا کہ یہ بات کھلنے والی ہے کہ جواد، طالش تیموری کا بیٹا ہے۔

طالش جیسے فرعون صفت لوگ جب کوئی غلط فیصلہ کرتے ہیں تو اس غلطی کو پتھر کی لکیر بنا کر دوسروں کے ذہنوں پر مسلط کردیتے ہیں۔ جب وہ سفید کو سیاہ بنا دیتے ہیں تو پھر کوئی اسے سفید بنا نہیں پاتا۔ اسی طرح جواد کو بھی جھوٹ کی تاریکی سے نکال کر سچ کے اُجالے میں لانا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔

طالش نے سر جھکانے والے بھائی کو دیکھا اور دل میں کہا۔ ''ہم نے ایسے بہروپیے تابعدار بہت دیکھے ہیں، جو اچانک ہی آستین کا سانپ بن کر ڈس لیتے ہیں۔''

وہ غصے میں اور کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی نے اسے پکارا۔ اس نے اسکرین پر نمبر پڑھے۔ کوئی اجنبی پہلی بار کال کر رہا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر فون کان سے لگایا پھر پوچھا۔ ''ہیلو۔ کون...؟''

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''ہم امجد یار خان بول رہے ہیں۔ کیا آپ طالش تیموری ہیں؟''

''ہاں، ہم بول رہے ہیں۔ آپ کا نام بہت سنا ہے۔ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ کسی کو منہ نہیں لگاتے۔ ہم حیران ہیں کہ اچانک ہمیں کیسے فون کرلیا؟''

''ہم دانش تیموری سے بات کرنا چاہتے تھے کہ اس کے بیٹے رامش کی موت آگئی ہے۔ لیکن اس کا فون بند پڑا ہے۔''

طالش کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ اس نے پوچھا۔ ''دانش کے بیٹے سے آپ کو کیا شکایت ہے؟''

دانش نے چونک کر سر اُٹھا کر بھائی کی جانب دیکھا۔ اُدھر سے امجد یار خان کہہ رہا تھا۔ ''وہ ہماری بیٹی سے عشق فرما رہا ہے۔ ہم آپ کے ذریعے اس کے باپ کو وارننگ دے رہے ہیں، اگر وہ چھوکرا آج کے بعد ہماری بیٹی کے آس پاس دیکھا گیا یا اس نے فون پر بات کی تو وہ دوسرے دن کا سورج نہیں دیکھ سکے گا۔''

طالش نے کہا۔ ''جسٹ اے منٹ۔ دانش میرے سامنے ہے۔ یہ بات آپ خود اس سے کہہ دیں۔''

اس نے اپنا فون دانش کی طرف بڑھا دیا۔ وہ فون لے کر امجد یار خان سے باتیں کرنے لگا پھر اس کی دھمکیاں سُن کر بولا۔ ''تالیاں ایک ہاتھ سے نہیں بجتیں۔ عشقیہ تالی میں تمہاری بیٹی کا بھی ہاتھ ہوگا۔ یہ جو دھمکیاں دے رہے ہو، یہ بزدلوں کو دی جاتی ہیں۔ تیموری خاندان کا ایک بچہ بھی دھمکیاں دینے والوں کو ایک پھونک میں اُڑا دیتا ہے۔ آئندہ ہم سے بات کرتے وقت اپنا لہجہ درست رکھنا۔''

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ طالش نے کہا۔ ''تم نے اس مغرور کو منہ توڑ جواب دیا ہے لیکن یہ تمہارا بیٹا کیا کرتا پھر رہا ہے۔ ابھی تو وہ پندرہ یا سولہ برس کا ہوگا۔''

وہ بڑے فخر سے بولا۔ ''وہ کمسن سہی، جوان تو ہے۔ ہم بھی جوانی کی شروعات سے رنگ رلیاں مناتے آرہے ہیں۔ جوان ہوتے ہی ثابت کرنا چاہیے کہ جوان ہوگئے ہیں۔''

طالش کو یوں لگا جیسے وہ طعنہ دے رہا ہے کہ اس کا بیٹا حماد جوان ہو کر باپ دادا کی روایات کو برقرار نہ رکھ سکا۔ خاندانی روایات کو صرف چھوٹے بھائی کی اولاد ہی قائم رکھے گی۔

دانش پھر انجانے میں بڑے بھائی کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر رہا تھا۔ پھر اسے غصہ دلا رہا تھا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے سوچا۔ ''اب تو ایک بیٹا اور ایک پوتا ضروری ہوگیا ہے۔ ہمارا بیٹا مرد نہ سہی، مگر ہم ایک بیٹا ضرور دنیا میں لائیں گے۔''

وہ غصے سے منہ پھیر کر پاؤں پٹختا ہوا حویلی میں آگیا۔ اس نے اپنی خواب گاہ میں آکر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ فون نکال کر نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر غصے سے بولا۔ ''کیا ابھی تک کوئی امید سے نہیں ہو رہی ہے؟ اور کتنے مہینوں تک انتظار کرنا ہوگا؟''

ایک عورت کی آواز فون پر ابھری.....''اے حضور...! میں صدقے، میں واری کام ہوگیا ہے۔ آپ کی دونوں کنیزوں کے پاؤں بھاری ہوگئے ہیں۔ آپ ہمار

منہ میٹھا کریں۔ بھولی بھاری کریں۔''

''رقم کے لیے منہ نہ پھاڑو۔ ورنہ چیر پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ کیا تمہیں معاوضہ اور انعام نہیں ملتا ہے۔''

''معافی چاہتی ہوں سرکار! میں خوشی کے مارے آپے سے باہر ہوگئی تھی۔ آپ حکم کریں؟ مجھے کیا کرنا ہے؟''

''اب ہمیں کرنا ہے۔ ہم نازنین اور ربابہ سے چھ ماہ پہلے کی تاریخوں میں نکاح نامہ تیار کرائیں گے۔ ان میں سے جو بیٹا پیدا کرے گی، اس سے نکاح پکا ہوگا اور جو بیٹی دے گی اسے طلاق ملے گی۔ ان سب کا مقرر کردہ معاوضہ ادا کردیا جائے گا۔''

اس نے فون بند کر کے خود کو قدِ آدم آئینے میں دیکھا۔ صبح سے مسائل میں الجھے رہنے کے بعد پہلی بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ اس نے زیرِ لب کہا۔ ''فاخرہ بی بی، جواد کے حقوق چھیننے آئی ہو...؟

دانش...! کیا صرف تمہارا بیٹا ہی تیموری نسل چلائے گا؟ اونہہ...! ہمارے لہو میں بیٹوں کی کمی نہیں ہے۔

اور دانش! تم ایک ہی بیٹے پر تکیہ کرو۔ اسی کے گن گاؤ۔ اس چھوکرے نے تو خود کو امجد یار خان کے چھرے تلے پہنچا دیا ہے۔ اس کے لیے سر پکڑ کر رونے والے ہو۔''

وہ دونوں بھائی کروڑوں کی جائداد اور کاروبار کے مالک تھے۔ دونوں برابر کے حصے دار تھے۔ آئندہ اولاد کے ذریعے حصوں میں کمی بیشی ہوسکتی تھی۔ ان میں سے جو بھی اولادِ نرینہ سے محروم ہوتا اور نسل آگے نہ بڑھاتا، اس کی صرف بیٹیاں رہ جاتیں، جنہیں قانون کے مطابق کم سے کم حصہ ملتا۔

دانش کے مقابلے میں اب تک طالش ہر معاملے میں میدان مارتا آیا تھا۔ اس بار بھی خوش خبری ملی تھی کہ دو داشتائیں اس کی اولاد پیدا کرنے والی ہیں۔

دانش لان میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے لباس پر جیلی، مکھن اور چائے کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے دماغ میں بھی بھائی کے خلاف غبار بھر گیا تھا۔ احاطے میں موجود ملازمین کے سامنے اس کی توہین ہوئی تھی۔ پھر بھی وہ بڑے صبر و تحمل سے برداشت کر رہا تھا۔

پھر وہ اپنی کار میں بیٹھ کر احاطے سے باہر آیا۔ وہاں جواد نے گاڑی روکنے کو کہا۔ پھر اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر بولا۔ ''گھر چلیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''بھائی جان نے تمہیں چھٹی دی ہے؟''

''مجھے ان کی تابعداری نہیں کرنی ہے۔ جو میرے بابا کی توہین کرے، وہ میرا دشمن ہے۔''

''ایسی باتیں نہ کرو حویلی میں جاؤ۔''

''نہیں جاؤں گا۔ پہلے گھر چل کر بات ہوگی پھر سوچوں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

وہ دونوں اپنی کوٹھی میں آگئے۔ وہاں بلقیس اور اس کی بیٹیوں نے اس کے آلودہ لباس کو دیکھا۔ جواد نے بتایا کہ خر دماغ بابا جانی نے ملازموں کی موجودگی میں بابا کی بے عزتی کی ہے۔ یہ سُن کر بیٹیاں رونے لگیں۔ بلقیس نے کہا۔ ''جب سے اس خاندان میں آئی ہوں، رو رہی ہوں۔ لیکن تمہارے باپ کو نہ احساسِ کمتری ہوتا ہے۔ نہ یہ بھائی کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

اس کے بیٹے رامش نے کہا۔ ''میں بڑے ابو کی حویلی میں نہیں جاؤں گا اور نہ ہی ان سے بات کروں گا۔''

دانش نے بیٹے کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم باہر بدمعاشیاں کر رہے ہو۔ ابھی امجد یار خان نے کہا ہے کہ تم اس کی بیٹی کے پیچھے پڑے ہو۔ اس نے وارننگ دی ہے کہ آج کے بعد اس کی بیٹی کے آس پاس دکھائی دو گے تو تمہیں گولی ماردی جائے گی۔''

بلقیس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ہائے میں مر جاؤں گی۔ کون ہے وہ میرے بچے کو گولی مارنے والا؟ آپ نے اسے کیا جواب دیا ہے؟''

''جو بھی جواب دیا ہے۔ ہمیں اپنی کمزوریوں کو دیکھنا چاہیے۔ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے اور اس نے بیٹھے بٹھائے موت کو للکارا ہے۔ ہم دشمنوں سے نمٹنا جانتے ہیں اور ہم گولیاں چلانے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک آدھ گولیاں ہماری طرف بھی آتی ہیں۔ دعا کرو، بیٹے کی طرف نہ آئے۔''

بلقیس نے بیٹے کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ بہنیں اسے ڈانٹنے لگیں۔ جواد نے سمجھایا۔ ''رامش! فی الحال دو چار دن گھر میں رہو۔ کسی بھی ضرورت سے باہر نہ جاؤ۔ دشمنوں کو تو موقع چاہیے۔ وہ دشمنی کا کوئی بھی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

دانش غسل کرنے اور لباس تبدیل کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شام کو بلقیس نے جواد سے کہا۔ ''تمہارے بابا کہیں جا رہے ہیں۔ میں نے کہا، تمہیں ساتھ لے جائیں لیکن انہوں نے انکار کردیا اور کہہ دیا کہ وہ جہاں جا رہے ہیں، وہاں بیٹے کو ساتھ نہیں لے جایا جاتا۔ آخر وہ کہاں جا رہے ہیں؟''

وہ ماں کو تھپکتے ہوئے بولا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔

میں ان کے پیچھے جاؤں گا۔"

جواد کو اندازہ ہو گیا۔ باپ بیٹے کو مسجد میں لے جاتا ہے۔ بازارِ حسن میں نہیں لے جاتا اور حالات کہہ رہے تھے کہ وہ دونوں بھائی چیلنج کرنے والی فاخرہ تک پہنچنے کے لیے اس کی بہنوں کے پاس ضرور جائیں گے۔

رات کے دس بجے دانش کوٹھی سے باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھنے لگا۔ ایسے وقت طالش نے فون پر پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ تم سے کہا تھا کہ فاخرہ کی بہنوں کے پاس جا کر انہیں ٹٹولو۔ معلوم کرو، دشمن ان کے پیچھے چھپا ہوگا۔"

"بھائی جان! میں وہیں جا رہا ہوں۔ وہاں سے واپس آپ کے پاس آؤں گا۔"

اس نے پوچھا۔ "جواد کہاں ہے؟ وہ ہماری اجازت کے بغیر ڈیوٹی چھوڑ کر گیا ہے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "بھائی جان! وہ آپ سے ناراض ہے۔ کہتا ہے، آپ نے ملازموں کے سامنے اس کے باپ کی توہین کی ہے۔ وہ آپ کا کام نہیں کرے گا۔"

وہ غصے سے بھڑک گیا۔ "کیا اس کی شامت آئی ہے؟ وہ ہماری نوکری سے انکار کر رہا ہے۔ اسے فوراً حاضر ہونے کو کہو۔"

"آپ ناراض نہ ہوں۔ وہ مجھے اپنا باپ مانتا ہے۔ میں واپس آ کر اسے سمجھاؤں گا۔"

"تم کیا سمجھاؤ گے، میں ابھی اسے سیدھا کر دوں گا۔"

فون بند ہو گیا۔ دانش کار اسٹارٹ کر کے کوٹھی کے احاطے سے باہر جانے لگا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر جواد موٹر سائیکل پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی فاصلہ رکھ کر کار کے پیچھے جانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی سنائی دی۔ اس نے فون نکال کر بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے طالش نے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ فوراً یہاں آؤ۔"

"سوری بابا جانی! آپ نے ایک بیٹے کے سامنے اور ملازمین کے سامنے میرے بابا کی توہین کی ہے۔"

وہ نفرت سے بولا۔ "گدھے کی اولاد! وہ تمہارا باپ کہاں سے، کس رشتے سے ہو گیا؟"

"اگر میرا باپ گدھا ہے تو آپ درست فرما رہے ہیں۔"

طالش کو جیسے پتھر آ کر لگا۔ بیٹا اسے گدھا کہہ رہا تھا اور اس نے خود بھی اپنے آپ کو یہی کہا تھا۔ وہ جھنجلا کر بولا۔ "بکواس مت کرو۔ ٹریفک کا شور سنائی دے رہا ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟ میں حکم دیتا ہوں، فوراً یہاں آؤ۔"

"آپ ملازمین کے سامنے میرے بابا سے معافی مانگیں۔ میں آجاؤں گا۔"

"ہم اور معافی مانگیں...؟ کتے...! کمینے...!"

وہ مزید شرمناک گالیاں دینے لگا۔ جواد نے فون بند کر دیا۔ یہ سوچ کر مسکرانے لگا کہ وہ مغرور باپ انگاروں پر لوٹ رہا ہوگا۔ یہ اس کی کامیابی تھی۔ وہ صبح سے باپ کو ذہنی اذیت...... اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

دانش کی کار ستارہ کے کوٹھے کے سامنے آ کر رُکی۔ جواد نے دیکھا کہ وہ کار کو لاک کرنے کے بعد سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر جا رہا تھا۔ ہارمونیم، طبلے اور سارنگی کی آوازیں گلی تک آ رہی تھیں۔ بڑے ہال میں گھنگھرو بج رہے تھے۔ ستارہ کی بیٹیاں گا رہی تھیں، ناچ رہی تھیں۔ ان کے ایک ایک ٹھمکے پر نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔

ستارہ نے استقبالیہ کمرے میں دانش کو دیکھ کر آداب بجا لاتے ہوئے کہا۔ "حضور...! مہربان...! قدر دان...! مدتوں بعد تشریف لائے ہیں۔ ہماری اور آپ کی عمر کے ساتھ یہ شعر بھی پرانا ہو گیا ہے... وہ آئیں ہمارے گھر میں خدا کی قدرت ہے..."

دانش نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "شاعری رہنے دو۔ ہم ناچ گانے کی محفل لوٹنے نہیں آئے ہیں۔ بس دو گھڑی باتیں کریں گے۔ تمہارے وقت کی قیمت ادا کریں گے پھر چلے جائیں گے۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے سرکار...! تشریف رکھیں۔"

وہ فرشی نشست پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ "تمہاری بہن فاخرہ کبھی ہمارے بھائی جان کی منکوحہ تھیں۔ ہمیں اس کی ہلاکت کا افسوس ہے۔"

"آج برسوں بعد افسوس کرنے آئے ہیں۔"

"ہاں، اس لیے کہ برسوں بعد ایک اور فاخرہ ہماری دنیا میں آئی ہے اور بھائی جان سے اپنے بیٹے جواد کے حقوق طلب کر رہی ہے۔"

"تعجب ہے۔ یہ دوسری فاخرہ کون ہے؟ اور ابھی دو دن پہلے ایک جوان یہاں آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اس کا نام جواد ہے اور وہ میری بہن فاخرہ کا بیٹا ہے۔"

دانش چونک کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "وہ کون تھا؟ اس کا حلیہ بتاؤ، وہ دیکھنے میں کیسا تھا؟"

"کسرتی بدن والا خوبرو جوان تھا..." وہ اس کا ناک نقشہ بتانے لگی۔ ہو بہو جواد کی تصویر لفظوں میں کھینچنے لگی۔ وہ دانش کے تصور میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "وہ جوان کیا کہہ رہا تھا؟"

ستارہ نے کہا۔ "وہ جوان پوچھ رہا تھا، کیا طالش تیموری نے اس کی ماں سے نکاح پڑھایا تھا؟ کیا ہماری بہن فاخرہ نے اسے جنم دیا تھا؟ کیا طالش تیموری اس کا باپ ہے؟ اور کیا اس کی ماں کو ہلاک کیا گیا تھا؟"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"جو سچ ہے، وہ کہہ دیا۔"

"کیا اس نے پوچھا تھا کہ اس کی ماں کو کس نے قتل کیا تھا؟"

"ہاں۔ پوچھا تھا۔ ہم کیا جانیں، کس نے قتل کیا تھا؟ پولیس آج تک اسے گرفتار نہ کر سکی یا انہوں نے قاتل سے ٹکا ٹکا کر لیا ہوگا۔"

"کیا تم نے دیکھا تھا، وہ کس گاڑی میں آیا تھا؟"

"باہر گلی میں بلیک ہنڈا اکارڈ تھی۔"

اس نے ہزار ہزار کے دس نوٹ ستارہ کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے قیمتی وقت کی قیمت ہے۔ اب ذرا کھڑکی سے باہر دیکھ لو۔ کیا یہی بلیک ہنڈا اکارڈ تھی۔ اس کے شیشے کلرڈ ہیں۔"

ستارہ نے کھڑکی کے پاس آ کر دیکھا۔ وہ کار نیچے گلی میں کھڑی تھی۔ اس نے کہا۔ "ہاں یہی گاڑی تھی۔"

دانش ہر پہلو سے تصدیق کر چکا تھا۔ یہ ثابت ہو رہا تھا کہ جواد نے اس بازار میں آ کر اپنی صحیح لائف ہسٹری معلوم کی ہے اور وہی فرضی فاخرہ کے نام سے اپنے باپ کو چیلنج کر رہا ہے اور اسی نے آج اس پر حملہ کرایا ہے۔

جواد اسی گلی میں دور کھڑا تھا۔ اس نے کھڑکی میں ستارہ اور دانش کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ بلیک ہنڈا اکارڈ پہچانی جا رہی ہے۔ وہ اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔

اب اسے انتظار تھا کہ دانش گھر آئے گا اور سامنا ہوگا تو اس کا ری ایکشن کیا ہوگا؟ اس نے نازیہ سے کہا۔ "بابا کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں اپنی ماں کے نام کے پیچھے بابا جانی سے دشمنی کر رہا ہوں۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "اب کیا ہوگا؟"

"انتظار کرو۔ دیکھتے ہیں کہ تمہارے ابو ابھی کیا کہنے اور کیا کرنے والے ہیں۔"

وہ ایک گھنٹے بعد آیا۔ گھر کے سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس نے وہاں سے گزرتے ہوئے نظریں اُٹھا کر جواد کو نہیں دیکھا۔ اسے نظرانداز کرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

بلقیس نے کہا۔ "شاید تمہارے ابو کا موڈ خراب ہے۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔"

وہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی پھر واپس نہیں آئی۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ سب ہی ایک ایک کر کے سونے چلے گئے۔ نازیہ اور جواد اُلجھ گئے۔ دانش نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کی خاموشی پُراسرار تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر اس نے سنجیدگی سے جواد کو دیکھا پھر پوچھا۔ "تم ڈیوٹی پر کیوں نہیں گئے؟"

"میں نے کل رات بابا جانی سے فون پر کہہ دیا ہے کہ ان کا کوئی کام نہیں کروں گا۔"

بلقیس نے اور تمام بیٹیوں نے اسے تعجب سے دیکھا۔ جواد نے کہا۔ "میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ انہوں نے میرے بابا کی توہین کی ہے۔ وہ جب تک ملازموں کے سامنے آپ سے معافی نہیں مانگیں گے، تب تک ان کا کوئی حکم نہیں مانوں گا۔"

دانش نے پریشان ہو کر کہا۔ "پاگل ہو گئے ہو؟ تم نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی؟ یا خدا...! انہیں معافی مانگنے کو کہا ہے؟ جانتے ہو کیسی قیامت آئے گی؟"

"میں قیامت سے گزر سکتا ہوں۔ اپنے باپ کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ کیا کر لیں گے؟ انہیں قتل و غارت گری کے سوا کیا آتا ہے؟ وہ اپنے لہو کے رشتوں کو بھی معاف نہیں کرتے ہیں۔ مجھ پر بھی چڑھ دوڑیں گے۔ پھر نتیجہ سب کے سامنے ہوگا۔ وہ رہیں گے یا میں رہوں گا۔"

بلقیس نے کہا۔ "بیٹے! خدا جانتا ہے، تم رامش سے بھی زیادہ ہمارے دلوں میں دھڑکتے ہو۔ تم نے اپنے بابا کی عزت اور وقار کے لیے موت کو دعوت دی ہے۔ تم نے جوش میں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے بیٹے.....!"

بڑی بہن نے کہا۔ "جواد ابھی جاؤ اور بڑے ابو کے قدموں میں گر پڑو۔ ان سے معافی مانگو۔ ہمیں تمہاری سلامتی چاہیے۔"

وہ بولا "تمہارے بڑے ابو میرے بابا کے قدموں میں گریں گے یا..."

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ دانش نے پوچھا۔ "یا...؟"

وہ بولا۔ "میں نہیں جانتا، کیا کر گزروں گا۔"

دانش تھوڑی دیر تک اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "تم ستارہ کے کوٹھے پر گئے تھے؟"

وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ”جی ہاں...!“
”تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ تم بھائی جان کے بیٹے ہو؟“
”جی ہاں...! پہلے یہ حقیقت پیرو دادا سے معلوم ہوئی تھی۔“
اس نے گھور کر پوچھا۔ ”تم ہی فاخرہ کے نام سے اپنے باپ کو چیلنج کر رہے ہو؟“
”جی ہاں...!“
گھر کے تمام افراد گم صم ہو کر جواد کے جوابات سن رہے تھے۔ دانش نے پوچھا۔ ”وہ کون ہے، جو فاخرہ بن کر بھائی جان کو فون کرتی ہے؟“
جواد اور نازیہ نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ بولا۔
”نازیہ...“
یہ چونکا دینے والی بات تھی۔ ماں باپ اور بہنیں سب ہی شدید حیرانی سے ان دونوں کو دیکھنے لگے۔ دانش نے غصے سے میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ ”میں تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔ تم نے کیا سمجھ کر اتنا بڑا قدم اُٹھایا ہے؟ کیا بھائی جان تمہارے حقوق تسلیم کر لیں گے؟“
”نہ کریں۔ بچپن سے ولدیت میں آپ کا نام لکھتا اور بولتا آیا ہوں۔ آپ کو فخر سے اپنا باپ کہتا آیا ہوں اور آپ ہی پر فخر کرتا رہوں گا۔ مجھے طالش تیموری کی اولاد کہلانے کا شوق نہیں ہے۔“
دانش، بلقیس اور تمام بیٹیاں دل ہی دل میں اس پر قربان ہو رہی تھیں۔ دانش نے پوچھا۔ ”جب ان کی اولاد کہلانا گوارا نہیں ہے تو کیوں ان سے دشمنی مول لی ہے؟“
”میری مقتول ماں کا قرض مجھ پر ہے۔ مجھے وہ قرض چکانا ہے۔“
”کیا ارادے ہیں تمہارے...؟“
”میرے ارادے نہ پوچھیں۔ اپنا مزاج تبدیل کریں۔ بابا جانی کی تابعداری اور جی حضوری چھوڑ دیں۔ آپ جائداد اور کاروبار میں ان کے برابر کے حصے دار ہیں۔ ان کی فرعونی طاقت سے اور خون خرابے والی فطرت سے خوف زدہ نہ ہوں۔ میں آپ پر ذرا بھی آنچ نہیں آنے دوں گا۔“
دانش بڑے جذبے اور اعتماد سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ طالش تیموری کا بیٹا اپنے باپ کی طرح ضدی اور خونخوار دکھائی دے رہا تھا۔ کیا خدا کی قدرت ہے۔ بھائی جان کے مقابلے میں بھائی جان کی اولاد ہی اس کی محافظ بن رہی تھی۔

☆☆☆

طالش تیموری کو ذرا سی بات پر طیش آ جاتا تھا۔ اور یہ تو بہت بڑی بات تھی کہ جواد نے حکم عدولی کی تھی۔ پھر اسے دانش سے معافی مانگنے کو ایسے کہا تھا جیسے وہ کوئی گرا پڑا معمولی آدمی ہو۔
طالش کو صرف جواد ہی سے نہیں، دانش سے بھی بغاوت کی بو آ رہی تھی۔ اس نے پچھلی رات بھائی سے کہا تھا کہ بازارِ حسن سے واپسی پر اس کی حویلی میں حاضری دینے آئے گا اور فاخرہ کے متعلق جو معلومات حاصل ہوں گی، انہیں بیان کرے گا۔ لیکن وہ بھی حاضر نہیں ہوا تھا اور نہ ہی غیر حاضری کی وجہ بتائی تھی۔
یہ سراسر غصہ دلانے والی بات تھی۔ وہ دوسرے دن بھی انتظار کر رہا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ دونوں کب تک اس سے لاتعلق رہیں گے۔ آخر خون کا رشتہ تھا اور بہت سے خاندانی معاملات تھے۔ آج نہیں تو کل تو اس کے دروازے پر انہیں آنا ہی ہوگا۔
اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ گارڈ نے انٹرکام پر اطلاع دی کہ دانش اور جواد اس سے ملنے آئے ہیں۔ وہ دونوں پہلی بار حویلی میں اپنے آنے کی اطلاع دے رہے تھے۔ طالش نے کہا۔ ”انہیں ڈرائنگ میں لے آؤ۔“
گارڈ نے کہا۔ ”یہ حویلی کے باہر لان میں ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“
اس نے غصے سے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ وہ دونوں ملاقات کے لیے اپنی شرط منوا رہے تھے۔ اسے حویلی سے باہر آنے کو کہہ رہے تھے۔ وہ ملاقات سے انکار کر سکتا تھا لیکن نہ کر سکا۔ یہ جاننے کی بے چینی تھی کہ وہ دونوں اچانک خودسر اور باغی کیوں ہو گئے ہیں؟
اس نے کہا۔ ”انہیں لان میں آنے دو۔ تمام گارڈز کو الرٹ رہنے کا حکم دو۔ خلاف توقع کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“
وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا اور وہاں سے انہیں دیکھنے لگا۔ صرف وہ دونوں ہی تھے۔ اپنے ساتھ مسلح گارڈز لے کر نہیں آئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح ادنیٰ تابعدار دکھائی دے رہے تھے۔
وہ بڑے ہی شاہانہ انداز میں چلتا ہوا لان میں آیا۔ انہوں نے سلام کیا، اس نے جواب نہیں دیا۔ ایک کرسی پر تن کر بیٹھ گیا۔ میز کے دوسری طرف دانش ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جواد نے دوسری کرسی پر بیٹھنا چاہا تو وہ تیز آواز میں بولا۔ ”اے، رُک جا۔ دو کوڑی کا باڈی گارڈ ہمارے سامنے کھڑا رہے گا۔“
جواد نے کہا۔ ”کل تک باڈی گارڈ تھا۔ آج میں جواد تیموری ولد طالش تیموری ہوں۔ یہ میرے باپ کی حویلی ہے

اور یہ میرے باپ کی کرسی ہے۔ کسی کا باپ بھی مجھے یہاں بیٹھنے سے نہیں روک سکے گا۔“
وہ اپنے باپ کے انداز میں کرسی پر تن کر بیٹھ گیا۔ طالش کے لیے یہ چونکا دینے والی بات تھی کہ جواد کو اپنی صحیح، پیدائشی حقیقت معلوم ہو گئی ہے۔ اس وقت ٹھکرائے ہوئے بیٹے کا انداز ایسا تھا جیسے آخری فیصلہ کر کے سر سے کفن باندھ کر آیا ہو۔
اس نے دانش کو گھور کر دیکھا۔ وہ بولا۔ ”بھائی جان! میں نے یہ بھید نہیں کھولا ہے۔ اسے پیرو دادا نے حقیقت بتائی تھی۔“
جواد نے کہا۔ ”اور اس کے بعد ہی میری امی نے آپ کا سکون برباد کر دیا۔ اس فون کے پیچھے میں ہی تھا۔“
وہ حیرانی اور بے یقینی سے دشمن بیٹے کو دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کل میں نے ہی آپ پر حملہ کرایا تھا اور آئندہ بھی بہت کچھ کرنے والا ہوں۔“
وہ حقارت سے بولا۔ ”کچھ اور کرنے کے لیے یہاں سے زندہ جا سکو گے؟“
وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”آپ بھول رہے ہیں، کل دو خاموش گولیاں آپ کی طرف آئی تھیں۔ ایک نے پہیے کو بیکار بنایا۔ دوسری نے آپ کے کارندے کو زخمی کیا۔ وہ گولیاں کہاں سے آئیں، یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔“
وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ”اس وقت بھی آپ کے گارڈز معلوم نہیں کر سکیں گے کہ دو چار گولیاں آپ کی طرف کہاں سے آئی ہیں؟ یہ معلوم ہونے تک آپ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکے ہوں گے۔“
وہ پریشان ہو کر فوراً ہی سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بیٹے نے کہا۔ ”میری لائی ہوئی موت کل بھی پردہ نشین تھی۔ آج بھی نظر نہیں آئے گی، آزمائش شرط ہے۔“
وہ پریشانی سے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے دور اپنے گارڈز کی طرف دیکھنے لگا۔ دانش نے کہا۔ ”کیوں نہ ہم موت کو بھول جائیں اور زندہ رہنے کی باتیں کریں؟“
وہ گھور کر بولا۔ ”تم ایک تابعدار بھائی بن کر بائیس برس سے اندر ہی اندر لاوا پکا رہے تھے۔ میری ہی اولاد کو میرے خلاف کرتے رہے۔“
”میں آپ کی طرح سازشی دماغ نہیں رکھتا ہوں۔ میں دل سے آپ کی تابعداری کرتا آ رہا تھا۔ اب آپ کے رویّے .... اور آپ کے پیدا کردہ حالات نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ جی حضوری نہیں کرنی چاہیے۔ آج کے بعد میرے اور آپ کے راستے الگ رہیں گے۔ جائداد اور کاروباری معاملات کو قانونی طور پر نمٹایا جائے گا۔ لیکن...“
وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ ”میں اپنے خاندانی شجرے میں کسی طرح کی ہیرا پھیری نہیں ہونے دوں گا۔ آپ حماد کی شادی کرائیں گے تو میں اس کی میڈیکل رپورٹ ساری دنیا کو دکھاؤں گا۔“
وہ غصے میں کرسی سے اُچھل پڑا پھر بولا۔ ”تم میرے اور میری اولاد کے معاملے میں مداخلت نہیں کرو گے۔“
”صحیح اولاد ہو گی تو کبھی مداخلت نہیں کروں گا۔ شرمناک اولاد ہو گی تو اپنے شجرے میں رہنے نہیں دوں گا۔ ہمارا شجرہ جھوٹ اور فریب سے پاک رہے گا۔“
وہ بے بسی سے دانت پیس کر بولا۔ ”میں نے تمہیں رازدار بنا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔“
”میرا فرض ہے کہ میں آپ کو غلطیوں سے بچاتا رہوں۔“
جواد نے کہا۔ ”آپ لوگ اپنی خاندانی برتری اور جھوٹی شان و شوکت کو قائم رکھنے کے لیے کیا کرتے ہیں...؟ وہی جو آپ نے اور میری امی نے کیا۔ آپ کو میری ضرورت تھی اور امی نے لاکھوں روپے کمانے کے لیے اپنی محبت اور ممتا بیچ دی۔“
وہ نفرت سے بولا۔ ”آپ لوگ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کتنے گر گئے؟ ایک بے قصور اور معصوم بچے سے اس کی ولدیت اور اس کی شناخت چھین کر اسے لے پالک بنا دیا۔“
طالش نے کہا۔ ”تمہارے مقدر میں جو لکھا ہے، وہی ہو رہا ہے۔ تمہیں میرا نام، میری دولت اور میری شان و شوکت کبھی حاصل نہیں ہو گی۔“
”میں تھوکتا ہوں، آپ کی اس کھوکھلی شان و شوکت پر۔ افسوس کہ لہو کی خاصیت بدل نہیں سکتا۔ جو آپ کا انتقامی مزاج ہے، وہی میرا بھی ہے۔ آپ نے میرے ساتھ برا کیا ہے۔ میں بھی انتقاماً کچھ اچھا کرنے والا نہیں ہوں۔ میری رگوں میں جو تیموری لہو دوڑ رہا ہے یہ لہو آپ کو جلد ہی عبرت کا نشان بنا دے گا۔“
دانش نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہا۔ ”ہم جا رہے ہیں۔ اب بھی وقت ہے۔ بیٹے کے انتقامی رویّے کو محبت میں بدل دیں۔ آپ کا مقابلہ کسی اور سے نہیں ہے۔ اپنے ہی لہو سے ہے۔“
جواد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بابا! آپ کتنا ہی سمجھائیں، ہمارے جاتے ہی یہ اپنی ٹیڑھی عقل سے دوڑنے لگیں گے۔ چلیں یہاں سے...“
وہ دونوں وہاں سے جانے لگے۔ طالش اپنی جگہ سے اُٹھ کر چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔ یہ معلوم کرنا چاہتا

تھا کہ جواد کے شوٹرز اور کلرز کہاں چھپے ہوں گے؟ کل دو خاموش گولیاں چلی تھیں۔ آج دو سے زیادہ چل سکتی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ کوئی اس کے گھر آ کر اپنی طاقت منوا کر جا رہا تھا اور وہ جواباً کچھ کرنہیں پارہا تھا۔

وہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک فاتح ... اور مردِ میدان کی شان دکھا کر چلے گئے۔ وہ ٹہلنے لگا۔ لان کی ہری بھری گھاس کو قدموں تلے کچلنے لگا۔ بھائی اور بیٹے کی دشمنی اچانک نقصان پہنچارہی تھی۔

تقدیر فیصلہ سنا چکی تھی کہ آئندہ اس کی کسی اولاد سے کوئی اولاد نہیں ہوگی۔ فی الحال اولادِ نرینہ حاصل کرنے کی اُمید صرف دو عورتیں سے رہ گئی تھی۔ آئندہ میڈیکل رپورٹ بتانے والی تھی کہ وہ دونوں ایک یا دو بیٹے دے سکیں گی یا نہیں؟

اِدھر جواد نے چیلنج کیا تھا۔ یہ واضح طور پر کہا تھا۔ ”لہو کی خاصیت نہیں بدلتی۔ جو آپ کا مزاج ہے وہی میرا بھی ہے۔ آپ نے میرے ساتھ بُرا کیا ہے۔ میں بھی انتقاماً کچھ بُرا کرنے والا ہوں۔ میری رگوں میں جو تیموری لہو دوڑ رہا ہے، وہ آپ کو عبرت کا نشان بنادے گا۔“

وہ سوچ رہا تھا اور زور زور سے پاؤں پٹخ رہا تھا۔ بیٹا جنگجوئی اور خون خرابے میں باپ سے کم نہیں تھا۔ جرائم کی دنیا میں واردات کرنے والے جتنے چور، بدمعاش اور کرائے کے قاتل تھے، جواد ان سب سے رابطہ رکھتا تھا اور ان سے کام لینا بھی جانتا تھا۔ وہ مجرمانہ حکمتِ عملی اختیار کرنے کے معاملے میں اپنے باپ سے کسی طرح کم نہیں تھا۔

وہ شام کو پینے کے لیے بیٹھا تو دماغ کی گرمی کچھ کم ہوئی۔ اس نے پہلا گھونٹ حلق سے اُتار کر سوچا۔ ”ہم اپنی توہین پر تلملاتے رہیں گے تو کوئی کام کی بات سوچ نہیں سکیں گے۔ ہمیں ہوش میں رہ کر یہ سمجھنا چاہیے کہ دانش اور جواد ہمیں کتنے پہلوؤں سے نقصان پہنچا سکتے ہیں اور ہم کس طرح منہ توڑ جواب دیتے ہوئے انہیں مٹی میں ملا سکتے ہیں؟“

وہ پیتا رہا اور سنجیدگی سے سوچتا رہا کہ کس طرح ان کے خلاف خفیہ سازشیں کرسکتا ہے...

اس دن سے اس نے بظاہر خاموشی اختیار کرلی۔ اپنی مصروفیات کو محدود کر کے حویلی کی چار دیواری میں وقت گزارنے لگا۔ وہ کوئی عبادت گزار نہیں تھا اس لیے دن رات تنہائی میں شیطان مشورے دینے چلا آتا تھا۔

چند ماہ بعد ان دونوں بازاری عورتوں کی میڈیکل رپورٹس آ گئیں۔ ان رپورٹس نے طالش کو پھر ایک بار بلندی سے پستی میں لا پھینکا۔ ایک داشتہ نے بیٹی پیدا کی۔ دوسری نے ایک بیٹے کو جنم دیا لیکن وہ چند سانسیں لینے کے بعد دنیا سے چلا گیا۔

یہ ایسی بدنصیبی تھی کہ وہ پاگل ہو گیا۔ کمرے میں رکھی ہوئی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگا۔ پھر بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر بیٹھ گیا۔ برسوں پہلے اس نے جواد کو نہیں، اپنی بدنصیبی کو ٹھکرایا تھا۔ اب اسے ایک بھی بیٹا نصیب نہیں ہو رہا تھا۔

اب دو باتیں اس کے دماغ میں چکرانے لگیں۔ ایک تو یہ کہ اولادِ نرینہ کے معاملے میں دانش بازی لے جا رہا ہے۔ آئندہ اس خاندان میں اس کے بیٹے رامش تیموری سے نسل چلے گی۔ طالش تیموری کا نام شجرے میں حماد تک پہنچ کر رُک جائے گا۔

دوسری یہ بات اشتعال دلا رہی تھی کہ بیگم عارفہ نے ایسا بیٹا دے کر اسے دھوکا دیا ہے۔ وہ تو بائیس برس پہلے ہی عارفہ کو بیٹا پیدا نہ کرنے کے جرم میں موت کے گھاٹ اُتارنا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت حماد کو جنم دے کر سزائے موت سے بچ گئی تھی۔ اس نے مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستے ہوئے سوچا۔ ”اب نہیں بچے گی۔ اس عورت نے میرا سر جھکایا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اس نے دوسرے دن عارفہ سے کہا۔ ”اس حویلی میں بہت رہ چکیں۔ اسے خالی کرو۔“

اس نے پوچھا۔ ”آپ مجھے یہاں سے کیوں نکال رہے ہیں؟“

”یہاں ہماری نئی شریکِ حیات آئے گی۔ تم رحیم آباد کی کوٹھی میں باقی عمر گزارو گی۔“

حماد نے کہا۔ ”میں امی کو تنہا نہیں رہنے دوں گا۔ ان کے ساتھ جاؤں گا۔“

”تم تو نہ سایہ دار ہو نہ پھل دینے والے درخت ہو۔ اچھا ہے، میرا پیچھا چھوڑو اور ماں کے ساتھ رہو۔“

وہ ماں بیٹے دو دن بعد ہی رحیم آباد چلے گئے۔ عارفہ اپنے شوہر کے مزاج کو خوب سمجھتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے حویلی سے دور بھیج کر اس سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرنے والا ہے۔

موت برحق ہے۔ جب اسے ہر حال میں آنا ہی ہے تو یہ ضرور آئے گی۔ عارفہ کو اب سے پہلے بھی اس کی موت کا ایک مقررہ وقت بتایا گیا تھا اور وہ وقت ٹل گیا تھا۔ اب بھی وہ اللہ اللہ کر رہی تھی۔

جواد نے کئی ماہ بعد طالش کو فون پر مخاطب کیا اور کہا ”پچھلے چھ ماہ میں مجھ پر تین حملے ہو چکے ہیں۔ میں جانتا ہوں، آپ مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

الحال آپ کو الزام نہیں دے سکتا کیونکہ آپ کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

اس نے غرّانے کے انداز میں پوچھا۔ "کیا یہی فضول باتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "آج تیسری بار حملہ کرنے والا وہ ٹارگٹ کلر میری گولی کا نشانہ بن ہی گیا۔"

"میرا کوئی ٹارگٹ کلر نہیں ہے۔ بکواس مت کرو۔"

"وہ زخمی ہوا تھا۔ زندہ تھا۔ میں نے اس کی جان بخشنے کا وعدہ کیا تو اس نے سچ اُگل دیا کہ کس کے لیے کام کررہا ہے اور کون مجھے قتل کرانا چاہتا ہے؟"

"ایک مجرم، کرائے کا قاتل مجھ جیسے معزز شریف آدمی پر الزام لگائے گا تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

"یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی یقین کرے اور یہ نہیں چاہوں گا کہ آپ قانون کی گرفت میں آئیں۔ آپ کا مقدمہ تو میری عدالت میں ہے۔ آخری فیصلے کا انتظار کریں۔"

اس نے کوئی جواب سنے بغیر فون بند کردیا۔ وہ بیٹا گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گیا تھا۔

وہ داشتاؤں اور کنیزوں سے کن شرائط پر رشتے جوڑتا اور توڑتا تھا' یہ خاندان کے بزرگ اور دوسرے معزز افراد صحیح طور پر نہیں جانتے تھے۔ فاخرہ سے نکاح کا اور جواد کی پیدائش کا کوئی تحریری ریکارڈ محفوظ نہیں تھا۔ ان حالات میں وہ اسے اپنا بیٹا تسلیم کرنا چاہتا تو سب یہی کہتے کہ وہ کسی پلے پلائے جوان کو اپنا بیٹا بنا رہا ہے۔

یعنی وہ ہڈی نگل نہیں سکتا تھا اور اسے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کے لیے اُگل بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ جواد کے معاملے میں ناکام ہورہا تھا کہ دوسری طرف اسے ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک دن دانش کے بیٹے رامش کو اسکول کے احاطے میں گولی لگی اور وہ پھڑ پھڑا کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔

دانش اور بلقیس تو صدمے سے پاگل ہوگئے۔ گھر کا اور شجرے کا ایک ہی چراغ تھا' وہ بجھ گیا بلکہ بجھا دیا گیا۔ اس نے دشمن کے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر چیخ کر کہا۔ "امجد یار خان! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تیری بیٹی بھی حرام موت مرے گی۔ میرے بیٹے کا خون اُچھال کر تُو نے اپنے پورے خاندان کی تباہی کو دعوت دی ہے۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "کیا بکواس کررہے ہو؟ میں نے اور میرے آدمیوں نے تمہارے بیٹے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔"

"تم جھوٹ بول کر میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکو گے۔ میرے بیٹے کے صرف تم ہی دشمن ہو۔"

"لیکن تمہارے تو بے شمار دشمن ہیں۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ اور دوسرے دشمنوں کو ٹٹولو۔ کسی نے بڑی مکاری سے میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائی ہے۔"

جواد بھی اسپیکر سے امجد یار خان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی قسم کھا کر کہہ رہا تھا کہ اس نے کئی مہینوں سے رامش کو نہ تو دیکھا تھا اور نہ ہی رامش نے اس بیٹی کو پریشان کیا تھا پھر وہ کیوں خوامخواہ اس کی جان کا دشمن بن جائے گا؟

طالش تیموری اپنے مسلح گارڈز کے ساتھ رامش کی تجہیز و تکفین کے وقت آیا اور اس کی ہلاکت پر رسمی جملے ادا کیے۔ پھر وہ جانے لگا تو دانش نے کہا۔ "ہم دونوں بھائیوں کا حساب برابر ہوگیا۔ اب میری نسل بڑھانے والا بیٹا بھی نہ رہا۔ آپ کا کلیجا ٹھنڈا ہوگیا ہوگا۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو' کیا ہم نے تمہارے بیٹے کو ہلاک کیا ہے؟ اس کی ہلاکت سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟"

"یہ دیکھ کر آپ کے حسد اور جلاپے کو ٹھنڈک مل رہی ہے کہ میں بھی آپ کی طرح شجرِ بے ثمر رہوں گا۔"

وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے بولا۔ "ہم پر شبہ کرسکتے ہو لیکن ثابت نہیں کرسکتے کہ ہم نے دشمنی کی ہے۔"

جواد نے کہا۔ "ثابت کرنے کے لیے کون قانونی بکھیڑوں میں پڑے گا۔ رامش کا جو بھی قاتل ہے' اسے گولی کا جواب گولی سے ہی ملے گا۔"

اسی شام عارفہ نے دانش اور بلقیس سے تعزیت کی اور کہا۔ "تمہارے بھائی کا حکم ہے کہ ہم ماں بیٹے رحیم آباد کی کوٹھی سے باہر نہ جائیں۔ میں مجبور ہوں' وہاں نہیں آسکوں گی۔ ویسے آپ جلد ہی ہماری آخری رسومات ادا کرنے یہاں آئیں گے۔"

بلقیس نے پوچھا۔ "کیا تم اپنے اور حماد کے لیے خطرہ محسوس کررہی ہو؟"

"مجھے یقین ہے ہمارا آخری وقت آگیا ہے۔ اسی لیے ہمیں حویلی سے دور بھیج دیا گیا ہے۔ مجھے اپنی نہیں، حماد کی فکر ہے۔ اس کے لیے کیا کروں؟"

"اسے ہمارے پاس بھیج دو۔ میں تمہیں بھی وہاں نہیں رہنے دوں گی۔ بھائی جان سے بغاوت کا حوصلہ کرو اور ہماری پناہ میں آجاؤ۔"

"میں حوصلہ کروں گی تو میرے بیٹے کی شامت آجائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ بلقیس نے جواد سے کہا۔ "بیٹے! بھائی جان نے عارفہ بھابی پر مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔ وہ ماں بیٹے بے یار و مددگار ہیں ان کے لیے کچھ کرو۔ میں اپنے بیٹے کا صدمہ اُٹھا رہی ہوں۔ عارفہ بھابی کے بیٹے کی کسی طرح حفاظت کرو۔"

بلقیس نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا اور یہ کوئی نہ جان سکا کہ وہ چور دروازے سے آیا تھا۔ جھوٹ اور فریب ایک دن ضرور کھلتا ہے۔ اگر نہ کھلے تو اس کے بہتر نتائج کبھی حاصل نہیں ہوتے۔ بلقیس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ رامش چور راستے سے آیا تھا اور کوئی پھل دیے بغیر چلا گیا تھا۔

طالش اولادِ نرینہ کے معاملے میں ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ وہ پھر داشتاؤں اور کنیزوں کو آزمانے والا تھا۔ ان عورتوں کے لیے یہ انعام تھا کہ بیٹا پیدا کریں گی تو بیگم طالش تیموری بن جائیں گی۔ ورنہ مقررہ معاوضہ دے کر ان کی چھٹی کردی جائے گی۔

اُدھر یہ بات خاندان سے باہر پھیل رہی تھی کہ طالش تیموری نے رامش کو ہلاک کرایا ہے۔ وہ ہمیشہ سے الزامات اُٹھانے کا عادی تھا۔ ایسی باتیں سن کر ایک طرف تھوک دیا کرتا تھا۔

اس نے سوچا۔ "دانش اپنے اکلوتے بیٹے سے محروم ہوکر بے چارہ مظلوم ہوگیا ہے۔ یہ مناسب وقت ہے۔ ہمیں بھی حماد سے محروم ہوکر مظلوم کہلانا چاہیے۔ یوں بھی ہماری حویلی میں غیر ضروری سامان اور غیر ضروری رشتہ نہیں رہتا اور حماد کا وجود تو سراسر سر جھکا رہا ہے۔"

اس نے عارفہ کو فون کیا۔ وہ بولی "آپ نے اتنے دنوں بعد یاد کیا ہے۔ مجھے خوشی ہورہی ہے۔ کیا آپ بھی یہاں آئیں گے؟"

"ہم نے یہی کہنے کے لیے فون کیا ہے۔ رحیم آباد میں ایک کام نکل آیا ہے۔ ہم شام تک آرہے ہیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے رابطہ ختم کردیا۔ جھوٹے منہ ماں بیٹے کی خیریت بھی نہیں پوچھی۔ عارفہ اس روّیے کی عادی تھی۔ ان لمحات میں اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے دوسرے کمرے میں حماد کے پاس آکر کہا۔ "بیٹے! تم شام کو کہیں چلے جاؤ۔ تمہارے ابو آنے والے ہیں۔ میں تنہائی میں ان سے ضروری باتیں کروں گی۔"

"ضروری باتیں ضرور کریں۔ میں دوسرے کمرے میں رہوں گا۔ مجھے نادان بچہ نہ سمجھیں۔ میں آپ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

اس نے پریشان ہوکر بیٹے کو دیکھا۔ اس سے بحث کرنا فضول تھا۔ وہ اپنی ماں کو باپ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جانے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں آکر دانش سے فون پر رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ "آپ کے بھائی جان نے فون کیا تھا۔ وہ آج شام کو کسی وقت آرہے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"آپ خوامخواہ گھبرا رہی ہیں۔ کچھ نہیں ہوگا۔"

"آپ اپنے بھائی کو جانتے ہیں پھر بھی کہہ رہے ہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"ہماری آپ کی زندگی میں سب اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ بھائی جان کی مرضی سے نہیں ہوتا۔ آپ پریشان نہ ہوں، میں آرہا ہوں۔"

خدا کے بعد ایک دانش کا ہی آسرا رہ گیا تھا۔ اس سے امید تھی کہ وہ ماں بیٹے کو بھائی کے خونخوار ارادوں سے بچا سکے گا۔ جبکہ دونوں بھائی فطرتاً سفاک اور بے رحم تھے۔ ویسے عارفہ دیکھ رہی تھی کہ دانش کا مزاج بدل گیا ہے۔ رامش کی ہلاکت کے بعد وہ کسی ثبوت کے بغیر طالش کو قاتل ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم اس کا دشمن ہوگیا تھا۔

شام ہوگئی۔ دانش نہیں آیا۔ رات کی تاریکی پھیلتے ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔ حماد نے دروازہ کھولا تو طالش کا چہرہ اوور کوٹ کے اٹھے ہوئے کالر اور جھکے ہوئے فلیٹ ہیٹ میں چھپا ہوا تھا۔ وہ رات کی تاریکی میں چھپ کر آیا تھا۔

اس نے اندر آتے ہی دروازے کو بند کیا پھر ہیٹ کو اوپر اٹھایا اور کالر کو نیچے کیا۔ ایک ہاتھ جیب میں تھا۔ وہ ہاتھ بھرے ہوئے ریوالور کے ساتھ باہر آیا۔ حماد سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

عارفہ دوسرے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ ریوالور دیکھتے ہی سہم کر بولی۔ "آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ میری جان لے لیں۔ اسے بخش دیں۔ یہ جیسا بھی ہے آپ ہی کا خون ہے۔ اپنا خون نہ اچھالیں۔"

وہ نفرت سے منہ بنا کر بولا۔ "تم ماں بیٹے نے دشمنوں سے زیادہ دشمنی کی ہے۔ تم بائیس برسوں سے فریب دیتی آرہی ہو کہ ایک مرد بچہ دیا ہے۔ اور یہ نامراد ہمارا سر جھکا رہا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا اشتہار ہے کہ ہماری نسل آگے نہیں بڑھے گی۔"

عارفہ تیزی سے چلتی ہوئی بیٹے کے سامنے آکر ڈھال بن گئی وہ بولا۔ "یعنی پہلے تم مروگی پھر بیٹا۔۔۔"

اس نے اچانک ہی گولی چلائی۔ عارفہ کے حلق سے چیخ

نکلی لیکن وہ آخری چیخ نہیں تھی۔

گولی نہیں لگی تھی۔ وہ دوسری طرف گئی تھی۔ البتہ طالش کے حلق سے کراہیں نکلیں۔ اس کا ہاتھ زخمی ہوگیا تھا۔ ریوالور چھوٹ کر فرش پر آ گیا تھا۔

اس نے سہم کر دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں جواد اور دانش کھڑے تھے۔ وہ شام ہی سے آکر حماد کے کمرے میں چھپے ہوئے تھے۔ جواد نے سائلنسر لگا ہوا ریوالور دکھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ میری لائی ہوئی موت بے آواز ہوتی ہے۔ آج کے بعد کوئی معلوم کر سکے گا کہ موت کہاں سے آئی تھی اور آپ کو کہاں لے گئی؟“

دانش نے قریب آکر اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ”کہاں ہے میرا بیٹا؟ درندے! تو کیسا بھائی ہے۔ میری جوان اولاد کو کھا گیا۔“

وہ اسے دونوں ہاتھوں سے مارنے لگا۔ جواد نے دانش کو پیچھے ہٹا کر کہا۔ ”یہ دنیا والوں سے چھپ کر یہاں آئے ہیں۔ تاکہ ماں بیٹے کے قتل کا الزام ان پر نہ آئے۔ اب یہ اسی طرح چھپ کر دنیا سے جائیں گے۔“

اس نے طالش کے چہرے پر کوئی چیز اسپرے کی۔ وہ دوسرے ہی لمحے میں زمین پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔ اس دنیا سے اور اپنے آپ سے غافل ہوگیا۔ موت سے پہلے عارضی طور پر مر گیا۔

پھر پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ وہ اپنے آپ سے غافل رہا۔ پھر رفتہ رفتہ احساسات بیدار ہونے لگے۔ پہلے تو کچھ دھیمی دھیمی سی آوازیں سنائی دیں۔ درختوں کی ٹہنیاں ہواؤں کی زد پر ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں اور شور مچا رہی تھیں۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ احساسات کچھ اور بیدار ہوئے تو اس نے دیکھنا چاہا لیکن آنکھیں نہ کھول سکا۔

آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے تڑپ کر کچھ بولنا چاہا۔ منہ پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پھر معلوم ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں پیچھے کی طرف بندھے ہوئے ہیں۔ اور وہ نرم و ملائم گھاس پر پڑا ہوا ہے۔

دماغ نے چیخ کر کہا۔ ”وقت خود کو دہرا رہا ہے۔“

وہ اوں اوں کی آوازیں نکالتا ہوا گھاس پر لوٹنے لگا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اکثر ظالم جان لینے سے پہلے آنکھیں بند کر دیتے ہیں۔ بصارت چھین لیتے ہیں۔ منہ بند کر کے فریاد بھی نہیں کرنے دیتے۔

کبھی اس نے بھی تو یہی کیا تھا۔

وہ ادھر سے ادھر تڑپتے ہوئے تھک گیا۔ بے بسی سے ہانپنے لگا۔ پھر اسے اپنی ہی آواز سنائی دی۔ وہ بھاری بھرکم سرگوشی میں بول رہا تھا۔ ”اے! میں ہوں طالش تیموری...!“

پتا نہیں وہ کون تھا۔ طالش تیموری کے ہی لب و لہجے میں بول رہا تھا۔ ”ہم زبردست ہیں۔ ہمیں آج تک کوئی قانون گرفت میں نہیں لے سکا۔ اس لیے آج ہم نے خود کو گرفتار کیا ہے۔“

معلوم نہیں وہ کون تھا۔ طالش کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ خود ہی بول رہا ہے اور خود ہی سن رہا ہے۔ وہ کچھ بولنے کے لیے تڑپنے لگا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہم نے فاخرہ کو اسی طرح مجبور اور بے بس بنا دیا تھا۔ اب یہ طالش تیموری تمہیں سزائے موت دے رہا ہے۔

الزام یہ ہے کہ تم نے ایک بیٹا پیدا کرنے والی ماں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا...

الزام یہ ہے کہ تم نے نسل بڑھانے والے بیٹے کو اپنی ولدیت سے خارج کر دیا۔

الزام یہ ہے کہ تم نے دوسرے بھائی کی نسل بڑھانے والے رامش کو ہلاک کر دیا۔

الزام یہ ہے کہ تم جواد کی ماں کی طرح حماد کی ماں کو بھی ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ تم زندہ رہو گے تو نہ جانے کتنے بے گناہ مارے جاتے رہیں گے۔“

وہ کسمسا رہا تھا۔ اوں اوں کی آوازیں نکال کر کچھ بولنا چاہتا تھا۔ اسے کان کے قریب آواز سنائی دی۔ ”ذرا یہ آواز سنو۔ ایسی آوازیں تم خوب پہچانتے ہو۔“

ریوالور کے سیفٹی کیچ ہٹانے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ٹھائیں کی زوردار آواز کے ساتھ ایک گولی شانے میں آکر پیوست ہوئی۔ وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ کر ادھر سے ادھر ہوا۔ پھر دوسری اور پھر تیسری گولیاں چیخنے اور گونجنے لگیں۔ اس کا دم نکل چکا تھا۔ اس کے باوجود ریوالور چیختا چنگھاڑتا رہا۔ جب پوری گولیاں جسم میں اتر گئیں تب اس ویرانے میں سناٹا چھا گیا۔

وہاں سے بہت دور جواد ایک جیپ کار میں اسٹیئرنگ سیٹ پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دانش آہستہ آہستہ چلتا ہوا، خالی ریوالور کو رومال سے صاف کرتا ہوا اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا پھر وہ، گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور اس مقام سے دور ہوتی چلی گئی۔

☆

قطرہ خون

سلیم انور

باہمی ملاقاتیں اور آشنائیاں کبھی قلبی رفاقت میں نہیں ڈھلتیں... وہ دونوں بھی ایک دوسرے سے شناسائی کا دعویٰ رکھتے تھے مگر... مفاد پرستی اور دھوکا دہی سے دور ایک مجرم کا فسانہ...

خون کی دستیابی و تلاش میں سرگرداں ایک سراغرساں کی کوشش

کامپٹن شہر اس قسم کا علاقہ نہیں جہاں مجھ جیسا یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، لاس اینجلس کا کوئی پروفیسر عام طور پر وزٹ کرتا ہو۔ اس وزٹ کے لیے مجھ سے اسی علاقے کے مارکس بروکس نامی شخص نے رابطہ کیا تھا۔ وہ کامپٹن کا رہائشی تھا۔

میرا نام جولیس کنگ ہے لیکن پریس کے لوگوں نے مجھے ”معصوم شخص“ کا لقب دے رکھا ہے۔ اس لقب کی ایک وجہ ہے۔ وہ یہ کہ میں غلط مجرم قرار دیے گئے افراد کو بری کرانے کا کام سرانجام دیتا ہوں۔

یہ طرز فارنسک سائیکالوجسٹ، میری مہارت حقیقی انصاف کے حصول میں مددگار ثابت ہوتی تھی۔ آپ اسے میرا مشغلہ، مصروفیت، پیشہ، روزگار یا اندر کی آواز کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ چاہے جو بھی کہیں، میرے یہاں کامپٹن آنے کی وجہ یہی تھی۔

میں ایک سیاہ فام ہوں لیکن میرا ٹوئیڈ جیکٹ، چمڑے کے بغیر ایڑی کے جوتے اور 1957ء ماڈل کی شیورلیٹ کورویٹ کار مجھے نمایاں کر رہے تھے۔ مجھے اس بات کا احساس اس شخص نے کرایا جو مارکس بروکس کے دیے ہوئے پتے کے سامنے پارک کی ہوئی ایک شیورلیٹ..... کار کے برابر میں کھڑا ہوا تھا۔

''تم کون ہو؟ کیا یہاں اپنی فینسی کار میں اتراہٹ کا اظہار کرنے کے لیے آئے ہو؟ یا یہ جتانے آئے ہو کہ ہم کمتر لوگوں کے مقابلے میں تم کتنے رئیس ہو؟'' یہ جملے اس ہٹے کٹے شخص نے ادا کیے جو جینز کے اوپر ایک بڑا سا رومال پہنے ہوئے تھا۔ اس کے جسم پر کوئی قمیص نہیں تھی۔ مجھے اس کے سینے پر چند ٹیٹو کے نشانات دکھائی دیے جو جیل میں سزا پانے والے قیدیوں کے جسم پر گودے جاتے ہیں۔

''مجھے یہاں مارکس بروکس نے مدعو کیا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''شاید تم اسے جانتے ہوگے؟''

''مارکس... ہاں، یقیناً جانتا ہوں۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ تم جیسے اکل ٹام سے مارکس کو کوئی کام ہوسکتا ہے۔''

اس شخص کے حقارت آمیز لہجے نے مجھے جھنجلا دیا۔ لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ میرا کوئی بھی جارحانہ قدم مجھے چند امکانی ٹانکوں کے علاوہ اور جسمانی چوٹیں بھی پہنچا سکتا ہے۔ گو میں بھی خاصا قدآور اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک ہوں اور میں کالج میں غضب کا فٹ بالر رہ چکا ہوں لیکن کسی مسلح اور طاقتور غنڈے سے ٹکر لینا جس کا تعلق کسی ٹولے سے ہو، میری سرشت میں شامل نہیں۔ سو میں نے اس کی باتوں کو درگزر کرنے کو ترجیح دی۔

''میرا خیال ہے، یہ معاملہ میرے اور مارکس کے مابین ہے۔'' میں نے بلااشتعال جواب دیا۔

میرا یہ جواب اسے پسند نہیں آیا۔ وہ حملہ کرنے کے لیے مجھ پر لپکا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے الفاظ کے انتخاب میں احتیاط سے کام نہیں لیا تھا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنی جسمانی قوت کا عملی مظاہرہ کرتا، ایک مضبوط ہاتھ نے اس کا بازو دبوچ لیا۔

''نرمی سے کام لو، ٹاڑون۔'' نووارد نے کہا جس نے مجھ پر حملہ کرنے والے کا ہاتھ روکا تھا۔ ''یہ شخص صحیح کہہ رہا ہے۔ میں نے اسے یہاں بلایا ہے۔ اب پلیز... ہمیں تنہا چھوڑ دو۔''

ٹاڑون نے نامی اس غنڈے نے یہ سن کر اپنا بازو چھڑایا اور فٹ پاتھ پر غصے سے تھوکتا ہوا وہاں سے ایک طرف چل دیا۔

''مارکس بروکس۔'' میرے نجات دہندہ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں نے اس سے مصافحہ کیا۔ اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ مجھے اس کی جسمانی طاقت کا اندازہ ہوگیا۔

''میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم ہی مارکس بروکس ہو۔'' میں نے کہا۔ میری اس شخص سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا دیا۔

''تم نے کہا تھا کہ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں۔''

''تو پھر کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تمہاری کار میں بیٹھنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' مارکس بروکس نے پوچھا۔

''بڑی خوشی سے۔'' میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

''عمدہ کار ہے۔'' مارکس بروکس نے کہا۔

''شکریہ! اسے عمدہ حالت میں رکھنے کے لیے مجھے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''دکھائی دے رہا ہے۔''

''میرا خیال ہے تم نے مجھے میری کار کے بارے میں تعریفیں کرنے کے لیے یہاں مدعو نہیں کیا ہے۔ یہ بتاؤ، میں تمہارے کیا کام آسکتا ہوں؟'' میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''تم جو کام کرتے ہو، میں اس کے بارے میں باخبر رہتا ہوں۔'' مارکس بروکس نے کہنا شروع کیا۔ ''غلط سزا پانے والوں کو جیل سے رہا کرانا۔ ویل! میرے پاس بھی ایک کیس ہے جو تمہاری توجہ کا مستحق ہے۔ شاید تم نے اس کیس کے بارے میں سنا ہو، شاید نہ سنا ہو۔''

''مجھے تفصیل بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ ولیز آرم اسٹرانگ نامی ایک شخص کو ڈکیتی کے دوران ایک .... اسٹور کلرک پر مجرمانہ حملہ اور اسے قتل کرنے کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔ اس نے یہ واردات فرانسس اسمتھ نامی ایک اور غنڈے کے ساتھ مل کر سرانجام دی تھی۔ فرانسس اسمتھ کو مسلح ڈکیتی کے جرم میں جیل بھیجا گیا تھا اور وہ گزشتہ سال رہا ہوگیا۔ ولیز آرم اسٹرانگ موت کی سزا پانے والوں کی بیرک میں پھانسی کا انتظار کر رہا ہے۔'' یہ کہہ کر مارکس بروکس نے قدرے توقف کیا۔

میں خاموشی سے اس کے مزید تفصیل بیان کرنے کا منتظر تھا۔

وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''جیل میں فرانسس اور میں ایک ہی کوٹھڑی میں تھے۔ ایک روز [illegible]

اگل دیا کہ ڈکیتی کے دوران .... اسٹور کلرک کو ریپ اور قتل اس نے کیا تھا لیکن وہ موت کی سزا سے بچ نکلا اور اس کے ساتھی ولیز آرم اسٹرانگ کو موت کی سزا ہوگئی۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ لیبارٹری میں ان دونوں کا ڈی این اے تبدیل ہو گیا تھا۔ مقتول کلرک کے جسم پر جو اسپرم پایا گیا تھا، اسے تجزیے کے دوران ولیز کا قرار دیا گیا تھا جبکہ یہ فرانسس کا ہونا چاہیے تھا۔ میں خود بھی چند ہفتے قبل ہی جیل سے رہا ہوا ہوں اور یہ کہانی برسوں سے مجھے کچوکے لگا رہی ہے۔ میں نہ تو کسی کا دوست ہوں اور نہ ہی یقینی طور پر کسی کا ہمدرد۔ لیکن مجھے یہ غلط لگ رہا ہے کہ ولیز کو اس جرم میں پھانسی ہو جائے جس کا مرتکب فرانسس ہوا تھا۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ نہ صرف مجھ سے رابطہ کیا بلکہ تمام حقیقت میرے گوش گزار کر دی۔'' میں نے مارکس سے کہا۔

''اب میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے۔'' مارکس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''میں کسی پرائیویٹ لیبارٹری سے دوبارہ ٹیسٹ کرانے کا انتظام کرتا ہوں۔ اس قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''یہ کسی کو مت بتانا کہ یہ سب کچھ تم نے مجھ سے سنا ہے۔'' بروکس نے کہا۔ ''ورنہ میرے لیے اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔''

''فکر مت کرو۔ تمہارا راز میرے پاس محفوظ رہے گا۔'' میں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے وعدہ کیا۔

وہ میری کار سے اتر گیا۔

میں واپس لاس اینجلس اپنی یونیورسٹی کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

میرا دفتر یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، لاس اینجلس میں واقع تھا۔ میں نے اپنے دفتر سے ایک پرائیویٹ فارنسک لیبارٹری کو فون کیا جسے میں اس قسم کے کیسوں میں استعمال میں لاتا تھا۔ ان کے کام کی فیس میں اس رقم سے ادا کرتا تھا جو مجھے کتابوں اور فلموں کی ڈیل سے حاصل ہوتی تھی۔ میرے کام کی بڑی انٹرٹینمنٹ ویلیو تھی اور لوگ میرے حقوق کی ادائی کے لیے رضامند ہوتے تھے۔

میں اس کیس کی فائل حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔

چونکہ ریپ اور قتل کی اس واردات کا کوئی عینی گواہ

نہیں تھا اس لیے یقینی امکان یہی تھا کہ لیبارٹری میں تجزیے کے وقت غلطی ہوگئی تھی اور ویلز کو مجرم قرار دیے جانے کے غیر منصفانہ فیصلے کی ذمے دار وہ لیبارٹری تھی جہاں ان دونوں ڈکیتوں کے اسپرم ٹیسٹ کیے گئے تھے۔

مجھے اندازہ تھا کہ کرائم سین سے ڈی این اے کا حصول کچھ وقت لے لے گا لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے کامیابی حاصل ہوجائے گی۔ اس لیے کہ میں ہمیشہ ہی کامیاب رہتا تھا۔

اب مجھے ویلز اور فرانسس دونوں کے ڈی این اے درکار تھے۔ ویلز کا ڈی این اے حاصل کرنا کوئی پرابلم نہیں تھا۔ وہ خوشی خوشی مدد کے لیے تیار ہوجاتا۔ البتہ فرانسس کا ڈی این اے حاصل کرنا خاصا دشوار تھا۔ اس بات کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا اور اس کا حصول لازمی تھا تاکہ حقیقت ثابت کی جاسکے۔

اتنے میں میرے دفتر کا دروازہ کھلا اور نفیس سوٹ پہنے ہوئے ایک سیاہ فام اندر داخل ہوا۔ وہ ناراض لگ رہا تھا اور اس کے چہرے سے کرختگی عیاں تھی۔

میں اس کی تصویر اپنی فائلوں میں دیکھ چکا تھا، اس لیے اسے پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

”ہیلو فرانسس! تم سے بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل ہوگیا۔“ میں نے کہا۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میرے بارے میں اسے ٹائرون نے بتایا ہوگا جس سے کامپٹن میں میری مڈبھیڑ ہوئی تھی۔

وہ میری میز پر آگے کی جانب جھکا اور میری قمیص پکڑ کر مجھے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اس کا غضب ناک چہرہ میرے چہرے کے مقابل آگیا۔

”تم جانتے ہو کہ تم کیا کر رہے ہو؟“ وہ غرایا۔ ”ان معاملات میں دخل اندازی کر رہے ہو جن سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

میں نے اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ ”کیا تم جانتے نہیں... معصوم اور بے گناہ لوگوں کو جیل سے رہائی دلانا میرا مقصد ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

اس نے غصے سے اپنی انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں۔ اس معاملے سے دور رہو۔“

میں مسکرا دیا۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا کلبلا رہا تھا۔

”اور اگر میں اس معاملے سے دور نہ رہا تو؟“ میرا لہجہ اسے اشتعال دلانے کے لیے کافی تھا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جیسا نابکار مجھے اپنے کام سے باز رکھ سکتا ہے؟ شہدے کہیں کے۔“

اس نے جواباً مجھ پر گھونسے سے وار کیا۔

میں پہلے سے تیار تھا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ سے اس کا وار روکا اور اپنے داہنے ہاتھ کا گھونسا پوری قوت کے ساتھ اس کی ناک پر جڑ دیا۔ ہڈی کے چٹخنے کی آواز سنائی دی اور میرا گھونسا فرانسس کے خون میں تر ہوگیا۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ جاری ہوگیا تھا۔

وہ ضرب پڑتے ہی لڑکھڑاتا ہوا پیچھے چلا گیا۔

اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے کیمپس کے سیکیورٹی گارڈز کو آواز دی اور خود کو اس کے ایک اور وار کے لیے تیار کرلیا۔

لیکن ٹوٹی ہوئی ناک اور اس سے بہتے ہوئے خون نے فرانسس کو قدرے ڈھیلا کردیا تھا۔ وہ مجھ پر دوبارہ حملہ آور ہونے کی پوزیشن میں نہیں لگ رہا تھا۔ البتہ میں اپنی جگہ چوکنا تھا اور اس کے وار کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

اتنے میں کیمپس سیکیورٹی کے دو قوی ہیکل گارڈز اندر آگئے۔ انہوں نے فرانسس کو بازوؤں سے جکڑ لیا اور زبردستی گھسیٹتے ہوئے میرے دفتر سے باہر لے گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں خیریت سے ہوں اور مجھے کوئی گزند تو نہیں پہنچی؟

میں نے انہیں یقین دلا دیا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا اور میں بخیریت ہوں۔ اس دوران فرانسس کی زبان میرے لیے مغلظات بکتی رہی۔

مجھے اس کی بدکلامی کی پروا نہیں تھی۔ یقیناً آپ ہر کسی کے لیے تو معروف یا مقبول نہیں ہوسکتے۔

میری مٹھی پر موجود فرانسس کا خون ضروری ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے کافی تھا۔ مارکس بروکس کی کہانی سچ ثابت ہوگئی۔ فرانسس کا ڈی این اے اس ڈی این اے سے میچ کر گیا جو جائے واردات پر مقتولہ کے جسم پر پایا گیا تھا۔

فرانسس کے خلاف جرم ثابت ہوگیا اور ویلز کو جیل سے رہائی مل گئی۔ میرا نام ایک بار پھر لاس اینجلس ٹائمز کے صفحۂ اول کی زینت بن گیا۔

میرا کام جو بھی ہے، اسے اندر کی آواز کہہ لیں یا میرا مشغلہ... لیکن یہ اس بات پر مائل رہتا ہے کہ عدل و انصاف کا بول بالا رہے!

☆

مغرب زدہ ماحول میں کب... کیسے اور کیا ہوجائے کچھ نہیں کہا جاسکتا... ان کا ماحول... لمحہ بھر میں ان کے جذبات کو کشیدہ، کثیف اور وحشی بنا دیتا ہے... کچھ ایسے ہی ماحول میں پروان چڑھتی مغرب زدہ کہانی... جس کے ہر کردار کے پیچھے ایک انوکھا چہرہ چھپا ہوا تھا... ایڈونچر پسندوں کے لیے ایک تیز رفتار پُرتجسس تحریر۔

فیشن گزیدہ

سیریناراض

کبھی کبھی خوش نصیبی حادثوں کی صورت میں وارد ہوتی ہے... ایسے ہی خوش نصیبوں کا ملاپ

میں کافی دیر سے اس کوشش میں تھی کہ دروازہ کھلے تو اندر جاکر اپنے کلائنٹ تک پہنچوں مگر دروازہ کھلنا تو دور کی بات کم بخت بل بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ لاس ویگاس کی ڈیزرٹ لیک ریزیڈنسی نامی اس پوش سوسائٹی کا سیکیورٹی گارڈ تھا اور ہمیشہ میکانکی دروازے کے پیچھے مجھے مسکراتا نظر آتا مگر آج نہ جانے وہ بھی کہاں مر گیا تھا۔ کلائنٹ کا چار ہندسوں کا انٹرکام نمبر بھی ملایا مگر اسے بھی کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔ میں کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر بلیک بیری نکالنے لگی۔ امکان تھا کہ کلائنٹ کی معلومات میں دروازہ کھولنے کا کوڈ بھی ہو۔ عموماً میرے کلائنٹ یہ کوڈ بھی مجھے نوٹ کروا دیتے تھے تاکہ ان تک پہنچنے میں آسانی رہے۔ میں کافی لمبا فاصلہ طے کرکے یہاں پہنچی تھی اور اب ہرگز مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ بند

دروازے کو وجہ مان کر کلائنٹ سے ملے بغیر لوٹ جاؤں۔ ویسے بھی مجھے ہر حال میں مسز روزی روزنٹین سے ملنا تھا۔ ملے بغیر جانے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

جیسے ہی میں نے بلیک بیری نکالا، ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور میری نگاہ خود بخود سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ عمارت کا خودکار خارجی سلائڈنگ گیٹ کھل رہا تھا۔ میں نے بلیک بیری گود میں ڈالا، گاڑی اسٹارٹ کی اور جلدی سے گیٹ کے قریب جا کر روک دی۔ میری کوشش تھی کہ جیسے ہی اندر والی گاڑی باہر نکلے، میں تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے اندر چلی جاؤں۔ دروازہ پوری طرح کھلتے ہی سیاہ شیشوں والی چمچماتی سبز رنگ کی کراؤن وک کار باہر نکلی۔ گاڑی کون چلا رہا تھا اور اس میں کون سوار تھا... یہ نہ تو نظر آ رہا تھا اور نہ ہی مجھے یہ جاننے میں دلچسپی تھی۔ جیسے ہی گاڑی گیٹ سے باہر ہوئی، میں نے تیزی سے نئے ماڈل کی سرخ شیورلیٹ آگے بڑھائی اور نہایت مہارت سے، بند ہوتے گیٹ سے گاڑی اندر لانے میں کامیاب ہوگئی۔

جب داخلی سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی تو مجھے بل نظر آیا، وہ گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے رسماً ہاتھ اٹھا کر ایک دفعہ ہلایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ دوسری بار اس نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ میں جانتی تھی کہ دو بار ہاتھ اٹھا کر استقبال کرنا اس کی عادت تھی مگر میں نے اس پر سوچنے میں اپنا وقت برباد نہیں کیا۔ مجھے کلائنٹ سے ملنے میں دلچسپی تھی۔ ان کا سامان پہنچانا اور بل وصول کرنا پہلی ترجیح تھی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ آج بل کی وصولی بہت اہم ہے۔ میرے کریڈٹ کارڈ کی گنجائش اب مزید بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اس کی وجہ میرا وہ کلائنٹ تھا جس نے بھاری رقم کا چیک روک لیا تھا اور مجبوری میں مجھے کریڈٹ کارڈ سے تمام ادائیگی کرنا پڑی تھی مگر مسز روزی ایسی نہ تھی۔ وہ فوراً بل ادا کرتی تھی۔ میری گاڑی میں اس کی بیٹی کا عروسی لباس رکھا ہوا تھا، ساتھ ہی اس کے نئے ڈریس کے لیے بھی کچھ ڈیزائن تھے جس کے عوض مجھے چیک وصول کرنا تھا۔ رقم بھاری تھی۔ اس ادائیگی کے بعد میرے کریڈٹ کارڈ کا سارا بوجھ ختم ہو سکتا تھا۔ ساتھ ہی دوسرے تمام چھوٹے موٹے مالی مسائل بھی نمٹ جاتے۔

میں اس وقت لاس ویگاس کے سب سے مہنگے علاقے میں تھی، جہاں اصلی دولت مند رہتے تھے۔ میں ان کے لیے نت نئے ڈیزائن کے مہنگے ترین ملبوسات فراہم کرنے والی کمپنی کی کنسلٹنٹ تھی جس میں تنخواہ سے زیادہ کمیشن ملتا تھا۔ کئی کلائنٹ ایسے تھے کہ جو کمپنی کو بیچ میں لائے بغیر مجھ سے خدمات لیتے تھے۔ مسز روزی بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھیں۔

گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ مسز روزی کا آرڈر پہنچا کر چیک وصول کرتے ہی چمپت ہو جاؤں گی۔ میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے پریشان ہو جاتی تھی۔ جیسے کہ گیٹ کیوں نہیں کھلا، فون اب تک کیوں اٹینڈ نہیں ہوا... اور آج کے دن تو اس طرح کی مصیبتوں سے کئی بار پالا پڑا تھا مگر اب میں بہت تھک چکی تھی۔

اگلے ہفتے مسز روزی کی بیٹی کی شادی تھی اور کئی ہفتوں کی بحث اور ترمیم کے بعد آخر اس کا عروسی لباس تیار ہو چکا تھا۔ اب میں وسیع و عریض چار دیواری میں بنے محل نما گھروں کے درمیان سے گزرتی سڑک پر گاڑی چلاتی ہوئی اس چھوٹی سی پہاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی جس کے برابر مسز روزی کا گھر تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ مسز روزی نے آج مزید چند لباس کا آرڈر دینا تھا جنہیں وہ بیٹی کی شادی کے بعد ہونے والی پارٹیوں میں پہننا چاہتی تھیں۔ ان کے اسکیچ میں بنا کر لائی تھی اور کپڑوں کے نمونے بھی ساتھ تھے۔

میں نے مسز روزی کے شان دار گھر کے سامنے لگے فوارے کے قریب پہنچ کر گاڑی روکی اور پچھلی سیٹ پر رکھے عروسی لباس کا بڑا سا پیکٹ، نئے لباس کے ڈیزائن، اسکیچ بک اور پیمائش والی نوٹ بک سنبھالی اور گاڑی سے باہر نکل آئی۔

میں لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے داخلی دروازے پر پہنچی اور ڈور بیل پر انگلی رکھ کر دبا دی۔ چند سیکنڈ تک گھنٹی دبائے رکھنے کے بعد چند قدم پیچھے ہٹی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی مگر جب امید سے بھی زیادہ وقت گزرنے کے باوجود دروازہ نہ کھلا تو میں نے ایک بار پھر گھنٹی بجائی۔ دروازہ نہ کھلنے کے باعث میرے ذہنی تناؤ میں ایک بار پھر اضافہ ہونے لگا.... میں جانتی تھی کہ مسز روزی کے گھر میں روبی این اور جیمس نام کے دو بوڑھے سیاہ فام ملازمین تھے مگر مجھے حیرت تھی کہ اس کے باوجود اب تک دروازہ نہیں کھلا تھا۔

کافی دیر تک دروازہ نہ کھلا تو میں سمجھی کہ شاید دونوں ملازمین چھٹی پر ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں گھر کے عقبی حصے کی طرف بڑھی۔ میں اس گھر میں کئی بار آ چکی تھی جانتی تھی کہ عقبی حصے میں سوئمنگ پول ہے۔ یہی سوچ کر اس طرف جا رہی تھی کہ شاید مسز روزی سوئمنگ کر رہی ہوں اس لیے کسی نے گھنٹی سنی ہی نہ ہو۔ ویسے بھی مجھے مسز روزی سے نہیں، اپنے چیک سے غرض تھی جس کے لیے میں کہیں جا سکتی تھی، شاید جہنم میں بھی۔ یہ تو پھر بھی مسز روزی کا محل نما بنگلا تھا۔

عقبی حصے میں واقع سوئمنگ پول بہت بڑا تھا اور اس طرف باڑ بھی نہیں تھی بلکہ سڑک کے اختتام پر بنے اس گھر کے عقبی حصے کے اردگرد خودرو جھاڑیوں سے قدرتی باڑ بن گئی تھی۔ میں جھاڑیاں پھلانگتے ہوئے اندر پہنچی' چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

''مسز روزی روزنٹین، مسز روزی...'' میں نے مہذب انداز میں پکارا۔ جواب میں خاموشی رہی۔ ''کیا مسز روزی ہیں؟'' مگر اس بار بھی جواب ندارد تھا۔ وہاں بالکل خاموشی طاری تھی۔ ''ہنی...'' میں نے اس کی جواں سال بیٹی کو پکارا مگر جواب اس بار بھی نہیں ملا۔

میں نے دو قدم آگے بڑھائے۔ اب تک مجھے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ میں درختوں کی قطار سے ہو کر سوئمنگ پول تک جا رہی تھی مگر وہاں مجھے رنگین پٹیوں والی بڑی سی چھتری اور نیچے رکھی خالی میز اور کرسیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں چند قدم مزید آگے بڑھی اور جونہی درختوں کی قطار کے نیچے پہنچی، اچانک مجھے شدید ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ حالانکہ آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور دن بھی گرم تھا مگر پھر بھی ٹھنڈک کا احساس غیر معمولی تھا۔

میں سوئمنگ پول کے قریب پہنچی تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ کوئی مرد پیٹ کے بل سوئمنگ پول کے شفاف پانی میں بے ڈھب انداز سے تیر رہا تھا۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ساکت تھا مگر تیز ہوا سے، بہت بڑے سوئمنگ پول کے پانی میں اٹھتی چھوٹی چھوٹی لہریں اسے خود بخود تیرا رہی تھیں۔ یہ بھی حیرت کی بات نہیں ہوتی مگر کوئی شخص مکمل سوٹ اور جوتے پہن کر سوئمنگ نہیں کرتا جبکہ وہ شخص مکمل لباس پہنے ہوئے تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے تھوڑی سی حیرانی ہوئی۔ مگر یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ بھئی دولت مند لوگ ہیں، کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر آواز دی لیکن اس بار مسز روزی کو نہیں اس کے شوہر کو پکارا۔ ''مسٹر روزنٹین۔'' چند لمحے گزرنے کے بعد بھی جواب نہ ملا تو پھر پکارا۔ جواب میں پھر وہی سناٹا۔

میں جلدی سے آگے بڑھی۔ ہاتھ میں پکڑا سامان، بغل میں دبایا ہوا عروسی لباس کا ڈبا، قیمتی چمڑے کا بنا ہوا پرس میز پر رکھا اور سوئمنگ پول کے کنارے، گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے اپنی طرف گھسیٹنے کے بارے میں سوچنے لگی مگر وہ کافی دور تھا اور بدستور ادھر سے ادھر تیر رہا تھا۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا۔ ایک دم مجھے لگا کہ یہ تو مسٹر روزنٹین ہی ہو سکتے تھے۔ میں دو چار بار ان سے سرسری طور پر مل چکی تھی۔ وہ کچھ ویسا ہی لگ رہا تھا۔ جھٹکا لگنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ پیٹ کے بل تیرتے شخص کے سر پر سرخ رنگ کا دھبا تھا یا وہاں کچھ ایسی ضرب لگی تھی جس سے آہستہ آہستہ خون بہہ رہا تھا۔ پانی اسے مسلسل دھو رہا تھا مگر خون پھر بھی بہہ رہا تھا۔

میں نے اسے کھینچ کر باہر نکالنے کا ارادہ ترک کیا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ خالی ہاتھوں اسے کھینچ کر باہر نکالنا کم از کم میرے لیے بہت مشکل ہے۔ میں اٹھی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ مجھے المونیم کی بنی اس لمبی سی سلاخ کی تلاش تھی جس کے کنارے لگے چھوٹے سے جال کے ذریعے سوئمنگ پول کے پتے وغیرہ صاف کیے جاتے ہیں۔ میں ہک کے ذریعے اسے کھینچ کر اتنے قریب لانا چاہتی تھی کہ ہاتھ سے پکڑ کر باہر نکال سکوں۔ ویسے بھی میں کپڑوں سمیت پانی میں کودنے کے حق میں نہیں تھی اور کسی دوسرے کے گھر میں کپڑے اتار کر بنا اپنی مرضی کے تیرنا مجھے پسند نہیں تھا۔ اتفاق سے وہ سلاخ مجھے مل گئی۔ میں نے سلاخ کے دوسرے سرے پر لگے ہک کے ذریعے اسے کھینچنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ میں پول کے کنارے بیٹھ کر اسے ہک سے کھینچنے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ پہنچ سے بہت دور تھا۔ اتفاق سے اسی دوران میری مخالف سمت سے تیز ہوا کا جھونکا آیا جس سے پانی میں مزید چھوٹی چھوٹی لہریں بنیں اور اس کا رخ میری طرف ہو گیا۔ اب مجھے لگا کہ اسے پکڑنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ اس کا سر میری طرف تھا۔ میں اس کے کوٹ میں ہک پھنسا کر بس کھینچنے ہی والی تھی کہ اچانک میرا توازن بگڑ گیا۔ خوش قسمتی سے میں پانی میں گرنے سے تو بچ گئی مگر بدقسمتی سے وہ سلاخ پول میں جا گری۔ اب مجھے یقین تھا کہ اسے نکالنا میرے لیے ممکن نہیں۔ اچانک میرے دماغ میں نیا آئیڈیا آیا جس پر عمل کرنے کے لیے میں نے جیب سے فون نکالا اور ریسکیو نائن ون ون نمبر ملانے لگی۔

''اب پیشہ ور لوگوں کو معاملہ سنبھالنے دو۔'' نمبر ملاتے ہوئے میں بڑبڑائی اور پول میز کی طرف بڑھی، سامان اٹھایا اور گھر کے فرنٹ کی طرف چل دی۔ فون میرے کان سے لگا تھا اور میں آپریٹر کو ہر بات تفصیل سے بتا رہی تھی۔ اسی دوران جب میں گھر کے وسیع عقبی حصے سے باہر نکلنے کے لیے چھوٹا سا موڑ مڑی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ وہاں ایک پولیس والا تھا اور اس کی پستول کی نال میرے سر کی طرف تھی۔ فون میرے کان سے لگا ہوا تھا۔

''زمین پر جھک جاؤ۔'' اس نے چلا کر حکم دیا۔ میرے ایک ہاتھ میں فون اور دوسرے میں اسکیچ اور نوٹ بک جبکہ

بغل میں عروسی جوڑے کا ڈبا دبا ہوا تھا۔ ”ریسکیو سے بات کر رہی ہوں۔“ میں نے منمنا کر جواب دیا۔ دوسری طرف آپریٹر بدستور لائن پر تھا۔

”بند کرو فون اور زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔“ وہ پھر دہاڑا۔ میں نے فون بند کیا۔ اسکیچ، نوٹ بک، ڈریس کا ڈبا زمین پر رکھا۔ فون کوٹ کی جیب میں ڈالا اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کا حکم ماننے میں ہی مجھے عافیت نظر آرہی تھی۔

”سر اور نیچے کرو۔“ وہ حکم صادر کرتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھا۔ ”دونوں ہاتھ بھی اوپر اٹھاؤ۔“

اس وقت میرے ہاتھوں کی پوزیشن ایسے تھی جیسے گھڑی کی سوئیاں پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی ہونے کا پتا دیتی ہیں۔ اس کی پستول کی نال میرے ماتھے کے عین بیچوں بیچ تنی ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں نے دوسرا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ چند پولیس والے دندناتے ہوئے سامنے سے آئے اور پیچھے جا کر میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنانے لگے۔

”کیا ہوا، میں نے کیا کیا ہے... میں نے ہی ایمرجنسی فون کیا تھا۔“ سچویشن کو یوں بدلتے دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

”اپنا منہ بند رکھو۔“ وہ موٹا بھدا سا پولیس والا دہاڑا۔

”وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے، کون ہے؟“

”کون؟“ میں نے روہانسے لہجے میں کہا۔

”وہی جو اس واقعے کا متاثر ہے۔“ وہ پھر دہاڑا۔

”پتا نہیں۔“ چند لمحے پہلے تک مجھے صرف اپنے بل کی فکر تھی مگر اب تو میں خوامخواہ ملزم بننے جارہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ میں جہاں بیٹھی تھی، وہاں سے سوئمنگ پول صاف نظر آرہا تھا۔ دو پولیس والے پول میں جھانک رہے تھے۔ ”سنو...“ ان میں سے ایک چلایا۔ ”سپروائزر اور سراغ رساں کو فوراً پہنچنے کا پیغام بھیجو۔“

”شاباش...“ میں نے بندوق تانے کھڑے پولیس والے سے کہا۔ ”اسے پانی سے نکالو اور خود پوچھ لو کہ وہ پول میں کیا کر رہا ہے، وہی بتائے گا۔ میں... میں تو خوامخواہ...“

”بکواس بند کرو۔“ وہ دوسرے ہاتھ سے وائرلیس سیٹ سنبھالتے ہوئے چلایا۔ اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ مجھے کچا چبا جائے گا۔

”یہ اتارو، میری کلائی میں درد ہو رہا ہے؟“ میں نے کمر کے پیچھے بندھے ہاتھوں کو ہلاتے جلاتے ہوئے کہا۔

”عادت ہو جائے گی، ابھی نئی نئی لگی ہے نا اس لیے درد ہو رہا ہے۔“ اس نے نہایت خبیث انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”پلیز...“ میں منت سماجت پر اتر آئی۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا۔“

یہ سنتے ہی وہ میرے قریب آیا اور اپنا گندے موٹے موٹے جوتوں والا پاؤں اٹھایا اور زور سے میری کمر پر لات ماری۔ میں درد سے کراہتے ہوئے دُہری ہو گئی۔ میرا سر زور سے زمین پر لگا تھا۔ ”اب ایک لفظ بھی بولا تو منہ سی دوں گا۔“ وہ غصے سے دہاڑا۔ ”ابھی پتا چل جائے گا تم نے کیا گل کھلائے ہیں۔“

میں چند لمحے تک یونہی پڑی رہی اور جیسے ہی اپنے جسم کا سارا بوجھ گھٹنوں پر ڈالتے ہوئے دوبارہ سیدھی ہوئی، زناٹے سے ایک کار قریب پہنچی اور زوردار بریک لگائے۔ اگلے ہی لمحے اس میں سے ایک شخص برآمد ہوا۔ مجھے لگا کہ ہو سکتا ہے یہ شخص سراغ رساں ہو اور اس کے آنے سے شاید مجھے اس تکلیف سے نجات مل جائے مگر میں نہیں جانتی تھی کہ ابھی اور بہت کچھ ایسا ہونے والا ہے جس کے آگے یہ تکلیف مجھے کسی حد تک راحت محسوس ہوگی۔

وہ واقعی سراغ رساں تھا۔ اس کے حکم پر مجھے اٹھا کر اسکواڈ کار کے پچھلے حصے میں سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ میں نے چالیس منٹ وہاں نیم دراز حالت میں گزارے۔ وہاں شدید بدبو تھی جس کے باعث میرا دماغ پھٹ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کبھی گاڑی کی دھلائی کروائی ہی نہیں گئی تھی۔ میری اپنی حالت بھی بہت بری تھی۔ کپڑے، ہاتھ، منہ... سب کچھ اتنا گندا تھا کہ دل کر رہا تھا فوراً غسل خانے میں گھسوں اور رگڑ رگڑ کر نہاؤں... مگر کیا کرتی، سب سے بڑی مشکل تو ہتھکڑی اور پولیس کی حراست تھی۔ تقریباً چالیس منٹ گزرنے کے بعد سراغ رساں مائر میرے پاس آیا۔ اسپورٹس کوٹ میں ملبوس افسر کو دیکھ کر میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ اور بات ہے کہ کلائی پشت پر بندھے ہونے کے باعث میری کمر دُہری ہو رہی تھی۔ درد بھی بہت تھا۔

”پوچھ گچھ سے پہلے میں تمہارے قانونی حقوق کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔“ میں نے سر ہلایا اور اس نے ایک منٹ میں مشین کی طرح قانون کا سبق دہرایا مگر مجھے کچھ پلے نہیں پڑا۔ میری کلائی اور کمر میں درد ہو رہا تھا۔

”اب میں تم سے پوچھنا چاہوں گا کہ یہاں کیا ہوا ہے؟“ اس نے اپنا لیکچر پلانے کے بعد کچھ توقف کیا اور پھر سیدھا مطلب کی بات پر آگیا۔

”کیوں نہیں، بالکل پوچھیے۔“ میں نے درد بھری آواز میں کہا۔

”تم یہاں... مسٹر روزنٹین کے گھر میں کیا کر رہی تھیں؟“

”میں مسز روزی روزنٹین کی فیشن کنسلٹنٹ ہوں۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”ان سے میری ہفتہ وار طے شدہ ملاقات تھی اور اس وقت میں کچھ نئے ڈیزائن اور ان کی بیٹی کا عروسی لباس دینے آئی تھی۔ گھنٹی بجائی اور جب کافی دیر تک جواب نہ آیا تو میں گھر کے عقبی حصے میں چلی گئی۔ مجھے یہ عجیب لگا تھا کہ کسی نے گھنٹی کے جواب میں نہ تو انٹر کام پر جواب دیا اور نہ ہی دروازہ کھولا۔“ ہتھکڑیاں لگنے کے بعد پہلی بار کسی نے مجھ سے موجودگی کا سبب سننا چاہا تھا۔ میں نے بھی فرفر بتا دیا کہ شاید خلاصی مل جائے۔

”فیشن؟“ میری بات مکمل ہونے پر اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں، میں اسٹائلسٹ ہوں، یہی میرا کام ہے۔“

”تم نے اتنی جلدی کیوں کی کہ دو بار گھنٹی بجانے پر جواب نہ ملا تو از خود اندر داخل ہو گئیں؟“ مائر نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

”دوپہر ڈھلنے والی تھی اور مجھے شام ہونے سے پہلے دو تین اور جگہوں پر بھی جانا تھا۔“

”تم مسٹر روزنٹین سے پہلے کتنی بار مل چکی تھیں؟“ مائر نے بھویں چڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

”ایک دو بار... وہ بھی سرسری انداز میں۔ میرا تعلق تو مسز روزی سے تھا۔“

”تو سوئمنگ پول میں تیرتے شخص کو دیکھ کر پہچان گئی تھیں کہ وہ مسٹر روزنٹین تھے؟“

”نہیں۔“ میں نے فوراً کہا۔ ”وہ اوندھے منہ تھے۔ چہرہ نہیں دیکھ سکی مگر یہ خیال میرے دل میں آیا ضرور تھا۔“ یہ کہہ کر میں نے چند لمحے کا توقف کیا مگر مائر کچھ نہ بولا جس پر میں نے اسے باڑ عبور کر کے سوئمنگ پول اور پھر ریسکیو کو کال کرنے کی اب تک کی مکمل کہانی تفصیل سے سنا دی۔ وہ گہری نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے سنتا رہا۔

”تم نے یہ ساری باتیں آفیسر ڈیلوپ کو کیوں نہیں بتائیں؟“ میرے خاموش ہونے پر مائر نے سوال کیا۔

”اس نے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔“

”تم نے لاش کے سر پر زخم دیکھا تھا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اور تم کتنے بجے یہاں پہنچی تھیں؟“

”پولیس کے آنے سے کچھ دیر پہلے۔“ میں نے مائر کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کی تصدیق سیکیورٹی گارڈ بل سے کی جاسکتی ہے۔ اس نے مجھے یہاں آتے دیکھا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے میری بات سن کر جواب دیا۔

”کیا تم میری ہتھکڑی کھول سکتے ہو؟ کلائی میں سخت درد ہو رہا ہے۔“ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے متفق نظر آرہا تھا اس لیے میں نے بھی لوہا گرم دیکھ کر وقت ضائع کیے بنا چوٹ مار دی۔

ایک منٹ کے اندر اندر میری ہتھکڑی کھل گئی اور میں بدبودار کار سے باہر نکل کر اپنی کلائیوں کو مسل کر، خون کی روانی درست کرنے لگی۔

”وہ تمہاری کار ہے؟“ اس نے سامنے کی طرف انگلی اٹھائی جہاں میری نئے ماڈل کی اسٹائلش کار کھڑی تھی۔

”جی ہاں۔“ میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”بہت قیمتی لگتی ہے۔“ مائر کی بات سن کر میں مسکرا دی۔

”کیا میں اس کی اندر سے تلاشی لے سکتا ہوں؟“ اس نے اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

مجھے یقین تھا کہ انکار کروں گی، تب بھی وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ اس لیے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”اس کی تلاشی کے لیے آپ کو وارنٹ کی ضرورت نہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”تعاون کا شکریہ۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کار کی طرف بڑھا۔ میں نے ریموٹ سے دروازوں کے لاک کھول دیے۔

مجھے نہیں معلوم کہ مائر میرے بارے میں کیا سوچ رہا تھا مگر میرے نادوے مسائل تھے جن میں سرِفہرست مسئلہ یہ تھا کہ میں قتل کے شبہے میں پولیس کی حراست میں تھی۔ اس وقت بھی انہی مسائل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

”تو تم پستول بھی رکھتی ہو۔“ کچھ دیر تک گاڑی کو باہر سے دیکھنے کے بعد وہ پلٹا اور مسکراتے ہوئے کہا مگر اس کے الفاظ بہت سخت تھے۔

”ہاں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ اس وقت مجھے مسٹر روزنٹین کے سر سے بہتا ہوا خون یاد آگیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ انہیں گولی ماری گئی ہے۔“ میں نے اپنے دل میں کہا، تاہم مجھے یقین تھا کہ یہ گولی نہ تو میں نے چلائی ہے اور نہ میرے اس پستول سے چلی ہے، جو میں نے ذاتی حفاظت کے لیے خریدا تھا مگر استعمال کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ میں یہ پستول بھی سیکیورٹی گارڈ بل سے مشورے کے بعد خریدا تھا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کس قسم کا پستول خریدنا بہتر رہے گا۔

بل کی اور بات تھی، وہ تو سابق پولیس والا تھا۔
''مگر میرا پستول گاڑی میں نہیں، گھر پر ہے۔'' میں نے اس کا شبہ دور کرنے کو کہا۔ ''وہ میری ذاتی حفاظت کے لیے ہے۔''
''میں سوچ رہا ہوں کہ تم مسٹر روزنٹین کو کیوں قتل کرسکتی ہو؟'' کچھ توقف کے بعد مائر نے منہ کھولا۔
''نہیں، میں نے انہیں نہیں مارا۔'' اس کی بات سن کر میں ششدر رہ گئی۔
''مگر تمہارے پاس پستول ہے۔'' اس بار مائر کا لہجہ سرد تھا۔
''مگر وہ تو گھر پر ہے۔''
اسی دوران میں ایک پولیس والا اس کے قریب پہنچا۔ مائر مڑا اور اسے ساتھ لے کر چند قدم پیچھے ہٹا اور کیا کہا، میں یہ نہیں سن سکی۔ البتہ تھوڑی دیر بعد جب وہی پولیس والا سیکیورٹی گارڈ بل کے ساتھ واپس آیا تو میں سب کچھ سمجھ گئی۔
''تم اسے آفیسر کرینڈل کے پاس لے جاؤ۔ میرے خیال میں اس کا بات کرنا مناسب رہے گا۔'' اس نے حکم دیا اور دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''چلو، اس وقت بہتر یہی ہوگا کہ تم اسکواڈ کار میں ہی بیٹھی رہو۔'' اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر آگے دھکیلا۔
''مگر میں نے کچھ نہیں کیا۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ میں اس بدبودار گاڑی میں مزید بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے شریفانہ انداز میں خود کو بچانے کی کوشش کی مگر یہ بیکار ثابت ہوئی۔ اس نے اندر دھکیل کر ہی دم لیا۔
گاڑی کی دھندلی ونڈ اسکرین سے باہر کا دھندلایا ہوا منظر نظر آرہا تھا۔ میں نے دیکھا، مائر اس طرف بڑھ رہا ہے، جہاں بل پولیس والے کے سامنے کھڑا تھا۔ مائر اس کے قریب پہنچا۔ وہ اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ کیا پوچھ رہا تھا، یہ تو میں نہیں سن سکتی تھی، البتہ جہاں مائر خاموش ہوتا، بل اثبات میں سر ہلا دیتا۔ کچھ دیر بعد بل دوسرے پولیس والے کے ساتھ ایک طرف کو چل دیا، البتہ مائر میری طرف پلٹ آیا اور گاڑی کا دروازہ کھولا۔
''آپ نے بل سے پوچھ لیا کہ میں کتنے بجے یہاں پہنچی تھی؟'' میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔
''ہاں۔''
''تو پھر۔''
''میں نہیں جانتا۔''
''کیا...!'' میں نے تڑپ کر کہا۔
''یہ میں نے نہیں، بل نے کہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے تمہیں اندر داخل ہوتے نہیں دیکھا۔ شاید جب تم اندر آئی تھیں، اس وقت وہ کسی کام سے گیٹ چھوڑ کر دوسری طرف گیا تھا۔'' مائر نے وضاحت کی۔
''کیسا کام؟'' میں نے پوچھا۔
''بل کے مطابق اسے شک تھا کہ اس کے سامنے سے جنگلی بھیڑیا گزرا ہے اور وہ اسی کے پیچھے گیا تھا۔''
''سی سی ٹی وی فوٹیج تو ہوگی نا۔'' مائر کی بات سن کر میں نے یکدم کہا۔ ''گیٹ پر کیمرے نصب ہیں۔''
''مگر فلم غائب کی جاچکی ہے۔'' یہ سنتے ہی میرے اوسان خطا ہوگئے۔ ''مگر مجھے لگتا ہے کہ فلم کی گمشدگی کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتیں۔'' اس کا لہجہ طنزیہ اور فقرہ... ذومعنی تھا۔
یہ سنتے ہی میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ننانوے مسائل اور اب فوٹیج کی گمشدگی... پورے سو مسائل میرے سامنے کھڑے ہنس رہے تھے۔ میری آنکھیں بند تھیں پر مجھے یقین تھا کہ اس وقت مائر کے لبوں پر مسکراہٹ ہوگی۔
☆☆☆
میں کب تک آنکھیں موندے خود کو کوستی رہی، اس کا اندازہ نہیں۔ البتہ مائر کے پکارنے پر آنکھ کھولی تو وہ ایک کاغذ لیے کھڑا تھا۔ ''اجازت نامے پر دستخط کرو، تمہاری کار کی تلاشی لینا ہے۔'' میں نے خاموشی سے دستخط کیے اور جیب سے چابی نکال کر اسے تھما دی۔ اگلے ہی لمحے مائر اور وردی میں ملبوس دو پولیس والے میری کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک ڈیلوپ تھا۔
کچھ دیر بعد وہ لوگ کار سے میری تمام نجی نوعیت کی چیزیں نکال نکال کر زمین پر ڈھیر کیے جارہے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے دل سے ہُوک اٹھی۔ کچھ دیر بعد پولیس افسر ڈیلوپ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب آنے کو کہا۔ میں پہنچی تو یہ دیکھ کر تقریباً رونے کے قریب تھی کہ پختہ سڑک پر پھینکنے سے میرے قیمتی سن گلاسز کے شیشے کرچیوں میں بدل چکے تھے۔
''یہ تم نے کیا کیا۔'' میں نے مائر کی توجہ سن گلاسز کی طرف دلائی۔
''آفیسر ڈیلوپ... یہ نیچے دیکھو، تم نے کیا کردیا ہے۔'' مائر نے میری بات سن کر فوراً کہا۔
''اوہ میرے خدا!'' اس نے سن گلاسز کے ٹکڑوں پر نظر ڈالتے ہوئے حیرانی سے کہا۔
''مگر یہ بہت قیمتی...''

''تم یہاں سے نکلنا چاہتی ہو؟'' مائر نے میرے احتجاج کو روکنے کے لیے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے مداخلت کی۔
''کون کمبخت اس صورتِ حال میں رہنا چاہتا ہے۔''
''تو پھر اپنی زبان بند رکھو۔'' مائر نے کہا۔ اسی دوران میں ڈیلوپ قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ ''تم دور جاکر کھڑے ہو مگر زیادہ دور مت جانا۔ مجھے تم سے بات کرنی ہوگی۔'' یہ سن کر ڈیلوپ نے کینہ توز نظروں سے مجھے گھورا اور واپس گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔
کچھ دیر بعد میں جب اپنی گاڑی میں بیٹھنے جارہی تھی تو اس دوران میں ایک سیاہ مرسڈیز بینز سامنے سے آئی۔ گاڑی چلانے والے کی وردی بتارہی تھی کہ وہ ڈرائیور ہے۔ سنہری بالوں والے ڈرائیور نے گاڑی ہمارے قریب روکی اور مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہورہا ہے؟''
''تم کون ہو؟'' میں نے بھی اُلٹا اسی سے پوچھ لیا۔
''تم یہاں کیسے؟'' مائر نے بھی پوچھ لیا۔
''رابن برائن... میں مسٹر روزنٹین کا ڈرائیور ہوں۔'' اس نے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔
''یہاں پولیس کیا کررہی ہے... کیا کچھ ہوگیا ہے؟'' اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
مائر جواب دینے کے بجائے کچھ دیر تک اسے گھورتا رہا۔ ''کیا تم ہمیشہ مرسڈیز بینز پر سوار ہوکر کام پر آتے ہو؟''
''جی نہیں۔'' اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آئل چینج کرانے کے لیے گاڑی ورکشاپ لے کر گیا تھا۔''
''تمہارے ساتھ اور کون ہے؟'' مائر نے سوال کیا۔
''مسز روزی اور ان کی بیٹی... ورکشاپ سے میں اسپا ہاٹ باتھ ریزورٹ گیا اور انہیں لیتا ہوا واپس آرہا ہوں۔'' رابن نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔
ڈرائیور کی بات سن کر مائر کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کا منہ سختی سے بند تھا۔ وہ گاڑی کے پچھلے دروازے کی طرف آیا اور سیاہ شیشوں والا دروازہ کھولا۔
''یہاں کیا ہورہا ہے؟'' دروازہ کھلتے ہی مسز روزی نے اس سے پوچھا۔
اسی دوران میں دوسرا دروازہ کھلا اور اس کی بیٹی ہنی باہر نکلی۔ ''رابن! یہ کیا ہے؟... کیا یہ پولیس والے ہیں؟'' اس نے اپنے ڈرائیور کو پکارتے ہوئے پوچھا۔ وہ استفساریہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی پلکیں بوجھل تھیں۔ آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یا تو وہ نیند سے ابھی ابھی بیدار ہوئی ہے یا پھر پوری رات سو نہیں سکی تھی۔
اس دوران میں مائر نے وائرلیس پر کسی سے بات کی اور پھر مسز روزی کی طرف بڑھا اور منٹوں میں سارا قصہ بیان کردیا۔ اسی دوران میں پولیس کی ایک اور کار آپہنچی۔ پھر مرسڈیز بینز سے روبی این اتری۔ یہ مسز روزی کی خادمہ تھی۔
''یہ کون ہے؟'' مائر نے ڈرائیور رابن سے پوچھا۔
''مسز روزی کی خادمہ۔''
روبی این مجھے جانتی تھی۔ اس نے مجھے کار میں بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف پہنچی اور جھک کر پوچھا۔ ''اے اسٹیسی! یہاں کیا ہورہا ہے؟'' اس کی نگاہوں میں کئی سوال پوشیدہ تھے۔
اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دیتی، مائر تیزی سے آگے بڑھا۔ مسز روزی اور ان کی بیٹی گھر کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ''آپ اندر جائیں، ضرورت پڑی تو آپ سے بات کی جائے گی۔'' اس نے شائستہ انداز میں روبی سے کہا اور قریب کھڑے ایک پولیس والے کو مخاطب کیا۔ ''انہیں گھر کے اندر پہنچادو۔'' یہ سن کر روبی سیدھی کھڑی ہوئی اور میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں بدستور سوالیہ تھیں۔ وہ آہستہ سے مڑی اور ایک لفظ کہے بنا آگے بڑھ گئی۔
''اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اپنی بات یہاں مکمل کروگی یا پھر ہمیں پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد اسے دوبارہ شروع کرنا پڑے گا۔'' مائر نے روبی کے جاتے ہی مجھ سے کہا۔
میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول اٹھا۔ ''جو کچھ بتا چکی ہو، اسے مت دہرانا۔ میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں۔'' اس نے سرد مہری سے کہا۔
''بہت بہتر۔'' یہ کہہ کر میں نے لمحہ بھر توقف کرکے یہ سوچا کہ کیا کچھ بتانا ضروری ہے۔ ''میرے اندر داخل ہونے سے پہلے سبز رنگ کی کراؤن وک باہر نکلی تھی۔ بل کے نہ ہونے کی وجہ سے گیٹ بند تھا، لہٰذا اس کار کے باہر نکلتے ہی میں اسی گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔''
''گاڑی کون چلا رہا تھا؟'' بات مکمل ہوتے ہی مائر نے پوچھا۔
''یہ میں دیکھ نہیں سکی، ویسے بھی اس کے شیشے سیاہ تھے۔''
''گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا؟'' مائر نے پھر سوال کیا۔
''نہیں، میں جلدی میں تھی۔ ویسے بھی مجھے کیا پتا تھا کہ یہاں پہنچ کر میں ہی دھرلی جاؤں گی۔'' میرا لہجہ شکایتی تھا۔

اب تک مجھے یقین سے پتا نہیں تھا کہ مسٹر روزنٹین زخمی ہیں یا پھر... مگر جب میں اور مائز گفتگو کررہے تھے، تب میں نے ایک پولیس والے سے سنا ''کرائم سین...'' یہ سنتے ہی میرے اندر خوف کی ایک لہر اٹھی جس سے میرے رونگٹے تک کھڑے ہوگئے۔ میں نے سامنے کی طرف نظریں دوڑائیں۔ مسز روزی اور ہنی ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہی تھیں۔ وہ گھر کے عقبی حصے کی طرف کھڑی تھیں اور میں کار میں بیٹھے ہونے کے باوجود انہیں صاف دیکھ سکتی تھی۔ میں جو کچھ جانتی تھی، وہ سب کچھ اسے صاف صاف بتا چکی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے نوٹ بک نکالی اور میرا نام و پتا نوٹ کیا اور پھر میری طرف اپنا وزیٹنگ کارڈ بڑھایا۔ ''اس حوالے سے تمہیں کوئی اور بات یاد آئے یا کوئی اطلاع تو مجھ سے اس نمبر پر رابطہ کرنا۔''

''شکریہ سر!'' میں نے کارڈ تھامتے ہوئے کہا۔

''تو کیا اب میں جاسکتی ہوں؟''

''ضرور، پر رابطے میں رہنا۔'' اس نے ہلکے سے بائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

جانے کی اجازت ملتے ہی میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ کم از کم سو میں سے ایک دو مسئلے تو مائز کی اس اجازت سے ہی حل ہوگئے تھے۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر میں نے مسز روزی کے لیے لے جانے والا سارا سامان اسٹور روم میں رکھا اور سیدھی غسل خانے میں گھس گئی۔ کافی دیر تک گرم پانی سے نہانے کے بعد حالت سنبھلی۔ لباس تبدیل کیا اور ڈرائر سے بال خشک کیے۔ بالوں ان میں پن لگا کر جوڑا باندھا اور کچن میں آگئی۔ جو کچھ ہوچکا تھا، اس کے بعد اعصاب کو مزید پُرسکون رکھنے کے لیے مجھے بلیک کافی کی سخت ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ کافی پیتے پیتے میں ایک بار پھر اپنے مسائل میں کھوگئی۔

مجھے کریڈٹ کارڈ کا بل ادا کرنا تھا۔ گھر کا کرایہ دینا تھا اور بھی کئی ایسے کام تھے جو پیسے پھنسے ہونے کی وجہ سے التوا میں تھے۔ آج تو مجھے دو سو فیصد امید تھی کہ مسز روزی سے بھاری رقم کا چیک ملتے ہی یہ سب مسائل حل ہوجائیں گے مگر وہاں پہنچ کر مسائل اور بڑھ گئے تھے۔ اب میرے لیے پریشانی کی بات یہ تھی مسٹر روزنٹین کی موت کے باعث نہ جانے کب مسز روزی اس صدمے سے باہر نکلتی ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ ان سے ملنے والی رقم غیر معینہ مدت تک لیے التوا میں چلی گئی۔ یہ بات اس لیے بھی یقینی تھی کہ باپ کی موت کے بعد بیٹی کی اگلے ہفتے ہونے والی شادی بھی گئی۔ دوسرے خود مسز روزی سوگ میں ہیں۔ یوں صرف رقم ہی التوا میں نہیں گئی، کئی ہفتوں کے لیے یہ کلائنٹ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

اسی دوران میں اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے فوراً فون اٹھایا اور مسز روزی کے گھر کا نمبر ملانے لگی۔ میں جاننا چاہ رہی تھی کہ وہاں کیا صورتِ حال ہے۔ جب میں وہاں سے نکلی تھی، تب تک پولیس اور لاش بدستور جائے وقوعہ پر موجود تھی، حالانکہ پولیس کے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد وہاں ایمبولینس پہنچ چکی تھی مگر میرے نکلنے تک وہ وہیں کھڑی تھی۔

''ہیلو۔'' میں نے فون اٹھاتے ہی کہا۔ دوسری طرف روبی این تھی۔ میں اس کی آواز پہچان گئی تھی۔ ''میں اسٹیسی ڈیشلے بول رہی ہوں۔ کیا مسز روزی سے ایک منٹ کے لیے بات ہوسکتی ہے؟'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''سوری اسٹیسی... وہ فون سننے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔''

''وہاں کیا صورتِ حال ہے؟''

''میرے خیال میں اس وقت تمہارا ان سے بات کرنا ناممکن ہے۔'' روبی نے کہنا شروع کیا۔ ''پولیس والے یہاں موجود ہیں اور وہ سب سے سوال وجواب کررہے ہیں۔ ویسے خود مسز روزی کی حالت بھی ٹھیک نہیں۔''

''.... پولیس والے کیا پوچھ رہے ہیں؟'' میں نے ٹوہ لینے کی کوشش کی، میرے بعد وہاں کیا ہورہا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ رہائی عارضی نہ ہو۔

''وہ مسز روزی سے اُن سب کے بارے میں سوال کررہے ہیں جو اُن کے یہاں کام کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔ ''میں، جیمس، برائن، اور تم... وہ میڈم سے سب کے بارے میں بات کررہے ہیں۔''

''میں... مگر میں کیوں؟ میں تو ان کی ملازم نہیں۔''

''تم پریشان مت ہو۔'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگانے کے بعد کہا۔ ''وہ تمہیں مشتبہ نہیں سمجھ رہے۔''

''اوہ...'' روبی کی وضاحت سن کر میری جان میں جان آئی۔

''میں فون بند کرتی ہوں، بعد میں بات کرتے ہیں۔''

''اوکے... میں پھر فون کروں گی۔'' میں نے جلدی سے کہا اور فون بند کردیا۔

فون رکھنے کے بعد میں کچھ دیر تک پیش آنے والے تمام حالات پر غور کرتی رہی۔ میری دلچسپی کا محور یہ تھا کہ کس

طرح خود کو بے گناہ ثابت کرسکتی ہوں۔ کافی دیر تک سوچنے کے بعد میں نے کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنا پرس اٹھایا اور مائز کا وزیٹنگ کارڈ نکالنے لگی۔ اس کا نمبر ملایا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کال وائس میل باکس سے منسلک تھی۔ مائز کے بعد اب کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں تھا جس سے بات کی جاسکتی۔ اسی لمحے مجھے بل کا خیال آیا۔ وہ مہربان شخص تھا مگر مجھے یہ بات سمجھ نہیں آرہی تھی کہ جب میں واپس نکل رہی تھی تو وہ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟ حالانکہ اس سے میری اچھی خاصی بول چال تھی۔ میں کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر گھر سے نکل گئی۔ میں نے گاڑی نکالی اور واپس ڈیزرٹ لیک ریزیڈنسی کی طرف چل دی مگر گیٹ پر پہنچی تو مایوسی ہوئی۔ میں بل سے بات کرنا چاہتی تھی مگر اس کی ڈیوٹی بدل گئی تھی۔ وہاں ایک دوسرا بوڑھا سیکیورٹی گارڈ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میں اس سے پہلے نہیں ملی تھی۔

گاڑی گیٹ پر روک کر میں نے شیشے اتارے اور اس کی طرف دیکھ کر نہایت واہیات انداز میں مسکرائی۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ ''بیوٹی فل...'' اس نے ٹھرکی بڈھوں کی طرح میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''واقعی بیوٹی فل۔'' اس نے گاڑی کی طرف نظریں گھمائیں۔ میں سمجھ گئی کہ وہ جو کہنا چاہتا تھا کہہ بھی گیا اور بات کو آڑ بھی دے گیا۔

''میں اسٹیسی ہوں۔''

''اور میں ویرن۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ جس طرح وہ میرے نام بتانے کو صرف تعارف سمجھا تھا، اس سے یقین ہوگیا کہ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

''سنو...'' میں نے اس کو متوجہ کرنے کے لیے کہا اور پھر دل ربا انداز میں مسکرائی۔ ''میں مسز روزی کی طرف جانا چاہتی ہوں۔''

''آپ وہاں نہیں جاسکتیں۔'' اس نے بھی مسکرا کر کہا۔ ''وہاں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ کسی کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں۔''

''کیسی گڑبڑ؟'' میں نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر کہا جیسے یہ سن کر سخت حیرت ہوئی ہو۔ ''کیا وہاں کوئی حادثہ پیش آگیا ہے؟'' یہ کہہ کر میں نے سوالیہ نظروں سے اسے گھورا۔

''ہاں... کافی بڑا حادثہ۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں اس بارے میں آپ کو ضرور بتاتا مگر اس کی اجازت نہیں ہے مجھے۔'' اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''بہت خوب! بڑے ذمّے دار ہو تم۔'' میں نے ستائشی لہجے میں کہا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''بل ہے یہاں پر؟''

''بل...؟'' اس نے استفساریہ لہجے میں کہا۔ ''تم اسے جانتی ہو؟''

''ہاں... کہاں ہے وہ؟''

''اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی، وہ گھر جاچکا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر تاسفانہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''جو کچھ بھی ہوا وہ بہت خوفناک تھا۔ بے چارہ برداشت نہیں کرسکا۔'' یہ کہہ کر اس نے بھویں چڑھائیں اور کہنے لگا۔ ''میں نائٹ شفٹ میں ڈیوٹی کرتا ہوں۔ اس نے فون کرکے مجھے بلایا تھا کہ اس کی جگہ ڈیوٹی کرسکوں۔''

''اس کے پاس کون سی گاڑی ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہاں آتے ہوئے شاید میں نے اس کی گاڑی کو پاس کیا تھا۔ وہ ہنڈرسن میں رہتا ہے نا... ٹھیک ہے نا یہ بات؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں رہتا ہے مگر اس کے پاس ہنڈا کار ہے۔'' ویرن نے سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''ہوسکتا ہے راستے میں تم نے اسے پاس کیا ہو۔ ویسے بل کو اس کی بیوی ہی پک اور ڈراپ کرتی ہے۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنی گاڑی یہاں کھڑی نہیں کرتا؟''

''نہیں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں زیادہ تر کام کاج کرنے والے لوگ بسوں سے آتے ہیں یا ان کی کمپنی ڈراپ کرتی ہے یا پھر بل کی طرح اُن کی بیویاں چھوڑ کر جاتی ہیں۔''

''یہاں کسی کے پاس سبز رنگ کی کراؤن وک کار ہے؟'' اس بار میں نے براہِ راست سوال پوچھا۔

''نہیں۔'' یہ سنتے ہی اس کی پیشانی پر بل پڑگئے اور آنکھیں سکڑ کر گول ہوگئیں۔ ''یہاں رہنے والے فورڈ اور ہنڈا جیسی عام گاڑیاں استعمال نہیں کرتے۔ یہاں تو بی ایم ڈبلیو اور مرسڈیز ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''میں نے یہاں سبز رنگ کی کراؤن وک دیکھی ہے، اسی لیے پوچھ رہی تھی اور بس!''

''یقیناً کسی ملازم کی ہوگی اور اسے ڈراپ کرکے واپس چلی گئی ہوگی۔''

''اے سنو!'' میں نے چٹکی بجا کر اسے متوجہ کیا۔ ''تمہارے ہاں گیٹ کی نگرانی کے لیے ویڈیو ریکارڈنگ کا

سسٹم ہے یا نہیں؟"

"کیوں؟" اس نے بھویں چڑھا کر پوچھا۔

"نہیں... میرا کوئی خاص مطلب نہیں، میں تو بس یہ چاہ رہی تھی کہ تم ریکارڈنگ کو دیکھو اور صرف یہ بتا دو کہ بل کتنے بجے یہاں سے گھر جانے کے لیے نکلا تھا۔" میں نے پوری کوشش کی تھی کہ اسے تسلی بخش جواب دے سکوں۔

"سوری... یہ میں نہیں بتا سکتا۔" اس کا لہجہ ایک بار پھر معذرت خواہانہ تھا۔ "ریکارڈنگ ڈسک غائب ہے، شاید پولیس والے اسے لے گئے ہیں۔"

"اوکے۔" میں نے مسکرا کر کہا جیسے کوئی بات نہیں، حالانکہ میں جانتی تھی کہ ریکارڈنگ ڈسک پولیس کو بھی نہیں ملی، وہ تو ان کے پہنچنے سے پہلے غائب کردی گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے چند منٹ تک سیکیورٹی گارڈ سے دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ اس دوران نہ تو پولیس کی کوئی گاڑی باہر آئی اور نہ اندر گئی۔

"اچھا ویرن! میں چلتی ہوں۔ تم سے مل کر اچھا لگا۔" میں نے ہاتھ ہلا کر کہا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے یوٹرن لیا۔

میں آہستہ آہستہ گاڑی چلا رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کہاں جانا چاہیے۔ میں نے موبائل نکالا اور ایک بار پھر مائر کا نمبر ملایا مگر وہ فون اب تک وائس میل باکس سے منسلک تھا۔ میں نے مائر کے لیے پیغام چھوڑا کہ مجھے کال کرے۔ میں اپنے طور پر اس سبز کار کا پتا چلانے کی کوشش کررہی تھی جو میرے اندر جانے سے پہلے باہر نکلی تھی۔ میرا مقصد اس غلط فہمی کو دور کرنا تھا جس کی وجہ سے میرے اوپر انگلیاں اٹھیں۔

کافی آگے تک جانے کے بعد بھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر میں نے گاڑی گھر کی طرف موڑ لی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ جیسے کوئی مشتبہ گاڑی میرا پیچھا کررہی ہے۔ میں نے سیدھے ہاتھ پر دو ٹرن لیے اور کچھ آگے جا کر گاڑی روک دی۔ میری نظریں بیک ویو مرر پر جمی ہوئی تھیں۔ کافی دیر گزرنے کے بعد بھی جب کوئی مشتبہ کار نہ آئی تو میں نے سر جھٹکا اور ریڈ فلیمنگو کی طرف چل دی جس کے قریب میرا گھر تھا۔

سارے راستے میں سوچ بچار کرتی رہی۔ سب اشارے بل کی طرف تھے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ بل ہی وہ آدمی ہے جس کے ذریعے یہ گتھی سلجھ سکتی ہے۔ بنا کسی ٹھوس وجہ کے اس کی گیٹ سے غیر موجودگی، سبز کار کا نکلنا، نگرانی کے کیمروں کی ریکارڈنگ کا غائب ہونا... یہ سب کڑیاں تھیں جنہیں ایک دوسرے سے جوڑ کر میں اپنی صفائی ثابت کرسکتی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ جب گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی، تب کیا وقت ہوا ہوگا مگر مجھے یاد نہیں آرہا تھا۔

اپنے گھر سے کچھ دوری پر تھی جب میں نے ایک بار بیک ویو مرر میں دیکھا مگر دور دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے سکھ کا سانس لیا اور ریموٹ سے پارکنگ گیراج کا الیکٹرانک گیٹ کھول کر گاڑی اندر بڑھا دی۔

گاڑی پارک کرنے کے بعد میں پرس سے چابیاں نکالتے ہوئے گھر کی طرف بڑھی مگر جیسے ہی میں نے دروازے میں چابی لگائی، مجھے احساس ہوا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ میں نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا مگر اگلے ہی لمحے میری سانس رک گئی۔ سامنے پستول کی نال میری پیشانی کا نشانہ لیے ہوئے تھی اور پستول بل کے ہاتھ میں تھا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ دوستانہ انداز سے ملتا تھا لیکن اس بار اس کے چہرے کے تاثرات قطعی دوستانہ نہیں تھے۔

میں نے تھوک نگلا اور بڑی مشکل سے اپنے اندر کے خوف پر قابو پایا۔ میں یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر قطعی خوف زدہ نہیں ہوں۔ "بل... یہ کیا ہے اور تم یہاں کیا کررہے ہو؟" میں نے کوشش کی تھی کہ اپنی آواز میں غصے کا تاثر شامل کرسکوں۔

"اسٹیسی... مجھے گولی چلانے پر مجبور مت کرنا۔" اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا مگر اس کا چہرہ سفید ہورہا تھا۔ اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے ہوئے تھے۔

"تم جلدی سے یہ بتاؤ، میرے گھر کے اندر گھس کر کیا کررہے تھے؟" میں نے ہاتھ میں پکڑے فون کو پستول کی طرح اس کی طرف تانتے ہوئے کہا۔ "جلدی سے بتاؤ ورنہ میں پولیس کو فون کرتی ہوں۔"

بل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا پورا وجود پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کی ہو۔ وہ بدستور میری پیشانی کا نشانہ لیے ہوئے تھا مگر اس کے باوجود اس کے ہاتھوں کی لرزش صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں نے اسے خوف زدہ دیکھ کر سوچا کہ یہاں سے دوڑ لگا دوں مگر اگلے ہی لمحے یہ خیال آیا کہ اگر اس نے واقعی گولی چلا دی تو پھر... مگر اس سے آگے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کوئی شخص دبے قدموں پیچھے سے آیا اور بڑی آسانی سے میرا فون اُچک لیا۔ یہ برائن تھا... مسٹر روزنٹین کا ڈرائیور۔ بل کے مقابلے میں وہ خاصا پُرسکون لگ رہا تھا۔ اس نے بھی ہاتھوں پر سفید دستانے چڑھائے ہوئے تھے۔ اُسے

دیکھ کر تو مجھے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔

"اب یہ پولیس کو فون نہیں کرسکے گی۔" اس نے میرے موبائل فون کو دیکھتے ہوئے بل سے کہا۔

"تم اور یہاں..." برائن کے سامنے آنے کے بعد اپنے اندر اٹھنے والی خوف کی نئی لہر پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا۔ "تم دونوں یہاں کیا کررہے ہو؟" خوف سے میری آواز لرز رہی تھی۔

اس دوران میں میری نظریں بل کے اوپر مرکوز تھیں۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور مجھے برائن سے زیادہ پستول والے بل سے خوف محسوس ہورہا تھا۔ لیکن اچانک اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت آگئی۔ "نہیں، نہیں... اب میں کسی اور کو قتل نہیں کرسکتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ سابق پولیس والے کے بجائے دس سال کا معصوم بچہ لگ رہا تھا۔

"ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور چوائس بھی نہیں ہے؟" برائن نے سرد لہجے میں کہا۔ "چلو، اسے بھی ماردو۔"

برائن کی بات سنتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے موت ناچنے لگی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اب ان کے ہاتھوں موت سے کیسے بچ سکتی ہوں۔ زندگی میں پہلی بار میں نے خود کو بدترین صورتِ حال میں گرفتار محسوس کیا۔

"پلیز برائن... مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے پیشانی پر آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ یہ دیکھ کر مجھے تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ وہ گولی چلانے سے خوف زدہ ہے۔

"ٹھیک ہے، تم سوچو اور میں اس کی رکھوالی کرتا ہوں۔" وہ اٹھا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ وہ سامنے آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے ہاتھ میں سرخ چمڑے کا بٹوا تھا جس میں سے وہ پستول نکال رہا تھا۔ یہ پستول میرا تھا جسے میں اپنے بستر کی بغلی میز کی اوپری دراز میں رکھتی تھی۔

"یہ تمہارا ہے؟" اس نے مسکرا کر کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوا، اب تمہاری موت کو خودکشی قرار دینا زیادہ آسان ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ مکروہ انداز میں مسکرایا۔

"ایسا مت کرو۔" بل نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "تم بڑے نیچ آدمی ہو۔ تم بھول گئے، میں نے کتنی بار تمہیں موت کے منہ سے بچایا اور اب تم مجھے ہی پھنسا رہے ہو۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو مگر ایک بات یاد رکھو۔" وہ بل کو دیکھ کر مسکرایا۔ "میں نے ہمیشہ لوگوں کو وہ چیز دی ہے جس کی انہیں ضرورت تھی اور انہوں نے وہ دیا جس کی مجھے ضرورت تھی... حساب برابر۔"

"مگر تم نے مسٹر روزنٹین کی جان لی ہے۔" بل چلّایا۔

"اگر وہ یہ بات جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان کی پیاری بیٹی ہنی کو منشیات کون سپلائی کرتا ہے تو وہ اب بھی زندہ ہوتے۔" یہ کہہ کر وہ بل کی طرف دیکھنے لگا۔ "اب ذرا سوچو کہ ان کی موت کا ذمے دار کون ہوا... میں، ہنی کی محبت یا وہ خود؟"

اگرچہ عام حالات میں میرا دماغ بہت تیزی سے کام نہیں کرتا مگر اس وقت موت سامنے کھڑی تھی اور اُن دونوں کی گفتگو سے سب کچھ واضح ہوگیا تھا۔ اب یہ سمجھنے میں ذرہ برابر شبہ نہیں تھا کہ مسٹر روزنٹین کو برائن نے قتل کیا اور بل نے اسے آڑ فراہم کی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

"یہ تمہارا بیٹا ہے نا؟" میں نے آنکھ سے برائن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بل سے پوچھا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"ڈیڈی...!" میرا پستول ہاتھ میں تھامے ہوئے برائن نے بل سے کہا۔ "ایک پستول نہیں سنبھل رہا ہے آپ سے۔"

بل نے یہ سن کر اسے گھورا اور ہونٹ بھینچ لیے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنے کی کوشش کررہا ہے مگر کہہ نہیں پا رہا۔

"چلو..." برائن نے پستول سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔ "اور ڈیڈی آپ بھی۔" میرے ہاتھوں میں اب تک گھر، گیراج اور کار کی چابیاں تھیں مگر لگتا تھا برائن یہ دیکھ نہیں سکا تھا۔ "چلو، اپنی کار نکالو۔" اس نے مجھے دوسرے ہاتھ سے باہر کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

گیراج میں الارم بٹن لگا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی مجھے اتنا موقع ضرور مل جائے گا کہ میں الارم بٹن دبا سکوں اور پھر خوش قسمتی سے مجھے موقع مل گیا اور میں نے بٹن دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے زوردار الارم بجنے لگا جس کی وجہ سے برائن کی توجہ ایک لمحے کے لیے میری طرف سے ہٹی اور میں نے بنا سوچے سمجھے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ میرے جوتے ہیل والے تھے۔ اس سے پہلے کہ بل یا برائن میرے پیچھے آتے، میں نے جوتے اتارے اور ہائی اسکول کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ خاصی رونق والی جگہ تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہاں تک پہنچ گئی تو ضرور بچ جاؤں گی۔

میں سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ وہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میری سانس بہت تیزی سے پھول رہی تھی مگر موت

کا خوف ہر شے پر حاوی تھا۔ میں برائن سے بچنے کے لیے سرپٹ دوڑتی جارہی تھی۔ اچانک مجھے ایسے لگا جیسے کوئی میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ اس سے پہلے کہ پلٹ کر دیکھتی، اس نے میرے کندھے پر ہاتھ ڈال کر پکڑ لیا اور میں اپنی ہی جھوک میں زمین پر گر گئی۔ وہ مجھے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کررہا تھا مگر میں نے مزاحمت کی اور اسے سامنے سے زوردار لات ماری۔ وہ ہلکا سا لڑکھڑایا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔ وہ طاقتور تھا اور میں کمزور اور نازک فیشن اسٹائلسٹ... میرا اور اس کا کیا مقابلہ تھا۔ اس نے مجھ ناتواں پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ بھاگنے کے باعث پہلے ہی میری حالت غیر ہوچکی تھی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ ''آگے بڑھو۔'' اس نے میری دائیں پنڈلی پر لات مارتے ہوئے کہا۔ میں گرتے گرتے بچی اور پھر سنبھل کر اس کے آگے آگے مرے مرے قدموں سے چلنے لگی۔

''میرے پاس پستول ہے اور اب چالاکی دکھائی تو بھیجے میں گولی اتار دوں گا؟'' اس نے چلتے چلتے خوفناک انداز میں دھمکی دی۔

مجھے یقین تھا کہ جو کچھ ہوا، اس کے بعد وہ ایسا کرسکتا ہے۔ میں چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ ہمارا رخ گھر کی طرف تھا۔ ڈھلتا سورج ہماری پشت پر تھا اور میرے برابر، خوفناک حد تک لمبا برائن کا سایہ بھی چل رہا تھا۔ ہم تقریباً گھر پہنچ چکے تھے کہ اچانک گولی چلی۔ میرے قدم اٹھتے اٹھتے رک گئے۔ میں یہ سوچ کر سہم گئی... کہ لو میں گئی مگر میں نے اگلے ہی لمحے برائن کے سایہ کو لہراتے دیکھا۔ فوراً پلٹی، برائن زمین پر گر رہا تھا اور سامنے بل پستول تانے کھڑا تھا۔

''ڈیڈی...'' زمین پر پڑے بل نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا؟'' اس نے ہاتھ اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

بل قریب آچکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے قمیص کے کف سے آنکھیں صاف کیں۔ ''تم سے کہا تھا نا کہ بس! اب اور قتل نہیں، مگر تم...'' اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں وہیں پر سہمی کھڑی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اپنی آنکھوں کے سامنے کسی انسان کو مرتا دیکھ رہی تھی۔ خوف سے میری آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میری آواز غائب ہوگئی تھی۔ میں وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی مگر لگتا تھا کہ زمین نے میرے پاؤں جکڑ لیے ہیں۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔

''میں نے کہا تھا اسے، تم نے بھی تو سنا تھا نا۔'' اس نے پستول کی نال سے برائن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بس! اب کوئی قتل نہیں۔'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ برائن کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ زمین پر تیزی سے خون پھیلتا جارہا تھا۔

میں نے نظریں اٹھا کر بل کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ بدستور لرز رہا تھا۔ اس کے پیچھے، میرے گیراج کے کونے پر سراغ رساں مائر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور نشانہ بل تھا۔

''پولیس... پستول نیچے پھینک دو اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر ہاتھ پیچھے کرلو۔'' مائر نے چلا کر اسے حکم دیا۔

یہ سنتے ہی بل نے پیچھے مڑ کر دیکھے بنا پستول زمین پر پھینک دیا اور زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اس نے دونوں ہاتھ پشت پر کرلیے۔ وہ خود بھی سابق پولیس والا تھا۔ جانتا تھا کہ اس حالت میں اسے وہی کرنا ہے جس کا حکم پولیس دے گی۔ میری نظریں سراغ رساں مائر پر تھیں۔ وہ وائرلیس پر بات کرتا ہوا آگے بڑھا اور بل کی کلائیوں میں ہتھکڑی لگادی۔

میں سخت خوف زدہ تھی۔ میری ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ میں زمین پر بیٹھ گئی۔ بل کو ہتھکڑی لگانے کے بعد مائر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر برائن کی نبض دیکھ رہا تھا۔

''یہ زندہ ہے؟'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ''میں نے ایمبولینس کے لیے فون کردیا ہے، وہ پہنچنے والی ہے۔''

میں نے بل کی طرف دیکھا۔ اس کا سر نیچے تھا اور آنکھوں سے بدستور آنسو بہہ رہے تھے۔

''بہت بُرا ہوا۔'' میں نے مائر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دونوں مسٹر روزنٹین کے قاتل ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

''تم بے گناہ ہو۔ میں جانتا ہوں۔'' مائر نے کہا اور جیب سے رومال نکال کر برائن کے قریب پڑا پستول اٹھانے لگا۔

''تم کیسے پہنچے؟'' کچھ توقف کے بعد میں نے سوال کیا۔

''تمہارا پیچھا کررہا تھا۔'' اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں اپنے پاؤں دبا رہی تھی۔ بنا جوتوں کے سڑک پر بھاگنے سے میرے تلووں میں شدید درد ہورہا تھا۔ ''سوری... مجھے پہنچنے میں ذرا دیر ہوگئی۔'' اس نے میرے پاؤں پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھے چکما دے کر نکل گئے تھے، ورنہ یہ تکلیف تمہیں نہیں اٹھانا پڑتی۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ''شکریہ...''

''کس بات کا؟'' میں نے قطع کلامی کی۔

''میری مدد کرنے کا۔''

''اور میں قتل کے الزام سے لے کر قتل ہونے تک پہنچ چکی تھی۔ تمہیں ان دونوں پر کیسے شبہ ہوا؟''

''اس کی کئی وجوہات تھیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''تم تھوڑا سا دماغ استعمال کرو تو مجھے یقین ہے کہ بہت کچھ خود سمجھ جاؤ گی؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے اسے گھورا۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ تمہارے فون کرنے کے صرف چند منٹوں کے اندر پولیس پہنچ چکی تھی...''

''اور پہنچتے ہی آفیسر ڈیلوپ نے مجھے ہتھکڑیاں لگادی تھیں۔'' میں نے قطع کلامی کرکے سر پکڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو میں شاید پوری زندگی نہیں بھلا سکوں گی... اُف میرے خدا۔''

''برائن نے مسٹر روزنٹین کی بیٹی کو نشے پر لگادیا تھا اور ساتھ ہی وہ مسز روزی پر بھی ڈورے ڈال چکا تھا۔''

''مسز روزی بھی اس کے...''

''نہیں...'' اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ''بات یہ ہے کہ مسٹر روزنٹین نے آج دوپہر پولیس کو فون کرکے مدد کی درخواست کی تھی اور جب تم ایمرجنسی کو فون کررہی تھیں، اس وقت آفیسر ڈیلوپ اور اس کے ساتھی میری ہدایات پر ان سے ملنے پہنچ گئے تھے۔ میں گیٹ سے کچھ فاصلے پر تھا جب ریسکیو پر تمہاری کال وائرلیس پر سن گئی۔ بس! میں نے آفیسر ڈیلوپ کو ہدایت کی اور اس نے تمہیں ہی مشتبہ سمجھ کر دھر لیا۔''

''مسٹر روزنٹین نے کیا شکایت کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ برائن کو انہوں نے تین ماہ پہلے ڈرائیور کی ملازمت دی تھی... اس کے باپ سیکیورٹی گارڈ بل کے کہنے پر۔'' مائر نے کہنا شروع کیا۔ ''مگر اس نے ان کی بیٹی ہنی کو نشے پر لگادیا۔ یہی نہیں، اس نے مسز روزی سے بھی بہت قریبی تعلقات اختیار کرلیے تھے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور کچھ سوچنے لگا۔ ''ساری گڑبڑ آج دوپہر ہوئی تھی جب انہوں نے اپنی بیوی کو برائن کی آغوش میں دیکھا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے مجھے فون کیا اور ساری بات بتائی۔ میں نے ان سے معلومات لے کر چیک کیا تو معلوم ہوا کہ وہ عادی منشیات فروش ہے اور صرف آٹھ مہینے پہلے فلاڈلفیا کی جیل سے سزا کاٹ کر رہا ہوا تھا۔''

''تو یہ باپ بیٹا ملے ہوئے تھے؟''

''نہیں... بل ایسا نہیں ہے مگر برائن نے اسے زبردستی مسٹر روزنٹین کے قتل میں گھسیٹا، وہ یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ''یہی وجہ تھی کہ جب میں نے تمہیں ہتھکڑی میں دیکھا تو افسوس ہوا اور اگر تم نہ کہتیں، تب بھی میں ہتھکڑی کھلوانے والا ہی تھا۔''

''افسوس مسٹر روزنٹین...''

''ہاں، کاش ہم تھوڑا جلدی پہنچ جاتے۔'' مائر نے افسردگی سے کہا۔ ''دوپہر کو ان کی بیوی اور بیٹی کو اسپا ہاٹ باتھ ریزورٹ جانا تھا۔ انہیں چھوڑ کر کار کا انجن آئل بدلنے کے لیے برائن کو ورکشاپ جانا تھا۔ اسی لیے انہوں نے ہمیں سہ پہر کو ملنے کے لیے بلایا تھا۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان تینوں میں سے کوئی انہیں پولیس سے ملاقات کرتا دیکھے۔ ہمارے پاس برائن کو گرفتار کرنے کی ٹھوس وجہ تھی۔ ہم ایسا ہی کرتے مگر کیا کریں، ان کی موت یونہی لکھی ہوئی تھی۔''

''تو برائن کا کیسے پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

یہ کہہ کر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''تم نے سبز کراؤن وک کی بات کی تھی، وہ بھی پتا چل گیا۔ یہ کار برائن کی تھی۔ وہ مرسڈیز کو ورکشاپ چھوڑ کر واپس آیا۔ بل کو ساتھ لیا، مسٹر روزنٹین سوئمنگ پول پر بیٹھے تھے۔ برائن نے ان کے سر میں ایک گولی ماری، لاش پول میں پھینکی اور واپس استقبالیہ پر پہنچا۔ خفیہ کیمروں کی فوٹیج نکالی اور جس گاڑی کو تم نے جاتا دیکھا، اس میں برائن سوار تھا۔ وہ واردات کے بعد ورکشاپ جارہا تھا، جس کے برابر والے پیٹرول پمپ پر اس نے صبح اپنی گاڑی سروس کے لیے دی تھی تاکہ اسے کوئی جواز مل سکے۔ آئل کی تبدیلی کے لیے مرسڈیز کو ورکشاپ پر چھوڑ کر وہ اپنی سبز کار میں ہی گھر پہنچا تھا۔ واردات کے بعد وہ دوبارہ ورکشاپ پہنچا اور ایک سنسان جگہ پر اپنی کار کھڑی کی۔ پھر ورکشاپ سے مرسڈیز لی اور جب وہ مسز روزی، ہنی اور روبی کو لے کر گھر پہنچا تب ہم وہیں تھے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ''بل چھٹی کرکے گیا اور وہاں سے کار پک کی جہاں برائن نے کھڑی کی تھی۔ دوسرا یہ کہ ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے کا کہہ کر برائن بھی سب سے آنکھ بچا کر نکل لیا مگر گیٹ پر اس کی خفیہ نگرانی ہورہی تھی۔ اطلاع ملتے ہی میں ان کے پیچھے

لگ گیا مگر میں اکیلا تھا اور مجھے تمہاری بھی نگرانی کرنی تھی۔"

"مگر میری کیوں؟"

"بھول گئیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "پندرہ دن پہلے تم نے برائن کو دو ہزار ڈالرز دیے تھے۔"

"ہاں..." میں نے بھولپن سے کہا۔ "مسز روزی نے غلطی سے زیادہ رقم کا چیک لکھ دیا تھا۔ جب میں چیک بینک میں جمع کرانے گئی، تب احساس ہوا۔ میں نے انہیں فون کیا مگر انہوں نے کہا کہ تم چیک جمع کرا دو اور دو ہزار ڈالرز میرے ڈرائیور کو کیش دے دینا۔ ایسا دو تین بار پہلے بھی ہو چکا تھا۔ سو جب برائن آیا تو میں نے رقم اسے دے دی۔"

"یہ اتنی سادہ بات نہیں تھی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "یہ مسز روزی کی چال تھی۔ وہ تمہیں استعمال کر کے دراصل رقم برائن کو دینا چاہتی تھیں تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ تم نے سب سے پہلے لاش دیکھی، تم روزی کی رقم برائن کو دیتی رہیں۔ تم نے سبز کراؤن وک کار دیکھی، تم نے بل کو گیٹ پر سے غیر موجود پایا، تم پولیس کے لیے مشتبہ تھیں اور تم اپنی جان بچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھیں... اب برائن تمہیں کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ ویسے بھی اگر وہ اپنے منصوبے کے مطابق تمہارے پستول سے تمہاری جان لینے کو خودکشی کا رنگ دے دیتا تو پولیس سمجھتی کہ تم نے مسٹر روزنٹین کو قتل کیا اور پھر اتنی خوف زدہ ہوئیں کہ اپنی جان لے لی... معاملہ ختم ہو جاتا۔"

"مگر میں ایسا کیوں کرتی؟"

"کیوں کا سوال تمہاری موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا... سمجھیں؟"

"اوہ میرے خدا! کیسے کیسے لوگ ہیں دنیا میں۔" میں نے سر تھام لیا۔ اسی دوران میں ایمبولینس اور پولیس گاڑیوں کے سائرن گونجنے لگے۔

کچھ ہی دیر میں لاش کو اسپتال اور بل کو پولیس اسٹیشن منتقل کیا جا رہا تھا۔ مائر بدستور وہیں تھا۔ "فی الحال تمہارا پستول پولیس تحویل میں رہے گا۔" ایمبولینس اور پولیس گاڑیوں کے روانہ ہونے کے بعد اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "چلو اٹھو، میں تمہیں اندر تک چھوڑ دوں۔" اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور سہارا دے کر گھر کی طرف لے جانے لگا۔

"پستول تو اب تمہارے پاس ہے نہیں، سوچ رہا ہوں کہ تمہاری حفاظت کے لیے کیا انتظامات کروں؟" میں دروازہ کھول رہی تھی، تب اس نے کہا۔ "میرے خیال میں اگر تم کوئی خطرہ محسوس کرو تو فوراً پولیس کو فون کر دینا۔"

"ہاں... تاکہ ڈیلوپ آئے اور پھر مجھے ہی ہتھکڑی لگا دے۔" میں نے کلائی مسلتے ہوئے کہا۔ "بڑا درد ہوا تھا اس کم بخت کی وجہ سے۔"

"اور وہ تمہارے سن گلاسز؟" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے اس کا ذمے دار بھی وہی موٹا ہے۔"

"میں سوچ رہا ہوں تمہارے لیے بالکل ویسے نئے سن گلاسز لا دوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم آرام سے بیٹھو، میں ابھی کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

"تو تم بھی میری طرح اکیلی ہی ہو؟" کافی پیتے ہوئے مائر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اب تک تو ہوں مگر..."

"تو اگر تم چاہو تو یہاں دو لوگ رہ سکتے ہیں۔" اس نے معنی خیز انداز میں دیکھا۔

"یہ ممکن ہے۔" میں اس کی بات سمجھ گئی۔

"تو پھر اپنے لیے عروسی لباس کتنے دن میں تیار کر لو گی؟" مائر نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"لباس تو تیار ہے بس ذرا کاٹ چھانٹ کر کے درست کرنا ہے۔"

اس کے بعد ہم کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

مائر سے پہلی ملاقات کے صرف دس روز بعد لاس ویگاس کے مرکزی چرچ میں ہم دونوں نے شادی کی مگر اس وقت میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی، جب چرچ سے واپسی پر میں نے دیکھا کہ شادی کی لیموزین کا دروازہ آفیسر ڈیلوپ کھول رہا تھا۔

"ارے تم...!" میں نئی نویلی دلہن کے تمام تکلفات بالائے طاق رکھتی ہوئی چلائی۔ مجھے ایک دم کلائی کا درد اور کمر پر اس موٹے کی پڑنے والی لات یاد آ گئی تھی۔

"ہاں میں۔" ڈیلوپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "یہ میری لیموزین ہے اور میں پارٹ ٹائم یہی کام کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا، آگے بڑھا اور لیموزین کا دروازہ کھولا۔ "چلیے میڈم۔"

"خدا کرے یہ اس کی پولیس کار کی طرح بدبودار نہ ہو۔" میں نے اپنے دل میں دعا کی مگر اندر بیٹھنے کے بعد یہ محسوس کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ مائر نے مجھے بانہوں میں جکڑ لیا تھا۔

نادیدہ قاتل

میمونہ عزیز

خونی رشتے فاصلوں اور ملاقاتوں سے یکسر مبرا ہوتے ہیں... رشتوں کی کا اٹوٹ بندھن... جس پر زمانے کے سرد و گرم اثر انداز نہیں ہوتے... ان دونوں باپ اور بیٹے کا بھی یہی حال تھا... وہ اپنے معمولاتِ زندگی سے ہٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنا ضروری تصور کرتے تھے۔

عمر کی نقدی ختم ہونے سے پہلے وقت اور شوق کی دیرینہ تکمیل کا قصہ

وہ مئی کی ایک گرم شام تھی۔ پونے آٹھ بج چکے تھے جبکہ ڈیڈی نے مجھے اور میکس کو ڈنر کے لیے ساڑھے سات بجے بلایا تھا۔ انہیں انتظار کرنا پسند نہیں تھا۔ یہ بات میں بھی اچھی طرح جانتا تھا لیکن کیا کرتا مجبوری تھی۔ ڈاکٹر کے پاس اپنا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ مجھے بھی ایمرجنسی میں ایک آپریشن کرنا پڑ گیا۔ میکس جانوروں کی ڈاکٹر ہے۔ اس کی اپنی مصروفیات ہیں۔ جب ہم دونوں کام سے فارغ ہو کر چلنے

کے لیے تیار ہوئے تو گاڑی نے نخرے دکھانا شروع کر دیے۔ بڑی مشکل سے دس منٹ تک کوشش کرنے کے بعد وہ اسٹارٹ ہوئی۔

ڈیڈی نے ہمیں عقبی حصے سے آنے کے لیے کہا تھا کیونکہ ان کا ارادہ باربی کیو کا تھا۔ میں نے اس خیال کی مخالفت تو نہیں کی لیکن ڈرتے ڈرتے یہ ضرور کہا کہ اس مقصد کے لیے سور یا مرغی کا گوشت استعمال نہ کریں۔ یہ کہتے وقت میں بھول گیا تھا کہ ڈیڈی کے کسی خیال کی مخالفت یا اس میں کوئی ترمیم کرنا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہے چنانچہ بالکل ایسا ہی ہوا۔ ڈیڈی میری بات سنتے ہی بھڑک اٹھے اور تیزی سے بولے۔

''کیوں؟''

''کیونکہ مرغی اور سور کا گوشت باربی کیو کے لیے مناسب نہیں ہے۔ یہ پوری طرح گل نہیں پاتا اور اندر سے کچا رہ جاتا ہے۔'' میں نے مناسب الفاظ میں وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

''مجھے تو کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا۔'' وہ کسی دوسرے کی بات مشکل سے ہی سمجھتے تھے۔

''بیف برگر کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے تجویز پیش کی۔

''یہ تو میں اپنے کتوں کو بھی دینا پسند نہیں کروں گا۔ انہیں ہضم کرنا مشکل ہوتا ہے۔''

میں نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میکس کو بھیڑ کا گوشت پسند ہے۔''

یہ تیر نشانے پر بیٹھا اور ڈیڈی نرم پڑتے ہوئے بولے۔ ''اوہ، اچھا۔ میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔''

میں نے جلدی سے گیراج کی طرف والا لکڑی کا دروازہ کھولا جہاں سے عقبی باغ کی طرف راستہ جاتا تھا۔ ابھی دروازہ بمشکل تھوڑا ہی کھلا ہو گا کہ ایک زوردار آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ میری داہنی آنکھ سے دو انچ کے فاصلے پر ایک تیر گزرتا ہوا دروازے میں پیوست ہو گیا۔ میں پیچھے کی جانب اچھلا اور میکس سے ٹکرا گیا جو اس اچانک افتاد سے گھبرا کر گر پڑی۔ میں جونہی اسے اٹھانے کے لیے بڑھا، باغ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ڈیڈی کا چہرہ نمودار ہوا۔

''یہ کیا شور مچا رکھا ہے؟''

مجھے میکس کو اٹھانے میں چند سیکنڈ لگ گئے جو سوالیہ انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی کہ آخر میں نے اس پر چڑھائی کیوں کی۔ اس لیے میں فوری طور پر ڈیڈی کی جانب متوجہ نہ ہو سکا۔ اس دوران میں ڈیڈی دروازے میں سے تیر نکال چکے تھے اور اس کا معائنہ کر رہے تھے۔ میں نے انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کیا کر رہے تھے؟''

میں نے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ مجھے بڑوں سے بات کرنے کا طریقہ سیکھنا چاہیے۔ انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''مشق کر رہا تھا۔''

''مشق... کیسی مشق؟ مجھے مارنے کی؟''

''نہیں، میں تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔'' انہوں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

میں جانتا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ڈیڈی کو نئے نئے مشغلے اختیار کرنے کا شوق ہو گیا ہے۔ پہلے انہیں اسکول کے بچوں کی طرح نامور فٹ بال کے کھلاڑیوں کی تصویریں جمع کرنے کا شوق ہوا پھر جلد ہی وہ اس سے اکتا گئے۔ گزشتہ برس انہوں نے یکے بعد دیگرے پامسٹری، بڑھئی، لوہار، کراٹے اور شعبدہ بازی جیسے مشاغل اختیار کیے لیکن کوئی مشغلہ بھی چند دنوں یا ہفتوں سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔

''آپ اپنے باغ کے دروازے کو نشانہ بنا رہے تھے؟'' میں نے اس جانب اشارہ کیا جہاں تیر جا کر لگا تھا۔

''بالکل۔'' انہوں نے ہمارے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک بڑا سا گتا لگا ہوا تھا جس میں کئی سوراخ ہو گئے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی نشانے پر نہیں تھا۔

''یہ جگہ نشانے بازی کے لیے بہت مناسب ہے۔'' ڈیڈی نے پُرجوش انداز میں کہا۔

''لیکن آپ جانتے تھے کہ ہم اسی راستے سے آ رہے ہیں۔'' میں نے انہیں یاد دلایا۔

''پھر کیا ہوا؟'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولے۔ ''تم مجھے اتنا ہی احمق سمجھتے ہو۔ اگر دروازہ مزید کھل جاتا تو یقیناً میں تیر نہ چلاتا۔''

مجھے ان کی بات پر بالکل بھی یقین نہیں آیا لیکن اختلاف کی گنجائش نہیں تھی لہٰذا میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ''یہ تیر میری آنکھ کے بالکل قریب سے گزرا ہے۔ اگر ذرا سا بھی نشانہ چوک جاتا تو...''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ پُرجوش انداز میں

بولے۔ ''یہ کمان میں نے خود بنائی ہے۔ آؤ تم بھی دیکھو۔''

ہم دونوں کے پاس ان کے حکم کی تعمیل کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ اپنے باربی کیو کے پاس کھڑے ہوئے تھے جہاں سے گوشت کے جلنے کی مہک آ رہی تھی اور وہ اپنی کمان کو اس طرح پچکار رہے تھے جیسے کوئی ماں اپنے نومولود بچے کو پچکارتی ہے۔ انہوں نے کمان مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

''خوب صورت ہے نا؟''

واقعی وہ کمان دیکھنے میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی لمبائی پانچ فٹ اور درمیان سے اس کا نصف قطر ایک انچ تھا۔ اس پر بڑی نفاست سے پالش کی گئی تھی اور دستے کے بالکل نیچے ایک باریک بولٹ کی طرح کی کوئی چیز آگے کو نکلی ہوئی تھی۔

''یہ میں نے خود بنائی ہے۔'' ڈیڈی نے فخر سے کہا۔

میکس متاثر ہوتے ہوئے بولی۔ ''حیرت انگیز ڈاکٹر ایلیٹ۔ تم واقعی بہت باصلاحیت ہو۔''

''میں لائبریری سے تیر اندازی کے متعلق ایک کتاب لایا تھا اور اس کو پڑھنے کے بعد ہی مجھے یہ کمان بنانے کا خیال آیا۔''

''کیا آپ نے اب تک اس سے کسی کو مارا ہے؟''

وہ جارحانہ انداز میں بولے۔ ''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، باربی کیو میں شعلے بھڑک اٹھے۔ ہماری توجہ آگ بجھانے اور باقی ماندہ گوشت کو بچانے پر مرکوز ہو گئی اس لیے یہ موضوع ادھورا رہ گیا۔ اس شام ہمیں اسی ادھ جلے کچے پکے گوشت پر گزارہ کرنا پڑا۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ڈیڈی کے اس نئے شوق پر اظہارِ رائے کر سکوں۔

☆☆☆

تین جون کو صبح سات بجے میں نے اپنی کار فیئر لینڈ ایونیو میں پارک کی۔ میں یہاں گھومنے پھرنے نہیں بلکہ پولیس سرجن کی حیثیت سے ڈیوٹی جوائن کرنے آیا تھا۔ میں یہ عہدہ قبول کرنا نہیں چاہ رہا تھا لیکن اپنے ایک دوست کے کہنے پر راضی ہو گیا جو خود بھی دس سال سے اس پوسٹ پر تھا اور اب ریٹائر ہونے والا تھا۔ وہ میرے والد کے معاون کے طور پر بھی کام کر چکا تھا جو خود بھی اپنے زمانے میں پولیس سرجن رہ چکے تھے۔ ان کی زندگی کو دیکھتے ہوئے واقعی یہ ایک ناخوشگوار کام تھا لیکن اس کا ایک روشن پہلو یہ بھی تھا کہ اس کی وجہ سے میری آمدنی میں معقول اضافہ ہو جاتا۔ اس کے عوض مجھے اپنی سماجی زندگی کی قربانی دینا پڑتی۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں میکس میری شکل ہی نہ بھول جائے۔

میں سڑک کے کنارے چلتا ہوا فیئر لینڈ ایونیو تک پہنچ گیا جہاں بہت سے پولیس والے مجمع لگائے کھڑے تھے۔ وہاں مجھے ایک گھڑی ساز کی دکان بھی نظر آئی جس کے بورڈ پر مالک کا نام ہاروے کارلٹن لکھا ہوا تھا۔ میں کسی رکاوٹ کے بغیر انسپکٹر میسن کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ساتھ کچھ اور سپاہی بھی کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

''ڈاکٹر! ہم تمہیں زحمت نہ دیتے لیکن مشکل یہ ہے کہ پیتھالوجسٹ کو ڈائریا ہو گیا ہے۔''

''کیا ہوا؟''

اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ ہم سپاہیوں کی قطار میں سے گزرتے ہوئے ایک ایسی لاش کے پاس پہنچے جس نے براؤن اوورآل پہن رکھا تھا۔ وہ کمر کے بل زمین پر پڑا ہوا تھا اور اس کی ایک آنکھ غائب تھی اور اس جگہ خون کا لوتھڑا سا نظر آ رہا تھا۔ گرتے وقت وہ ایک الماری سے ٹکرایا تھا جس میں گھڑیال، گھڑیاں، بیرومیٹر اور موسم بتانے والے آلات رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر ٹوٹ چکے تھے اور آس پاس ان کے پرزے بکھرے ہوئے تھے۔

''کیا اس کی موت ٹکرانے سے واقع ہوئی؟'' میسن نے پوچھا۔

میرا بھی یہی خیال تھا لیکن میں فوری طور پر یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ ''کیا میں اسے چھو سکتا ہوں؟''

''ہاں، اس میں کوئی مضائقہ نہیں... کیونکہ لاش کی تصاویر لی جا چکی ہیں۔''

میں نے آہستہ سے اس کا سر اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور اپنی انگلیوں سے اس کی کھوپڑی ٹٹولنے لگا۔ وہاں مجھے ایک نرم پلپلی جگہ محسوس ہوئی جو کسی بیرونی زخم کی وجہ سے ہو سکتی تھی پھر میں نے اس کا سر زمین پر رکھ دیا اور اس کے پورے جسم کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے ایک کانسٹیبل سے کہہ کر لاش کو سیدھا کیا۔ اس کے بازو، گردن، کمر، کہنیوں اور ہتھیلیوں کا معائنہ کیا۔ میں نے ایک سپاہی سے کہہ کر اس کی پتلون اتروائی اور تھرمامیٹر سے ٹمپریچر چیک کرنے لگا۔ لاش کی چیر پھاڑ کیے بغیر میں اتنا ہی معائنہ کر سکتا تھا۔

''لاش کے درجۂ حرارت میں صرف دو درجے کمی ہوئی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اسے مرے ہوئے تین سے چار گھنٹے ہو چکے ہیں۔''

''ڈاکٹر! میں جانتا ہوں کہ اس کی موت کب واقع ہوئی تھی کیونکہ اس کے گرنے سے کم از کم آٹھ وال کلاک ٹوٹ گئے اور ان کی سوئیاں اپنی جگہ پر رک گئیں۔ یعنی تین بج کر باون منٹ پر۔''

مجھے یہ بات سخت ناگوار گزری کہ اس نے میرے اندازے کو کوئی اہمیت نہیں دی لہٰذا میں تلخی سے بولا۔ ''مجھے آنکھ کے علاوہ جسم کے کسی حصے پر کوئی گہری چوٹ یا زخم دکھائی نہیں دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ آنکھ پر لگنے والے زخم ہی کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی ہوگی۔''

''لیکن یہ زخم کیسے لگا؟''

''میرا پہلا تاثر یہی ہے کہ یہ ایک نسبتاً چھوٹی گولی کا زخم ہے لیکن جب تک پوسٹ مارٹم نہ ہو جائے، اسے ایک اندازہ ہی سمجھنا چاہیے۔''

اس نے تائید میں سر ہلایا اور سپاہیوں کی طرف گھومتے ہوئے بولا۔ ''گولی تلاش کرو۔''

میں نے انہیں کچھ ضروری ہدایات دینا مناسب سمجھا۔ ''بیرومیٹر ٹوٹ جانے سے زمین پر پارا پھیل گیا ہے، یہ زہریلا ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

میسن نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''کیا واقعی؟''

''سب لوگوں کو دستانے پہن لینے چاہئیں۔'' میں نے کہا۔

اس نے نتھنے پھلاتے ہوئے میری طرف دیکھا پھر اپنے آدمیوں سے بولا۔ ''تم نے سن لیا۔ فوراً ڈسپوزیبل دستانوں کا بندوبست کرو۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ لاش ہاروے کارلٹن کی ہے؟''

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا، اس کے بعد خاموشی سے کھسک لیا۔ وہ سب اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ باہر آتے ہوئے میری نظر مخالف سمت پر واقع کونے کی دکان پر گئی جو مجھے فرنیچر شاپ لگ رہی تھی۔ میں نے اس دکان پر لگا ہوا بورڈ پڑھا جس پر پیٹر کارلٹن کا نام لکھا ہوا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر میسن کو مجھ سے معاملہ کرتے وقت ہمیشہ جلدی ہوتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ موجود ہے کیونکہ جب وہ کسی معاملے کی کھوج لگانے میں ناکام رہتا تو وہ میری مدد کا طلب گار ہوتا۔ اس کیس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ لہٰذا میں نے اور میکس نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہماری معلومات کے مطابق پیٹر اور ہاروے کارلٹن سگے بھائی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ ہاروے گھڑی ساز تھا جبکہ پیٹر نے بڑھئی کا پیشہ اختیار کیا۔ اس کا بنایا ہوا فرنیچر ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔ ان دونوں کے درمیان بیس سال پہلے ایک عورت میری کے مسئلے پر اختلاف ہوا تھا۔ دونوں ہی اس سے محبت کرنے لگے تھے جبکہ ان میں سے ایک ہی اس عورت کو حاصل کر سکتا تھا۔ وہ دونوں شکل و صورت، مہارت اور رتبے کے لحاظ سے ایک جیسے تھے لیکن میری نے ہاروے کو ترجیح دی۔ اس پر پیٹر نے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی کوشش کی مگر ناکام رہا لیکن اس کے بعد وہ بدلا ہوا آدمی بن گیا اور اس کی شہرت ایک سخت گیر، بے رحم اور غیر لچک دار تاجر کی ہو گئی۔ گو کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا لیکن ماضی کے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے وہی مشتبہ شخص قرار دیا جا سکتا تھا۔

''مجھے تو یہ شخص ہی قصوروار معلوم ہوتا ہے۔'' میکس نے پورے یقین سے کہا۔

''وہ کیسے؟''

''وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔''

اس نکتے پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی لہٰذا میں خاموش رہا۔ گو کہ جائے وقوعہ سے ایک گولی مل گئی تھی لیکن پوچھ گچھ کے باوجود یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی تھی۔ پیٹر سے بھی کئی گھنٹے تک پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ وہ پوری طرح تعاون کر رہا تھا اور اس کے چہرے سے صدمے کا اظہار ہو رہا تھا لیکن غور سے دیکھنے پر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اسے اپنے بھائی کی موت پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ وقوعہ والے روز وہ پورے دن دکان سے باہر نہیں گیا اور اس کے بیان کی تردید کے لیے کوئی بھی شہادت موجود نہیں تھی۔ اخبارات میں شائع ہونے والی تفصیل کے مطابق ہاروے کارلٹن کی مالی حیثیت مستحکم تھی اور اس کی ذاتی زندگی میں بھی کوئی الجھن نظر نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دنوں تک تفتیش جاری رہی پھر یہ کیس لوگوں کو یاد نہ رہا۔

☆☆☆

ستائیس جون اتوار کی شام میں اور میکس اپنے باغ میں بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو مجھے وہاں انسپکٹر میسن کا دھوپ میں تمتماتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ڈاکٹر لاسن! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''

میں اسے اپنے ساتھ لے کر باغ تک آیا۔ میکس کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر بشاشت لوٹ آئی اور وہ خوش دلی سے بولا۔

''میکس...... کیسی ہو؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں انسپکٹر۔''

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کچھ پیو گے؟''

''نہیں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی مجھے یہاں دیکھ کر۔''

''ظاہر ہے۔ تم محض ہم سے ملنے کے لیے تو یہاں نہیں آ سکتے۔''

''تم جانتے ہو میرے پاس لوگوں سے ملنے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔'' وہ مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

میکس بولی۔ ''کیا ہاروے کارلٹن کی موت سے متعلق کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے؟''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''پیتھالوجسٹ نے تمہارے خیال کی تصدیق کر دی ہے کہ ہاروے کی موت ایک چھوٹے بور کی گولی سے واقع ہوئی جو اس کی بائیں آنکھ میں لگی اور کھوپڑی کے پچھلے حصے سے نکل گئی۔ ہم نے اس گولی کو لکڑی کی الماری میں دبا ہوا پایا۔ لگتا ہے کسی چھوٹے بور کے ریوالور سے اسے نشانہ بنایا گیا تھا۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ میں نے میکس کو دیکھا۔ وہ بھی میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ شاید ہم دونوں ہی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ ہمیں کچھ کہنا چاہیے یا خاموشی ہی بہتر ہے۔ چند لمحے اسی طرح گزر گئے پھر میسن بولا۔

''یہ پیٹر کارلٹن ہی ہو سکتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ چند ہفتے قبل ان دونوں بھائیوں کا میری کی قبر پر آمنا سامنا ہو گیا تھا اور ان کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ قبرستان کے ایک مالی کا کہنا ہے کہ وہ پوری طرح بات تو نہ سن سکا لیکن وہ حلفیہ کہہ رہا ہے کہ پیٹر نے اپنے بھائی کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔''

میکس نے پوچھا۔ ''کیا پیٹر کارلٹن کے پاس ریوالور ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ریوالور حاصل کرنے کے لیے پچاس پاؤنڈ کافی ہیں۔ بشرطیکہ آپ صحیح بندے کو جانتے ہوں۔''

میکس نے مزید جرح کی۔ ''کیا وہ ایسے کسی شخص کو جانتا تھا؟''

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''پھر شاید اس نے یہ قتل نہ کیا ہو۔''

میسن نے فوراً ہی اپنا سر ہلایا اور بولا۔ ''یہ قتل اسی نے کیا ہے۔ میں جانتا ہوں۔''

میکس نے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس میں کوئی منطق نظر نہیں آتی۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔''

''آخر کیوں؟'' میکس نے وضاحت چاہی۔

''پیٹر کارلٹن کے پاس کولن بیل نامی ایک لڑکا مددگار کے طور پر کام کرتا ہے اور دکان کے باہر کے سارے کام وہی دیکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس روز ہاروے کی موت واقع ہوئی، وہ تقریباً سارا دن پیٹر کے ساتھ دکان پر ہی رہا۔ اس دوران میں وہ صرف تیس منٹ کے لیے دکان سے باہر گیا کیونکہ پیٹر نے اسے ایک اسٹول گونول روڈ پر واقع ایک مکان میں پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ وہ ساڑھے تین اور چار بجے کے درمیان دکان سے باہر رہا تھا۔''

''مردود۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ تمہیں خاص بات معلوم نہیں ہوتی؟''

''میں نے بھی ایسا ہی سوچا تھا۔''

''ہم نے وہ ریوالور بھی تلاش کر لیا ہے۔'' وہ فخریہ انداز میں بولا۔ ''اسے سڑک سے دو سو گز دور سینٹ جوڈ چرچ کے میدان میں پھینکا گیا تھا۔''

وہ ایسی خبریں سنا رہا تھا کہ مجھے اس معمے کے حل ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا پھر وہ اچانک بولا۔ ''لیکن ایک مسئلہ ہے۔ گولی کا تجزیہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسے تھارنٹن روڈ کی مخالف سمت یعنی پیٹر کارلٹن کی دکان سے نوّے درجے کے زاویے سے چلایا گیا تھا۔ اس مکان میں ایک نوبیاہتا جوڑا مسٹر اور مسز ہومن رہتے ہیں۔ بیوی حاملہ ہے اور شوہر راج کا کام کرتا ہے۔ ہم نے اس مکان کی تلاشی لی اور ان دونوں سے پوچھ گچھ بھی کی لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا۔''

''اوہ۔'' میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''شاید تم نے اخبارات میں پڑھ لیا ہوگا۔ پیٹر کا کہنا ہے کہ وہ پوری دوپہر اپنی دکان میں ہی موجود تھا اور ہم نے جتنے

بھی گواہوں سے بات کی، انہوں نے پیٹر کے اس دعوے کی تصدیق کی ہے۔ ہمیں کوئی ایسا ثبوت نہیں مل سکا جس سے ظاہر ہوسکے کہ وہ اس خاص وقت کے دوران دکان سے باہر گیا تھا۔ خاص طور پر کسی نے اسے ریوالور سمیت نہیں دیکھا۔"

"کیا کسی نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی؟ یقیناً قرب و جوار میں کوئی تو ایسا ہوگا۔"

"نہیں، لگتا ہے کہ ریوالور میں سائیلنسر فٹ تھا۔"

"یہ ایک الگ بات ہے۔"

وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "سائیلنسر لگانے سے نشانے باز تو نہیں چھپ سکتا۔ شاید وہ کسی ساؤنڈ پروف گاڑی میں ہو یا کسی ایسی گاڑی میں جو اس مکان کے سامنے والی سڑک پر کھڑی ہو۔" وہ بے صبری سے بولا۔ "یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ وہ دن بھر دکان سے باہر نہیں گیا۔"

"ممکن ہے کہ کوئی اس کے جرم میں شریک ہو۔" میکس نے قیاس آرائی کی لیکن اس نے یہ بات بے دلی سے کی تھی۔ شاید اسی لیے میسن نے اسے سننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور ایک بار پھر اپنے کہے ہوئے الفاظ دہرائے۔

"اسی نے یہ قتل کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ اسی کا کام ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ اس نے یہ قتل کیسے کیا؟"

"تم یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"کیونکہ تفتیش کے دوران میں مسلسل نو دن تک اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا اور وہ مردم بیزاری کا اظہار کرتا رہا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہی مجرم ہے اور یہ بات مجھے بھی معلوم ہے لیکن فی الحال میں اسے ثابت نہیں کر سکتا۔"

میکس مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولی۔ "انسپکٹر! تم یہاں کس لیے آئے تھے؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور تیکھے انداز میں بولا۔ "تم اس کے ڈاکٹر بھی تو ہو۔"

اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔"

"میں جانتا ہوں کہ مریض کی میڈیکل ہسٹری خفیہ ہوتی ہے لیکن میں تم سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔ صرف اتنا بتا دو کہ کبھی اس نے کوئی ایسی بات کی جس کا تعلق اس کے بھائی کی موت سے ہو؟"

مجھے اس کی حماقت پر ہنسی آگئی۔ ڈاکٹر کی انتظار گاہ ایسی جگہ نہیں جہاں کوئی اپنے گناہ کا اعتراف کرے۔ میرا تعلق صرف مریض کی طبی حالت سے ہوتا ہے لہٰذا میں نے بے دھڑک کہہ دیا۔

"مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں۔"

"واقعی؟" وہ شک کرنے کے انداز میں بولا۔

"ہاں، اس نے کبھی اپنے بھائی یا اس کے ساتھ تعلقات کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں سمجھوں گا کہ یہ کوشش بھی رائگاں گئی۔"

میکس نے اسے ہمدردی سے دیکھا اور بولی۔ "یقیناً اس سے پہلے بھی تمہیں ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، جب کوئی کیس حل ہوتا نظر نہ آرہا ہو۔"

"ہاں، ایسا کئی بار ہوا ہے اور ان میں سے کچھ کیس بعد میں حل بھی ہوگئے لیکن ایسی ذلت کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں کبھی اسے قاتل ثابت نہیں کرسکوں گا اسی لیے وہ دندناتا پھر رہا ہے۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں اس کی طرف لپکا۔ دوسری طرف سے ڈیڈی بول رہے تھے۔

"لاسن! میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ وہ واپس آگئی ہے۔"

"وہ کون؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کتاب۔"

"کون سی کتاب؟"

"مجھے لائبریری سے وہ کتاب مل گئی ہے۔"

یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "ڈیڈ! کیا آپ اس کی وضاحت کر سکیں گے؟"

"میرے منصوبے کا اگلا مرحلہ۔" انہوں نے پُراسرار انداز میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں کہ آپ کس منصوبے کی بات کر رہے ہیں۔"

"کمان کی تیاری کا اگلا مرحلہ۔" وہ مجھے سمجھانے کے انداز میں بولے۔ "اس کتاب میں ایسے طریقے بیان کیے گئے ہیں جن کے ذریعے کمان کو زیادہ طاقتور اور بہ آسانی استعمال کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔"

"لیکن ڈیڈی، آپ ایسا نہیں کر سکتے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ واقعی کسی نہ کسی کو اپنی مشق کے دوران مار دیں گے۔ جیسا کہ میں اس روز بال بال بچا تھا۔"

"تم واقعی بہت بڑے ڈرامے باز ہو۔ تمہاری باتیں سن کر کوئی یہی سمجھے گا کہ تم کسی غیر ذمے دار بچے سے مخاطب ہو۔" میں نے جواب میں کچھ نہ کہا تو وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے۔ "لاسن! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں ڈیڈی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا اور باغ کی طرف چل دیا۔ میکس کافی پریشان نظر آرہی تھی جبکہ میسن پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"اب مجھے چلنا چاہیے۔"

میں اسے دروازے تک چھوڑنے گیا اور بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم جلد ہی یہ کیس حل کرلو گے۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

☆☆☆

دو مہینے تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا اور سب لوگ ہاروے کارلٹن کی موت کو بھول گئے۔ اخباروں میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ ڈیڈ بھی ان دنوں خاموش تھے۔ میں نے ان سے کئی مرتبہ پوچھا کہ ان کی کمان کی تیاری کس مرحلے میں ہے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس میں کچھ تکنیکی مسائل ہیں۔

پھر اچانک ہی ایک صبح پیٹر کارلٹن اپنی دکان کے فرش پر بے ہوشی کی حالت میں پایا گیا۔ یہ اطلاع ایک عورت نے دی جو ڈائننگ سیٹ کی کرسیاں خریدنے آئی تھی۔ ایمبولینس بلائی گئی اور اسے اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں اس پر جسم کے بائیں حصے میں فالج کی تشخیص ہوئی۔ چوبیس گھنٹے بعد اسے ہوش تو آگیا لیکن اس کا دایاں ہاتھ مفلوج ہو چکا تھا اور وہ بات بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے دو دن بعد اس کا معائنہ کیا۔ وہ شدید قسم کے ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ ایک لمحے میں اس کی پوری زندگی تباہ ہوگئی تھی۔ اس کی حالت میں معمولی سی بہتری آسکتی تھی، اگر وہ خود اس جانب کوشش کرتا لیکن وہ کبھی خودمختار زندگی گزارنے یا کام کرنے کے قابل نہ ہوتا۔

اس شام پارک میں چہل قدمی کرتے ہوئے میں نے میکس کو پیٹر کے بارے میں بتایا لیکن اس کے دل میں پیٹر کے لیے ہمدردی کے جذبات بیدار نہیں ہوئے اور وہ بولی۔ "شاید اسے اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے۔"

"کس بات کی سزا؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے بھائی کو مارنے کی۔"

"ہم نہیں جانتے کہ یہ قتل اسی نے کیا ہے۔"

"انسپکٹر کو بھی وہی قصوروار دکھائی دیتا ہے۔ ویسے بھی کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔"

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ ہم انسپکٹر کی بات پر آنکھ بند کرکے یقین کرلیں... اور کسی کے غیر مقبول ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے جرم کی بنیاد ٹھہرایا جائے۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" وہ مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن اس نے مسز کیری کے جارجی سے بدسلوکی کی تھی جو اس کے بدقماش ہونے کی علامت ہے۔"

جارجی ایک کتا تھا اور میکس کبھی کسی ایسے شخص کو معاف نہیں کرسکتی تھی جو کسی جانور سے بدسلوکی کرے۔

"کتے کو لات مارنا اور کسی شخص کو قتل کرنے میں بہت فرق ہے۔" میں نے بحث کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" اس نے فوراً جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اب وہ ساری عمر اسپتال میں پڑا رہے گا۔"

مجھے اس کا لہجہ پسند نہیں آیا۔ میں نے ناگواری کے انداز میں کہا۔ "تمہارے ذہن میں کیا ہے میکس؟"

اس نے ایک لمحے کے لیے تیوری چڑھائی پھر فوراً ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ ٹالنے کے انداز میں بولی۔

"کچھ نہیں۔"

اس کے بعد میں اس سے پوچھتا ہی رہ گیا لیکن اس نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔

☆☆☆

اگلے روز میری رات کو ڈیوٹی تھی۔ چنانچہ اس سے اگلے دن مجھے آرام کرنے کا موقع مل گیا۔ میں دن بھر سونے کے بعد شام چھ بجے نیند سے بیدار ہوا۔ ایک سینڈوچ کھانے کے بعد میکس کو فون کیا لیکن جواب نہیں ملا۔ اسے کبھی کبھی ایمرجنسی میں نائٹ ڈیوٹی بھی کرنا ہوتی تھی اس لیے مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ یہ شام ٹی وی دیکھ کر گزاروں گا اور بعد میں کسی وقت اس سے فون پر بات کرلوں گا۔ ٹی وی دیکھتے دیکھتے میری آنکھ دوبارہ لگ گئی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر میں رات گیارہ بجے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، میکس کی آواز سنائی دی۔

"لاسن! تم مصروف تو نہیں ہو؟"

"نہیں، بات کیا ہے؟"

"کیا تم اس وقت میرے پاس آسکتے ہو؟"

''ہاں لیکن تم کہاں ہو؟''
اس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیا۔ ''پیٹر کارلٹن کی دکان میں۔''

☆☆☆

میکس کے ساتھ وقت گزارنے میں مجھے کبھی بوریت نہیں ہوئی لیکن اس کی یہ حرکتیں مجھے بہت ناگوار گزرتی تھیں۔ اسی لیے جب میں فیئرلینڈ ایونیو کے اختتام پر کار سے اتر کر پیٹر کارلٹن کی دکان کی جانب بڑھا تو میرا موڈ خاصا خراب تھا۔ گوکہ اس وقت وہاں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن یقیناً وہ مجھے دیکھ رہی ہوگی کیونکہ جیسے ہی میں نے دکان کا دروازہ تھوڑا سا کھولا تو وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔
''اندر آجاؤ۔''
جیسے ہی میں اندر داخل ہوا تو اس نے فوراً ہی دروازہ آہستہ سے بند کر دیا اور بولی۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''
وہ مجھے لے کر دکان کے عقبی حصے میں گئی۔ وہاں ایک چھوٹا سا دفتر بنا ہوا تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دفتر کا دروازہ بند کیا اور میز پر رکھا ہوا لیمپ روشن کر دیا۔
''میکس! تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟''
''تحقیقات کرنے۔''
''دوسرے لفظوں میں اسے تالا توڑنا اور غیر قانونی طور پر داخل ہونا کہتے ہیں۔''
''میں نے کچھ نہیں توڑا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
''پھر تم دکان کے اندر کیسے داخل ہوئیں؟''
''میں نے اس کی چابی مسز کیری سے لی ہے جو برابر والے گھر میں رہتی ہے اور پیٹر کی دکان کی صفائی بھی اسی کے ذمے ہے۔ میں اس کے کتے کا علاج کرتی رہی ہوں اس لیے وہ میری شکر گزار رہتی ہے۔''
''تم نے کیا کہہ کر اس سے چابی لی؟''
''میں نے اسے بتا دیا کہ تم پیٹر کارلٹن کا علاج کر رہے ہو اور تم نے مجھ سے اس کی کچھ چیزیں لے کر اسپتال آنے کو کہا تھا۔''
میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو میکس! یہ ٹھیک ہے کہ پیٹر اس وقت اسپتال میں ہے اور شاید اسے آئندہ چند ہفتوں تک وہاں رہنا پڑے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس کی دکان کی تلاشی لیتی پھرو۔''
وہ آنکھیں پھاڑتے ہوئے بولی۔ ''لاسن! وہ ایک قاتل ہے۔''
''پھر بھی اس کے لیے کچھ اصول اور قاعدے ہیں۔''
اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ مجھے یہاں کچھ نہیں ملا۔''
میں نے برجستہ کہا۔ ''تمہیں کس چیز کے ملنے کی توقع تھی؟ خون سے لکھا ہوا اعتراف نامہ یا ریوالور جس سے صرف ایک گولی چلائی گئی ہو؟''
''تم کبھی نہیں سمجھو گے۔''
''زندگی اتنی آسان نہیں ہے میکس۔''
اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔ سوائے لکڑی اور دیگر سامان کی رسیدوں کے۔''
کچھ دیر بعد ہم دونوں دکان سے باہر آچکے تھے۔ مسز کیری کے لیٹر بکس میں چابی ڈالنے کے بعد ہم تیزی سے کار کی جانب بڑھے۔ خطرہ تھا کہ کہیں کوئی ہمیں دیکھ نہ لے۔
واپسی کے سفر کے دوران میکس نے کہا۔
''میرا خیال ہے کہ پیٹر کچھ کھسکا ہوا ہے۔''
''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''
''کیونکہ اس نے بڑی مقدار میں ملائم گوٹیاں خریدی تھیں جو ہم اپنی کار میں لٹکاتے ہیں۔''
''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''
''میں نے اس کے دفتر میں رسیدیں دیکھی ہیں۔ اس نے مئی کے مہینے میں ان گوٹیوں کی خریداری پر اتنی پاؤنڈ خرچ کیے۔''
''اس رقم سے تو اس نے ڈھیروں گوٹیاں خریدی ہوں گی جن سے پورا کمرا بھر جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جیسے ماہر فرنیچر ساز کو انوکھے تحفے فروخت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔''
''اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بھائی کے کاروبار میں بھی قدم رکھ رہا تھا۔'' میکس بولی۔
''وہ کس طرح؟''
''اس نے اسی دوران بیرومیٹر کی بھی ایک کھیپ خریدی تھی۔ ممکن ہے کہ شاید ہاروے کو قتل کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کیونکہ اس نے بیرومیٹر بیچنے پر اعتراض کیا ہوگا۔''
''اس کے پاس ہاروے کو قتل کرنے کی اور بھی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن ابھی یہ معلوم کرنا باقی ہے کہ ہاروکو کس نے اور کیوں قتل کیا؟''

☆☆☆

میں اور میکس باغبانی میں مشغول تھے جب ڈیڈ

نئی دلہن نے فخریہ انداز میں شوہر کو بتایا ''یہ روٹی میں نے خود پکائی ہے۔''
''بہت خوب......!'' شوہر نے کہا ''لیکن اسے توے سے اتارنے میں کس نے تمہاری مدد کی؟''

کلاس ٹیچر اپنی کلاس کے بچوں کو چڑیا گھر دکھانے لے گئی تھیں۔ سب جانور دکھانے کے بعد انہوں نے ننھے فرید سے پوچھا ''ہاں......تو بیٹا! ان جانوروں کو دیکھ کر تمہارے ذہن میں کوئی خیال آیا؟''
''جی ہاں مس!'' فرید نے گہری سنجیدگی سے کہا ''میرا خیال ہے کہ ہاتھی اور کینگرو کو اپنی اپنی دم ایک دوسرے سے بدل لینی چاہیے۔''

اس شام مجھ سے ملنے آئے۔ مجھے باغبانی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لیکن مجبوراً میکس کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ ڈیڈی ہمیشہ کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا موڈ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ ان کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جسے انہوں نے باغ میں پڑی ہوئی میز پر رکھ دیا اور اپنے مخصوص انداز میں بولے۔
''تمہارے یہاں مہمانوں کی خاطر کرنے کا یہی طریقہ ہے؟''
میکس بولی۔ ''آپ کیا پینا پسند کریں گے ڈاکٹر ایلیٹ! بیئر، وائن یا کوئی سافٹ ڈرنک؟''
''اگر میرے بیٹے کے پاس کوئی عمدہ سی بیئر ہے تو میں اسی پر گزارہ کرلوں گا۔''
میکس ان کے لیے بیئر لینے چلی گئی تو میں نے پوچھا۔
''اس سوٹ کیس میں کیا ہے؟''
''بے فکر رہو۔ میں تمہارے یہاں رہنے نہیں بلکہ کچھ دکھانے آیا ہوں۔'' وہ قہقہہ مارتے ہوئے بولے۔ پھر انہوں نے سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک کمان نکالی۔
''واہ... یہ تو بہت شاندار ہے۔'' میں نے کہا۔
''میں خود بھی اس سے مطمئن ہوں۔'' وہ کمان اپنے کندھے پر لٹکاتے ہوئے بولے۔ ''اس میں کئی خوبیاں ہیں۔ تم اس سے ماربل جیسی چیزیں بھی فائر کر سکتے ہو۔ وہ بھی تیر کی طرح ہی مہلک ثابت ہوں گی۔''
یہ کہہ کر انہوں نے کمان میز پر رکھ دی۔ میکس اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا اسے آسانی سے استعمال کیا جا سکتا ہے؟''
''کیوں نہیں۔ یہی تو اس کی خوبی ہے۔ لمبی کمان کے مقابلے میں اس سے نشانہ لینا بہت آسان ہے۔ البتہ اس میں ایک خامی یہ ہے کہ اس سے ایک منٹ میں ایک یا دو تیر ہی چلائے جاسکتے ہیں لیکن سائز میں چھوٹی ہونے کے سبب اس کے ذریعے چھپ کر نشانہ لگایا جاسکتا ہے جو دو سو گز کے فاصلے تک درست اور مہلک ہوگا۔''
جس وقت وہ اپنی کمان کی خوبیاں بیان کر رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ ان کے پڑوسیوں کو فون کر کے احتیاط کا مشورہ دے دوں کیونکہ ڈیڈی اپنی نئی ایجاد کو استعمال کرنے کے شوق میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔ میرے دماغ میں چند ہفتے پہلے کی یاد ابھی تک تازہ تھی۔ لیکن مجھے فوراً ہی ڈیڈی کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ اب وہ اس کی تخلیق کے دوران حائل مسائل کا تذکرہ کر رہے تھے۔
''اس کمان کی تیاری کے لیے مجھے جس کتاب کی ضرورت تھی، وہ لائبریری سے کافی دیر میں ملی۔ کچھ لوگ بڑے خود غرض اور بے پروا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے دوسروں کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ کتاب بھی کارلٹن نامی ایک شخص کافی دنوں سے دبائے بیٹھا ہوا تھا...''
''کارلٹن؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔
''ہاں، میں کہہ رہا تھا...''
میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس کا پورا نام پیٹر کارلٹن ہے؟''
''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''
میں نے میکس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی ایسے ہی تاثرات تھے۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ ڈیڈی نے کیا کہا اور میں نے کیا سنا۔ میرا دماغ تو کسی اور طرف چلا گیا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح میں نے لائبریرین کو فون کر کے پوچھا کہ کیا پیٹر کارلٹن ہی وہ شخص ہے جس نے کمان کے موضوع سے متعلق کتاب کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا؟ پہلے تو وہ حیران ہوا پھر اس نے تصدیق کر دی کہ وہ کتاب پیٹر کارلٹن کے پاس ہی تھی۔ اس نے اس بات پر بھی خوشی کا اظہار کیا کہ پیٹر نے فالج کا حملہ ہونے سے پہلے ہی وہ کتاب واپس کر دی تھی ورنہ

اس کے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔

میں پورا دن یہی سوچتا رہا کہ ان معلومات کو لے کر کس طرح آگے بڑھوں پھر میں نے اپنا ذہن بنایا اور منافقت کا سہارا لیتے ہوئے مسز کیری کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے ان سے جھوٹ بولا کہ پیٹر کارلٹن کی چیک بک تلاش کرنے کے لیے مجھے اس کی دکان کی چابی چاہیے۔ اس بوڑھی عورت نے میرے جھوٹ پر یقین کرتے ہوئے چابی میرے حوالے کردی۔

مجھے کس چیز کی تلاش تھی؟ شاید میں سمجھ رہا تھا کہ وہاں کوئی کمان مل جائے گی لیکن میں بہت زیادہ پُرامید نہیں تھا۔ اگر پیٹر کارلٹن میں ذرا بھی سمجھ ہوگی تو اس نے وہ کمان فوراً ہی جلا دی ہوگی اور مجھے یقین تھا کہ وہ بہت زیادہ سمجھ دار ہے۔ اب تک میری سوچ کا نچوڑ یہ تھا کہ اس نے وہ گولی کمان کے ذریعے فائر کی ہوگی لیکن اس کے باوجود کئی اہم سوالوں کے جواب باقی تھے۔ پہلا سوال تو یہ تھا کہ اس نے اس مقصد کے لیے سائیلنسر لگے ریوالور سے چلی ہوئی گولی کا انتخاب کیوں کیا؟ اور دوسرا یہ کہ اس نے دن دہاڑے کمان کا استعمال کیسے کیا جبکہ وہ سیکڑوں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا۔

کئی گھنٹے کی تلاش کے باوجود مجھے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ چھوٹے سے عقبی صحن میں مجھے دھات کے چند ٹکڑے ملے۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں انہیں بغور دیکھا۔ بظاہر یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کسی کمان کے ٹکڑے ہیں پھر بھی میں نے انہیں اکٹھا کر کے پلاسٹک کے تھیلے میں ڈال لیا۔ اس کے بعد میں نے دفتر کی تلاشی لی اور جب گوٹیوں اور بیرومیٹر کی رسیدیں میرے ہاتھ لگیں تو معاملہ بالکل صاف ہو گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح میں میکس کو ساتھ لے کر پیٹر کارلٹن سے ملنے گیا۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کا دایاں حصہ مرجھایا ہوا تھا جبکہ دایاں بازو بھی ران پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے اس کی خیریت دریافت کی جس کا جواب اس نے اشاروں سے دیا۔ پھر میں نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”پیٹر! میں تم سے تمہارے بھائی کی موت کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اس روز کیا ہوا ہوگا۔“

گو کہ وہ میری بات سن رہا تھا لیکن اس نے مجھ پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ میں نے میکس کی طرف دیکھا جس نے مسکراتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی۔ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم نے اس روز انتہائی چالاکی اور سلیقے سے کوئی کام کیا تھا۔“

اس جملے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، تب میں نے کھل کر بولنا شروع کر دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم نے خود ہی ایک کمان بنائی اور اس مقصد کے لیے لائبریری سے کتاب لے کر آئے اور اپنی مہارت کو استعمال کرتے ہوئے ایک بہت ہی اچھی کمان بنالی۔ جیسا کہ میرے والد نے بتایا کہ چھپ کر وار کرنے کے لیے یہ ایک بہترین ہتھیار ہے اور اس کے ذریعے صرف تیر ہی نہیں بلکہ کچھ بھی فائر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ قتل دن کی روشنی میں دوپہر تین بج کر باون منٹ پر ہوا اور گولی جس سمت سے آئی، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قاتل ایک کھلی جگہ پر موجود تھا اور یہ کہنا پاگل پن ہوگا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔“

پہلی بار اس کے حلق سے بے ہنگم آوازیں نکلیں جن پر دھیان دینے کی میں نے ضرورت محسوس نہیں کی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ پولیس کو جو گولی ملی، یہ وہ نہیں ہے جس سے تمہارے بھائی کو قتل کیا گیا۔ وہ محض ایک دھوکا تھا تاکہ پولیس غلط سمت میں کام کرتی رہے۔ یہ گولی تم نے ایک رات پہلے سائیلنسر لگے ریوالور سے چلائی تھی۔ تم یہ ریوالور لے کر تھارنٹن روڈ کے پار ہومن کے باغ میں گئے۔ تم جانتے تھے کہ ہاروے عموماً دیر تک دکان میں کام کرتا ہے اور تمہیں کم و بیش اس کے گھر جانے کے اوقات بھی معلوم تھے۔ تم نے اس کے دکان سے نکلنے کا انتظار کیا اور اس طرح نشانہ لیا کہ گولی اس کے کندھے کے اوپر سے گزر گئی۔ تم واقعی ایک اچھے نشانے باز ہو۔“

اس نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا لہٰذا میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”تم یقیناً اسے اسی وقت مار دینا چاہ رہے ہوگے لیکن تم نے صبر سے کام لیا۔ تمہارا نشانہ اس کے پیچھے رکھی ہوئی لکڑی کی الماری تھی کیونکہ ریوالور چھوٹے سائز کا تھا اس لیے الماری کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ تم جانتے تھے کہ پولیس یہ گولی تلاش کر لے گی اور اس کی تفتیش کا رخ غلط سمت کی جانب مڑ جائے گا۔ اس طرح تم نے اسے قتل کرنے کا راستہ ہموار کر لیا۔ پھر دوسرے روز اپنی دکان میں کھڑے ہو کر تم نے اپنی کمان سے اس کو نشانہ

بنایا اور اس کے لیے تمہیں اس وقت تک انتظار کرنا پڑا جب تک وہ اس جگہ پر نہیں آیا جہاں تم نے گزشتہ شب اس پر گولی چلائی تھی۔“

مجھے لگا کہ اس پر کپکپی طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے کہا۔ ”لیکن تم نے کون سی گولی استعمال کی تھی؟ پولیس کو تو جائے واردات سے ایک ہی گولی ملی ہے۔ دوسری کہاں گئی؟“

میکس بولی۔ ”ہاں..... وہ گولی کہاں ہے؟“

میں اپنے ساتھ دھات کے وہ ٹکڑے لے کر آیا تھا جو مجھے پیٹر کی دکان کے صحن سے ملے تھے۔ میں نے بستر پر ایک اخبار بچھایا اور اس پر وہ ٹکڑے ڈالتے ہوئے بولا۔ ”پہلے میرا خیال تھا کہ یہ کمان کے ٹکڑے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بیرومیٹر کے ٹکڑے ہیں جو تم نے مئی کے مہینے میں کافی تعداد میں خریدے تھے۔“

”اور وہ ملائم گوٹیاں؟“ میکس نے پوچھا۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں میکس! وہ ملائم گوٹیاں نہیں بلکہ کارڈائس تھیں۔“

میکس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ٹھوس کاربن ڈائی آکسائڈ ہے اور اس کا درجۂ حرارت منفی ستر ڈگری سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔ یہ بہ آسانی پارے کو ٹھوس شکل میں منجمد کر سکتی ہے۔ وہی پارا جو اس نے بیرومیٹر سے حاصل کیا تھا۔“

اب وہ میری بات سمجھ گئی تھی۔ میں پیٹر کارلٹن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار مجھے ایسا لگا کہ وہ میری بات سن رہا ہے بلکہ مجھ سے اتفاق بھی کر رہا ہے۔ میکس بولی۔ ”اس نے ٹھوس پارے سے وہ گولی بنائی تھی؟“

”اس نے احتیاطاً ایک نہیں کئی گولیاں بنائی تھیں۔ اس نے اپنی دکان کے دروازے میں کھڑے ہو کر ہاروے کا اس وقت نشانہ لیا جب وہ اس الماری کے پاس کھڑا ہوا تھا جہاں بیرومیٹر رکھے جاتے تھے۔ گولی اس کی آنکھ میں لگی اور دماغ سے ہوتی ہوئی کھوپڑی کے عقبی حصے سے نکل گئی اور پھر فرش پر بکھرے ہوئے پارے میں مل کر پگھل گئی۔“

کچھ لمحے کے لیے خاموشی رہی پھر میں نے محسوس کیا کہ پیٹر کارلٹن ہچکیاں لے کر رو رہا ہے۔

☆☆☆

سرکاری طور پر میسن نے ہی یہ کیس حل کیا تھا لیکن اس نے مجھ سے شکریہ کا ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اگلی بار جب اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے تصدیق کی کہ پیٹر کارلٹن نے اعترافِ جرم کر لیا ہے اور جو حقائق میں نے معلوم کیے، ان کی بھی تصدیق کر دی ہے۔

”میں نہیں جانتا ڈاکٹر کہ اگر میرا ذہن اتنے پیچیدہ کیس کو حل کرنے کے قابل ہوتا تو آج میں کہاں ہوتا۔“

میں نے سوچا کہ یہ تو انگور کھٹے ہونے والی بات ہو گئی۔ تاہم مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کسی بھی شخص میں یہ صلاحیت ہو سکتی ہے کہ وہ اس طرح کے پیچیدہ کیس کو حل کر سکے۔ بس عقل کا استعمال شرط ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ مجھے کوئی سخت جملہ کہتا، میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے کمرے سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

ڈیڈی نے ہمیں ایک بار پھر باربی کیو پر مدعو کیا۔ میں نے اس یقین دہانی کے بعد یہ دعوت قبول کی کہ وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے اپنی کمان کو سوٹ کیس سے باہر نہیں نکالیں گے۔ اس کے باوجود عقبی باغ کا دروازہ کھولتے وقت مجھ پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ میں نے احتیاط سے اندر جھانکا۔ ڈیڈی کرسی پر بیٹھے بظاہر کچھ پڑھنے میں معروف تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور کمان نکال کر ہمارے سامنے کرتے ہوئے بولے۔

”میں نے اس کے لیے تیر بھی بنائے ہیں۔ ان کے استعمال کا طریقہ بہت آسان ہے۔“ اس کے بعد وہ تفصیل سے بتانے لگے کہ کس طرح تیر کمان میں رکھ کر اسے چلایا جاتا ہے پھر انہوں نے اس کا عملی مظاہرہ شروع کر کے ہینڈل کو گھمایا۔ پہلے تو کوئی مشکل پیش نہیں آئی پھر آہستہ آہستہ کمان کی ڈور سخت ہوتی گئی۔ ڈیڈی کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”احتیاط سے۔“

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولے۔ ”لاسن! شور مت کرو۔ یہ انتہائی درست ہتھیار ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں کتنی لچک ہے...“

ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی کمان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ڈیڈی کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا لیکن مجھے کوئی افسوس نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ باز آنے والے نہیں۔ ایک کمان ٹوٹ گئی تو کیا ہوا، وہ دوسری کمان بنانا شروع کر دیں گے۔ ان کے اسی شوق اور جذبے کی بدولت ہم پیٹر کارلٹن تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ اس واقعے کے بعد مجھے ڈیڈی کے تجربات سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ اب میں بلا جھجک ان کی دعوتوں میں جاتا ہوں۔

☆

اسماقادری

قسط : 36

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف وتشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے . . . ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے ۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے ، یہ تو بس ہو جاتی ہے ۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزر نا پڑتا ہے ۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں . . . کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے ۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے . . . اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے ۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی قس

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

سوغ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں ہیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی ہیرآباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ شہر یار، ماہ بانو کو کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ آفتاب اور کشور میر پور خاص آ جاتے ہیں۔ ماہ بانو اغوا ہو کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ شہر یار، مختار مراد کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہر یار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑے اور عزت کی زندگی گزارے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، للی زبردستی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ چودھری کے کرگے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ تاہم جگو کے آدمی بچی کو چھڑا لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی ڈیرے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی۔ اسلم، ماہ بانو اور للی سفر کے دوران ایک جگہ رکتے ہیں۔ وہاں جمرو پہنچ جاتا ہے اور اسلم اور جمرو کے درمیان خونی تصادم ہوتا ہے۔ للی اس تصادم میں جمرو کی گولی کا شکار بنتی ہے۔ جمرو، اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر پولیس والے شبانہ کے ذریعے آفتاب کا فون نمبر پتا کر کے اس کی قیام گاہ کا پتا لگا لیتے ہیں اور چودھری سے پیسوں کے عوض اس کا پتا بتا دیتے ہیں۔ سفر کے دوران ماہ
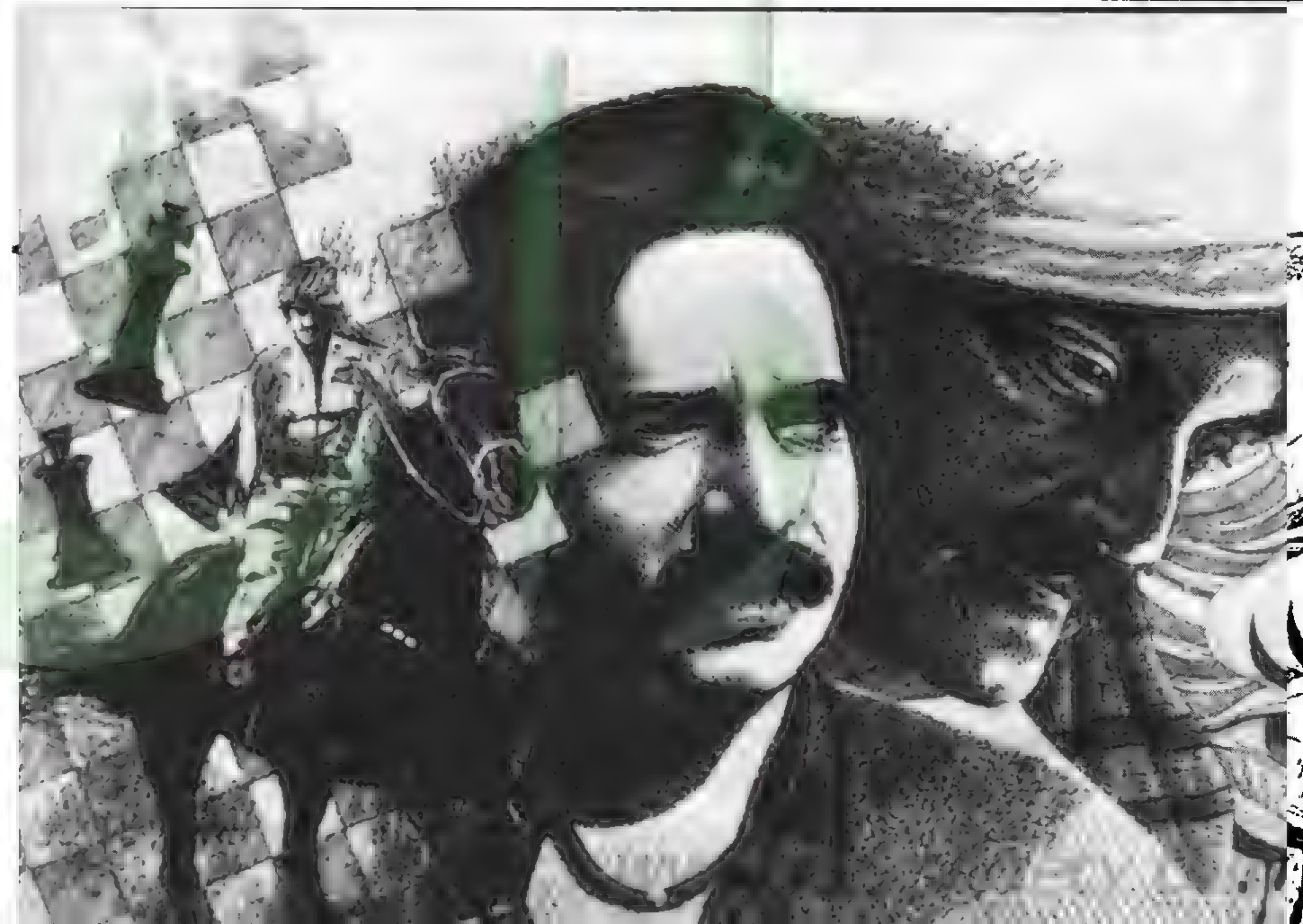
بانو اور اسلم کی ملاقات شفقت راؤ نامی شخص سے ہوتی ہے۔ وہ انہیں اپنے بہنوئی کا پتا سمجھا دیتا ہے اور ان کے لیے پناہ کا بندوبست کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کرلیتا ہے۔ ماہ بانو اور اسلم، شفقت راؤ کے بتائے ہوئے گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ لوگ حامد راؤ کے گھر آجاتے ہیں۔ اسلم اور ماہ بانو ایک ہی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔ صبح ان کی روانگی کا پروگرام ہوتا ہے۔ تاہم رات میں کچھ لوگ ان کے مکان کو گھیرتے ہیں۔ پھر وہاں دوبدو مقابلہ شروع ہوجاتا ہے۔ تاہم وہ سب دشمنوں کا گھیرا توڑ کر فرار ہوجاتے ہیں اور حامد راؤ کے شہر میں واقع فلیٹ میں آجاتے ہیں۔ ادھر مشابرم خان شہریار کو خانقاہ کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی خبر دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔ شہریار یہ خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہرحال وہ مشابرم خان کو دوبارہ تابلی والا جاکر تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مشابرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ ادھر ماہ بانو اسلم کے گاؤں اس کی ماں کو لینے پہنچتی ہے مگر زینت بی بی انتقال کرجاتی ہے۔ وہ اس کی تدفین کرا کے واپس اسلم کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ تاہم نواز چانڈیو اور اس کا بھائی وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ماہ بانو اور اسلم کو وہاں سے لے کر ویرانے میں آجاتے ہیں مگر اسلم اچانک حملہ کر کے انہیں ناکوں چنے چبوا دیتا ہے۔ وہ دونوں شہر چھوڑ دیتے ہیں۔ شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کرلی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہوگیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے تو وہ چونک جاتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہریار کو مشابرم خان کے ذریعے تابلی والا میں مشکوک اشیا کے پہنچائے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ شہریار میجر ذیشان کے ذریعے وہاں کارروائی کرواتا ہے اور خود بھی اس کے ہمراہ تابلی والا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پتا چلتا ہے کہ اس کی جاسوسی کی جارہی ہے تو وہ اپنے گھر میں جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والی ڈیوائس کو ڈھونڈتا ہے جو اسے کرسٹل کے پیالے میں رکھے موتیوں میں سے ایک موتی کی شکل میں مل جاتی ہے۔ شہریار کو ماریا پر شبہ ہوتا ہے۔ ماریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو شہریار مشابرم خان کو اس کی نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ ادھر شہریار کو ماہ بانو کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی لاہور جانا پڑتا ہے۔ راستے میں اسے اپنے تعاقب کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تعاقب کرنے والے کو قابو کرلیتا ہے اور اسے لے کر ذیشان کے آفس پہنچ جاتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو اور اسلم کو بھی وہیں بلا لیتے ہیں۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف بیٹی کی موت پر شدید غم و غصے کا شکار ہوتی ہے اور درما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ کرنل توحید پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ ادھر شہریار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ راستے میں گاڑی کے خراب ہونے پر وہ ایک جگہ رکتے ہیں۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے تاہم وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں اور اس کی شناخت بدلنے کے معاملات پر غور ہوتا ہے۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ ادھر شہزادی کو عابد انصاری کی جاسوسی کرنے کے الزام میں دھر لیا جاتا ہے۔ عابد انصاری اس سے سب کچھ اگلوانے کے بعد اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی اور عملی طور پر بھی ایسا دکھایا جائے گا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ کوما میں چلا گیا ہے۔ اس کی جگہ اسپتال میں کوئی دوسرا شخص ہوتا جبکہ اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کردی جاتی۔ مشابرم خان کو جب شہریار کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع ملتی ہے تو وہ اس کے پاس پہنچنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ جلد از جلد شہریار کے پاس لاہور پہنچنا چاہتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

’’تم لوگ حامد راؤ کی فیملی سے ملاقات کے لیے تابلی والا تو نہیں جاسکتے۔ بہتر تھا کہ فون پر انہیں اپنی روانگی کی اطلاع دے دیتے۔‘‘ ماہ بانو اور اسلم دونوں اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور اس نے کسی بھی ایک کو مخاطب کیے بغیر یہ بات کہی تھی۔ اس وقت وہ حامد راؤ کے چھوٹے سے فلیٹ کے لاؤنج میں بیٹھا ان دونوں کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ ابتدا میں جب حامد راؤ اور اس کے اہلِ خانہ بھی اسی فلیٹ میں مقیم تھے تو ماہ بانو نے اسے یہاں کا پتا نہیں دیا تھا۔ اسلم سے نکاح کے بعد جب تیزی سے ان دونوں کے امریکا جانے کی کارروائی ہونے لگی تو مختلف امور کے لیے رابطے کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے ماہ بانو نے خود ہی اسے یہاں کا پتا دے دیا لیکن وہ آج پہلی بار ہی یہاں آیا تھا۔ اس سے قبل جو بھی کام پڑتا تھا، ایف پی کا کوئی اہلکار آکر نمٹا دیتا تھا۔ اس نے خود یہاں آنے سے گریز اس لیے کیا تھا کہ ایک تو وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے پیچھے لگے دشمنوں میں سے کسی کی یہاں تک رسائی ہوسکے۔ ایسی صورت میں ماہ بانو اور اسلم مشکل میں پڑ جاتے۔ دوسرے یہ کہ وہ خود اتنا مصروف اور الجھا ہوا تھا کہ اس کے پاس کسی سے ملاقات کے لیے وقت کی شدید قلت تھی۔ اور ان سب باتوں سے بڑھ کر مسئلہ یہ تھا کہ اپنی تمام تر میچورٹی اور اخلاص کے باوجود ماہ بانو کو اسلم کی بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ دیکھنا ایک تکلیف دہ عمل تھا اس لیے وہ اس عمل سے گزرنے سے گریز کرتا رہا لیکن آج کی یہ ملاقات ناگزیر تھی۔

چند گھنٹوں بعد ہی ان دونوں کو نیویارک کے لیے روانہ ہوجانا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اب آئندہ زندگی میں پھر کبھی ان سے ملاقات ہوسکے گی یا نہیں۔۔۔ اس لیے ہر بات

بھول کر اس الوداعی ملاقات کے لیے پہنچ گیا تھا۔ ان کے یہاں سے نکلتے ہی اس کے ایکسیڈنٹ کا ڈراما پلے کیا جاتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جاتے جاتے ماہ بانو اپنے ساتھ کوئی ایسا دکھ یا پریشانی لے کر جائے جو بعد میں بھی اسے بےقرار رکھے اس لیے بہت سوچ سمجھ کر ذیشان کے ساتھ ٹائمنگ طے کی تھی اور خود یہاں ایک مختصر سی ملاقات کے لیے پہنچ گیا تھا۔ ماہ بانو اور اسلم کے سفری بیگ بالکل تیار حالت میں لاؤنج میں ہی رکھے تھے اور انہیں دس پندرہ منٹ بعد یہاں سے نکل جانا تھا۔ انہیں ائرپورٹ پہنچانے کے لیے بھی ایف پی کا ہی کوئی اہلکار گاڑی سمیت باہر پارکنگ میں منتظر تھا اور شہریار کے یہاں سے جاتے ہی انہیں بھی روانہ ہوجانا تھا۔

’’میں نے راؤ صاحب کو فون کردیا تھا۔ افسردہ ہو رہے تھے کہ ہم بغیر ملاقات کے جا رہے ہیں۔ مسعود نے تو خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ وہ خود ملاقات کے لیے ائرپورٹ پہنچ جائے گا لیکن میں نے اسے ٹال دیا کہ کہاں اتنی لمبی ڈرائیو کر کے آؤ گے۔ فون اور انٹرنیٹ کا دور ہے۔ ہمارے امریکا جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہم وہاں جاکر بھی تم لوگوں سے رابطے میں رہیں گے۔ وہ سمجھ دار لڑکا ہے، زیادہ اصرار نہیں کیا۔ ہمارے حالات بھی کسی حد تک ان لوگوں کے علم میں ہیں اس لیے یقیناً وہ سمجھ گیا ہوگا کہ ہم ائرپورٹ پر اپنے اردگرد کسی جاننے والے کو نہیں دیکھنا چاہتے تاکہ بعد میں کسی تعلق کی وجہ سے ان کے ذریعے ہمارا سراغ لگانے کی کوشش نہ کی جاسکے۔‘‘ اسلم نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

’’بالکل صحیح۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں خود بھی اپنی سیکیورٹی سے متعلق احتیاطی تدابیر کا احساس ہے۔‘‘ اس نے فوراً ہی اسلم کو سراہا۔ ماہ بانو سے اس کی شادی کا سخت مخالف ہونے کے باوجود وہ اس سے چند ملاقاتوں میں ہی قائل ہوگیا تھا کہ اسلم ایک عمدہ انسان ہے جسے معاشرے کی ستم ظریفی نے ڈاکو بنا دیا۔ نہ بناتی تو یقیناً وہ اتنا اہل تھا کہ خود اس کے لیول کی کوئی ملازمت کر رہا ہوتا اور اس کا اپنا ایک مقام ہوتا۔ اسے خوشی تھی کہ ماہ بانو کی فرمائش پر اس نے اسلم کے ڈاکو ہونے کو نظرانداز کرنے کی جو غیر قانونی حرکت کی تھی، آج وہ اسے اپنے اوپر بوجھ نہیں لگتی تھی۔ اس نے ایک اچھے انسان کی زندگی کے مزید ماہ و سال برباد ہونے سے بچا کر اسے نئے سرے سے زندگی کے آغاز کا موقع دے دیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ نئی زندگی اس کے لیے بہت خوش گوار ثابت ہوگی۔ ماہ بانو جیسی لڑکی کے ساتھ زندگی کے ناخوش گوار ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

’’تمہیں یاد ہے ناکہ نیویارک سے تمہیں کنیکٹڈ فلائٹ سے آرلینڈو جانا ہے اور وہاں میرے اس دوست سے ملنا ہے جس کا ایڈریس میں نے تمہیں دیا ہے۔ میرا وہ دوست آرلینڈو میں سیٹل ہونے میں تمہاری مدد کرے گا۔ لیکن یاد رکھنا کہ تم لوگ نہ تو خود وہاں جاکر مجھ سے رابطہ کروگے اور نہ ہی اس کے ذریعے رابطے میں رہنے کی کوشش کروگے۔ بس سمجھ لو کہ آج ہماری آخری ملاقات ہے۔ بعد میں کبھی قسمت نے سامنا کروادیا تو الگ بات ہے، ورنہ جانتے بوجھتے نہ تو میں تم سے رابطہ کروں گا اور نہ ہی تم دونوں کو رابطے کی اجازت دوں گا۔ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ایک دوسرے سے کٹ کر رہنے میں ہی ہماری بقا ہے۔‘‘ اس نے دیکھا کہ اس کے الفاظ نے ماہ بانو کی خوب صورت آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک پیدا کردی ہے لیکن اس نے جان کر نظرانداز کردیا۔ وہ اسے جن تکالیف سے بچانا چاہتا تھا اس کے لیے یہ تکلیف سہہ جانا اس کے حق میں بہتر تھا۔

’’ہم آپ کی ہدایات پر پورا پورا عمل کریں گے لیکن ساتھ میں یہ امید بھی رکھیں گے کہ ایک نہ ایک روز ہماری پھر سے ملاقات ضرور ہوگی۔ وہ کہتے ہیں ناکہ یار زندہ صحبت باقی۔۔۔ تو بس جب تک سانس ہے، ملنے کی آس بھی رہے گی۔‘‘ آج ماہ بانو بالکل خاموش تھی اور گفتگو کی ساری ذمے داری اسلم نبھا رہا تھا۔

’’ٹھیک کہا تم نے لیکن اس دنیا میں زندگی سے زیادہ بےبھروسا کوئی اور شے نہیں ہے۔ سانسوں کا سلسلہ کب کہاں ٹوٹ جائے، کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا اس لیے اس زندگی سے زیادہ امیدیں بھی نہیں لگانی چاہئیں۔‘‘ وہ جو پیش بندیاں کر رہا تھا، اس کی وجہ تو ماہ بانو کو سمجھ نہیں آرہی تھی لیکن وہ اپنے دل میں سخت تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ تکلیف کی اس شدت کو خاموشی سے برداشت کرنے کے لیے اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو بیدردی سے دانتوں تلے دبا ڈالا۔

’’جانے دیں سر! اس موضوع پر ہمارے درمیان ایک طویل بحث چھڑ سکتی ہے لیکن فی الحال اس کا موقع نہیں ہے اس لیے میں ہی ہار تسلیم کرلیتا ہوں۔‘‘ اسلم نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ اسے جواب دیا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

’’اوکے، پھر مجھے اجازت دو۔ تم لوگوں کی سہولت کے لیے جو ممکنہ انتظامات میں کرسکتا تھا، وہ میں نے کردیے ہیں۔ کوئی کمی بیشی رہ گئی ہو تو اس کے لیے ابھی معذرت کرلیتا

ہوں۔ آگے تو مجھے اس کا بھی موقع نہیں ملے گا۔'' اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے جو الوداعی جملے ادا کیے، ان سے بھی صاف ظاہر تھا کہ وہ مستقبل میں واقعی ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا۔ اس بار ماہ بانو خود پر قابو نہیں رکھ سکی اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر ڈھلک گئے۔ وہ فوراً ہی نظر چرا گیا۔

''شرمندہ مت کریں شہریار صاحب! آپ نے جس بے غرضی سے ہماری مدد کی ہے، اس کے لیے تو ہمارے پاس شکریے کے الفاظ تک نہیں ہیں۔ آپ سے کسی قسم کا شکوہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں، میں ذاتی طور پر آپ سے ان تکالیف کے لیے معذرت خواہ ہوں جو میری ذات سے آپ کو پہنچیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں جانے انجانے میں آپ کے لیے بار بار تکلیف کا باعث بنتا رہا ہوں۔'' اسلم کے الفاظ بہت سادہ لیکن لہجہ بہت خاص تھا۔ الفاظ سے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اس کا اشارہ ان واقعات کی طرف ہے جب وہ ایک ڈاکو کی حیثیت سے چودھری کا آلۂ کار بن کر اس کے خلاف کام کر رہا تھا... لیکن لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی اور تکلیف کا ذکر کر رہا ہے۔

اس کے لہجے نے شہریار کو چونکا دیا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا اسلم اس کے اور ماہ بانو کے درمیان موجود تعلقِ خصوصی سے واقف تھا؟ اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس خیال کی تصدیق کے لیے اس نے بغور اسلم کے چہرے کا جائزہ لیا لیکن اب وہ اس سے بالکل انجان بنا اس چھوٹے سے ہینڈ بیگ کا جائزہ لے رہا تھا جس میں ان دونوں کے سفری کاغذات موجود تھے۔

شہریار ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اسلم کا یہ انجان بنا ہی بھید کھول گیا تھا کہ معاملہ وہی ہے جو اس نے سمجھا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ اسلم کی یہ آگاہی اس کی اپنی ذہانت اور زبردست قوتِ مشاہدہ کی وجہ سے تھی یا ماہ بانو نے خود اس کے ساتھ اپنے جذبات کو شیئر کر لیا تھا... کیونکہ بعض صاف گو لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو سمجھتی ہیں کہ اپنے ماضی کی وابستگیوں کو اپنے شوہر سے چھپانا بددیانتی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن وہ خود اپنی جگہ یہ سمجھتا تھا کہ ماہ بانو کو اس قسم کی شیئرنگ کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان دونوں کے درمیان جو کچھ بھی تھا، وہ ہمیشہ اَن کہا رہا تھا اور اس اَن کہے جذبے کا تقدس اسی میں تھا کہ اسے کہیں بھی عیاں نہ کیا جائے۔

''ٹھیک ہے تو پھر مجھے اجازت۔ تم لوگوں کو بھی اب فوری طور پر روانہ ہو جانا چاہیے۔ میں نیچے جا کر ڈرائیور کو اوپر بھیجتا ہوں تاکہ وہ سامان وغیرہ گاڑی تک پہنچانے میں تم لوگوں کی مدد کر سکے۔'' اس معاملے پر مزید سوچنا بیکار سمجھتے ہوئے اس نے اپنا سر جھٹکا اور اسلم کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ گرم جوشی سے تھام لیا۔

''اللہ حافظ سر! سی یو اگین۔'' اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہتا وہ گویا اسے باور کروا رہا تھا کہ چاہے وہ کچھ بھی کہے لیکن خود وہ دوبارہ ملنے کی امید رکھتا ہے۔ اس کے انداز پر شہریار دھیرے سے مسکرایا اور لحظہ بھر کے لیے ماہ بانو کی طرف متوجہ ہوا۔

''اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' جواب میں اس کے لبوں نے جنبش ضرور کی لیکن کپکپاتے لبوں سے نکلنے والے الفاظ شہریار کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ اسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ بنا سنے بھی اس کی ہر بات سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا... لیکن اب ان کے بیچ کہنے سننے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ حالات انہیں جس موڑ پر لے آئے تھے، وہاں سے کچھ کہے سنے بغیر ہی ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانا بہتر تھا۔ چنانچہ وہ مزید رکے بغیر وہاں سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والا منظر خاصا توجہ کھینچ لینے والا تھا۔ اسکرین پر ایک گاڑی اس حال میں نظر آ رہی تھی کہ اس کی باڈی بُری طرح تباہ ہو گئی تھی اور کھڑکیوں کے شیشوں کے علاوہ ونڈ اسکرین بھی بالکل غائب تھی۔ بُری طرح اندر دھنسے بونٹ اور ٹیڑھے ہو جانے والے اسٹیئرنگ وہیل کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ گاڑی کو چلانے والے شخص کا حشر خراب ہو گیا ہوگا۔ ٹوٹی پھوٹی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ اور پائیدان میں پھیلا ڈھیروں خون اس اندازے کو تقویت بخش رہا تھا۔ منظر کے ساتھ ساتھ بیک گراؤنڈ سے سنائی دیتی نیوز رپورٹر کی آواز وضاحت کر رہی تھی کہ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ شہریار کے اپنے ذاتی حوالوں کے ساتھ ساتھ اس کے لیاقت رانا کے خاندان سے تعلق کا بھی حوالہ دے کر بتایا جا رہا تھا کہ جواں سال اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کی کار کو لاہور سے نور کوٹ جاتے ہوئے بدترین حادثہ پیش آیا ہے۔ گاڑی ایک ہیوی ٹرک کی زد میں آنے کی وجہ سے بُری طرح تباہ ہو گئی ہے اور گاڑی کو خود ڈرائیو کرتا شہریار عادل بے حد نازک حالت میں سروسز اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ ٹرک ڈرائیور کے بارے میں حسبِ معمول یہی رپورٹ تھی کہ وہ

موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

اسکرین پر دکھائے جانے والے مناظر ایسے تھے کہ ٹی وی اسکرین کے سامنے صحیح سلامت بیٹھے شہریار کو بھی گمان ہو رہا تھا کہ واقعی اس کا شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ رہی سہی کسر نیوز رپورٹر کے الفاظ اور لہجے کی سنسنی سے پوری ہو رہی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ حادثہ کس وقت پیش آیا اور شہریار عادل کی حالت اس وقت کتنی نازک ہے۔ ڈیڑھ دو منٹ پر محیط اس رپورٹ کے بعد اسٹوڈیو میں موجود نیوز اینکر اسکرین پر نظر آنے لگی تھی۔ فل میک اپ اور لہراتے بالوں والی خوش شکل نیوز اینکر ناظرین کو بتا رہی تھی کہ اس واقعے پر بات کرنے کے لیے لیاقت رانا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ اتنے صدمے اور پریشانی میں مبتلا تھے کہ انہوں نے میڈیا کے کسی بھی فرد سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

لیاقت رانا کی طرف سے انکار ہونے کے بعد انہوں نے آئی جی مختار مراد سے رابطہ کیا جنہوں نے زیادہ تفصیلی بات کرنے کے بجائے صرف مختصراً اتنا ہی کہا کہ حادثے کے ذمے دار ٹرک ڈرائیور کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ ساتھ ہی انہوں نے شہریار کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کی بھی درخواست کی۔ نیوز اینکر کے اس سوال کا کہ کیا یہ حادثہ شہریار پر ہونے والے قاتلانہ حملوں کا تسلسل ہے، انہوں نے کوئی واضح جواب نہیں دیا اور اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ ان کا جواب سن کر نیوز اینکر نے دو تین جملوں میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا اور پھر دوسری خبریں پڑھنے لگی۔

اپنے متعلق چلنے والی خبر ختم ہوتے ہی اس نے ریموٹ کی مدد سے ٹی وی بند کر دیا لیکن تاریک پڑی اسکرین پر بھی گویا اسے وہی مناظر نظر آ رہے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ مناظر اس کے چاہنے والوں کے لیے کتنے تکلیف دہ ہوں گے۔ حقیقت سے واقف لیاقت رانا اور آفرین کو اس نے پہلے ہی خبریں دیکھنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی ان لوگوں کو اس چیز سے تکلیف ہو گی۔

وہ اس بات پر بھی مطمئن تھا کہ اس نے یہ سب سامنے آنے سے پہلے ماہ بانو کو پاکستان سے روانہ کر دیا تھا۔ ماہ بانو معہ اسلم یقینی طور پر اس وقت نیویارک کی طرف جانے والی جہاز میں سفر کر رہے تھے اس لیے ان تک یہ خبر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہاں سے انہیں مزید آگے کا سفر کرنا تھا اور پھر اس کے بعد نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کی جدوجہد۔ اس لیے اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ یہ خبر کبھی ماہ بانو کے کانوں تک پہنچ سکے اور جب خبر نہیں پہنچتی تو اسے تکلیف بھی نہ ہوتی۔ اپنے قریبی فیملی ممبرز اور ماہ بانو کو تکلیف سے بچانے کے بعد بھی وہ جانتا تھا کہ ان کے علاوہ بھی ایسے دوسرے بہت سے لوگ ہیں جن پر یہ خبر بجلی بن کر گرے گی۔ مشابرم خان، عبدالسنان اور ملازمین کے علاوہ اس فہرست میں وہ دیہاتی بھی شامل تھے جو تھوڑے سے عرصے میں اسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے تھے۔ رشتے داروں اور دوست احباب کی ایک اچھی خاصی تعداد ان کے علاوہ تھی لیکن وہ مجبور تھا۔ اسے اپنے پیاروں کو یہ تکلیف دینی ہی تھی کہ اسے اب ان کے لیے کچھ نہ کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کرنا تھا۔

آج سے شہریار عادل کا وجود دنیا کے لیے میدانِ عمل سے نکل گیا تھا۔ اب نہ جانے کتنی مدت تک اسپتال کے کمرے میں ہوش و حواس سے بیگانے، بگڑے چہرے والے بے شناخت اشتیش کار کو شہریار عادل سمجھا جاتا تھا اور خود شہریار عادل شخصیت کی تبدیلی کے عمل سے گزرنے کے لیے سی ایف پی کے ایک خفیہ ٹھکانے پر موجود تھا۔ آج سے اسے بیرونی دنیا سے اپنا تعلق ختم کر دینے کا پابند کر دیا گیا تھا۔ اس کے دونوں سیل فون آف تھے اور اب وہ ایک خاص مدت تک یہاں سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اسے یہاں پہنچانے کے بعد ایک طے شدہ شیڈول تھما دیا گیا تھا جس میں تفصیل سے ساری ہدایات درج تھیں۔ یہاں اسے مخصوص اوقات میں سونا جاگنا، کھانا پینا تھا۔ ورزش، مارشل آرٹ کی مشقوں، لب و لہجے اور چال ڈھال میں تبدیلی کی تربیت، جدید اسلحے اور جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والے آلات کا استعمال سکھانے کے لیے باقاعدہ ایک انسٹرکٹر مقرر کیا گیا تھا جس نے یہاں پہنچتے ہی اس سے ملاقات کی تھی اور مختصر سی اس ملاقات میں ہی شہریار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خاصا سخت گیر اور خشک مزاج آدمی ہے۔ اس نے اپنی نپی تلی گفتگو میں اسے آگاہ کر دیا تھا کہ اسے دیے ہوئے شیڈول کی سختی سے پابندی کرنی ہوگی اور چند سیکنڈوں کی تاخیر بھی قابلِ گرفت سمجھی جائے گی۔ ان تربیتی مراحل سے گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے خدوخال کی تبدیلی کے عمل سے بھی گزرنا تھا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ چند دن کے بعد ایک ماہر سرجن اس کے اوپر کام شروع کر دے گا اور جب وہ شہریار عادل کے چولے سے نکل کر ایک نئی شخصیت میں ڈھل جائے گا تو دوسرا اور اصل مرحلہ شروع ہوگا۔ اس مرحلے میں وہ اپنے اہداف کے ساتھ میدانِ عمل میں اترے گا اور وہ سب کچھ کر سکے گا جو شاید اس کے لیے اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کے روپ میں

کرنا کسی صورت بھی ممکن نہ ہو پاتا۔

☆☆☆

شہزادی اور اس کے معصوم بچے کی لاشیں گھر کے صحن میں بچھی چارپائیوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان لاشوں کے گرد اس کے بڑے بچے بیٹھے زار و قطار رو رہے تھے اور بار بار ماں کو آواز دے کر جگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک طرف اس کی ساس بھی بیٹھی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اسے یہ غم ستا رہا تھا کہ اس بڑھاپے میں جبکہ وہ خود دوسروں کی محتاج تھی، کیسے شہزادی کے بچوں کو پالے گی۔ بیٹے کی زندگی میں بڑے ٹھسے سے رہنے والی وہ عورت جس نے مظلوم بہو کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی، اب بہو کے مرنے کے بعد اپنی زندگی کے بچے کھچے دن مشقت و پریشانی کی نذر ہوتے دیکھ کر خوف زدہ تھی اور یہ خوف ہی اسے رونے اور بین کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

آج صبح ہی بہرام اور فاریسٹ آفیسر کے تین مزید ملازمین نے یہ لاشیں شہزادی کے گھر پہنچائی تھیں۔ ان کے بیان کے مطابق شہزادی اور اس کے بچے کو رات کے کسی پہر زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ صبح جب شہزادی مقررہ وقت پر کوارٹر سے نہیں نکلی تو بنگلے کی ایک ملازمہ اسے جگانے کے لیے گئی تھی اور اسی نے ماں بچے کی منہ سے جھاگ نکلتی لاشیں دیکھی تھیں۔ دونوں کے جسموں پر سانپ کے کاٹنے کے واضح نشانات ملے تھے، اس لیے موت کی وجہ کا فوراً ہی تعین ہو گیا اور لاشیں تعزیتی پیغام اور کچھ رقم کے ساتھ گاؤں بھجوا دی گئیں۔ شہزادی کو قابلِ نفرت سمجھنے کے باوجود گاؤں کی عورتیں اس کے گھر پہنچ گئی تھیں اور اب مختلف ٹولیوں میں بیٹھی تبصرے اور تجزیے کر رہی تھیں۔ کسی کو اس کی جوان جہان موت پر افسوس تھا تو کوئی اس کے تنہا رہ جانے والے بچوں کے لیے فکرمند تھی۔ البتہ اس بات پر ان میں سے ہر ایک متفق تھی کہ شہزادی کو اس کے کیے کی سزا ملی ہے۔ کچھ عرصے قبل چاہے مجبوری اور دباؤ کے باعث ہی اس نے قبر سے مُردہ بچے کے اعضا چوری کرنے کی جو قبیح حرکت کی تھی، اسے کسی نے فراموش نہیں کیا تھا اور سب کا یہی خیال تھا کہ اس پر اپنی حرکت کی وجہ سے اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا۔

تبصرے کرتی عورتیں بار بار اپنے کانوں اور گالوں کو ہاتھ لگا کر استغفار پڑھ رہی تھیں۔ عورتوں کے علاوہ گھر کے باہر مرد بھی جمع تھے اور ان کی گفتگو بھی تقریباً انہی نکات پر مشتمل تھی۔ انہی میں سے کسی نے یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا تھا کہ ایسی گناہ گار عورت کی تجہیز و تکفین ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں کی جا سکتی، نہ ہی اسے مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس خیال کے سامنے آتے ہی بہت سے لوگ فوراً ہی قائل ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میتوں کے پہنچائے جانے کے بعد کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود ابھی تک دونوں لاشیں بے غسل و کفن پڑی ہوئی تھیں۔ آخرکار بات گاؤں کے تھانے تک بھی پہنچ گئی۔ تھانیدار نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے دو کام کیے۔ اوّل یہ کہ اس نے لاشوں کی حفاظت کے لیے دو سپاہی بھیج دیے۔ دوم واقعے کی اطلاع اے سی آفس میں کر دی۔ وہاں سے اسے ہدایت ملی کہ لاشیں مرکزِ صحت منتقل کر کے ان کی کڑی نگرانی کی جائے اور اس وقت تک کسی کو وہاں پھٹکنے نہ دیا جائے جب تک ان کی طرف سے بھیجی جانے والی ایمبولینس وہاں پہنچ کر لاشوں کو وصول نہ کر لے۔ تھانیدار نے فوراً اس حکم پر عمل درآمد کروایا جبکہ دوسری طرف حکم جاری کرنے والا عبدالمنان اس اطلاع کو سن کر پریشانی اور تشویش کا شکار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شہزادی، شہریار کے لیے کام کر رہی تھی اور مشابرم خان اسی کام کی وجہ سے ہر شام پیرآباد تک دوڑ لگانے پر متعین تھا لیکن کل شہریار کو پیش آنے والے حادثے کا سن کر وہ اپنے حواسوں کو قابو میں نہیں رکھ سکا اور اپنی ڈیوٹی بھول کر لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔

اس وقت وہ لاہور میں ہی موجود تھا اور ڈاکٹرز کی طرف سے مریض کو دیکھنے کی پابندی کے باوجود اسپتال میں ہی ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ خود عبدالمنان کی بھی دلی خواہش یہی تھی کہ وہ لاہور پہنچ جائے لیکن اس کا نورکوٹ میں رہ کر یہاں کے معاملات پر نظر رکھنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ وہ خود پر جبر کر گیا تھا لیکن مشابرم خان سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھا جس کے پاس کوئی امید افزا خبر نہیں تھی اور ہر بار اس کے استفسار کے جواب میں وہ یہی بتاتا تھا کہ شہریار کو ہنوز ہوش نہیں آیا ہے۔ پریشانی کے اس عالم میں شہزادی کی حادثاتی موت کی خبر نے اسے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ شہزادی کو کیا ٹاسک دے کر فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر بھیجا گیا تھا لیکن یہ واضح تھا کہ مشابرم خان کی پہلی ہی غیر حاضری میں وہ اپنی جان سے چلی گئی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ یہ کوئی اتفاق تھا یا وہ جان بوجھ کر شکار بنائی گئی تھی۔ حقائق جاننے کے لیے اس نے لاشیں نورکوٹ منگوانے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ لاشوں کے پوسٹ مارٹم کے بعد صورتِ حال واضح ہو سکے۔ ساتھ ہی اس نے مشابرم خان کو بھی اس واقعے کی اطلاع دے دی تھی۔ اطلاع سن کر وہ بھی سخت

پریشان ہوا تھا اور تھوڑی سی شرمندگی بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی بے توجہی کی وجہ سے شہزادی کی جان چلی گئی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شہریار کے حادثے کے بعد اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ موجودہ حالات میں وہ کیا لائحہ عمل اختیار کرے۔

اس وقت تو وہ سب سے زیادہ شہریار کے لیے فکرمند تھا اور مسلسل ایسی کیفیت میں مبتلا تھا کہ اسے لگتا تھا کوئی اس کے دل کو بُری طرح مسل رہا ہے۔ اس کیفیت سے وہ پہلے بھی گزر چکا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی اکرام خان کی موت اور صدمے سے کومے میں چلی جانے والی ماں کی حالت پر بھی اس کی یہی کیفیت ہوئی تھی۔ وہ اس وقت بھی بُری طرح ہاتھ پیر مارنے کے باوجود اپنے پیاروں کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا اور اب بھی بے بسی کا شکار تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ شہریار کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ صرف حادثہ نہیں بلکہ قاتلانہ حملہ تھا لیکن ابھی تک شہریار کے کسی قریبی رشتے دار نے اس کے خیال کی تائید نہیں کی تھی۔ وہ سب اسے حادثہ ہی سمجھ رہے تھے اور اسی خیال کے مطابق پولیس بھی اپنا کام کر رہی تھی۔

مشابرم خان اس صورتِ حال پر مطمئن نہیں تھا لیکن فی الحال اسپتال سے ہٹ کر کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ جب تک اسے شہریار کے بارے میں کوئی حتمی اطلاع نہیں مل جاتی، اس کے لیے کچھ بھی کرنا ممکن نہیں تھا۔ پریشانی اور دکھ کے عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے البتہ اسے اتنا ضرور یاد آ گیا کہ کسی خاص موقع پر اپنی عدم دستیابی کی صورت میں شہریار نے اسے ذیشان سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ بات یاد آتے ہی اس نے فوراً اپنے موبائل میں فیڈ ذیشان ... نمبر ڈائل کیا اور اسے واقعے کی اطلاع دے دی۔

”ٹھیک ہے۔ میں اس معاملے کو دیکھ لیتا ہوں۔ تم میری طرف سے کوئی ہدایت ملنے سے قبل اپنی مرضی سے کوئی قدم نہیں اٹھانا۔“ ساری بات سن کر ذیشان نے اسے سنجیدگی سے حکم دیا جس کے جواب میں وہ صرف ”یس سر“ ہی کہہ سکا۔ فی الحال تو اس کا خود بھی یہاں سے ہٹ کر کہیں جانے کچھ کرنے کا پروگرام نہیں تھا۔

☆☆☆

”مبارک ہو سنتھیا! اب تو تم خوش ہو گی۔ جس کا ہم تم مل کر کچھ نہیں بگاڑ سکے، اس سے اوپر والے نے انتقام لے لیا۔ میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کروایا ہے۔ شہریار کی حالت بہت نازک ہے۔ پورے جسم پر شدید زخموں کے علاوہ اس کے سر پر بھی چوٹ آئی ہے جس کی وجہ سے وہ مستقل بے ہوش ہے اور ڈاکٹرز اس کی زندگی کی طرف سے خاصی تشویش کا شکار ہیں۔ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کی زندگی بچا بھی لی گئی تو وہ کسی دوسرے بڑے نقصان سے دوچار ہو سکتا ہے۔ اس نقصان میں اس کا ذہنی توازن بگڑ جانے سے لے کر طویل مدت کے لیے کوما میں چلے جانے تک کچھ بھی شامل ہو سکتا ہے۔ تاہم ابھی کوئی حتمی رائے دینے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ بہرحال جو بھی ہو، یہ طے ہے کہ ہماری راہ کا ایک کانٹا نکل گیا ہے اور اب تم اس بات پر غم زدہ نہیں رہو گی کہ تمہاری بیٹی کو موت کے منہ میں دھکیلنے والا خود مزے سے زندہ ہے۔“ سنتھیا نے کھنکتی آواز میں بولتے ورما کا ہر لفظ بہت سکون سے سنا اور جب وہ خاموش ہوا تو نہایت سنجیدگی سے بولی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ جو کچھ کہا اور دکھایا جا رہا ہے وہ سچ ہے؟“

”کیا مطلب؟“ ورما گویا اچھل پڑا۔ ”کیا تمہیں شک ہے کہ یہ کوئی ڈراما ہے؟“

”نہیں، میں نے یہ نہیں کہا لیکن اتنی آسانی سے کسی بات کو قبول کر لینا ہماری تربیت کا حصہ نہیں۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ تم نے میڈیا پر نشر کی جانے والی خبر کی اپنے ذرائع سے بھی تصدیق کی کوشش کی ہو گی۔“ وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

”آف کورس... میں نے ایسا کیا ہے اور اس سلسلے میں کافی معلومات اکٹھی کر لی ہیں۔ حادثہ جس سڑک پر پیش آیا، وہاں سے صرف پرائیویٹ گاڑیاں اور لوڈرز وغیرہ ہی گزرتے ہیں۔ شہریار کی گاڑی کو ایک ایسے ٹرک نے ٹکر ماری جس پر دوسرے شہر بھجوایا جانے والا الیکٹرونک کا سامان لوڈ تھا۔ حادثے کی اطلاع بعد میں وہاں پہنچنے والے معیز نامی ایک کار سوار نے دی۔ میں نے اس شخص کا بھی پورا بائیو ڈیٹا معلوم کر لیا ہے۔ وہ ایک عام سا کاروباری شخص ہے جس نے اپنی کار میں وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ ایک کار کو ٹرک سے زبردست حادثہ پیش آ گیا ہے اور ٹرک ڈرائیور موقع سے مفرور جبکہ کار سوار شدید زخمی ہے۔ اس نے سب سے پہلے ایمبولینس کے لیے کال کی اور پھر پولیس کو حادثے کی اطلاع دی۔

”ایمبولینس اور پولیس کی گاڑی دونوں آگے پیچھے وہاں پہنچیں اور اسپتال پہنچنے سے پہلے پہلے ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ حادثے کا شکار ہونے والا کون ہے، اس لیے انہوں نے اسی حساب سے معاملے کو ہینڈل کیا۔ میں نے ایمبولینس

سروس کے دفتر کے ریکارڈ سے بھی حادثے کے وقت کی تصدیق کرلی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حادثے کا ذمے دار مفرور ٹرک ڈرائیور پہلے بھی کوئی اچھا ریکارڈ نہیں رکھتا ہے۔ اس سے پہلے بھی اس پر دو اس قسم کے حادثات کا الزام ہے لیکن وہ جس ٹرانسپورٹر کے لیے کام کرتا ہے، وہ بہت پہنچ والا ہے اس لیے دونوں بار اس نے اپنے آدمی کو بڑی دیدہ دلیری سے بچالیا۔ اسے اپنے کام میں زیادہ مشکل اس لیے بھی پیش نہیں آئی کہ ان دونوں حادثات کا شکار ہونے والے متوسط طبقے کے لوگ تھے جن میں اتنا دم نہیں تھا کہ اس ٹرانسپورٹر کے سامنے ٹک سکتے۔ اس لیے اس کا چہیتا ڈرائیور بغیر کسی سزا اور حساب کتاب کے آرام سے سڑکوں پر دندناتا رہا لیکن ظاہر ہے اب سچویشن مختلف ہے۔ پولیس اس ڈرائیور کو گرفتار کرنے کے لیے پورا زور لگا دے گی اور وہ پکڑا گیا تو سزا سے بھی نہیں بچ سکے گا۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اس کا آقا اسے بچانے کے لیے علاقہ غیر کی طرف بھگا دے اور وہ پھر کبھی منظر پر ہی نہ آئے۔'' ورما نے اسے اپنی کارگزاری کے بارے میں تفصیل سے بتایا لیکن وہ جواب میں کچھ نہیں بولی اور خاموشی سے بیٹھی کسی سوچ میں ڈوبی رہی۔

''مجھے بتاؤ کہ تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟ اتنا سب کچھ سن لینے کے بعد بھی مجھے تم مطمئن نہیں لگ رہیں۔'' پیپر ویٹ کو اضطراری طور پر گھماتے ہوئے ورما بولا تو اس کے لہجے سے جھنجلاہٹ عیاں تھی۔

''صاف بات ہے کہ مجھے یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں لگ رہا۔ خبروں میں بتایا گیا ہے کہ حادثہ اتنا شدید تھا کہ شہریار کے ہاتھ پیر بُری طرح کچلے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ چہرے پر بھی گہرے زخموں کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے اور یہ چیز مجھے شک میں مبتلا کر رہی ہے۔ تم اگر دماغ پر ذرا زور دو تو یہ بھی تو سوچ سکتے ہو کہ اس طرح کی انجریز کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ شناخت کو چھپایا جاسکے۔ فرض کرو، انہوں نے شہریار کے بجائے کسی دوسرے بندے کو قربانی کا بکرا بنا دیا ہو تو وہ اس کی شناخت چھپانے کے لیے کیا اقدامات کریں گے۔ آدمی کی سب سے پہلی شناخت ہوتی ہے اس کا چہرہ۔ جب چہرہ ہی مسخ ہوگیا تو اسپتال میں پڑے بندے کو دیکھ کر کون جان سکے گا کہ وہ شہریار ہی ہے یا اس کی جگہ کوئی اور۔ اب آتے ہیں ہم تصدیق کے دوسرے ذریعے یعنی فنگر پرنٹس کی طرف تو مجھے یقین ہے کہ ہم ان کے ذریعے بھی تصدیق نہیں کرسکیں گے کیونکہ حادثے میں اس کے ہاتھ پیر بُری طرح کچلے گئے ہیں۔'' وہ جوں جوں بولتی جارہی تھی، ورما کی آنکھیں کھلتی جارہی تھیں۔

''یو آر جینئیس سنتھیا! واقعی ایسا ممکن تو ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس سارے ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟''

''وہ کسی بھی وجہ سے یہ ڈراما کرسکتا ہے۔ سب سے پہلی وجہ تو یہی ہوسکتی ہے کہ اس طرح وہ ہماری نظروں سے چھپ کر خود کو محفوظ رکھنا چاہتا ہو کیونکہ آدمی کتنا ہی بہادر اور جی دار ہو، اپنی جان اسے بہرحال پیاری ہوتی ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ جب وہ سامنے ہی نہیں ہوگا تو ہم اسے نشانہ کیسے بنائیں گے۔ دوسرا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ وہ پسِ پردہ رہ کر آرام سے ہمارے خلاف کارروائی کرتا رہے اور ہمارا دھیان اس کی طرف نہ جاسکے۔ اصل وجہ جو بھی ہوگی وہ تو وہ خود جانتا ہوگا... اور ہونے کو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرے سارے شکوک وشبہات غلط ہوں اور واقعی وہ حادثے کا شکار ہوکر اسپتال میں پڑا ہو۔ لیکن اس بات کو بغیر تصدیق کے میں نہیں مان سکتی۔ ہمیں ہر حال میں تصدیق کرنی ہوگی کہ وہ شخص شہریار ہی ہے یا نہیں، اس کے بعد ہی میں مطمئن ہوسکوں گی۔'' اس کا انداز بڑا دوٹوک تھا اور ورما اس سے سینئر ہونے کے باوجود دل میں تسلیم کرتا تھا کہ وہ دوسروں کی نسبت زیادہ ذہین اور بیدار مغز عورت ہے۔ اس لیے اس کے کسی بھی اندازے سے اختلاف کرنے کے بجائے میز پر ذرا آگے کی طرف جھک کر بیٹھتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

''پھر تم نے کیا سوچا ہے؟ کس طرح چیک کروگی کہ وہ بندہ شہریار ہی ہے یا نہیں؟''

''میں اس کا ڈی این اے ٹیسٹ کرواؤں گی۔ جانتے ہو کہ ماریا ایک ڈاکٹر تھی اور بیوی کی حیثیت سے اس کے پاس موقع تھا کہ شہریار کا ڈی این اے ریکارڈ حاصل کرسکے اس لیے اس نے احتیاطاً یہ کام کر ڈالا۔ خوش قسمتی سے میرے پاس اب بھی وہ ریکارڈ موجود ہے اس لیے تصدیق کرنا مشکل نہیں ہے۔ ہم کوشش کرکے اسپتال میں داخل کا ڈی این اے سیمپل حاصل کرلیں تو سارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔'' اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا اور زخمی کے شہریار ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق کے لیے اس نے جو تدبیر سوچی تھی، وہ بھی بالکل درست تھی۔

''ٹھیک ہے ڈارلنگ! میں سمجھ گیا۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ اسپتال سے بلڈ وغیرہ کے نمونے حاصل کرنا میرا کام ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد یہ کام نمٹا لوں تاکہ ہماری الجھن دور ہو اور آگے کی پلاننگ کی جاسکے۔'' ورما نے اسے اطمینان دلایا تو پہلی بار اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

ورما کے ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کرنے پر بے ساختہ ہی اسے ماضی کے وہ روز وشب یاد آگئے تھے جب وہ جوان تھی اور اپنے نام نہاد شوہر کی لاعلمی میں ورما کے ساتھ کتنے ہی رنگین وسنگین لمحات گزارتی تھی۔ اس کے حسن اور ذہانت کے سامنے ورما ہمیشہ ہی ہتھیار ڈال دیتا تھا اور را کے ایسے کئی راز اس کے علم میں آجاتے تھے جنہیں عالمِ ہوش میں ورما کبھی اپنی زبان پر نہ لاتا۔ ورما کے علاوہ دوسرے اور بھی افسران تھے جنہیں اس نے اپنے ان ہتھیاروں سے زیر کر رکھا تھا لیکن پھر جب وقت نے اپنی چال چلی اور وہ جوانی کے ساتھ ساتھ اس کی حشر سامانیوں سے بھی محروم ہوگئی تو اس کے چاہنے والے بھی بھیڑ کی طرح چھٹ گئے۔ اس موقع پر اس نے اپنی ذہانت کا ہتھیار اور بھی تیز کرلیا اور کئی ایسے کارنامے انجام دیے کہ را میں اس کی حیثیت پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہوگئی۔ باقی جن معاملات میں حسن وجوانی کی محتاج تھی، وہ ماریا نے سنبھال لیے لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ بہت جلد ماری گئی اور اپنی ماں کی طرح موساد کے لیے اَن گنت خدمات انجام نہیں دے سکی۔ ماریا کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے اور وہ ورما کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہیں معلوم ہے ورما کہ شہریار نے ماریا کے بارے میں کیا مؤقف اختیار کیا تھا؟ اس کے فیملی ممبرز ماریا کے بارے میں لوگوں کے استفسار کے جواب میں بتا رہے ہیں کہ شہریار اس حادثے سے کئی دن قبل ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے ماریا کو طلاق دے چکا تھا اور اب ان میں سے کسی کو نہیں معلوم کہ ماریا کہاں ہے۔ لیاقت رانا نے خیال ظاہر کیا ہے کہ شاید ماریا اپنی ممی کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی ہے۔ دیکھی تم نے اس کی چالاکی... کتنی آسانی سے اس نے خود کو میری بیٹی کے قتل کے الزام سے بچالیا۔ ایسے شخص کے بارے میں کسی بھی بات کو کیسے آسانی سے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ جب وہ اتنے اہم رشتے سے اتنی آسانی سے اپنی جان چھڑا سکتا ہے تو کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اس لیے اس شخص کے زندہ یا مُردہ دونوں حالتوں میں مجھے یہ ثبوت چاہیے کہ وہ شہریار ہی ہے یا نہیں۔ نہ ہونے کی صورت میں، میں اسے ہر صورت تلاش کروں گی اور ویسی ہی دردناک موت دوں گی جو میری بیٹی کے حصے میں آئی۔'' فرطِ جوش سے اس کا وجود کانپنے لگا۔

''ریلیکس سنتھیا! جو تم چاہوگی اور جیسا چاہوگی ویسا ہی ہوگا۔ اب تم جاؤ اور جاکر آرام کرو۔ جیسے ہی کوئی اچھی خبر ملی، میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔'' پرانے تعلقات کے لحاظ میں ورما اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کا شانہ تھپکتے ہوئے تسلی دی۔ خود سنتھیا کو بھی احساس ہوگیا کہ وہ اپنی عادت سے کہیں زیادہ بڑھ کر جذباتیت کا مظاہرہ کرچکی ہے، چنانچہ فوراً ہی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی اور بہت تیزی سے اس کوشش میں کامیاب بھی ہوگئی۔

''سوری، میں ذرا جذباتی ہوگئی تھی۔'' ورما سے مختصر سی معذرت کرکے وہ اٹھ کر اس کے کمرے سے باہر نکلی تو وہی باوقار اور باحوصلہ سنتھیا لگ رہی تھی جسے سب جانتے تھے۔ لیکن وہ خود یہ بات جانتی تھی کہ اپنی اکلوتی بیٹی کلارا اینڈرسن المعروف ماریا جوزف کی موت نے اسے اندر سے کس بُری طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

☆☆☆

''میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم اطلاع ہے سر!'' اسپتال کے اس کمرے میں جہاں اشیش کمار، شہریار کے نام سے داخل تھا، باری باری ڈیوٹی دینے والی دو نرسوں میں سے ایک نے ذیشان سے رابطہ کرکے یہ الفاظ ادا کیے تو وہ چونک گیا۔ حقیقتاً اس خاص کمرے میں شفٹوں میں ڈیوٹی دینے والی دونوں ہی نرسیں سی ایف پی کا حصہ تھیں اور انہیں حکم تھا کہ روزانہ کی رپورٹ دینے کے علاوہ اگر کوئی بات بہت خاص محسوس ہو تو فوری طور پر رابطہ کریں۔ اس وقت نائٹ شفٹ میں کام کرنے والی نرس نے اس سے رابطہ کیا تھا اور بتا رہی تھی کہ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع ہے۔

''بتاؤ۔'' اس نے نرس کو صرف ایک لفظی حکم دیا۔

''کچھ دیر پہلے مجھ سے کسی آدمی نے میرے موبائل پر رابطہ کیا ہے۔ اس نے مجھے آفر کی ہے کہ اگر میں اسے مسٹر شہریار کے بال اور بلڈ سیمپل پرووائڈ کردوں تو مجھے بدلے میں پانچ لاکھ روپے مل سکتے ہیں۔''

''گڈ، اچھی آفر ہے۔ تم نے اسے کیا جواب دیا؟''

''میں رشوت خور نہیں ہوں سر!'' وہ گویا بُرا مان گئی لیکن پھر سنبھل کر بتانے لگی۔ ''فی الحال میں نے سوچنے کا وقت لے کر اس آدمی کو ٹال دیا ہے۔ ایک گھنٹے بعد وہ مجھے پھر فون کرے گا۔ اب آپ جیسا کہیں، میں اسے ویسا جواب دے دیتی ہوں۔''

''تم اس کی آفر قبول کرلو بلکہ چاہو تو رقم پر تھوڑی سی بحث کرکے اس میں اضافہ بھی کرواسکتی ہو۔ اس طرح اسے

یقین ہوجائے گا کہ تم کوئی لالچی عورت ہو اور پیسے کی خاطر اس کا کام کرنے کے لیے تیار ہو۔"

"اوکے سر! جیسی آپ کی مرضی۔" اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

"اس آدمی نے تمہیں جس نمبر سے کال کی تھی، اس کے بارے میں تم کیا کہتی ہو؟"

"وہ کسی پبلک کال آفس کا نمبر تھا اور اس سے اسے ٹریس کرنے میں کسی کامیابی کا امکان نہیں ہے۔" اس نے ذیشان کے سوال کے جواب میں دوٹوک رائے دی۔

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔ اگلی کال وہ یقیناً پھر کسی نئے نمبر سے کرے گا۔ بہرحال، تم اسے اثبات میں جواب دے دینا۔ بال اور خون کے نمونے تھوڑی دیر میں تم تک پہنچا دیے جائیں گے۔ پہنچانے والا خود باہر ہی موجود رہے گا۔ تم نمونوں اور رقم کے تبادلے کا طریقۂ کار طے ہوتے ہی مجھے انفارم کر دینا۔ آگے کے معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔" وہ نرس کو ہدایات دینے لگا۔

"ٹھیک ہے سر! میں سمجھ گئی۔"

"کوئی اور خاص بات تو نہیں ہے؟" ذیشان نے فون بند کرنے سے پہلے اس سے دریافت کیا۔

"نو سر! کوئی اور بات ہوئی تو میں آپ کو انفارم کر دوں گی۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو ذیشان نے کال منقطع کر دی اور تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اب وہ اس جگہ جا رہا تھا جہاں شہریار رہائش پذیر تھا۔ راستے میں فون کر کے اس نے وہاں موجود انچارج کو فون کر کے دونوں نمونے حاصل کر کے اسپتال کی طرف روانہ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ان چیزوں کا مطالبہ کرنے والا نرس کو کتنی مہلت دے گا اس لیے بہتر تھا کہ اس کے دوبارہ رابطہ کرنے سے پہلے دونوں چیزیں اسپتال پہنچ جائیں۔ بیس سے پچیس منٹ کی ڈرائیو کر کے وہ وہاں پہنچا تو شہریار اس کا منتظر تھا۔

"میرے بالوں اور خون کی اچانک کیا ضرورت پڑ گئی تھی جو تم نے مجھے کھانے کی میز پر سے اٹھوا دیا؟" رسمی علیک سلیک کے بعد شہریار نے اس سے پہلا سوال یہی کیا۔

"مجھے خیال نہیں تھا کہ تم اس وقت کھانا کھا رہے ہو گے۔ ویسے اگر معلوم بھی ہوتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو چار بال اور چند سی سی خون لینے کے لیے میں تمہارے ڈنر ختم کرنے کا انتظار ہرگز نہیں کرتا کیونکہ دونوں کام تو کھانا کھاتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر بھی آسانی سے نمٹائے جا سکتے تھے۔ کرنا کیا تھا، ایک بندہ تمہاری کرسی کے قریب کھڑا ہو کر تمہارے سر سے دو چار بال نوچتا اور پھر ایک ہاتھ میں سوئی گھسا کر سرنج بھر لیتا۔ تمہیں کھانا روکنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی، آرام سے کھاتے رہتے۔" مختصر عرصے کی دوستی میں ہی وہ شہریار کی عادات و اطوار سے واقف ہو گیا تھا اور جانتا تھا کہ وہ خاصا نفاست پسند بندہ ہے اس لیے اسے چھیڑنے کے لیے مزے سے بولا۔

"وہ جو گھڑی کی سوئیوں سے بندھا ایڈیکیٹس کا مارا انسٹرکٹر تم نے میرے سر پر مسلط کیا ہوا ہے، وہ مجھے ایسی حرکت کرنے دے سکتا تھا؟ تمہارا فون ملتے ہی اس نے مجھے ٹیبل سے اٹھایا اور سیدھا لے جا کر لیب میں بٹھا دیا۔ میں تو ڈر گیا کہ کہیں مجھے بتائے بغیر بالکل اچانک ہی تو میرے کل پرزوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع نہیں ہونے والی۔" وہ ذیشان کا مذاق سمجھ گیا تھا اس لیے خود بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"ہاں یار! اس انسٹرکٹر کا ساتھ تو تمہارے لیے کریلا اوپر سے نیم چڑھا والا حساب ہو گیا ہے۔ تم پہلے ہی ماشاءاللہ کم نہیں تھے، اب اس کی تربیت کے بعد جانے کیا بن جاؤ گے۔" ذیشان نے اس طرح منہ لٹکا کر کہا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اب یہ اداکاری بند کرو اور بتاؤ کہ اصل کہانی کیا ہے؟ تھوڑی دیر بعد میری اگلی کلاس کا ٹائم ہو جائے گا تو انسٹرکٹر صاحب تمہاری موجودگی کی پروا کیے بغیر مجھے یہاں سے اٹھا کر لے جائیں گے۔" اس نے ذیشان کو دھمکایا تو وہ پہلے تو بُرے بُرے منہ بنانے لگا پھر سنجیدہ ہو کر بتانا شروع کیا۔

"ہمارے خدشات درست ثابت ہوئے ہیں۔ دشمنوں نے ہماری طرف سے جاری کی جانے والی حادثے کی خبر کو کافی نہیں سمجھا اور وہ اپنے طور پر تصدیق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حادثے کا شکار ہونے والا شخص شہریار عادل ہی ہے یا نہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے تمہارے بال اور خون کا نمونہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور میں انہیں اس کوشش میں کامیاب کروا کر ان کی تسلی کا انتظام کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد انہیں یقین ہو جائے گا کہ اسپتال کے بستر پر بے بس پڑا آدمی شہریار عادل ہی ہے اور اس کے بعد تم ان کے دل و دماغ سے نکل جاؤ گے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ وہ لوگ جتنے مکار ہیں، آسانی سے

ہماری چال میں نہیں آئیں گے۔ تم نے اچھا کیا کہ ان کی تسلی کا سامان کردیا۔ ویسے انہوں نے اس کام کے لیے رابطہ کس سے کیا تھا؟'' اس نے ذیشان کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا تو جواب میں اس نے تفصیل کہہ سنائی۔

''بالکل ٹھیک۔ آگے یقیناً تمہارے آدمی اس شخص کا تعاقب کرنے کے لیے تیار ہوں گے جو اس نرس سے سیمپل لینے آئے گا۔'' اس نے اندازہ لگایا۔

''یقیناً موجودہ حالات میں جبکہ ہم تقریباً اندھیرے میں کھڑے ہیں، وہ شخص ہمیں دشمنوں میں سے کسی اہم شخص تک پہنچا سکتا ہے۔'' ذیشان نے جواب دیا۔

''تم ٹھیک سوچ رہے ہو لیکن اپنے آدمی سے کہنا کہ بے حد محتاط رہے کیونکہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو نہ صرف یہ کہ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا بلکہ بنا بنایا کھیل بھی بگڑ جائے گا۔ دشمن یہ جاننے کے بعد کہ نرس سے رابطہ کرنے والے آدمی کے ذریعے اس تک پہنچنے کی کوشش کی جارہی ہے، ایک بار پھر شکوک وشبہات میں گھر جائے گا۔'' اس نے ذیشان کو مشورہ دیا۔

''میں خود بھی یہ بات سمجھتا ہوں۔ اس لیے اپنے بہت قابل اور ہوشیار ماتحت کو یہ ڈیوٹی سونپی ہے۔ اب دیکھو کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ بہرحال، تم جاؤ جا کر اپنی کلاس لو، میں آج کی رات یہیں ہوں۔ جیسے جیسے میرے پاس اطلاعات آتی رہیں گی، میں تمہیں بتاتا رہوں گا۔ اس سارے کھیل میں چونکہ تمہیں سب سے اہم کردار ادا کرنا ہے، اس لیے تمہارا ہر بات سے باخبر رہنا سب سے زیادہ ضروری بھی ہے۔'' ذیشان نے ایک طرح سے اس پر اپنے یہاں تک دوڑے چلے آنے کی وجہ بھی ظاہر کردی۔

''ٹھیک ہے۔ میں کلاس لے کر آتا ہوں جب تک تم اس معاملے کو ہینڈل کرو۔'' شہریار وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ذیشان کے سیٹ پر کال آنے لگی۔

''ہاں تہمینہ! کیا رپورٹ ہے؟'' اس نے نمبر دیکھ کر فوراً ہی کال ریسیو کی۔

''اس نے دوبارہ کال کی تھی سر! میں نے بحث کر کے چھ لاکھ کے عوض کام کرنے کی ہامی بھرلی ہے۔ اس نے مجھے آدھے گھنٹے کی مہلت دی ہے۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے دونوں چیزیں لے کر اسپتال کے اس حصے میں جانا ہوگا جہاں عموماً مریضوں کے عزیز واقارب رات گزارتے ہیں۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ وہ مجھے پہچانتا ہے اور خود ہی مجھ سے مل کر دونوں نمونے وصول کرلے گا۔ رقم بھی وہ یہیں پر میرے حوالے کرے گا۔'' نرس نے اسے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ اس نے تمہیں جو ہدایات دی ہیں، ان پر عمل کرو۔ باقی معاملات ہم خود دیکھ لیں گے۔'' اس نے تہمینہ کو ہدایت دے کر سلسلہ منقطع کردیا اور اس آدمی سے رابطہ کرنے لگا جس کی اس نے اسپتال میں ڈیوٹی لگائی تھی۔ اسے ضروری ہدایات دینے کے بعد فارغ ہوا تو کافی کی طلب ہونے لگی۔ وہاں موجود خدمت گار کو گھنٹی بجا کر بلانے کے بعد اسے کافی بنانے کا حکم دیا اور خود اس لیپ ٹاپ پر مصروف ہوگیا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس مصروفیت کے دوران کافی بن کر آگئی۔ وہ گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہوتا ہوا اپنا کام نمٹاتا رہا۔

کام کے دوران بھی اسے گھڑی کی سوئیوں کے سفر کا دھیان تھا۔ آدھا گھنٹا گزرا تو اس کا ذہن حساب کتاب کرنے لگا کہ اب تہمینہ اس خصوصی پرائیویٹ روم سے نکل پڑی ہوگی جس میں بظاہر شہریار لیکن حقیقتاً اشیش کمار داخل تھا اور جس کے دروازے پر ایک مسلح پہرے دار ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ اس مسلح پہرے دار کے علاوہ بھی سی ایف پی کا کوئی نہ کوئی اہلکار غیر محسوس طور پر اس اسپیشل روم کے اردگرد ٹہلتا رہتا تھا تاکہ کوئی غیر معمولی بات محسوس ہونے پر فوراً حرکت میں آجائے۔ اس انتظام کی وجہ سے تہمینہ کی غیر موجودگی میں وہاں کسی گڑبڑ کا کم ہی احتمال تھا۔ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس بات کا بھی اندازہ لگایا کہ تہمینہ کو مقررہ مقام تک پہنچنے میں کتنی دیر لگی ہوگی۔ پھر وہ تصور کی آنکھ سے کسی اجنبی کو اس سے ملتا اور چیزوں کا تبادلہ کرتا دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اسے اپنے تخیل پر مزید زور دینے کی ضرورت نہیں پڑی اور اس کے ماتحت کی کال آگئی۔

''میں نے تہمینہ سے ملنے کے لیے آنے والے آدمی کو دیکھ لیا ہے سر اور اب اس کے پیچھے جارہا ہوں۔'' ماتحت عجلت میں تھا اس لیے مختصر رپورٹ دے کر سلسلہ منقطع کردیا۔ اس کال کو وصول کرنے کے بعد ذیشان کا جوش اور اعصابی تناؤ دونوں ہی بڑھ گئے۔ اپنے ماتحت کی کامیابی کی صورت میں وہ اس لائق ہوسکتا تھا کہ دشمن پر ہاتھ ڈال سکے کیونکہ تہمینہ سے شہریار کے بالوں اور خون کے نمونے وصول کر کے لے جانے والا یقیناً کسی خاص شخص کا ہی نمائندہ ہوسکتا تھا۔ وہ لوگ اس خاص شخص تک پہنچ جاتے تو پھر آگے بہت سی راہیں کھلتی جاتیں۔ ذہن کو مصروف رکھنے کی کوشش کے باوجود وہ بے چینی سے اگلی رپورٹ کا انتظار کرتا رہا۔ انتظار کو سہل کرنے

کے لیے اس نے ایک پیالی کافی مزید منگوالی۔ اس دوران شہریار بھی واپس آگیا۔

''کیا خبریں ہیں؟'' آتے کے ساتھ ہی اس نے ذیشان سے پوچھا۔ وہ اسے اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ شہریار نے بغیر کسی تبصرے کے اس کی پوری بات خاموشی سے سنی اور پھر خود بھی انتظار میں شامل ہوگیا۔ تقریباً پینتیس منٹ بعد ذیشان کے پاس اس کے ماتحت کی کال آئی۔

''میں اس وقت لبرٹی کے علاقے میں ہوں سر! میں جس بندے کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا ہوں، وہ ایک بڑے جنرل اسٹور پر آکر رکا ہے اور وہاں جا کر کاؤنٹر سنبھال لیا ہے۔ جنرل اسٹور میں اس کے علاوہ دو لڑکے اور بھی ہیں لیکن اس شخص کے انداز سے ایسا لگتا ہے کہ وہ اسٹور کا مالک یا کم از کم انچارج ضرور ہے۔ اسٹور پر پہنچنے کے بعد اس نے کوئی غیر معمولی حرکت نہیں کی ہے اور شاید حساب کتاب میں مصروف ہوگیا ہے۔ اسٹور خاصا چلتا ہوا ہے اور یہاں مسلسل گاہکوں کی آمدورفت جاری ہے۔ علاقے کی رونق اور اردگرد کی کھلی ہوئی دکانوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گیارہ بجے سے پہلے اسٹور بند نہیں ہوگا۔ شاید اسٹور بند ہونے کے بعد ہی وہ مال کی ڈیلیوری کے لیے جائے۔'' ماتحت نے اسے تفصیلی رپورٹ مع اپنی رائے کے دی۔

''ٹھیک ہے، تم اس پر نظر رکھو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اسٹور پر آکر ہی اس سے وصولی کرلے۔ دوسری صورت میں تمہیں اسٹور بند ہونے کے بعد بھی اس کا پیچھا کرنا ہوگا۔ وہاں سے نکل کر وہ کسی جگہ یہ چیزیں پہنچانے جاسکتا ہے یا کوئی اس کے گھر پر بھی وصولی کے لیے آسکتا ہے۔ تم ہر امکان کو ذہن میں رکھ کر نگرانی کرو اور یاد رکھنا کہ ہمارا اصل ہدف یہ شخص نہیں بلکہ وہ ہوگا جو اس سے وصولی کرے گا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہاری مدد کے لیے شاہد کو بھی بھیج دیتا ہوں۔ تم دو بندے ہوگے تو کسی مشکل سچویشن سے نمٹنے میں آسانی رہے گی۔ بس یاد رکھنا کہ تمہیں جنرل اسٹور والے کو قطعی نہیں چھیڑنا ہے اور نہ ہی کسی طرح اس کی نظروں میں آنا ہے۔ وہ ریلیکس رہے گا تو ہمارے لیے بھی آسانی رہے گی۔'' وہ رپورٹ سن کر اپنے ماتحت کو ہدایات دینے لگا۔

اس کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے شاہد نامی ماتحت کو کال کر کے اسے بھی وہاں پہنچنے کا حکم دیا جہاں پہلے والا ماتحت موجود تھا۔ شاہد کو کال کرنے کے بعد اس نے سیٹ ہاتھ سے رکھا بھی نہیں تھا کہ اس پر کال آنے لگی۔ نمبر دیکھ کر وہ چونکا اور شہریار کو اطلاع دی۔

''مشابرم خان کال کر رہا ہے۔'' پھر خود کال ریسیو کرلی۔

''ادھر اسپتال میں گڑبڑ ہے سر! وہ خانہ خراب نرس جو شہریار صاحب کے کمرے میں ڈیوٹی دیتی ہے، ادھر ایک بندے سے ملی ہے اور اسے کچھ دے کر اس سے کالے رنگ کا ایک بیگ وصول کیا ہے۔ مجھے وہ صورت حرام بندہ گڑبڑ لگ رہا تھا اس لیے میں نے فوراً آپ کو اطلاع دینے کے بجائے اس کا پیچھا کیا اور اب ادھر لبرٹی کے علاقے میں موجود ہوں۔ میرا بس نہیں چل رہا کہ گدی پکڑ کر اس صورت حرام بندے سے ساری تفصیل معلوم کرلوں لیکن سوچا پہلے آپ کی اجازت لینا ضروری ہے۔ میں بڑی دیر سے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن آپ کا نمبر ہی مصروف جارہا تھا۔'' مشابرم خان نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ اس سے جو کچھ کہا، اسے سن کر اس کی کھوپڑی ناچ اٹھی۔ اگر مشابرم خان اپنے کہے پر عمل کرنے کھڑا ہوجاتا تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔

''تم کچھ نہیں کرو گے خان! اس معاملے سے بالکل الگ رہو اور وہاں سے ہٹ جاؤ۔'' اس نے سرد اور جھلائی ہوئی آواز میں مشابرم خان کو حکم دیا۔

''لیکن صاحب......'' مشابرم خان اس کا حکم سن کر متذبذب ہوا۔

''کوئی لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم سے جو کہا جارہا ہے اس پر عمل کرو۔ یہ بہت نازک معاملہ ہے اور میرے بندے خود اسے دیکھ رہے ہیں۔ تمہاری وجہ سے کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں کسی صورت تمہیں نہیں بخشوں گا۔'' ذیشان کا لہجہ مزید سخت ہوگیا۔

''میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔ آپ مجھے بتائیں کہ کیا کرنا ہے۔ آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔'' وہ اب بھی وہاں سے لوٹنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

''تم صرف یہ کرو کہ وہاں سے اپنی شکل گم کرلو۔ اگر دو منٹ بعد بھی تم وہاں دکھائی دیے تو میں اپنے آدمی سے کہوں گا کہ تمہیں گولی ماردے۔'' ذیشان کی جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔

''ٹھیک ہے سر! آپ ناراض نہ ہوں۔ میں اسپتال چلا جاتا ہوں۔'' آخرکار مشابرم خان نے ہتھیار ڈال دیے۔

''تمہاری مرضی ہے، ویسے میری مانو تو اب اسپتال کا پیچھا چھوڑ دو۔ اسپتال میں سوائے وقت برباد کرنے کے تم کچھ نہیں کر رہے ہو۔ تمہارے صاحب کا علاج ڈاکٹرز کر سکتے

ہیں اور وہ کر رہے ہیں۔ تمہارا وہاں کوئی کام نہیں ہے۔'' ذیشان نے اسے تلخی سے جواب دیا۔

''میں آپ کی یہ بات نہیں مان سکتا سر! مجھے معلوم ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی میں صاحب کے قریب رہنا چاہتا ہوں۔'' مشابرم خان نے نہایت جذباتی لہجے میں کہا تو ذیشان نے اس سے مزید کچھ کہے بغیر لائن کاٹ دی اور لاؤڈ اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے ساری بات سنتے شہریار کی طرف متوجہ ہوا۔

''ایک تو یہ بڑا مسئلہ ہے۔ تمہارے دشمنوں کے ساتھ ساتھ تمہارے چاہنے والوں سے بھی نمٹنا پڑتا ہے۔ یہ شخص تو تمہارے لیے بالکل پاگل ہے۔ حال سے بے حال مستقل اسپتال میں ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔ میرا تو اس کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ شکر ہے کہ اس نے کچھ کرنے سے پہلے مجھ سے رابطہ کر لیا ورنہ بنا بنایا کھیل بگاڑ کر رکھ دیتا۔'' وہ ابھی تک جھلاہٹ کا شکار تھا۔

''ایزی یار! مشابرم خان بڑے کام کا بندہ ہے۔ فی الحال وہ میرے ساتھ حادثہ پیش آنے کا سن کر شاک میں ہے۔ تھوڑے دنوں میں سنبھلے گا تو تم دیکھنا تمہارے لیے بڑے کام کا بندہ ثابت ہوگا۔ تم نے عدم کا وہ شعر تو سنا ہوگا

خلوص کے بندوں میں ایک ہی کمی ہے عدم
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

تو بس سمجھو کہ خان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے ورنہ آدمی وہ زبردست ہے۔'' وہ ذیشان کو سمجھانے لگا۔

''ہمارے کام میں یہ جذباتیت نقصان دہ ہوتی ہے۔ میں تمہیں بتانے والا تھا کہ اس آدمی کے جذباتی پن نے کہیں اور بھی گڑبڑ کر دی ہے۔ تمہیں وہ عورت شہزادی تو یاد ہوگی نا جسے تم نے فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا؟''

''ہاں ہاں، بالکل یاد ہے... بلکہ میں منتظر تھا کہ اس کی طرف سے کوئی رپورٹ ملے۔''

''انتظار کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ شہزادی مر چکی ہے۔'' ذیشان نے انکشاف کیا۔

''کیوں؟ کیسے؟'' وہ چونک پڑا۔

''زیادہ تفصیل نہیں معلوم، بس یہ معلوم ہوا کہ رات کو سوتے ہوئے اس کو اور اس کے بچے کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ صبح لاشیں گاؤں پہنچا دی گئیں۔ عبدالمنان نے لاشیں اپنی تحویل میں لے کر پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا دیں اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ ہلاکت کا سبب وہی ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے جس بات نے تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حادثہ اسی رات پیش آیا ہے جس روز تمہارے ایکسیڈنٹ کی خبر نشر کی گئی اور مشابرم خان جذبات میں آ کر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے جانے کے بجائے لاہور بھاگا آیا۔ اب اگر اس معاملے کو شک کی نظر سے دیکھو تو یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شہزادی کوئی خاص اطلاع دینے کے لیے بنگلے سے نکلی ہو اور پکڑی گئی ہو۔ مشابرم خان وہاں موجود ہوتا تو اس کی کچھ مدد کر پاتا۔ کمزور عورت کو پکڑ کر انہوں نے آسانی سے سب کچھ اگلوا لیا ہوگا اور پھر اس کی موت کو حادثاتی رنگ دینے کے لیے سانپ سے ڈسوانا کون سا مشکل کام تھا۔ میں یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے اس کیس کی جو تھوڑی بہت تحقیق کروائی ہے، اس سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بے شک شہزادی کے جسم پر تشدد وغیرہ کے نشانات نہیں تھے لیکن اس کے پیروں پر چند ایسی خراشیں تھیں جن سے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ جھاڑیوں وغیرہ سے گزری ہو۔ اس کے علاوہ اس کے کپڑوں پر مٹی اور تھوڑی سی گھاس پھوس بھی پائی گئی ہے جس سے یہ شک ہوتا ہے کہ وہ بنگلے سے باہر نکلی تھی۔ سب سے اہم اور قابلِ غور جو کلیو ملا ہے، وہ یہ کہ برگد کے جس درخت پر مشابرم خان نے اپنے لیے مچان باندھی تھی، اس کے اطراف میں ایک سے زیادہ افراد کے قدموں کے نشانات پائے گئے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے، وہاں مشابرم خان کے علاوہ بھی کچھ لوگ آئے تھے۔ اب اگر سوچو تو یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ ہو سکتا ہے اس رات شہزادی کوئی اہم اطلاع لے کر پہنچی ہو لیکن مشابرم خان وہاں نہیں تھا۔ چنانچہ جب وہاں اسے کچھ لوگوں نے دھرا تو اس کی مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا اور وہ بے چاری بے موت ماری گئی۔ اس طرح کے قتل جو بظاہر حادثہ لگیں، کوئی نئی بات نہیں ہے اس لیے میں حالات کو دیکھتے ہوئے یہی سمجھتا ہوں کہ شہزادی حادثے کا شکار نہیں ہوئی بلکہ اسے سوچ سمجھ کر قتل کیا گیا ہے اور وہ بھی اس وجہ سے کہ وہ ہمارے لیے کام کر رہی تھی۔''

ذیشان نے بے لاگ تجزیے اور تبصرے پر مبنی تفصیل اسے کہہ سنائی جسے سن کر وہ خود سخت افسوس میں مبتلا ہو گیا۔ جذبات میں آ کر مشابرم خان سے جو کوتاہی ہوئی، وہ اپنی جگہ تھی لیکن اس وقت وہ خود کو شہزادی اور اس کے معصوم بچوں کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ وہ چودھری اور عابد انصاری کے درمیان تعلق ڈھونڈنے کے چکر میں اتنا دیوانہ ہو رہا تھا کہ اس نے

ایک کمزور عورت کو بھیڑیوں کی کچھار میں اترنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اگر ذیشان کا تجزیہ درست تھا تو پھر بے چاری شہزادی ان بھیڑیوں کی سفاکی کا شکار ہو گئی تھی اور اس کے پیچھے اس کے باقی بچ رہنے والے بچے ظالم دنیا میں تنہا رہ گئے تھے۔

''ایک کام کرنا ذیشان! کوشش کر کے شہزادی کے بچوں کو حکومتی تحویل میں لے لینا اور انہیں ایسے کسی ادارے میں داخل کر دینا جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب بندوبست ہو سکے۔'' وہ مرنے والی کو تو واپس نہیں لا سکتا تھا اس لیے اب مداوے کی واحد صورت یہی تھی کہ شہزادی کے بچوں کا مستقبل محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی۔

''تم فکر نہیں کرو۔ یہ کام ہو جائے گا۔'' ذیشان نے اس کی کیفیت بھانپ لی تھی چنانچہ فوراً ہی اپنے جارحانہ لہجے کو تبدیل کر لیا اور تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ساتھ ہی اس نے اس تکلیف دہ موضوع کو مزید جاری رکھنے کے بجائے اس کے دوسرے پہلو کو چھیڑ دیا۔

''شہزادی کے انجام سے ظاہر ہے کہ وہ کسی خاص راز تک پہنچ گئی تھی اور چونکہ وہ عابد انصاری کے بنگلے میں ملازمت کر رہی تھی، اس لیے یہ بات بھی خود بخود ہی ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ بندہ گڑبڑ ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ہم معاملات تک خفیہ طور پر پہنچنے کی کوشش ترک کر کے براہِ راست ایکشن لیں اور عابد انصاری کو اٹھا لائیں۔ جب میرے آدمیوں کے ہاتھوں پیٹ بھر کر مار کھائے گا تو خود ہی سب اگل دے گا۔'' ذیشان نے جو تجویز پیش کی، وہ اسے قابلِ غور لگی اور وہ خود بھی اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو کیونکہ اگر عابد انصاری واقعی کسی خطرناک کام میں ملوث ہے تو پھر اس نے اپنے اردگرد انہی لوگوں کو جمع کر رکھا ہوگا جو اس کے نزدیک قابلِ بھروسا ہوں گے۔ اس کے بھروسے کے کسی آدمی کو توڑنا ہمارے لیے مشکل ہے اور اپنے کسی آدمی کو اس کی صفوں میں شامل کرنا بھی ممکن نہ ہوگا کیونکہ شہزادی والے واقعے کے بعد اب وہ بہت زیادہ محتاط ہو گیا ہوگا۔''

''پھر طے ہو گیا کہ ہمیں عابد انصاری کو اٹھانا ہے۔ ابھی جو قصہ چل رہا ہے، اسے نمٹا لیں پھر آگے کی پلاننگ کریں گے کہ انصاری کو اٹھانے کے لیے کیا طریقۂ کار استعمال کیا جائے۔'' ذیشان ابھی یہ الفاظ ادا کر ہی رہا تھا کہ لمبے قد اور مضبوط جسامت کا ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ صورت ہی سے بارعب نظر آنے والا یہ آدمی شہریار کا انسٹرکٹر تھا اور جس جگہ وہ لوگ موجود تھے، وہاں اسی کا حکم چلتا تھا۔ یہاں موجود افراد کو ہر کام کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت پڑتی تھی۔

''آیئے عمر فاروق صاحب! کہیں آپ اپنے شاگرد کو ڈانٹ ڈپٹ تو کرنے نہیں آئے کہ یہ بنا اجازت اتنی دیر تک یہاں کیوں بیٹھا ہوا ہے اور اصولاً اسے اب تک سو جانا چاہیے۔'' اس آدمی کو دیکھتے ہی ذیشان نے شوخی سے پوچھا لیکن شہریار محسوس کر سکتا تھا کہ اس کی شوخی میں بھی احتیاط اور احترام موجود ہے۔

''میرا شاگرد اتنا نالائق نہیں ہے کہ بغیر اجازت لیے ہی قواعد وضوابط کے خلاف عمل کر سکے۔ رہی بات روٹین خراب ہونے کی تو یاد رکھو، روٹین کی پابندی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وقت کے حساب کتاب میں گڑبڑ سے کسی کا وقت برباد نہ ہو ورنہ یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ تم لوگ جس نوعیت کا کام کرتے ہو، اس میں ہمیشہ کسی طے شدہ معمول پر چلنا ممکن نہیں ہوتا... بلکہ بعض اوقات تو دن رات کا فرق بھی مٹ جاتا ہے اور بغیر کھائے پیے اور سوئے ہوئے کئی کئی دن تک نامساعد حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔'' عمر فاروق کے نام سے پکارے جانے والے انسٹرکٹر نے نرم سی سنجیدگی کے ساتھ ذیشان کی بات کا جواب دیا تو وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر اپنے سیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں بھئی، کیا رپورٹ ہے؟ اب تو گیارہ سے اوپر کا وقت ہو گیا ہے۔ کیا اب تک اس نے اسٹور بند نہیں کیا؟'' رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے اپنے ماتحت سے دریافت کیا۔

''میں خود آپ کو کال کرنے والا تھا سر! اسٹور بند ہو گیا ہے اور اس کا مالک اپنے گھر جا چکا ہے۔ میں بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا اس کے گھر تک پہنچ گیا ہوں۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے جس کے رنگ و روغن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مالک مکان اچھا خاصا خوش حال آدمی ہے۔ میں نے دروازے پر لگی نیم پلیٹ بھی دیکھی ہے۔ نیم پلیٹ پر اس کا نام رائے چند لکھا ہوا ہے۔ رائے چند نے نہ تو اسٹور میں کسی سے ملاقات کی تھی اور نہ ہی وہ راستے میں کہیں رکا ہے، اس لیے مجھے لگتا ہے کہ اس سے وصولی کے لیے آنے والا یہیں گھر پر ہی کسی وقت آئے گا۔'' ماتحت نے فوراً تفصیلی رپورٹ دے دی۔

''تم اپنا کام جاری رکھو۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے گھر کی نگرانی سے غافل نہیں ہونا۔ صبح چھ بجے تک تمہاری

وہاں پر ڈیوٹی ہے۔ اس دوران اگر کچھ نہیں ہوا تو دوسرا بندہ تمہاری جگہ سنبھال لے گا۔'' ذیشان نے اپنے ماتحت کو حکم دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر مسکراتا ہوا شہریار کی طرف متوجہ ہوا۔

''لو بھئی، اپنی تو رات کالی ہونے کا بندوبست ہو گیا۔ تم ایسا کرو کہ جا کر آرام سے سو جاؤ۔ جو بھی حالات ہوں گے، میں صبح تمہیں آگاہ کر دوں گا۔ صبح سے تمہیں پھر عمر فاروق صاحب کی مشقِ ستم کا سامنا کرنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ نیند لے کر فریش ہو جاؤ۔''

''نہیں، آج رات شہریار کو سونا نہیں ہے۔ یہ بھی تمہارے ساتھ ہی جاگیں گے اور صبح جب روٹین کا آغاز ہو گا تو انہیں بالکل ویسا ہی فریش نظر آنا ہو گا جیسے کوئی شخص بھرپور نیند لینے کے بعد نظر آتا ہے۔'' اس سے قبل کہ شہریار کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر ہوتا، عمر فاروق اچانک ہی بول پڑے۔ اور یہ تو طے تھا کہ ان کا کہا اٹل تھا۔ ویسے بھی ان دونوں میں سے کوئی بھی ان سے اختلاف کا ارادہ نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عمر فاروق کی ہر ہدایت اور حکم پر عمل کر کے ہی شہریار کندن بن سکے گا۔

☆☆☆

''عابد انصاری کو آف کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے ایس جے! اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی لانے کی کوشش کی جائے گی۔''

''لیکن وہ کیوں؟ انصاری تو کام کا بندہ تھا اور اب تک سب اس کی طرف سے مطمئن تھے۔'' سنتھیا جو موساد میں عموماً ایس جے کے مخفف سے ہی پکاری جاتی تھی، اس فیصلے کو سن کر حیران ہوئی۔

''انصاری نے الفا کو رپورٹ دی تھی کہ شہزادی نامی ایک عورت کے ذریعے اس کے بارے میں حقائق کھوجنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اتفاق سے اسے اس عورت پر شک ہو گیا اور اس نے اس کی نگرانی شروع کروا دی۔ نگرانی اور بعد کی تفتیش کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ اس عورت کو شہریار نے وہاں جاسوسی کے لیے بھجوایا تھا اور اس عورت نے ایسی معلومات حاصل کر لی تھیں کہ اگر وہ شہریار تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی تو ہمارا سارا کھیل بگڑ جاتا۔'' یہ ڈیوڈ تھا، موساد کا وہی خطرناک ایجنٹ جو لنڈا نامی قتالہ کے ساتھ امریکا میں بیٹھ کر اس سارے کھیل کی نگرانی کر رہا تھا۔ عمر میں کم ہونے کے باوجود وہ سنتھیا سے عہدے میں کچھ اوپر تھا لیکن سنتھیا کو اپنی برسوں کی خدمات کے صلے میں جو اہمیت حاصل تھی، اس کے سبب اس کے اوپر کے عہدیدار بھی اس سے عزت و احترام سے ہی بات کرتے تھے۔

''اب تو شہریار والا باب ہی بند ہو گیا۔ وہ اسپتال میں جس حالت میں پڑا ہے، اس کے بعد یہ امید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ کبھی میدانِ عمل میں اتر سکے گا۔ شہریار کے نان ایکٹو ہو جانے کے بعد اس کے ہرکاروں کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔'' سنتھیا نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ملنے والی اطلاع پر تبصرہ کیا۔ شہریار کے نام کے ساتھ ہی اسے ماریا کی دردناک موت یاد آ جاتی تھی۔ ہر ممکنہ طریقے سے تصدیق کر لینے کے باوجود کہ اسپتال میں پڑا مریض شہریار ہی ہے، اس کے اندر بے چینی اور بے قراری تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی بیٹی کی موت کے ذمے داروں میں سے ایک شہریار کو وہ سزا نہیں مل سکی جس کا وہ مستحق تھا۔ خصوصاً یہ بات سامنے آنے پر کہ شہریار نے حادثے سے قبل ہی ماریا کو طلاق دے دی تھی اور اس کے بارے میں مکمل طور پر لاتعلقی اور لاعلمی کا اظہار کیا تھا کہ وہ کہاں ہے، اس کے دل میں موجود شہریار کی نفرت کو مزید بڑھا دیا تھا۔

''شہریار کے باب کو اس لیے بند نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ خود تو بے شک میدان سے باہر ہو گیا ہے لیکن اس کے انٹیلی جنس والوں سے روابط کوئی رنگ دکھا سکتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے نان ایکٹو ہونے کے باوجود اس کا کون سا آدمی اب تک کام کر رہا ہے اور انٹیلی جنس کو معلومات دے رہا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم اس بندے کو ہی اڑا دیں جس کے ذریعے ہم تک پہنچا جا سکتا ہے۔'' ڈیوڈ نے اسے صورتِ حال سمجھائی۔ وہ لوگ اس وقت اسی طرح کے اسپیشل سیٹ پر بات کر رہے تھے جو چودھری کو الفا نے فراہم کیا تھا اس لیے انہیں کال ٹریس ہونے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔

''اگر ایسا ہے تو انصاری کے ساتھ ساتھ چودھری بھی ایسے ہی سلوک کا حق دار ہے۔ اس کے کارخانے پر ہونے والے ریڈ کے بعد تو وہ واضح طور پر منشیات کے کاروبار میں ملوث ثابت ہو چکا ہے۔ اور اگر کسی نے اس پر ہاتھ ڈال دیا تو وہ انصاری سے زیادہ حقائق اگل سکتا ہے۔'' اس نے فوراً ہی اعتراض کیا۔

''چودھری کی قانونی حیثیت مضبوط ہے۔ وہ اپنے وکیل کے ذریعے ثابت کر چکا ہے کہ جس کارخانے پر ریڈ کر کے منشیات کا ذخیرہ اور اسے تیار کرنے والی مشینیں وغیرہ پکڑی گئی ہیں، وہ اصل میں اس کا ہے ہی نہیں اور وہ کافی عرصہ قبل اسے فروخت کر چکا ہے۔''

''یہ بات اپنی جگہ لیکن انٹیلی جنس والے ایسی چالوں سے خوب واقف ہوتے ہیں اس لیے وہ کسی صورت چودھری کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔'' سنتھیا نے اسے ٹوکا۔

''یہ بات ہم بھی سمجھتے ہیں اس لیے چودھری کو فی الحال واپس جانے سے روک دیا گیا ہے۔ وہ یہاں بیٹھ کر بھی ہمارے لیے بہت کام کر سکتا ہے۔ اس کے پیچھے اس کے وفادار سارا کام سنبھال لیں گے۔ اب بھی انصاری کو قتل کرنے کی ذمے داری چودھری کے ایک وفادار بہرام کو ہی سونپی گئی ہے۔ بہرام اسے بالکل اسی طریقے سے قتل کرے گا جیسے اس نے شہزادی اور اس کے بچے کو مروایا تھا۔ اس طرح شہزادی کی موت ہی کی طرح اس کی موت پر بھی قتل کا شبہ کرنا مشکل ہو گا۔''

''تمہارا کام تم ہی جانو، مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے اب کیا کرنا ہے؟ کلارا کے بعد مجھے جس طرح اپنے پروجیکٹ سے الگ ہونا پڑا ہے، میں اپنے آپ کو بالکل بیکار سمجھ رہی ہوں۔ اس بیکاری میں مجھے کلارا کی موت کا غم اور بھی زیادہ ستاتا ہے۔'' وہ افسردہ ہو گئی۔

''خود کو ناکارہ مت سمجھو ایس جے! تم آج بھی ہمارے لیے بہت قیمتی ہو۔ بس تمہیں وقتی طور پر اس لیے روپوش ہونے کا کہا گیا ہے کہ تم پریشانی سے بچ سکو۔ باقی را والوں سے تو تم رابطے میں ہو ہی۔ ان کے ساتھ رہ کر ماضی کی طرح عظیم اسرائیل کے لیے کام کرتی رہو۔ ہاں اگر تم خود یہ سمجھتی ہو کہ اب تمہیں آرام کی ضرورت ہے اور تمہارے لیے یہ کام کرنا ممکن نہیں رہا تو کسی کو تمہاری ریٹائرمنٹ پر اعتراض نہیں ہو گا اور عظیم اسرائیل میں کھلی بانہوں سے تمہارا استقبال کیا جائے گا۔'' ڈیوڈ نے اسے کھلی پیشکش کی۔

''ابھی میں نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ میں اپنی بیٹی کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ شہریار کا حساب تو خود بخود ہی بے باق ہو گیا لیکن ابھی کرنل توحید باقی ہے۔ اس کا انجام ہونے سے پہلے میں ریٹائرمنٹ نہیں لے سکتی۔'' وہ نہایت عزم سے بولی۔

''اوکے، جیسی تمہاری مرضی۔ میں نے تو صرف ایک پیشکش کی تھی۔'' ڈیوڈ نے بات ختم کر دی اور نیا موضوع چھیڑتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں پروفیسر ہنری کی طرف سے خاصی تشویش ہے۔ چودھری کے کارخانے پر ہونے والے ریڈ میں ہمارا سب سے بڑا نقصان ہی یہ ہوا ہے کہ پروفیسر ہنری کو وہاں سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ اس گرفتاری کو کسی بھی سطح پر تسلیم نہیں کیا گیا لیکن حالات بتاتے ہیں کہ وہ انٹیلی جنس والوں کے قبضے میں ہیں کیونکہ موقع پر ان کے معاونین کی گولیوں سے ہلاک شدہ لاشیں تو ملی ہیں لیکن خود ان کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ اگر وہ وہاں سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو ہم سے رابطہ ضرور کرتے۔ ان کے رابطہ نہ کرنے کی صورت میں یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ انٹیلی جنس والوں کے قبضے میں ہیں اور یقیناً ان کی تفتیش کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔''

''رہنے دو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انٹیلی جنس والے سر کے بل کھڑے ہو کر بھی ان سے کچھ اگلوانے کی کوشش کریں گے تو کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ تم خود پروفیسر کو اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ کتنے ضدی آدمی ہیں۔ تشدد کے نتیجے میں تو کچھ اگلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کسی اور طریقے سے بھی اپنی زبان نہیں کھولیں گے۔ تم جانتے ہو کہ انہیں اپنے برین کو بلاک کر لینے کی کتنی حیرت انگیز صلاحیت حاصل ہے۔ ایسے بندے پر نہ تو ہپناٹزم اثر کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی دوا۔ وہ مر جائیں گے لیکن کچھ نہیں بتائیں گے۔'' اس کے لہجے میں گہرا یقین تھا۔

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن اصل پریشانی یہ ہے کہ بعض لوگوں کی طرف سے انہیں آزاد کروانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت میں نے تم سے اسی امکان پر گفتگو کرنے کے لیے رابطہ کیا ہے۔ تم بتاؤ کہ کیا ہم پروفیسر کو انٹیلی جنس کے قبضے سے چھڑا سکتے ہیں؟'' ڈیوڈ نے اس سے پوچھا۔

''سوری، یہ ممکن نہیں ہے۔ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ ہم براہِ راست انٹیلی جنس سے ٹکر لے سکیں۔ ابھی تک تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ پروفیسر کو کہاں رکھا گیا ہے لیکن یقینی سی بات ہے کہ وہ جگہ خاصی محفوظ ہو گی جہاں سے انہیں نکالنے کے لیے خاصی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اور تم جانتے ہو کہ یہاں ہمارے پاس اپنا ذاتی مسلح جتھا نہیں ہے۔ عموماً ہم اپنے مقاصد کے لیے کرائے کے لوگوں یا پھر را والوں سے مدد لیتے ہیں۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ کرائے کے لوگوں کی صلاحیتوں پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا اور را والوں کو ملوث کرنا ممکن نہیں ہے۔ بہت سے معاملات میں ان کے ساتھ شراکت کرنے کے باوجود یہ راز ان کے ساتھ کسی طور شیئر نہیں کیا جا سکتا کہ ہم یہاں کسی مفید مقام پر افیون کی کاشت کر کے ہیروئن تیار کروا رہے ہیں۔'' اس نے دوٹوک جواب دیا۔

''یہ سب میرے بھی علم میں ہے اسی لیے میں پریشان

ہوں کہ کیا کروں؟'' ڈیوڈ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا۔

''کچھ مت کرو۔ پروفیسر کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ہم لوگ برسوں سے عظیم اسرائیل کے لیے قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ پروفیسر بھی بخوشی یہ قربانی دے دے گا۔ جب میری جوان بیٹی، جس نے ابھی اس دنیا میں بہت کچھ دیکھنا تھا، اپنی جان کی قربانی دے سکتی ہے تو پروفیسر جیسا بوڑھا جو کہ زندگی کی ساری خوشیاں اور لطافتیں کشید کر چکا ہے، کیوں قربانی نہیں دے سکتا۔'' اس کا لہجہ بے حد سفاک ہونے کے باوجود اس کی بات ڈیوڈ کے دل کو لگی۔ سنتھیا جیسی سفاکی نہ سہی لیکن کچھ عقلی دلائل کے ساتھ وہ پروفیسر کی بازیابی کے لیے مطالبہ کرنے والوں کو قائل کر سکتا تھا اور کچھ نہیں تو تاخیری حربے تو ضرور ہی آزما سکتا تھا۔

☆☆☆

''یہ بہت عجیب خبر ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ اسے اتفاق سمجھا جائے یا طے شدہ منصوبہ۔ شہزادی کے بعد عابد انصاری کی بھی بالکل اسی طریقے سے ہلاکت نے میرے ذہن کو الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ جو کچھ ہم سوچ رہے تھے، وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں سچ مچ کوئی ایسا موذی سانپ موجود ہے جو انسانوں کی ہلاکت کا باعث بن رہا ہو اور اس سانپ نے پہلے شہزادی اور اس کے بچے کو پھر اب عابد انصاری کو اپنا نشانہ بنا لیا ہو۔'' ذیشان کی زبانی عابد انصاری کی سانپ کے ڈسنے سے ہلاکت کا سن کر وہ اپنی جگہ دم بخود رہ گیا۔ وہ لوگ تو اپنی جگہ پوری منصوبہ بندی کر کے بیٹھے ہوئے تھے اور اگلے ایک آدھ دن میں عابد انصاری کے اغوا کے منصوبے پر عمل درآمد ہونے والا تھا لیکن یہاں تو کہانی ہی الٹ گئی تھی۔ ان کے کچھ کرنے سے قبل عابد انصاری خود لقمۂ اجل بن گیا اور پوسٹ مارٹم رپورٹ نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کی موت سانپ کے ڈسنے سے ہوئی ہے۔

''اس طرح سے سوچا تو جا سکتا ہے لیکن میرا ذہن اس بات کو ماننے کے لیے راضی نہیں ہے۔ شہزادی کی موت حادثاتی نظر آنے کے باوجود جو چند چھوٹی موٹی واقعاتی شہادتیں ہمیں ملی تھیں، وہ اس بات پر دلیل دے رہی تھیں کہ معاملہ گڑبڑ ہے اور اس کے بعد اب انصاری کی بھی بالکل ویسی ہی موت نے مجھے چونکا دیا ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا دشمن ہمارے دماغ سے ہی سوچ رہا ہو۔ انہیں نظر آ رہا ہو کہ چودھری کی غیر موجودگی میں جو واحد ٹارگٹ ہمارے سامنے ہے، وہ انصاری ہے اور ہم کسی بھی وقت اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ اس لیے اس نے ہمارا راستہ مسدود کرنے کے لیے خود اپنے ہاتھ سے اپنا مہرہ پیٹ ڈالا ہو۔ تم خود دیکھو کہ انصاری کی موت کے بعد ہمارے پاس اب کون سا راستہ رہ گیا ہے۔ ایک رائے چند کا کلیو ملا تھا لیکن اس کی مسلسل نگرانی کے باوجود ہمارے آدمی یہ جاننے میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ وہ تہمینہ سے بالوں اور خون کے جو نمونے لے کر گیا تھا، وہ اس نے کس کے حوالے کیے۔ ظاہر ہے، یہ دونوں چیزیں وہ اب تک اپنے پاس تو نہیں رکھ کر بیٹھا ہو گا۔ اس نے کسی نہ کسی کو تو وہ چیزیں دی ہوں گی لیکن نہ جانے کس ہوشیاری سے یہ کام کیا کہ نگرانی کرنے والوں کو پتا ہی نہیں چل سکا۔ بظاہر تو نہ ہی کوئی اس سے ملنے آیا اور نہ ہی وہ خود کسی سے ملنے گیا۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ دونوں چیزیں لے جانے والا اس کے اسٹور پر گاہک کے روپ میں آیا ہو اور اس نے اتنی اچھی اداکاری کی ہو کہ نگرانی کرنے والے کو پتا ہی نہ چل سکا ہو کہ وہ روزمرہ استعمال کی اشیا کے ساتھ کچھ اور بھی وصول کر کے لے گیا ہے۔ بہر حال، دس طرح کے امکان ہو سکتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ یہ یاد رکھنا پڑے گا کہ ہمارا دشمن ہماری سوچ سے زیادہ چالاک اور شاطر ہے۔ اس لیے کوئی معاملہ چاہے کتنا ہی سیدھا نظر آئے، وہ مشکوک ہی سمجھا جانا چاہیے۔'' ذیشان نے فوراً ہی اپنے دلائل سے اس کے خیال کو رد کر دیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم رائے چند کو بھی فی الحال نہیں چھیڑ سکتے۔ اس کے ذریعے دشمن تک پہنچنے کی کوئی فوری کوشش کرنا ہمارے اپنے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔ اسے تو فی الحال نگرانی میں ہی رکھو اور وہ بھی اس طرح کے اسے شک نہ ہو سکے۔ آگے کہیں جا کر اس کی نگرانی ہمارے لیے سودمند ثابت ہو سکتی ہے۔ فی الحال اسے چھیڑنا کچا پھل توڑنے کے مترادف ہو گا۔'' ذیشان سے متفق ہوتے ہوئے اس نے اپنی رائے دی۔

''ہم سب کا اس بات پر اتفاق ہے۔ اب آ جاتے ہیں اپنے سامنے موجود دوسرے ٹارگٹ چودھری کی طرف... تو اس کا رویّہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔ کارخانے کے بارے میں یہ ثابت کر کے کہ وہ کافی عرصہ قبل اسے فروخت کر چکا ہے، اس نے اپنی قانونی پوزیشن محفوظ کر لی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ یہ بات سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہے، ہم اس کی بات پر یقین نہیں کریں گے اور وہ جب بھی پاکستان واپس آیا، اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس لیے وہ یہاں کا رخ ہی نہیں کر رہا ہے اور آرام سے نیویارک میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی مستقبل قریب میں واپسی کا کوئی امکان بھی نہیں ہے۔''

''وہ نہیں آیا تو ہم اس تک پہنچ جائیں گے۔'' شہریار نے کہا۔

''رائٹ، کرنل صاحب! اور میرا بھی یہی خیال ہے لیکن اس کے لیے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ ٹاسک تمہیں ہی دیا جائے گا اور تم خود فی الحال انڈر پروسس ہو۔ تمہارے حلیے میں ابھی مزید تبدیلیاں لائی جانی ہیں۔ کرنل صاحب خود ڈاکٹر یوسفی اور ڈاکٹر پاشا سے رابطے میں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ابھی تمہاری ایک دو سرجریز اور ہوں گی۔ اس کے بعد بالوں اور جلد کی رنگت کی تبدیلی کا پروسس ہے تو تم فوراً تو اٹھ کر امریکا نہیں جا سکتے۔ اس کے لیے ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔ بہت سی کاغذی کارروائیاں بھی کرنی ہیں۔ تمہارے یہاں کے ریکارڈ میں سے تمہارے فنگر پرنٹس وغیرہ میں تبدیلی کا پروسس بھی جاری ہے تاکہ آئندہ بھی کسی طور تمہیں شہریار عادل کے طور پر شناخت نہیں کیا جا سکے۔ میرا مطلب ہے کہ اس وقت تک جب تک تم اپنے اس بہروپ کو چھوڑ کر دوبارہ واپس اپنے روپ میں آنے کا فیصلہ نہیں کر لیتے۔ اس وقت پھر تمہارے لیے نئے سرے سے زندگی گزارنے کے مواقع پیدا کیے جائیں گے اور وہ سارے ضروری اقدامات کیے جائیں گے جو تمہارے مفاد میں ہوں۔'' ذیشان نے اس کے سامنے ساری صورتِ حال کھول کر رکھی تو وہ بے بسی سے ہاتھ مل کر رہ گیا پھر جیسے اچانک کوئی خیال آنے پر بولا۔

''ذیشان! ایسا کرو کہ خواجہ سراؤں اور کال گرلز پر ایک بار پھر کام شروع کرواؤ۔ سجاد بھائی اپنے قتل سے پہلے جولی نامی ایک کال گرل سے ملاقات کر کے آئے تھے۔ اس کال گرل نے بھی اگلے ہی دن خودکشی کر لی تھی لیکن حالات و واقعات کے تجزیے سے یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ جولی کی خودکشی اصل میں اس کے قتل پر پردہ ڈالنے کی کوشش تھی۔ اسے اپنے اشاروں پر نچانے والے سمجھ گئے تھے کہ سجاد بھائی اس کے ذریعے ان کے نیٹ ورک تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور شاید بہت کچھ جان بھی چکے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف انہوں نے ان کی زندگی کا چراغ گل کیا تو دوسری طرف اپنی اس ساتھی کو بھی ٹھکانے لگا دیا جس کے ذریعے ان کا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ خواجہ سراؤں کا قصہ بھی میں تمہیں سنا چکا ہوں۔ را والوں نے معاشرے کے اس مظلوم طبقے کو ان کی محرومیوں کی مدد سے خوب استعمال کیا ہے۔ ایک طرف وہ مذہب کی بنیاد پر انہیں تقسیم کرنے میں کامیاب ہوئے تو دوسری طرف ان کے ذہنوں میں ایسی خرافات بھر دیں کہ وہ انتہاپسندی کو ہی اپنا مذہب سمجھنے لگے۔ مذہب ہی کی وجہ سے ہندو خواجہ سراؤں نے پاکستانی شہری ہونے کے باوجود را کا آلۂ کار بننا منظور کر لیا۔ میرے اتفاقاً ان لوگوں تک پہنچنے کی وجہ سے وہ انتہاپسند گروہ منظر سے غائب ہو گیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ گروہ کا وجود اب بھی باقی ہو گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافی عرصے سے ہمارے اس طرف متوجہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا ہو کہ اب ہماری ان میں کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے اس لیے وہ ایک بار پھر اپنی سرگرمیاں شروع کر چکے ہوں۔'' وہ دور کی کوڑی لایا تھا لیکن ذیشان فوراً ہی اس سے متفق ہو گیا کیونکہ اس کی سجھائی راہ اندھیرے میں ابھرنے والی روشنی کی کرن کے مانند تھی۔

''تم نے اچھی تجویز دی ہے۔ واقعی ہم ان دونوں گروپس پر کام کر کے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ میں اپنے جوانوں کو براہِ راست ان کے درمیان داخل کر دوں گا تو وہ کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل کریں گے۔'' ایک راہ سجھائی دیتے ہی ذیشان پُرجوش نظر آنے لگا۔

''مشابرم خان اور جگو کی صلاحیتوں کو بھی وقتِ ضرورت کام میں لاتے رہنا۔ مشابرم خان کو تو میں نے خود تاکید کر دی تھی کہ میری عدم موجودگی میں تمہاری ہدایات پر عمل کرے، البتہ جگو سے تمہیں خود رابطہ کر کے اس سے فائدہ اٹھانا ہو گا۔ مشابرم خان کا معاملہ الگ ہے۔ وہ سرکاری ملازم ہے اور ملک سے وفاداری اس کے خون میں رچی بسی ہے،

بلڈ گروپ

ڈاکٹر نے کہا۔ ''خوشی کی بات ہے کہ آپ کا اور آپ کی بیگم کا بلڈ گروپ بالکل ایک ہے۔''

''وہ تو ہونا ہی تھا۔'' ملاقاتی نے بیزاری سے جواب دیا۔

''کیا اس اطلاع سے آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ بیس سال سے لہو پی رہی ہے میرا... بلڈ گروپ تو ایک ہونا ہی تھا، اس میں بغلیں بجانے کی کیا بات ہے؟''

الٰہ آباد سے راحیل احمد کی بے بسی

البتہ جگو ذرا مختلف بندہ ہے۔ وہ جن لوگوں کے لیے کام کرتا ہے، وہ ظاہری طور پر تو ملک کے خدمت گار اور خیر خواہ ہیں لیکن حقیقت میں ان کا کام ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنا ہے۔ ان کا اصل مذہب پیسا ہے۔ وہ پیسے کو پوجتے ہیں اور اسی سے وفاداری نبھاتے ہیں، چاہے اس چکر میں انسانیت کا خون ہو جائے۔ جگو ان جتنا بڑا بدمعاش نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی بدمعاشی کو چھپانے کے لیے شرافت کا چولا نہیں چڑھا رکھا ہے لیکن ایک طرح سے ہے تو وہ بھی پیسے ہی کا غلام جو پیسے کی خاطر اپنے آقا کا ہر حکم آنکھ بند کر کے بجالاتا ہے۔ البتہ اس کی ہوس کا برتن حکمرانوں کی عمرو عیار کی زنبیل جیسا نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر تم میرے حوالے سے کسی موقع پر اس سے مدد مانگو گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔'' وہ جس جگہ رہ رہا تھا، وہاں ذیشان کے سوا اس سے بات چیت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ملازمین صرف احکامات کی تعمیل کرتے تھے اور انسٹرکٹر عمر فاروق احکامات کا اجرا... اس لیے وہ خود نسبتاً کم گو ہونے کے باوجود کسی سے گفتگو کے لیے ترس جاتا تھا۔ ذیشان سے بھی روز روز ملاقات نہیں ہو پاتی تھی چنانچہ جب بھی وہ میسر آتا، وہ اپنی زبان کی گرہیں خوب خوب کھولتا اور یقین کر لیتا کہ اس کے جبڑے جام نہیں ہوئے ہیں۔ گفتگو کی یہ طوالت اس کی محرومی ہی کی دین تھی۔ ذیشان بھی سمجھتا تھا کہ خاندان، دوستوں، ملازمت اور دیگر عملی سرگرمیوں سے محروم یہ بالکل تنہا زندگی اس کے اعصاب کے لیے امتحان تھی اس لیے اس سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتا تھا۔

''میری جگہ کسی دوسرے بندے کی تعیناتی عمل میں آئی یا نہیں؟'' خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے ذیشان سے دریافت کیا۔

''بندے کا انتخاب ہو چکا ہے لیکن ابھی اسے پوسٹ نہیں کیا گیا۔ ابھی کچھ دن تو ہمیں اس بات کا انتظار کرنا ہوگا کہ ڈاکٹروں کی طرف سے تمہارے لیے مکمل ناامیدی کا اعلان کر دیا جائے پھر اس کے بعد اس بندے کو وہاں بھیجا جائے گا۔'' ذیشان نے جواب دیا۔

''عمیر آفندی نام ہے۔ اچھا پُرجوش جوان ہے۔ فیملی بیک گراؤنڈ بھی بہت ٹھیک ٹھاک ہے اس لیے فی الحال تو یہ امید نہیں کی جا رہی کہ پیسے کی خاطر بک جائے گا۔ باقی اس پر چیک رکھنے اور اسے مورل سپورٹ فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔'' ذیشان نے اسے مزید آگاہ کیا۔

''اور نیا فاریسٹ آفیسر... انصاری کے بعد نئے فاریسٹ آفیسر کی تعیناتی کے لیے کچھ ہوا یا نہیں؟''

''نہیں، ابھی کچھ نہیں ہوا۔ چند نام زیرِ غور ہیں لیکن کسی کے بارے میں ابھی فائنل فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ باجوہ اور انصاری دونوں فاریسٹ آفیسر اتنے مختصر عرصے اور مشکوک حالات میں موت کا شکار ہوئے ہیں کہ لوگوں کے ذہن میں کئی سوالات نے جنم لے لیا ہے۔ پھر جنگل میں ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے کیا جانے والا آپریشن بھی کوئی پرانی بات نہیں ہے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے واقف کوئی بھی شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اگر اسے اس جگہ پوسٹ کیا گیا تو اس کا مطلب ہوگا، اسے خاصے مشکل حالات میں کام کرنا ہوگا اس لیے ہو سکتا ہے کہ ہم کسی شخص کو وہاں بھیجنے کی کوشش کریں تو وہ انکار کر دے۔ اس لیے اس معاملے کو ذرا دیکھنا پڑے گا۔ پھر دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ عابد انصاری کی ڈیتھ کے باوجود ڈاک بنگلے پر ابھی تک چودھری افتخار کے آدمی موجود ہیں۔ غیر سرکاری لوگوں کا کسی سرکاری عمارت میں اس حد تک عمل دخل خاصا قابلِ غور ہے اور ان شکوک کو اور بھی تقویت دے رہا ہے کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے آدمی تحقیق کے لیے وہاں بھیجتے ہیں تو وہ فوراً ہی نظر میں آ جائیں گے اور کچھ حاصل ہونے کے بجائے الٹا ہمارے لوگوں کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہمارے لوگ بے شک وطن پر اپنی جان قربان کر دینا فخر سمجھتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہوتا ہے کہ ہمارا ہر آدمی بہت قیمتی ہے اور ہم اسے آسانی سے نہیں گنوا سکتے۔'' ذیشان نے بہت تفصیل سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''یہ تو میں خود بھی سمجھتا ہوں۔ البتہ میرے پاس ایک دو تجاویز ہیں جو اگر تمہیں قابلِ عمل لگیں تو ان پر عمل کر دیکھنا۔'' اس نے کچھ دیر قبل ملازم کی پہنچائی جانے والی چائے کا گھونٹ بھر کر کپ واپس میز پر رکھا اور خود صوفے پر قدرے پیچھے ہوتے ہوئے پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔ اس کے سامنے بیٹھا ذیشان بھی چائے پی رہا تھا اور ساتھ ساتھ ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا جو اس عرصے میں اس کی شخصیت میں کی گئی تھیں۔ یہ تبدیلیاں بہت معمولی نوعیت کی تھیں لیکن وہ پہلے سے قدرے مختلف محسوس ہونے لگا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں صرف اس کے خدوخال یا حلیے کو ہی تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی جا رہی تھی بلکہ نشست و برخاست اور دیگر عادات و اطوار میں بھی تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں تاکہ وہ ہر طرح سے ایک مختلف روپ میں ڈھل جائے اور قریب سے اسے جاننے والے بھی اندازہ نہ لگا سکیں کہ وہ شہریار عادل ہے۔

''تم اپنے لوگوں کو براہِ راست چھان بین کے لیے بھیجنے کے بجائے کوئی کور دے کر بھیج سکتے ہو۔ مثلاً پیشہ ور شکاریوں یا جنگلی حیات کا مطالعہ کرنے والی تحقیقاتی ٹیم کے روپ میں... ورنہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم ایک بار پھر پولیس کو جنگل میں اتاریں کہ پہلے آپریشن میں ڈاکوؤں کی مکمل سرکوبی نہیں ہو سکی اس لیے جنگل میں سرچ آپریشن کیا جا رہا ہے۔'' اس نے اپنی تجاویز پیش کیں۔

''ایسا ہو تو سکتا ہے لیکن میرے خیال میں پہلی دو تجاویز میں سے کسی ایک پر عمل کرنا مناسب رہے گا۔ اس معاملے میں پولیس کی انوالومنٹ کو میں مناسب نہیں سمجھتا۔ نہ ہی مجھے ان کی صلاحیتوں پر زیادہ اعتبار ہے۔ ہم لوگ کسی معاملے میں انہیں اسی وقت شامل کرتے ہیں جب دیگ پک کر تیار ہو اور وہ جا کر دعوت اڑا لیں جبکہ یہاں یہ عالم ہے کہ ہمیں خود بھی اندازہ نہیں ہے کہ گڑبڑ کیا ہے اور کس چیز کی تلاش کرنی ہے؟ ہمارے آدمیوں کے تربیت یافتہ ذہنوں کی بات الگ ہے، وہ صحیح جگہ پر پہنچ گئے تو خود گڑبڑ کی بو سونگھ لیں گے۔ پھر مجھے ان میں سے کسی سے کرپشن کا بھی ڈر نہیں ہے۔ انہیں کچھ ملا تو وہ مجھ تک اطلاع ضرور پہنچائیں گے جبکہ پولیس والوں کا ریکارڈ تمہارے سامنے ہے۔ ان کا منہ بند کرنا کبھی بھی مجرموں کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوتا۔''

ذیشان جو کہہ رہا تھا، وہ سو فیصد نہ سہی لیکن پھر بھی بڑی حد تک صحیح تھا۔ راشی اور بے ایمان لوگوں کی اکثریت نے پولیس کے محکمے کا تاثر اتنا خراب کر دیا تھا کہ وہاں موجود مٹھی بھر ایمان دار افراد بھی انہی جیسے سمجھے جاتے تھے۔

''میں نے تو صرف تجاویز پیش کی ہیں۔ کس پر عمل کرنا ہے اور کس پر نہیں، اس کا اختیار کلی طور پر تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میرے اختلاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم اپنا کام مجھ سے بہتر جانتے ہو۔'' اس نے کھلے دل سے ذیشان کو جواب دیا۔

''نہیں بھئی، اب ایسا بھی نہیں ہے کہ تم کچھ جانتے ہی نہیں یا میں تم سے بہت زیادہ قابل ہوں۔ ہمیں باہمی افہام و تفہیم سے ہی مسائل کا حل نکالنا ہے۔ ایک بات جو تمہیں بہتر لگتی ہے، تم کہہ دیتے ہو اور جو مجھے مناسب لگتا ہے، وہ میں بتا دیتا ہوں۔ تمہیں خود سے کم تر سمجھنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میں کچھ خاص ہے جب ہی تو کرنل صاحب جیسے جہاندیدہ شخص نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ وہ ایسے شخص نہیں ہیں جو سی ایف پی کے فنڈز کو ضائع کرنے کا سوچ بھی سکیں۔ وہ تم پر کثیر سرمایہ کاری کر رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں تم پر بھروسا ہے اور وہ تم سے بہت سی امیدیں رکھتے ہیں۔ اس لیے میں تو خود بخود ہی تمہارے ''متاثرین'' میں شامل ہو گیا ہوں۔'' آخری جملہ اس نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا جسے سن کر شہریار بھی ہنس پڑا اور بولا۔

''اب میں جواب آں غزل کے طور پر تمہاری تعریف ہرگز نہیں کروں گا۔ ویسے بھی وقت ہو گیا ہے کہ میں اپنے انسٹرکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں ورنہ ان کا بھروسا نہیں کہ وہ مجھے نااہل قرار دے دیں اور میں خدا ملا، نہ وصالِ صنم ہوا کی تصویر بن جاؤں۔ مستقبل میں کمشنر وغیرہ بننے کا تو ویسے ہی اب کوئی امکان نہیں رہا، یہ نہ ہو کہ جو کرنل صاحب مجھے بنانا چاہ رہے ہیں، میں وہ بھی نہ بن سکوں۔''

''وہ تو خیر تمہیں بننا ہی پڑے گا۔ عمر فاروق صاحب وہ بندے ہیں جو کسی کام کو ہاتھ میں لے لیں تو مکمل کیے بغیر چھوڑتے نہیں ہیں۔ رہی تمہیں نااہل قرار دینے کی پریشانی تو یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ عمر فاروق صاحب نے تمہیں اپنی شاگردی میں قبول کر لیا ہے تو سمجھ لو کہ تمہیں اہلیت کا سرٹیفکیٹ ٹریننگ سے پہلے ہی مل چکا۔ نااہل بندے کو تو وہ ایک دن بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔'' ذیشان نے نہایت سچائی سے حقیقت بیان کی تو وہ طمانیت کے ساتھ ساتھ ذمے داری کا ایک کوہِ گراں اپنے شانوں پر محسوس کرتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

''یہ دیکھیں آفتاب! یہ ریڈ فراک کتنی خوب صورت ہے۔ امید ہے پہنے گی تو بہت پیاری لگے گی۔''

''فراک پہن کر پیاری لگے گی سے کیا مراد؟ میری بیٹی ویسے ہی بہت پیاری ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ اگر میری بیٹی نے یہ فراک پہن لی تو اس فراک کی شان بڑھ جائے گی۔''

''ہاں بھئی۔ آپ کی بیٹی کے کیا کہنے۔ آپ کی بیٹی جیسا دوسرا کوئی اس دنیا میں ہے ہی کہاں؟''

''نہیں خیر ایسی بھی بات نہیں ہے۔ اس جیسا ایک پیس اللہ میاں نے بہت سال پہلے اس کی ماں کی صورت میں اس دنیا میں اتارا تھا۔ مجھے تو آج بھی اپنی زندگی کا وہ دن نہیں بھولتا جب سرخ عروسی جوڑے میں ایک آسمانی تحفہ مجھے عطا کیا گیا تھا۔ تمہیں بھی تو یاد ہوگا نا وہ وقت.....؟'' اس چھوٹے سے سوال نے جواں سال عورت کے چہرے پر گلال بکھیر دیا۔

''بس یہی ادا تو ہے جو میری بیٹی کی ماں کو سب سے

ممتاز کردیتی ہے۔'' وہ بے ساختہ ہنسی کے ساتھ بولتا ہوا اسے ایک ٹک گھورتا رہا۔

''میرے خیال میں ہم شاپنگ کے لیے آئے ہیں اور اس قسم کی گفتگو کے لیے یہ جگہ قطعی ناموزوں ہے۔'' وہ اس کی نظروں سے پزل ہوئی۔

''یہ نیویارک ہے میری جان! یہاں گفتگو چھوڑ اگر میں اپنے جذبات کا عملی مظاہرہ بھی شروع کردوں تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔'' اس نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھایا۔

''آپ اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ کسی کو تو اعتراض ہوگا۔'' وہ سمجھ گئی تھی کہ سامنے والا اسے پزل کرنے کی کوشش کررہا ہے، یک دم ہی خود کو سنبھال کر بھرپور اعتماد سے بولی۔

''اچھا... کون ہے وہ جو اعتراض کرے گا؟''

''میں۔'' اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا تو فضا میں زوردار مردانہ قہقہہ گونج اٹھا جس میں نسوانی ہنسی کی مدھر جھنکار بھی شامل تھی۔ یوں ہنستے مسکراتے، ایک دوسرے سے گفتگو کرتے جوڑے کو قطعی احساس نہیں تھا کہ وہ نیویارک کے اس معروف شاپنگ سینٹر میں کسی کی نگاہوں کا خصوصی مرکز ہیں۔ وہ اپنی بچی کو گود میں اٹھائے ایک دوسرے کے ساتھ بے حد مگن اور خوش تھے۔

''اچھا یہ پنک ٹاپ اور ٹراؤزر دیکھیں۔ یہ تو امید پر بہت ہی اچھا لگے گا۔'' ایک ایک لباس کو تنقیدی نظروں سے جانچتی وہ ایک اور بے بی سوٹ پر رکی تو رائے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اپنی جگہ پتھر ہوگئی۔ وہ جس کی توقع نہیں کررہی تھی، وہ چہرہ سامنے تھا۔

''آپ....؟'' اس کے تھرتھراتے لب بس یہی ایک لفظ ادا کرسکے۔

''کیسی ہو کشور؟'' بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا گیا۔

''اچھی ہوں... اور آپ؟'' وہ بے حد نروس تھی اور سامنے کھڑے شخص کے عقب میں آفتاب کو تلاشنے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ اس سے بہت دور امید کو گود میں اٹھائے کھلونوں سے بھرے شوکیس کی طرف متوجہ تھا اور یقیناً بیٹی کے پاس کھلونوں کا ایک اچھا خاصا ڈھیر ہونے کے باوجود اسے کوئی نیا کھلونا دلانا چاہتا تھا۔ کشور کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ بے شک یہ نیویارک تھا جہاں قانون سے ہر شخص ڈرتا تھا لیکن پیرآباد کی جاگیر کا وارث اگر غیرت میں آکر اسے قتل کرنے پر تل جاتا تو یہ سب نہیں سوچتا۔ بہت دن پہلے جب اس نے آفتاب سے محبت اور خفیہ شادی کی تھی، پھر اس کی خاطر حویلی بھی چھوڑ دی تھی تو اس وقت اسے مرنا اتنا مشکل نہیں لگتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ خوشیوں بھری زندگی کے ان چند دنوں کے بدلے میں اگر موت کا سامنا کرنا پڑا تو بخوشی اس کی آغوش میں سما جائے گی لیکن اب جبکہ اپنی خوشیوں کی پائیداری پر یقین آنے لگا تھا اور لگتا تھا کہ وہ سب کی پہنچ سے بہت دور آگئی ہے تو اب اچانک پھر موت کو اپنے سامنے دیکھ کر حالت غیر ہونے لگی تھی۔ اتنی پیاری زندگی کو چھوڑ کر قبر کے اندھیروں میں سوجانے کے خوف سے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ سامنے والے سے اس کی حالت پوشیدہ نہیں رہی اور وہ نہایت رسان سے بولا۔

''ڈرو مت کشور! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں تو بس تمہیں دیکھ کر بے اختیار ہی ملاقات کے لیے چلا آیا۔ میں کافی دیر سے تم لوگوں کو دور سے دیکھ رہا تھا۔ تمہیں اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ خوش دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے ورنہ تو دل ڈرتا ہی تھا کہ جانے جس کے لیے تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا، وہ تمہیں خوش بھی رکھتا ہوگا یا نہیں۔''

''آفتاب بہت اچھے انسان ہیں بھاجی! اگر مجھے اباجی کے مان جانے کی ایک فیصد بھی امید ہوتی تو میں اس طرح سے کبھی حویلی سے قدم نہ نکالتی۔ آفتاب نے میری خاطر بڑی پریشانیاں اٹھائی ہیں۔ وہ تو اللہ کا کرم ہے اور ہمیں ملک سے باہر نکل آنے کا موقع مل گیا ورنہ اباجی تو ہماری جان کے درپے ہوگئے تھے۔ اگر ہم کچھ دن اور پاکستان میں ہی رہتے تو شاید اباجی مجھے اور آفتاب کو بچی سمیت ختم کروانے میں کامیاب ہوجاتے۔'' اس نے ضبط سے سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ مراد شاہ کے سامنے اپنی صفائی پیش کی۔

''میں جانتا ہوں۔ اباجی کا مزاج اور ہمارے خاندان میں رائج الٹی سیدھی رسموں سے میں جتنا الرجک ہوں، وہ مجھے ہی معلوم ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تمہارا قدم سخت ناپسندیدہ ہونے کے باوجود تمہارے حالات کے اعتبار سے ناگزیر تھا۔ لیکن یاد رکھو کہ تمہیں اپنی ساری زندگی نہایت احتیاط سے گزارنی ہوگی اس لیے کہ اباجی آج بھی تمہاری جان کے درپے ہیں۔ ان کے دل میں تمہارے لیے بھڑکتا نفرت کا الاؤ اس وقت تک سرد ہونے کے لیے تیار نہیں جب تک اس پر تمہارے خون کے چھینٹے نہ پڑیں۔ وہ اس سلسلے میں میری بھی کوئی بات سننے کو راضی نہیں ہوتے۔ ان کے خیال میں بے شرم فرنگیوں کی صحبت میں رہ کر میں خود بھی بے

غیرت ہوگیا ہوں۔ بہرحال، تم محتاط رہو... خصوصاً اس لیے بھی کہ اباجی آج کل نیویارک میں ہی ہیں۔ جس طرح آج تم میری نظروں میں آئی ہو، کل کو اتفاقاً ان سے بھی سامنا ہوسکتا ہے۔'' مراد شاہ نے بہن کو سمجھایا۔

''اباجی نیویارک میں ہیں... لیکن کیوں؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ کچھ عرصہ پہلے بھی یہاں آچکے ہیں اور ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے اتنے مختصر عرصے میں دوبارہ آپ کے پاس چکر لگایا ہو۔'' مراد شاہ کے نرم لہجے کی وجہ سے اس کی حالت سنبھل گئی تھی اس لیے ذہن بھی ٹھیک ٹھاک کام کرنے لگا اور اس نے برملا اپنی حیرت کا اظہار کرڈالا۔

''ہاں، اصل میں حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ تمہیں تو یقیناً معلوم نہیں ہوگا کہ اماں کا انتقال ہوگیا ہے اور بقول اباجی، اماں کے بعد ان کا حویلی میں دل نہیں لگ رہا اس لیے وہ گھبرا کر میرے پاس یہاں آگئے ہیں۔'' مراد شاہ نے اسے بتایا تو وہ پل بھر کے لیے چپ ہوگئی اور پھر آہستہ سے بولی۔

''وڈی ماں جی کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ اصل میں آفتاب کا کام ایسا ہے کہ وہ حالاتِ حاضرہ سے ہمیشہ باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پاکستان سے متعلق خبروں پر ان کی خصوصی توجہ رہتی ہے اس لیے انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ وڈی ماں جی کا اچانک ہی انتقال ہوگیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ اگر میں چاہوں تو اپنی بہنوں وغیرہ کو فون کرکے ان سے تعزیت کرسکتی ہوں لیکن میں نے خود ہی رابطہ نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے فون کرنے سے اباجی کو پتا چلے کہ میں نیویارک میں ہوں۔ ہم تو اتنے محتاط رہتے ہیں کہ اپنے دوستوں اور محسنوں سے بھی رابطے میں احتیاط ہی کرتے ہیں۔'' وہ کچھ شرمندہ سی تھی۔

''میں تمہاری مجبوری سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے۔ میں تو بس تمہیں تمہارے سوال کا جواب دے رہا تھا۔''

''اور میں آپ کا جواب سن کر حیران ہوں۔ اباجی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہیں کسی کے مرنے سے کوئی فرق پڑتا ہو۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، معاملہ کوئی اور ہے۔ شاید وہ اپنے کارخانے پر پڑنے والے چھاپے کی وجہ سے یہاں منہ چھپا کر بیٹھے ہیں۔ واپس جائیں گے تو قانون کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' اس کا لہجہ بتدریج تلخ ہوتا چلا گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوگیا کہ وہ نیویارک میں رہتے ہوئے بھی پاکستان سے متعلق معاملات پر بے خبر نہیں ہے۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میری اس سلسلے میں اباجی سے بات ہوئی تھی۔ میں نے ان سے اس خبر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ سب کچھ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا۔ کارخانہ وہ پہلے ہی کسی کو فروخت کرچکے تھے لیکن نئے مالک نے نہ تو اس کا نام تبدیل کیا اور نہ ہی ملازمین پر اس تبدیلی کو ظاہر کیا گیا اس لیے ان کا نام اس معاملے میں آگیا۔ میں نے اس بارے میں خود بھی معلوم کروایا تھا۔ اباجی کے اس بیان کی تصدیق ہوچکی ہے اور اب اس بندے کی جو کارخانے کا موجودہ مالک ہے، تلاش کی جارہی ہے لیکن وہ غائب ہے۔''

''اور یقیناً تاقیامت غائب ہی رہے گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ایسے کسی بندے کا وجود ہی نہیں ہے۔'' مراد شاہ کے عقب سے آواز ابھری تو اس نے مڑ کر بولنے والے کو دیکھا۔ آفتاب بچی کو گود میں لیے وہاں کھڑا تھا۔

''ماموں جان کو سلام کرو بیٹا۔'' خود مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے بچی کو بھی نصیحت کی لیکن بچی ابھی بہت چھوٹی تھی۔ باپ کی بات پر عمل کرنے کے بجائے ٹکرٹکر اپنے سامنے موجود اجنبی شخص کو گھورتی رہی۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ میرے بھاجی ہیں؟'' ادھر کشور بھی حیران تھی۔

''ان کی شکل چودھری صاحب سے بہت ملتی ہے۔ پھر تم مجھ سے ذکر بھی کرچکی تھیں کہ تمہارے بھاجی یہاں نیویارک میں ہی رہتے ہیں اس لیے میں انہیں تمہارے قریب کھڑا دیکھ کر سمجھ گیا کہ محترم کون ہیں۔ مداخلت اس لیے نہیں کی کہ چلو بہن بھائی پہلے اکیلے میں کھل کر ایک دوسرے سے حال احوال پوچھ لیں... لیکن آپ دونوں کی گفتگو کا سلسلہ تو دراز ہی ہوتا جارہا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ میں اپنی اور اپنی بیٹی کی موجودگی کا احساس دلا دوں۔ یہ نہ ہو کہ آپ ہمیں بھول کر بھائی صاحب کی محبت میں انہی کے ساتھ چل پڑیں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بہت خوش گوار لہجے میں یہ سب کہہ رہا تھا اس لیے مراد شاہ کو اس کی گفتگو پر طنز کا شائبہ نہ ہوا، ورنہ لہجے کی ذرا سی تبدیلی سے اس کے الفاظ کو دوسرے معنوں میں بھی دیکھا جاسکتا تھا۔

''خیر، یہ تو ممکن نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میری بہن آپ کے ساتھ کتنی خوش ہے۔ اسے اتنا خوش میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اور میں جانتا ہوں کہ کوئی بھی شخص اپنی اچھی بھلی خوشیوں بھری زندگی کو چھوڑنے کی حماقت نہیں کرسکتا۔'' مراد شاہ نے مسکرا کر اس کی بات کا

جواب دیا۔ اس کا تجزیہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ آف وائٹ اور براؤن کمبی نیشن کے لباس میں ملبوس بڑا سا دوپٹا اچھی طرح سر پر اوڑھے کھڑی کشور۔۔۔ جس نے لباس کے ہی ہم رنگ آویزے اور چوڑیاں پہن رکھی تھیں، اتنی نکھری ہوئی اور آسودہ محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی بھی شخص اس کی خوشیوں بھری زندگی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

''اٹس آ کمپلیمنٹ فار می۔ آئیں چلیں کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ یہاں اس طرح کھڑے کھڑے کب تک بات کرتے رہیں گے؟'' آفتاب کو ہی خیال آیا تو ان لوگوں کو بھی احساس ہوا کہ وہ بلاوجہ شاپنگ ایریا میں کھڑے گپیں ہانک رہے ہیں۔ احساس ہوتے ہی انہوں نے وہاں سے ایک ریستوران کا رخ کیا۔

''تمہاری بیٹی بہت پیاری ہے کشور! اسے دیکھ کر تمہارا بچپن یاد آ رہا ہے۔ نام کیا رکھا ہے تم نے اپنی بیٹی کا؟'' ریستوران میں پہنچ کر انہوں نے ایک میز سنبھالی تو مراد شاہ نے بچی کے رخساروں کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

''امید۔۔۔ ہم نے اپنی بیٹی کا نام بہت سوچ سمجھ کر امید رکھا ہے۔ اس وقت جب موت ہمارے تعاقب میں بھاگتی آ رہی تھی اور ہمیں لگتا تھا کہ ہم کسی بھی لمحے اس کے ہاتھوں زیر ہو جائیں گے، ہماری بیٹی ہمارے لیے زندگی کی امید بن کر آئی تھی۔ اس کے آنے سے خاص طور پر میں نے اپنے اندر ایک نیا حوصلہ محسوس کیا تھا اور اب بھی مجھے امید ہے کہ میری بیٹی کی تقدیر مجھ سے بہت اچھی ہوگی۔ یہ میری طرح اپنی زندگی کے بہت سے سال بے جا پابندیوں اور بندشوں میں گزارنے کے بجائے ایسے ماحول میں گزارے گی جہاں اسے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو نکھارنے اور بروئے کار لانے کے مواقع مل سکیں گے۔ مجھے امید ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد جب میں اپنی ''امید'' کو لے کر ابا جی کے سامنے کھڑی ہوں گی تو میری آنکھوں میں فخر ہوگا اور میں ان سے کہہ سکوں گی کہ میں نے اپنی بیٹی کو اس سے بہت اچھا ماحول اور تربیت دی ہے جو آپ نے اپنی بیٹیوں کو دی تھی۔ ابا جی کی کوئی بھی بیٹی مجھ سمیت میری بیٹی کے مقابلے کی نہیں ہوگی۔'' وہ گویا مستقبل کو کسی جادوئی آئینے میں دیکھ رہی تھی۔

''اللہ تمہاری ساری نیک امیدیں اور خواہشات پوری کرے۔'' مراد شاہ نے اسے ڈھیرے سے دعا دی۔ اس کے بعد بھی وہ لوگ کافی اور اسنیکس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دیگر بہت سی باتیں کرتے رہے۔ آفتاب کی دلچسپی کا تو اصل مرکز تھا ہی پاکستان اور وہ صرف مجبوری میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا اس لیے اس کی پاکستان کے بارے میں معلومات قابلِ رشک تھیں جبکہ مراد شاہ بھی آبائی وطن ہونے کے حوالے سے وہاں کے متعلق باخبر رہنے کی کوشش کرتا تھا، اس لیے وہ آپس میں گفتگو کرنے بیٹھے تھے۔ باہمی دلچسپی کے بہت سے موضوعات نکلتے ہی چلے گئے، البتہ آفتاب نے دوبارہ چودھری افتخار کے موضوع کو نہیں چھیڑا۔ وہ اس بات کو سمجھتا تھا کہ مراد شاہ لاکھ روشن خیال اور باپ کا مخالف سہی لیکن باپ کی برائی سننا اس کے لیے تکلیف دہ ہوگا۔

''تم لوگ میرا فون نمبر اور ایڈریس رکھ لو۔ فی الحال تو ابا جی یہاں ہیں اس لیے میں تمہیں اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دے سکتا البتہ فرصت ہو تو فون پر رابطہ رکھنا اور ابا جی کے واپس جانے کے بعد ملنے بھی آنا۔ شاہدہ کو بھی تم سے مل کر خوشی ہوگی۔'' ملاقات آخری مرحلے میں داخل ہونے لگی تو مراد شاہ نے ایک کارڈ آفتاب کی طرف بڑھایا۔ اس موقع پر کشور کا بھی دل چاہا کہ وہ بڑے بھائی کو اپنا فون نمبر اور پتا نوٹ کروا دے۔ اتنے عرصے بعد اس کے میکے سے ملنے والا وہ پہلا فرد تھا اور خوش قسمتی سے اس نے اسے لعنت ملامت کرنے کے بجائے اس کی مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اس لیے قدرتی طور پر وہ اس کی طرف اپنا جھکاؤ محسوس کر رہی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ آفتاب نے خاموشی سے مراد شاہ کا کارڈ لے کر رکھ لیا ہے اور جواب میں ایسی کوئی اخلاقیات نہیں دکھائی تو دل پر جبر کر کے خاموش بیٹھی رہی۔

''یہ میری طرف سے امید کے لیے رکھ لو۔ آج پہلی بار میں نے اسے دیکھا ہے لیکن یہ ملاقات اتنی اچانک ہے کہ رواج کے مطابق میرے پاس اپنی بھانجی کو دینے کے لیے کوئی تحفہ نہیں ہے۔ میری طرف سے یہ تحفہ تم لوگ خود لے لینا، البتہ اگلی ملاقات پر انشاء اللہ میں خالی ہاتھ اس سے نہیں ملوں گا۔'' ٹیبل سے اٹھنے سے قبل مراد شاہ نے اپنا پرس نکالا اور بغیر گنے بہت سے ڈالرز نکال کر کشور کی طرف بڑھا دیے۔ وہ لاکھ انکار کرتی رہی لیکن مراد شاہ کے آگے اس کی ایک نہیں چلی۔ آفتاب نے بھی بہن بھائی کے درمیان دخل انداز ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ مراد شاہ ان سے رخصت ہو کر گیا تو کشور کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''آپ نے تو ثابت کر دیا کہ شوہر بے چارہ چاہے بیوی کو خوش رکھنے کی کتنی بھی کوشش کر لے لیکن عورت کو اصل خوشی میکے والوں سے مل کر ہی ہوتی ہے۔'' آفتاب نے اس کے دمکتے چہرے کو دیکھ کر مسکراتی آنکھوں سے چھیڑا۔

''میکے کا مان کیا ہوتا ہے، یہ ایک شادی شدہ عورت ہی سمجھ سکتی ہے آفتاب! آپ نے مجھے جتنی خوشیاں دی ہیں، ان سے میں انکار کر ہی نہیں سکتی لیکن خونی رشتوں کی محبت تو انسان کے خمیر میں شامل ہوتی ہے۔ ہم عورتیں کسی مجبوری کے تحت اپنے ان رشتوں سے دور رہ تو لیتی ہیں لیکن وجود میں ایک خلا، ایک ادھورا پن سا رہتا ہے۔ آج بھائی جی سے مل کر میرے اندر کا وہ احساس ہلکا ہو گیا ہے۔'' کشور نے نہایت سچائی سے اعتراف کر لیا پھر ذرا شکایتی لہجے میں بولی۔ ''بھائی جی نے اتنی محبت سے آپ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی لیکن آپ نے نہ تو جواب میں انہیں ایسی کوئی دعوت دی نہ ہی اپنا فون نمبر اور پتا وغیرہ بتایا؟''

''سوری، مجھے احساس ہے کہ آپ کو میری یہ حرکت بری لگی لیکن میری بھی مجبوری تھی۔ بے شک فی الحال ہمیں لگتا ہے کہ ہم خطرے کی حد سے نکل آئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم کبھی بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ مراد شاہ ہم سے جتنی محبت اور خلوص سے ملے، اس نے مجھے بھی متاثر کیا ہے لیکن آپ جانتی ہیں کہ میں صحافی ہوں اور ایسے بے شمار قصوں سے واقف ہوں جہاں اپنوں نے ہی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ میں مانتا ہوں کہ میرے دل نے ننانوے فیصد مراد شاہ کو اچھا آدمی تسلیم کیا ہے لیکن ایک فیصد شک بہرحال مجھے ہے۔ کیا معلوم کب ان کا جاگیردار خون جوش میں آ جائے یا پھر ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے ابا جی کے مقابلے میں زیادہ عقل مند ہوں اور خوامخواہ بھڑکیں مار کر اور غصہ دکھا کر دشمن پر حملہ کرنے کے بجائے پیار سے اپنا مقصد پورا کر لینے کے قائل ہوں۔ اس لیے میں نے اپنی مکمل تسلی سے پہلے کسی قسم کا رسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔''

آفتاب کی دلیل میں وزن تھا اس لیے کشور نہ صرف یہ کہ کچھ کہہ نہ سکی بلکہ بجھ سی بھی گئی۔ بھائی سے ہونے والی ملاقات کی خوشی کو اس مہیب اندیشے نے مٹا دیا تھا کہ کیا معلوم واقعی وہ دشمن ہو کر دوست کے روپ میں ملا ہو۔

''اتنی اداس نہ ہوں۔ میں نے جو بھی خدشات بیان کیے، وہ بس ایک احتیاط تھی ورنہ جب تک امید ہمارے ساتھ ہے، ہمیں یہی سوچنا ہے کہ ایک نہ ایک دن حالات ہمارے حق میں بہتر ہو جائیں گے۔ اللہ نے اب تک ہماری مدد کی ہے، کیا آگے وہ ہماری اس امید کو پورا نہیں کرے گا؟ وہ بہت مہربان ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ اپنے رحم و کرم کے سائے میں ہی رکھے گا۔ بس اس کے لیے ہمیں اس کی نافرمانی سے بچنا ہوگا۔ باقی چھوٹی موٹی خطاؤں اور غلطیوں کے لیے ہم اس کی بخشش اور رحم کی امید لگا کر رکھیں گے۔'' آفتاب نے مایوسی میں گھرتے اس کے دل میں امید کا ایک دیا روشن کر دیا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے، بہت اداس لگ رہی ہو؟'' وہ ایک بہت روشن صبح تھی۔ زمین پر ہر سو پھیلی ہریالی اور کہیں کہیں سفید بادلوں سے سجے نیلے آسمان کو دیکھ کر کسی خوب صورت پینٹنگ کا گمان ہوتا تھا لیکن اس منظر کو بے جان پینٹنگ اس لیے قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کہ بار بار فضا میں اڑان بھرتے پرندوں کے غول منظر کو متحرک کر دیتے تھے۔ ماہ بانو اپنی قیام گاہ کی کھڑکی میں کھڑی کب سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ یہ آرلینڈو کی صبح تھی اور وہ شہریار کے دوست کے اچھے خاصے وسیع گھر کی انیکسی میں مقیم تھے۔ شہریار کے اس دوست کا نام مصطفیٰ خان تھا اور وہ خاصے طویل عرصے سے یہاں مقیم تھا۔ ماہ بانو اور اسلم کو یہاں بھیجتے ہوئے شہریار نے نہ صرف انہیں مصطفیٰ خان کا پتا دیا تھا بلکہ ساتھ ہی ایک خط بھی دیا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد مصطفیٰ خان نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور انہیں اپنے گھر کی انیکسی میں ٹھہرا دیا تھا۔ اگلے دو دن میں وہ ان کے لیے ایک سپر اسٹور میں ملازمت کا بھی بندوبست کر چکا تھا۔ ان دو دنوں کے دوران مصطفیٰ خان کی بیوی انہیں باقاعدگی سے کھانا بھجواتی رہی تھی۔ وہ ایک خوش شکل اور خوش مزاج عورت تھی جس نے ماہ بانو کو گھرداری شروع کرنے اور ملازمت کے ساتھ اسے منظم کرنے کے کئی مفید مشورے دیے تھے۔ اس کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ماہ بانو، اسلم کے ساتھ جا کر کئی ایسی اشیا خرید کر لے آئی تھی جنہیں کم وقت میں پکایا جا سکے۔ یہاں انہیں نامعلوم مدت کے لیے رہنا تھا اس لیے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مصطفیٰ خان اور اس کی بیوی بلقیس کو زیادہ زحمت نہیں دیں گے اور خود سے اپنی ذمے داریاں نبھانے کی کوشش کریں گے۔ اس کوشش کا آغاز انہوں نے اپنی ملازمت کے پہلے دن سے ہی کر دیا تھا اور آج ماہ بانو نے خود ہی ناشتا تیار کیا تھا۔ ہلکے پھلکے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنا چائے کا کپ لے کر انیکسی کی ایک کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کھڑکی سے بہت دور تک کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس منظر کو دیکھتے دیکھتے ہی وہ اداسی میں گھر گئی تھی اور اس کے پیچھے ہی وہاں آ کھڑے ہونے والے اسلم نے اس کی اداسی کو بھانپ کر اس سے سوال کیا تھا۔

''یہ ہریالی اور شفاف آسمان دیکھ کر مجھے پیر آباد کی یاد آ گئی ہے۔ میں فیصل آباد میں جس جگہ رہتی تھی، وہ بہت تنگ محلہ تھا۔ گھر سے باہر نکلو تو گندے پانی کی نالیوں اور کچرے

کے ڈھیر ہی دیکھنے کو ملتے تھے۔ میں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے گھر کے آنگن میں ایک کیاری بنا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ چھ سات گملے بھی تھے جنہیں دیکھ کر مجھے خوشی تو ہوتی تھی لیکن جب میں اس کا مقابلہ پیر آباد کی ہریالی سے کرتی تھی تو کچھ اداس ہو جاتی تھی۔ پیر آباد میں اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی موجودگی کے باوجود مجھے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن میں جب بھی وہاں جاتی تھی، وہاں کی ہریالی میں کھو جاتی تھی۔ اس وقت مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ میں وہاں سے اتنی دور امریکا کی ایک ریاست میں پہنچ جاؤں گی اور وہ جگہ پیر آباد سے کئی گنا زیادہ خوب صورت ہوگی۔ آبادی سے بس ذرا سے ہی فاصلے پر موجود اس جنگل نے مجھے پیر آباد سے متصل جنگل کی یاد دلا دی ہے۔ اس جنگل میں، میں نے اپنی زندگی کے جوشب و روز بتائے تھے، انہوں نے میری زندگی کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا۔ وہاں مجھے آپ ملے اور آپ کے ساتھ میں یہاں تک پہنچ گئی۔ نہ جانے اب کبھی مجھے اپنے وطن کی فضاؤں میں سانس لینا نصیب ہوگا بھی یا نہیں؟ میں اپنے پیاروں کی شکلیں دوبارہ دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے جس کی وجہ سے سامنے کا منظر دھندلا گیا تھا۔

''تمہاری اداسی بالکل درست ہے۔ ہم جن حالات میں وہاں سے نکلے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے تو یہی سوچا جا سکتا ہے کہ شاید اب ہمیں ساری زندگی اس دیارِ غیر میں ہی گزارنی ہوگی لیکن میرا وجدان کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ کبھی نہ کبھی حالات ایسی کروٹ ضرور لیں گے کہ ہم اپنے وطن واپس لوٹ سکیں گے۔'' اسلم نے اس کے شانوں پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں؟'' ماہ بانو کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ چمکی۔

''نہیں، اپنے دل کی بات بتا رہا ہوں۔'' اس نے فوراً ہی تردید کر دی۔

''دل کبھی کبھی خوش گمانی میں بھی تو مبتلا ہو جاتا ہے۔''

''میرے خیال میں تو دل کو ہمیشہ خوش گمانی میں ہی مبتلا رکھنا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ اچھا سوچو گے تو اچھا ہوگا۔'' وہ دونوں بہت سویرے جاگ گئے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد انہوں نے فوراً ہی ناشتا بھی کر لیا تھا اس لیے ملازمت پر جانے کے لیے ابھی ان کے پاس خاصا وقت تھا اور وہ مزے سے اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھے۔

''اچھا سوچنے کے ساتھ ساتھ انسان کو عمل کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ قدرت نے کتنی منصفی کے ساتھ ہمیں اور یہاں والوں کو نوازا ہے۔ قدرتی ماحول کے اعتبار سے اس جگہ اور پیر آباد میں کتنی مماثلت ہے۔ جنگل، ہریالی، بہتا پانی، انواع و اقسام کے چرند پرند... کیا ہے جو یہاں ہے اور وہاں نہیں ہے؟ لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں والوں نے اپنی ہر چیز کو سنبھالا اور سنوارا ہے جبکہ ہم نے صرف اور صرف اپنی چیزوں کو اجاڑا ہے۔ بلقیس باجی بتا رہی تھیں کہ یہاں جانوروں کے تحفظات کا اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ اگر ڈرائیو کے دوران کوئی جانور سڑک پر آ جائے تو ڈرائیور گاڑی روک کر پہلے اسے گزرنے کا موقع دیتا ہے۔ حکومت بھی اس معاملے میں بہت سخت ہے اور کسی جانور کو نقصان پہنچانے کی صورت میں بھاری جرمانہ عائد کر دیتی ہے۔ ادھر ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے؟ جو ذمے دار ہوتے ہیں نگہبان اور تحفظ کے، وہی لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ غیر قانونی شکار سے لے کر لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ تک ایسا کون سا کام ہے جو اربابِ اختیار کی زیرِ نگرانی نہیں ہوتا۔ تعمیر و ترقی سے تو گویا ہمارے اوپر مسلط لوگوں کو چڑ ہے۔ میں اس جگہ کو دیکھتے ہوئے پیر آباد کو سوچتی ہوں تو افسوس ہوتا ہے۔ یہاں سب کچھ کتنا منظم اور صاف ستھرا ہے اور ادھر پیر آباد کا یہ حال ہے کہ پرائمری اسکول اور مرکزِ صحت قائم کرنے کے لیے بھی شہریار صاحب کو باقاعدہ ایک جنگ لڑنی پڑی تھی۔ گاؤں تک پہنچنے والے راستے کو بھی انہوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے پختہ کروایا تھا۔ امید تھی کہ وہ چند سال اپنی سیٹ پر ٹِک گئے تو پیر آباد سمیت پورے ضلع کا نقشہ بدل دیں گے لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے کہ جانے کب وہ ہمت ہار بیٹھیں۔ آخر ان کا بھی گھر بار ہے۔ ان کے عزیز و اقارب اور بیگم سے کب تک برداشت ہوگا کہ وہ یوں اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے رہیں۔'' وہ بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔ یہ سب بولتے ہوئے اسے علم نہیں تھا کہ شہریار کی ازدواجی زندگی کا اختتام اسی روز ہو گیا تھا جس روز وہ اسلم کی دلہن بنی تھی۔ بعد کے حالات بھی اس کے علم میں نہیں تھے ورنہ سب کی طرح اس وقت اسے بھی یہی معلوم ہوتا کہ شہریار شدید زخمی ہو کر کومے کی حالت میں اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ شہریار نے اس پر اپنے حالات کو کھوجنے اور رابطہ کرنے پر پابندی ہی اس لیے عائد کی تھی کہ وہ کسی بُری خبر کو سن کر ڈسٹرب نہ ہو اور سکون سے اپنی نئی زندگی کی شروعات کر سکے۔

''تم نے جو کچھ کہا، وہ غلط نہیں ہے۔ تمہاری طرح میں بھی حالات گزیدہ ہوں۔ تمہاری ہی طرح میں نے بھی دربدری کا عذاب سہا ہے لیکن زندگی جس طرح مجھ پر مہربان ہوئی ہے، میں نے جان لیا ہے کہ گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی روشنی کی ایک کرن کہیں سے نمودار ہو کر سب کچھ بدل سکتی ہے۔ میں وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتا جب حالات کے جبر نے میرے ہاتھ سے قلم چھین کر بندوق تھما دی تھی۔ میں اپنے باپ کی خواہشات کو بھول کر ڈاکو بنا لوگوں کو لوٹتا پھر رہا تھا اور گمان تھا کہ اب مرتے دم تک یہی کام کرتا رہوں گا... لیکن پھر تم میری زندگی میں چلی آئیں۔ تمہاری وجہ سے میں نے برائی کی دلدل سے باہر نکلنے کی ہمت کی اور بعد میں شہریار صاحب نے سہارا دے کر اس قابل کر دیا کہ میں اپنے ارادے پر قائم رہ سکوں۔ یہ سب کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے شک ہمارے ملک میں بہت ظلم اور بے ایمانی ہے لیکن ان بُرے لوگوں کے درمیان شہریار صاحب جیسے چند اچھے لوگ بھی تو ہیں۔ اور جب تک ایسے لوگ موجود ہیں، ہم اپنے ملک کے مستقبل سے ناامید نہیں ہو سکتے۔ انشاء اللہ ایک وقت آئے گا جب ہمارے ملک کے حالات بدلیں گے۔ وہاں بھی تعمیر و ترقی ہوگی اور ظالموں اور بے ایمانوں کا احتساب ہوگا۔''

اسلم کے لہجے میں وہ اعتماد بول رہا تھا جو وقت نے اسے عطا کیا تھا۔ بہت سے مایوس کن دن گزارنے کے بعد زندگی نے اسے اپنا جو رخ دکھایا تھا، وہ اس کے لیے اتنا خوش گوار تھا کہ وہ ماضی کی ہر تلخی کو فراموش کر بیٹھا تھا۔

''چلیں بھئی، آپ جیتے میں ہاری کیونکہ ایک تو آپ کا زندگی کے بارے میں تجربہ مجھ سے زیادہ ہے، دوسرے اب ہمیں اسٹور کے لیے روانہ ہونے کی تیاری کرنی ہے۔ میں پہلے ہی دن تاخیر سے پہنچ کر وہاں اپنا تاثر خراب نہیں کرنا چاہتی۔ ویسے بھی ہم بحیثیت قوم اس معاملے میں خاصے بدنام ہیں اور میرے دل میں بے شک پاکستانیوں کے لیے بہت سے شکوے ہیں پھر بھی میں نہیں چاہتی کہ ایک پاکستانی ہو کر اپنے وطن کی بدنامی میں کوئی کردار ادا کروں۔'' ماہ بانو نے ہنس کر کہتے ہوئے خود ہی ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کی کوشش کی اور پھر، وہ دونوں ہی تیار ہونے کے لیے سامنے پھیلے خوب صورت منظر کو چھوڑ کر کھڑکی سے ہٹ گئے۔

☆☆☆

''آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا بولی جی...؟''

نہایت نرمی سے پوچھے گئے سوال پر زرق برق لباس، گہرے میک اَپ اور بھاری زیورات سے لدے وجود کے

چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔ پھر وہ اپنی بھاری آواز میں بولا یا شاید بولی۔ ”ابھی تو میں قدرت کے رنگ دیکھ رہی ہوں۔ میں ناکارہ وجود جسے تم لوگ کسی قابل نہیں سمجھتے اور جسے جسم سے سانسوں کا رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے کبھی بھری سڑک پر تمہاری تفریح کا سامان بننا پڑتا ہے تو کبھی گڑگڑا کر بھیک مانگنی پڑتی ہے، آج اس لائق کیسے ہوگئی کہ حکومت کی کسی خفیہ ایجنسی کو میری ضرورت پڑ گئی؟“

”دیکھیں بوبی جی! آپ لوگوں کے ساتھ ہمارے معاشرے کا جو رویہ ہے، اسے میں خود بھی قابلِ مذمت سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہر تعلیم یافتہ اور باشعور فرد میرا ہم خیال ہوگا... لیکن اس کے باوجود میں نہایت شرمندگی سے اعتراف کرتا ہوں کہ ..... آپ جو کہہ رہی ہیں وہ واقعی درست ہے۔“ سی ایف پی کا وہ نوجوان اہلکار خواجہ سراؤں کے اس پُراعتماد گرو کے سامنے بیٹھا خود کو خاصا چغد محسوس کر رہا تھا پھر بھی اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح اس کو اپنے حق میں ہموار کرسکے۔

”درست نہ ہوتا تو میں کہتی ہی کیوں؟“ لائٹر کی مدد سے سگریٹ سلگاتے ہوئے بوبی صاحبہ نے اپنی دائیں ٹانگ کو بائیں پر جمایا اور ایک زوردار کش لیتے ہوئے اچھے خاصے پُراعتماد بندے کا اعتماد متزلزل کرنے کی کوشش کی۔

”بے شک۔“ نوجوان اہلکار نے اس کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کی۔ وہ اس وقت ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لینے کے مقولے پر عمل پیرا تھا۔

”اصل میں بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں کو اس بات کا شعور ہی نہیں ہے کہ ایک شخص جو قدرت کی طرف سے کسی کمی بیشی کو لے کر دنیا میں آیا ہے، بالکل ناکارہ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بھی صلاحیتوں کا ایک خزانہ چھپا ہوتا ہے اور ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ اس خزانے کو دریافت کرکے اسے استعمال میں لایا جائے۔“ اس نے کھنکھارتے ہوئے ایک بار پھر اسے قائل کرنے کے لیے اپنی تمہید کا آغاز کیا۔

”اور تم آج یہ کام کرنے آئے ہو۔“ بوبی نے اس کی بات کاٹ کر طنز کیا۔

”نہیں، میں ایسا کچھ نہیں کر رہا۔ میں تو آپ سے صرف درخواست کر رہا ہوں کہ چاہے آپ سے یہاں کتنی بھی ناانصافیاں کی گئی ہوں، آپ کے حقوق کو پامال کیا گیا ہو لیکن آپ اس بات سے انکار تو نہیں کرسکتیں ناکہ یہ ملک آپ کا بھی ہے... اور آج جب اس ملک کو آپ کی ایک چھوٹی سی خدمت کی ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو انکار نہیں کرنا چاہیے، ورنہ آج اگر آپ مظلوموں میں شامل ہیں تو کل ظالموں میں شامل ہوں گی۔ میری بات نہ مان کر بحیثیت ایک انسان اور ایک پاکستانی آپ کو کبھی سکون نہیں ملے گا۔ آپ جب بھی کسی دھماکے، کسی تخریب کاری کے بارے میں سنیں گی تو آپ کو پچھتاوا ہوگا کہ کاش ان ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کے لیے آپ نے ہمارا ساتھ دیا ہوتا تو یقیناً کئی انسانی زندگیاں بچ جاتیں۔“ وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر اور سلجھے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ بوبی کے سخت چہرے پر اس کی بات سن کر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم بہت چالاک ہو لڑکے۔“

”وہ تو ہوں۔ اگر نہ ہوتا تو میرا محکمہ اس کام کے لیے میرا انتخاب کیوں کرتا۔“ پہلی بار نوجوان کے چہرے پر بھی شوخ مسکراہٹ جگمگائی۔

”تو چلو پھر ایک بار اور بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ بوبی نے شاہانہ انداز میں اس سے پوچھا۔

”میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق خواجہ سراؤں کے مختلف گروہوں میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو شدت پسند ہندو خواجہ سراؤں پر مشتمل ہے۔ سابق ڈی آئی جی سجاد رانا صاحب کی نوعمر بیٹی اس گروہ کے ہاتھ لگ کر اپنی جان سے چلی گئی تھی۔ انہوں نے اپنی کسی ظالمانہ رسم کی ادائیگی کے لیے اسے ایک دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ پولیس اپنی کوشش کے باوجود اس گروہ تک اس لیے نہیں پہنچ سکی کہ اس واقعے میں ملوث جن خواجہ سراؤں کے نام سامنے آئے، ان سب کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ بعد میں ڈی آئی جی سجاد رانا بھی ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بن گئے اور ان کے بعد اس کیس کی تحقیقات میں وہ تیزی نہ رہی جو ہونی چاہیے تھی۔ شاید پولیس خود بھی ایک طرح سے مجبور ہی ہے کہ ابھی ایک واقعے سے نمٹ نہیں پاتی کہ دوبارہ پھر کہیں اسی نوعیت کا یا اس سے بھی بڑا سانحہ پیش آجاتا ہے۔ بہرحال، اس کیس میں جو سب سے اہم بات سامنے آئی تھی، وہ یہ تھی کہ انتہا پسند خواجہ سراؤں کے اس گروہ کے رابطے را جیسی بدنام بھارتی ایجنسی سے بھی ہیں اور یہ بات ہر محبِ وطن پاکستانی سمجھ سکتا ہے کہ اگر کسی جگہ را کام کر رہی ہے تو اس کا مطلب ہے وہاں پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچانے کی کارروائیاں بھی ضرور کی جارہی ہیں۔

”ایک پاکستانی اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض بنتا ہے کہ ان ملک دشمن عناصر سے نمٹنے میں

ہماری مدد کریں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کی اس مدد کو ذاتی طور پر آپ کا احسان بھی تسلیم کرلوں گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں اگر کوئی بھی شخص پاکستان کی خاطر کوئی کام کرتا ہے یا قربانی دیتا ہے تو یہ اس کا اپنے وطن پر احسان نہیں بلکہ ایک فرض اور ضرورت ہے۔ میرا یہ بھی ماننا ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کے حقوق نہ بھی مل رہے ہوں، تب بھی اس پر سے اپنے وطن کی سلامتی اور حفاظت کی ذمے داری ختم نہیں ہوجاتی... کیونکہ وطن سلامت رہے گا، تب ہی تو وہ یہ امید کر سکے گا کہ کبھی نہ کبھی اسے اس کا حق مل جائے گا۔“

”تم یہ بات کرسکتے ہو لڑکے کیونکہ تم نے زندگی میں کبھی محرومیوں کو نہیں دیکھا ہوگا۔“ بہت غور سے اس کی بات سنتا بوبی نامی وہ خواجہ سرا اس کے آخری جملوں پر بدمزہ ہو کر بولا۔

”آپ نے بالکل صحیح کہا کہ میں یہ بات کہہ سکتا ہوں لیکن اس لیے نہیں کہ میں نے زندگی میں کبھی محرومیوں کو نہیں دیکھا بلکہ اس لیے کہ بہت سی محرومیوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود میرا جذبۂ حب الوطنی زندہ ہے۔ میرے والد پاکستانی آرمی میں تھے۔ میں جب صرف چار سال کا تھا تو انہیں سیاچن کے محاذ پر بھیج دیا گیا اور پھر وہ کبھی وہاں سے واپس نہ آسکے۔ قاتل پہاڑ پر چلائی جانے والی دشمن کی ایک گولی نے انہیں شہید، میری ماں کو بیوہ اور مجھے یتیم کردیا۔ آپ نے شاید یہ تو سنا ہو کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں لیکن آپ نے کبھی ان کے پیچھے جیتے جی مرجانے والوں کو نہ دیکھا ہوگا۔ میرا باپ کوئی لاوارث شخص نہیں تھا لیکن اس کے بعد میں لاوارث ہوگیا۔ میرے چچاؤں نے بجائے مجھ یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے کے میرے والد کے حصے کی زمین بھی ہتھیالی اور میری ماں کو مجھ سمیت دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ ایک جوان بیوہ عورت کے لیے تنہا زندگی کی جنگ لڑنا ہمارے معاشرے میں کتنا مشکل ہے، یہ ہر شخص جانتا ہے۔ میری ستم رسیدہ ماں نے رزقِ حلال کے حصول کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ مجھے کتنی مشکلوں سے پالا ہوگا۔ اپنی ماں کی قلیل آمدنی کی وجہ سے میں ہمیشہ موسم کے پھلوں، اچھے کپڑوں، جوتوں اور بے شمار خواہشات کے لیے ترستا رہا لیکن پھر بھی اس وطن سے نفرت نہ کرسکا جس کی حفاظت کی خاطر مجھ سے میرا باپ چھن گیا تھا۔ میری بہادر ماں نے مجھے محرومیوں سے لڑ کر جینا سکھایا اور ساتھ ہی میرے دل میں جذبۂ حب الوطنی کی آبیاری کرتی رہی۔ وہ اتنی حوصلہ مند تھی کہ اس وطن کے دفاع پر اپنا سہاگ قربان کر دینے کے باوجود اپنے اکلوتے بیٹے کو فوج میں بھیجنا چاہتی تھی لیکن بدقسمتی سے ہر طرح کی اہلیت اور بہت سا جذبہ رکھنے کے باوجود میں اپنی ماں کی یہ خواہش اس لیے پوری نہیں کرسکا کہ میرا قد مطلوبہ معیار سے صرف آدھا انچ کم تھا۔ میں بہت رویا، بہت گڑگڑایا لیکن پھر بھی پاکستان آرمی میں شمولیت کا حق دار نہ ٹھہر سکا لیکن پھر زندگی میں پہلی بار تقدیر کو مجھ پر رحم آگیا۔ جانے کیسے میں ایک خفیہ ایجنسی کے ذمے داروں کی نظر میں آگیا اور انہوں نے ضروری تربیت کے بعد مجھے اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ میری بدقسمتی دیکھیں کہ میری ماں کو میری یہ کامیابی دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا اور وہ کینسر کے موذی مرض سے لڑتے لڑتے آخرکار موت کی گود میں جاسوئی۔ آج میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ کوئی رشتہ، کوئی محبت میرے ساتھ نہیں ہے لیکن پھر بھی میں کسی کو اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے لیے مجرم نہیں ٹھہراتا اور صرف اکیس سال کی عمر میں اس بات کے لیے تیار ہوں کہ اگر دفاعِ وطن کی خاطر میری جان جاتی ہے تو چلی جائے۔“ بہت تسلسل سے بولتا وہ یک دم خاموش ہوا تو دیکھا کہ بوبی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں۔

”تم نے میرا دل جیت لیا لڑکے۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں یہ جملہ کہا پھر بولی۔

”جو چاہتے ہو بتاؤ، میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”مجھے ہندو خواجہ سراؤں کے اس گروہ تک رسائی حاصل کرنی ہے۔ آپ بس مجھے ان تک پہنچادیں۔“

”میں اس کام میں تمہاری پوری مدد کروں گی۔ اس کے علاوہ اور کوئی خدمت چاہیے تو بتاؤ؟“ بوبی نے جواب دیا۔

”بس اتنا ہی کافی ہے۔“ سی ایف پی کا اہلکار جاوید علی مسکرا کر بولا۔ بوبی پر کی گئی اپنی محنت کو رنگ لاتا دیکھ کر وہ بہت خوش تھا۔

☆☆☆

رنگ، روشنی، خوشبو، قہقہے، خمار، مستی اور جانے مزید کیا کیا تھا جو اس محفل کا حصہ تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ یہ ایک صوبائی وزیر کے بیٹے کی تقریبِ ولیمہ تھی۔ وزیر موصوف نے.....

......شراب، شباب اور کباب جیسے سارے تعیشات اس محفل میں جمع کرنے کے ساتھ ساتھ ہر قابلِ ذکر آدمی کو مدعو کر رکھا تھا۔ وزیراعظم سے لے کر ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اہم افراد اس محفل میں شریک تھے اور ظاہر ہے

اسی حساب سے سیکیورٹی بھی درکار تھی۔ حکومتی محکموں پر اچھا خاصا اختیار رکھنے کے باوجود اس خاص موقع پر سرکاری آدمیوں کے علاوہ پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈز کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ یقیناً وہ خود بھی سرکاری محکموں کی ناقص کارکردگی سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے اس موقع پر کوئی رسک لینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اور اس وقت وہاں سی ایف پی کے جوان اپنی مخصوص یونیفارم کے علاوہ سادہ لباس میں بھی ادھر اُدھر بکھرے اپنا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ موقع کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ذیشان خود بھی وہاں موجود تھا اور ایک ایک شے کو اپنی نظر میں رکھے ہوئے تھا، چنانچہ وہ شعلۂ جوالہ جلد ہی اس کی نظروں میں آگئی جو تتلی بنی پوری محفل میں منڈلاتی پھر رہی تھی۔ اس نے نہایت مہین کپڑے کا سیاہ فراک نما لباس زیب تن کر رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں سے ذرا نیچے جا کر ختم ہو گیا تھا اور اس کے بعد اس کی سفید سڈول پنڈلیاں تھیں جو ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن رہی تھیں۔ توجہ کا مرکز بننے کے لیے اس نے اور بھی بہت اہتمام کر رکھا تھا۔ آستینوں کے تکلف سے آزاد اس کی گوری بانہوں میں ایسی کشش تھی کہ ہر کس و ناکس کو ہم آغوشی کی دعوت دیتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کانوں میں موجود بڑے بڑے دلکش آویزے جب اس کی کسی جنبش کے نتیجے میں اس کے عریاں شانے کو پل بھر کو چومتے تو دیکھنے والی آنکھوں کو خود بخود ہی ان بے جان موتیوں سے بنے آویزوں پر رشک آنے لگتا۔ لیکن پھر فوراً ہی وہ اس کے گلے میں پڑے نازک سے نیکلس کے اس موتی کی خوش بختی پر اش اش کرنے لگتے جو اس مقام تک رسائی حاصل کر رہا تھا جہاں سیاہ مہین لباس کے پردے نے صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں کی تفسیر بن کر آتشِ شوق کو بھڑکانے کا خوب انتظام کر رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ قدرت نے اگر اسے بے حساب حسن کی دولت سے نوازا ہے تو وہ اس حسن کی نمائش کا سلیقہ بھی خوب رکھتی ہے۔ یاقوتی ہونٹوں کی دلکش مسکراہٹ، ابروؤں کا چڑھانا، آنکھوں کی رنگین پتلیوں کو اِدھر سے اُدھر گھمانا اور لہروں کی شکل میں کٹے بالوں کو جھٹکنا... سب کچھ اتنے ردھم میں تھا کہ کہیں کسی ادا پر بازاری پن کا گمان نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن وہ کوئی شریف زادی بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ شریف زادیوں کو کہاں ایک ساتھ اتنے گروں پر کمال حاصل ہوتا ہے۔ یقینی طور پر وہ کوئی بہت ہائی لیول کی کال گرل تھی جو عام بازاری عورتوں اور شریف زادیوں کا حسین امتزاج بنی بے حساب دلوں کو لبھا رہی تھی۔

یہ بھی طے تھا کہ وہ بازار میں رکھی کسی عام جنس کی طرح ہر ایک کے لیے برائے فروخت نہیں ہوگی۔ نہ ہی نوٹوں سے بھرا پرس جیب میں رکھنے والا ہر شخص اسے خرید سکتا ہوگا۔ وہ ایسی انوکھی شے تھی جسے منتخب کرنے والے گاہک تو بہت سے ہو سکتے تھے لیکن خود کو خوش نصیب وہی گردانتا جس کے ہاتھ بکنے کو وہ خود راضی ہوتی۔ اس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے ذیشان کی نظر اس پر گئی تھی۔

سی ایف پی کے اہلکار سیکیورٹی گارڈز کے بہروپ میں جس قسم کے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے، وہ انہی میں سے محسوس ہو رہی تھی۔ عورتوں کے ناز و ادا اور چلتّروں کی کارستانیوں کی تو تاریخ گواہ تھی۔ عورت کے پیچھے جانیں بھی لٹائی گئی تھیں، جنگیں بھی لڑی گئی تھیں، مال و اسباب بھی داؤ پر لگائے گئے تھے اور بڑی بڑی یادگاریں بھی تعمیر ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے سورماؤں کے دلوں پر راج کرنے والی وہ عورتیں کچھ ایسی ہی خوبیوں کی مالک ہوتی ہوں گی جیسی اس وقت ایک خوش رنگ تتلی کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی پھر رہی تھی۔ ایسی عورت تو بڑے بڑے زاہدوں کے قدم ڈگمگا سکتی تھی پھر یہاں اس محل میں جہاں ایک سے بڑھ کر ایک عیاش گھوم رہا تھا، اس کا داؤ کیسے نہ چلتا۔ یہاں تو وہ جس کی طرف اشارہ کر دیتی، وہ اس کا بندۂ بے دام بن کر سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتا، چاہے اس سب کچھ میں ملکی سلامتی و امن بھی شامل ہوتا۔

سیکیورٹی کے انتظامات پر نظر رکھنے کے بہانے وہ اس قتالہ سے مل بیٹھنے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ آخر اسے یہ موقع اس وقت مل گیا جب وہ اسے تقریب کے میزبان وزیر اور آئی جی مختار مراد کے ساتھ کھڑی دکھائی دی۔ وہ خود بھی مسکراتا ہوا اس تکون کی طرف بڑھ گیا۔ میزبان وزیر نے اسے جوابی مسکراہٹ سے نوازا۔ ممکن تھا کہ اس مسکراہٹ کے بعد وہ اسے نظر انداز کر دیتا لیکن ذیشان کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتا ہوا ان تینوں کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

"آپ ہماری کارکردگی سے مطمئن ہیں نا سر... کہیں کوئی کمی تو نظر نہیں آرہی؟" اس نے وزیر موصوف سے دریافت کیا۔

"نہیں بھئی، آپ لوگوں نے تو سیکیورٹی کا صحیح معنوں میں فول پروف انتظام کیا ہے۔ میں دوسروں سے بھی سفارش کروں گا کہ اہم موقعوں پر آپ کی سیکیورٹی ایجنسی سے رابطہ کریں۔" وزیر صاحب نے خوش مزاجی سے کہا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں مختار صاحب! آپ کے محکمے کے ہوتے ہوئے یہ ایک غیر سرکاری ادارے کے گن گا رہے ہیں۔" اس سے قبل کہ ذیشان تعریف کے بدلے میں شکریہ ادا کرتا، اس حسینہ نے چڑانے والے انداز میں مختار مراد کو پن کیا۔

"شرارت نہیں موہنی! مختار صاحب ہمارے دوست ہیں۔ ہمیں ان کے محکمے سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن ان کے لوگوں پر کام کا بوجھ اتنا ہے کہ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان پر مزید بوجھ ڈالا جائے۔" وزیر صاحب نے جہاں اسے بہت پیار سے ٹوکا، وہیں مختار مراد کی دل جوئی میں ایک بہانہ گھڑ دیا۔

"یہ اچھی بات ہے کہ محکموں کے درمیان اختلاف کا شور سنتے ہمارے کان اس وقت باہمی اتفاق اور خیال داری پر مبنی کوئی جملہ سن رہے ہیں۔ مختار صاحب کو اس وقت اطمینان محسوس ہو رہا ہوگا کہ کوئی تو ہے جو ان کے محکمے کی مجبوریوں کو سمجھتا ہے اور ان کے جوانوں سے ہمدردی رکھتا ہے۔" اپنے وہاں کھڑے رہنے کا جواز بنائے رکھنے کے لیے اس نے گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ من موہنی صورت رکھنے والی موہنی اسے دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

"آپ کی تعریف...؟"

"مجھے ذیشان کہتے ہیں۔ پہلے آرمی میں ہوا کرتا تھا لیکن وہاں کی لگی بندھی زندگی سے طبیعت اوب گئی تو ملازمت چھوڑ کر ایک سیکیورٹی ایجنسی کو جوائن کر لیا۔ آج کل وہیں کام کر رہا ہوں اور اسی ملازمت کی بدولت آج ایک ایسی محفل میں شامل ہوں جہاں من موہنے چہروں کا راج ہے۔" اس نے ذومعنی انداز سے موہنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ جواباً وہ اتنی دلکشی سے مسکرائی کہ ہونٹوں کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں اور چہرے کا ایک ایک نقش مسکرانے لگا۔

"دیکھیں ذیشان صاحب! بات یہ ہے کہ رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ پولیس کی کارکردگی پر لگا سوالیہ نشان یونہی نہیں ہے۔ مختار صاحب کو برا نہ لگے تو میں نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہی کہوں گی کہ جس محکمے کا ایک اعلیٰ افسر اپنے داماد اور نواسی کے قاتلوں تک آج تک نہ پہنچ سکا، وہ محکمہ دوسروں کے لیے کیا کر سکے گا؟ چلیں اس قصے کو جانے دیں۔ یہ ماضی کا حصہ ہوا لیکن ابھی حال ہی میں ان کے ایک عزیز شہریار عادل صاحب کو ایک ٹرک ڈرائیور ہٹ کر کے فرار ہو گیا اور یہ ابھی تک اس معمولی ٹرک ڈرائیور کو گرفتار نہیں کر سکے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی مختار صاحب! کیا اس مفرور ڈرائیور کے بارے میں کوئی سن گن ملی ہے آپ کے محکمے کو؟"

وہ بڑے کٹیلے لہجے میں پوچھ رہی تھی اور ذیشان نہایت غور سے اس کے اور مختار مراد کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ مختار مراد کی سرخ پڑتی رنگت سے ظاہر تھا کہ وہ بے پناہ ضبط سے کام لے رہے ہیں جبکہ موہنی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ انہیں اکسا کر ان سے کچھ اگلوانے کی خواہش مند ہو۔ مشکوک وہ اسے پہلے ہی لگی تھی، اس انداز پر وہ مزید چونک گیا۔

"ہمارا محکمہ اپنا کام کر رہا ہے۔ بہت جلد ہم مفرور ڈرائیور کو گرفتار کر کے منظر پر لے آئیں گے اور آپ سمیت بہت سوں کی تسلی ہو جائے گی۔ لیکن مس موہنی! میں آپ کو بتا دوں کہ اس ٹرک ڈرائیور کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر بھی اس نقصان کا ازالہ نہیں ہو سکے گا جو ہمیں شہریار کو کھو کر ہوا ہے۔ وہ ایک نہایت ذہین شخص تھا جسے کومے کی حالت میں پڑا دیکھ کر مجھ سمیت ہمارے خاندان کے ہر فرد کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اسے اس حالت میں پہنچانے والے کو انجام تک پہنچانے کی خواہش جس شدت سے میرے دل میں ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں... لیکن پولیس کے محکمے کے پاس کوئی الہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ چٹکی بجاتے ہی ہر کام ہو جائے۔ ہم اپنی بہترین کوشش کر رہے ہیں، نتیجہ بھی انشاء اللہ جلد سامنے آجائے گا۔"

مختار مراد کے جواب اور فطری اداکاری نے ذیشان کا دل خوش کر دیا۔ وہ اسے اس کی اصل حیثیت میں نہیں جانتے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ان چند گنے چنے لوگوں میں شامل ہیں جنہیں اس بات کا علم تھا کہ اسپتال کے کمرے میں بستر پر پڑا شخص شہریار عادل نہیں ہے۔ شہریار عادل کسی بڑے مقصد کے لیے منظر سے غائب ہو گیا ہے۔ اس پر بھی ان کا انداز بالکل حقیقی تھا اور وہ ایک طرح دار حسینہ کو بھی اپنے مقابل پا کر ذرا غفلت کا شکار نہیں ہوئے تھے۔

"ایکسکیوز می! مجھے کچھ اور لوگوں سے بھی ملنا ہے۔"

وہ مزید ٹھہرے بغیر وہاں سے ہٹ گئے۔

"تم بھی کبھی کبھی حد کر دیتی ہو موہنی! میں نے تمہیں اپنا پی آر او اس لیے تو نہیں بنایا کہ تم لوگوں سے میرے تعلقات بہتر بنانے کے بجائے انہیں ختم کر دو۔ اب تمہاری وجہ سے مجھے مختار صاحب سے معذرت کرنی پڑے گی۔" صورت حال پر ہکا بکا وزیر نے اپنی پبلک ریلیشنگ آفیسر سے شکوہ کیا اور پھر خود بھی مختار مراد کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ موہنی کھڑی اسی مطمئن انداز میں مسکراتی رہی۔

"نائس... میں پہلی بار حسن اور جرأت مندی کو یکجا

دیکھ رہا ہوں۔ آئی جی پولیس کے منہ پر ایسی بات کہنے کی جرأت تو سچ کے علم بردار نیوز اینکرز بھی بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہوں گے۔" ذیشان نے اسے سراہا۔

"لیکن میں کہہ دیتی ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میری بات کا لوگ مشکل ہی سے بُرا مانتے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے ایک ادا سے بالوں کو جھٹکا اور قریب سے گزرتے ویٹر کو اشارہ کیا۔ ویٹر فوراً ہی ٹرالی لیے نزدیک چلا آیا۔ ٹرالی میں انواع واقسام کی شرابوں کے ساتھ ساتھ سوفٹ ڈرنکس کی بھی بڑی مقدار موجود تھی۔ موہنی نے اپنے لیے ایک سنہری سیال سے بھرا جام منتخب کیا جبکہ ذیشان کا انتخاب اورنج جوس تھا۔

"ڈرنک نہیں کرتے آپ؟" اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"جہاں مدہوش کرنے کا پہلے ہی اتنا سامان ہو، وہاں مزید پینا بیکار ہے۔" اس نے ذومعنی لہجے میں جواب دیا تو وہ مسکرادی۔ یہ مسکراہٹ بتارہی تھی کہ وہ حسین کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہے اور اس کا اشارہ سمجھ چکی ہے۔

"ڈرتے ہیں؟"

"ڈرنا بھی چاہیے۔ میں غافل ہوگیا تو بہت سوں کی زندگیاں داؤ پر لگ جائیں گی۔" اس کا جواب اب بھی ذومعنی ہی تھا لیکن موہنی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ اسے ایک سیکیورٹی ایجنسی کے ذمے دار کا بیان ہی سمجھی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ سی ایف پی اصل میں کیا بلا ہے۔

"ٹھیک ہے تو پھر آپ سوفٹ ڈرنک پی کر ہوش میں رہتے ہوئے اپنی ڈیوٹی انجام دیں۔ ہم ان کے پاس جاتے ہیں جو مدہوش ہوکر ہی خوشی محسوس کرتے ہیں۔" وہ اٹھلا کر کہتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔

"کوئی نشانی اور پتا تو دیتی جائیں کہ کبھی ہمیں مدہوش ہونے کی فرصت ہو تو آپ سے رابطہ کرسکیں۔" ذیشان نے اسے پکارا۔

"جانے دیں کیونکہ ہم خود بڑے مصروف لوگ ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کو فرصت ملے تو ہم خود مصروف ہوں۔" وہ اسے طرح دے گئی۔ ظاہر ہے اس کے معیار پر کسی سیکیورٹی ایجنسی کا ملازم کیونکر پورا اتر سکتا تھا۔ وہ جو چند لمحے اس کے ساتھ گزار گئی تھی تو وہ بھی شاید اس لیے کہ شاندار تیاری کے ساتھ ذیشان اس وقت جتنا پُرکشش لگ رہا تھا، صنفِ مخالف کے لیے اسے نظرانداز کردینا آسان نہیں تھا۔

"ابھی بلیک ڈریس والی جس عورت کے ساتھ میں کھڑا تھا، اس پر نظر رکھنی ہے۔ فنکشن ختم ہونے کے بعد بھی تاحکمِ ثانی اس کی نگرانی کرتے رہنا ہے۔ رپورٹ ڈائریکٹ مجھے دینا۔" موہنی کے ہٹتے ہی وہ ٹہلنے کے انداز میں اپنے ایک اہلکار کے قریب پہنچا اور اسے یہ حکم دے کر پلٹ گیا۔

☆☆☆

"میں تمہیں جس گرو سے ملانے لے جارہی ہوں، اس کا نام شالنی ہے۔ ذرا تنک چڑھی اور نخریلی ہے اور مشکل سے ہی کسی کو منہ لگاتی ہے لیکن میرا لحاظ کرتی ہے کیونکہ میں کوئی معمولی خواجہ سرا نہیں ہوں۔ سارے لاہور کے خواجہ سرا مجھے جانتے اور میری عزت کرتے ہیں۔ اگر شالنی یا اس جیسی کوئی دوسری میرے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئے تو میرے سارے چاہنے والے مل کر اس کا جینا دوبھر کردیں گے۔" بوبی اپنے چہرے پر جلدی جلدی پاؤڈر کا پف مارتے ہوئے سی ایف پی کے نوجوان اہلکار جاوید علی کی معلومات میں اضافہ کررہی تھی۔ جاوید علی جانتا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی۔

بوبی نے خواجہ سراؤں کے حقوق کی آواز اٹھانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ مسلسل لوگوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ خواجہ سرا بھی عام انسانوں جیسے احساسات اور جذبات رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں جنہیں قدرت کی طرف سے دی گئی ایک کمی کی وجہ سے خود کو تماشا بنا کر جینے میں خوشی نہیں ملتی۔ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں عام لوگوں کی طرح پڑھنے لکھنے، رہنے سہنے اور ملازمتیں کرنے کا حق ملے۔ اس نے خواجہ سراؤں کو اچھوتوں کی طرح معاشرے سے کاٹ کر رکھ دینے کے عمل کی شدید مذمت کی تھی اور لوگوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ محرومی کا شکار یہ انسان پہلے ہی کتنے دکھی ہیں، اس لیے انہیں مزید اپنے رویوں سے دکھ دینے سے گریز کریں۔

اس کی ان کوششوں کو خواجہ سراؤں کے حلقے کے علاوہ عام باشعور افراد کی طرف سے بھی سراہا جارہا تھا اور اس کی کوششوں کا اتنا نتیجہ تو سامنے آیا تھا کہ میڈیا کی آواز اس کی آواز کے ساتھ شامل ہوگئی تھی۔ بوبی کو امید تھی کہ اس کی زندگی میں نہ سہی، آنے والے وقت میں ہی لوگ اتنے باشعور ہوجائیں گے کہ ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرسکیں گے۔ جاوید علی نے اس کی رہائش گاہ پر مختصر قیام کے عرصے میں ہی اسے بہت قریب سے جان لیا تھا۔ بطور انسان بوبی کی اچھائی اور نیک دلی سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ بہت ہمدرد فطرت کی مالک تھی اور اپنے دکھوں کو بھلا کر ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی۔ اس نے جاوید علی کو اپنی دردبھری داستان بھی سنائی تھی۔ وہ اپنے والدین کی پہلوٹی کی اولاد تھی۔ اس کا

جاگیردار باپ اس کی دنیا میں آمد سے قبل بہت خوش تھا کہ اس کی جاگیر کا وارث آنے والا ہے۔ جب اس کے دنیا میں آنے کا وقت ہوا تو جہاں زچگی کے لیے دستیاب ماہر دائیوں کو حویلی میں جمع کرلیا گیا، وہیں ڈومنیاں وغیرہ بھی پہلے سے حویلی کے آنگن میں آبیٹھیں اور مبارک سلامت کے گیت گانے لگیں۔ انہیں یقین تھا کہ وارث کی پیدائش کے بعد وہ اپنی جھولیاں بھر کر حویلی سے روانہ ہوں گی۔ آثار بھی یہی بتا رہے تھے۔ بچہ ابھی دنیا میں آیا نہیں تھا اور اپنی ماں کو دردِزہ سے تڑپا رہا تھا لیکن حویلی کے باہر مبارک بادی کے لیے آنے والے مہمانوں کی ضیافت اور عام لنگر کے لیے دیگیں چڑھ گئی تھیں۔ حلوائی کو بھی تازہ مٹھائیاں بنانے کا حکم جاری کردیا گیا تھا اور جاگیردار صاحب شام کو حویلی میں دیسی گھی کے چراغ جلا کر اپنی خوشی اور امارت کا بیک وقت اظہار کرنے کی منصوبہ بندی کررہے تھے۔ ایسے میں بچہ دنیا میں آیا تو سب خاک میں مل گیا۔ کہاں کا لنگر اور کہاں کی مٹھائی؟ زچگی کروانے والی دائیوں کو یہ بھی ہمت نہ رہی تھی کہ وہ باپ کو بچے کی پیدائش کی خبر دے دیں۔ وہ تو اپنا معاوضہ وصول کرنے کے لیے بھی نہ رکیں اور خاموشی سے حویلی سے روانہ ہوگئیں۔

خوش خبری کے منتظر جاگیردار صاحب کا ماتھا ٹھنکا کہ ایسا کیا ہوگیا کہ دائیوں کی زبانوں کو مہر لگ گئی۔ دل میں خدشہ سا جاگا کہ کہیں نومولود کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔ گھبرائے ہوئے اپنی خواب گاہ کی طرف دوڑے۔ بچے کے رونے کی آواز پہلے ہی قدم پر سنائی دے گئی اور پہلا اندیشہ خودبخود ہی دور ہوگیا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں بیٹے کی جگہ بیٹی تو پیدا نہیں ہوگئی۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو انہیں مایوسی میں مبتلا کرسکتی تھی لیکن اس صورت میں بھی بہرحال انہیں خبر تو دی جانی چاہیے تھی۔ لمحوں میں بہت کچھ سوچتے ہوئے وہ بیوی کے پلنگ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ چت لیٹی ہوئی تھی اور بازو آنکھوں پر رکھے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ نومولود بھی اس کے پہلو میں پڑا ماں کے سروں سے سر ملا رہا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ ماں بیٹا دونوں اپنی تقدیر پر گریہ کررہے ہیں۔ پھر جاگیردار صاحب کو وہ خبر ملی جو ان کے گمان میں دور تک بھی نہیں تھی۔ غصے اور بے بسی کے ملے جلے احساس کے ساتھ وہ یوں منہ موڑ کر کمرے سے نکلے کہ پھر کبھی ماں اور بچے کی طرف توجہ دینا بھی گوارا نہیں کیا۔

پیدائش سے قبل بچے کا نام بابر سوچا گیا تھا۔ اگر وہ نارمل بچہ ہوتا تو اس کا یہی نام رکھا جاتا لیکن وہ نہ تو لڑکا تھا نہ لڑکی۔ ماتا کی ماری دکھی ماں نے اسے بوبی کا نام دے دیا۔

بوبی حویلی کا پہلا بچہ ہونے کے باوجود کسی کی محبت اور توجہ کا حق دار نہ ٹھہرا۔ جاگیردار صاحب کا حکم تھا کہ اسے اس کی ماں کے کمرے تک محدود رکھا جائے، سوا اسے اپنے باپ کے گھر میں ہی قیدِتنہائی دے دی گئی۔ ماں کو ایسا بچہ پیدا کرنے کی یہ سزا ملی کہ اس پر سوکن آگئی۔ سوکن بھی ایسی کہ اس نے آتے ہی سال کے سال بیٹوں کی لائن لگا دی۔ بوبی کی پیدائش سے پہلے حویلی پر راج کرنے والی اس کی ماں یہ سب دیکھتی تو کبھی اسے گلے سے لگا کر رو پڑتی اور کبھی معصوم بچے کو بُری طرح پیٹ ڈالتی جس کی وجہ سے اس کا راج پاٹ چھن گیا تھا۔

معصوم بوبی کی زندگی پیدائش کے فوراً بعد ہی دردوالم کا شکار ہوگئی تھی۔ اس کی مصیبتوں میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب اس کے سوتیلے بھائیوں نے چلنا سیکھا۔ بچے لاکھ روکنے پر بھی نہ رکتے اور بوبی کے ساتھ کھیلنے کے لیے پہنچ جاتے۔ پھر جیسا کہ معمول ہوتا ہے، بچے کھیلتے ہیں تو لڑتے جھگڑتے بھی ہیں لیکن بوبی کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ پیدائشی ہی معتوب تھا۔ اس لیے قصور چاہے جس بھی بچے کا ہوتا، سزا اسی کے حصے میں آتی۔ یوں بہت کم عمر میں ہی اسے جسمانی اذیت سے آگہی ہوگئی لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ اس اذیت سے بھی بڑی ایک اذیت اس کی منتظر ہے۔ باپ کی سنائی قیدِتنہائی کو روندتا وہ باغی ہوکر کمرے سے باہر بھی نکل کر کھیلنے لگا۔ نتیجے میں ایک طرف اسے جہاں باپ کی ڈانٹ پھٹکار کا سامنا کرنا پڑتا تو دوسری طرف وہ تضحیک کا نشانہ بھی بنایا جاتا۔ رفتہ رفتہ اسے ادراک ہوگیا کہ وہ عام لوگوں جیسا نہیں ہے اور نہ ہی یہ لوگ اسے قبول کرسکتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں گھٹ کر رہ گیا۔ اسے ماں کے رویوں کے تضادات کی وجہ بھی سمجھ آنے لگی اور یوں وہ اس کی طرف سے زیادتی ہونے کے باوجود بھی اس سے پہلے سے زیادہ محبت کرنے لگا اور خود کو اسی تک محدود کرلیا۔ لیکن سکون اب بھی اس سے دور تھا۔ وہ جس ماں کو کائنات مان کر بیٹھا تھا، وہی ایک رات سوتے میں اسے چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی۔

ماں کے بعد حویلی کے در و دیوار اس کے لیے اور بھی تنگ ہوگئے اور اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ حویلی چھوڑ کر اپنے جیسوں میں شامل ہو جائے۔ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ کے ساتھ رہتے ہوئے اس نے بھیک بھی مانگی۔ پیر میں گھنگھرو باندھ کر ناچا بھی اور فاقے بھی کیے۔ یہ سب کرتے اس کا دل خون کے آنسو روتا رہا کہ وہ ایک ایسا بدنصیب تھا جس کے باپ کی زمینوں پر ڈھیروں کے حساب سے اناج پیدا ہوتا تھا اور وہ اس کی جائداد کے حق داروں میں سے ایک حق دار ہوتے ہوئے چند لقموں کے لیے دربدر پھرتا تھا۔

وقت نے کروٹ لی اور بڑھتی عمر کے ساتھ اور اس نے غم کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپا کر جینے کا ہنر سیکھ لیا۔ اس نے اس بات پر کڑھنا بھی چھوڑ دیا کہ اللہ نے اسے ایسا کیوں پیدا کیا ہے؟ وہ اپنی منفی سوچوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس جدوجہد میں مصروف ہوگیا کہ اسے اور اس جیسوں کو معاشرے میں ان کے بنیادی حقوق مل سکیں۔ اور آج وہی بوبی جسے اس معاشرے سے بہت سے شکوے تھے، ذی الیف پی کے ایک نوجوان کی تحریک پر اس معاشرے اور ملک کو بچانے کے لیے ایک فریضہ انجام دینے چلا تھا۔

”آپ یہ بتائیں کہ شالنی مجھے اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے تیار تو ہو جائے گی نا؟ باقی اور کسی قسم کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں سب برداشت کرلوں گا۔“ اس کی معروفیت کا دلچسپی سے جائزہ لیتے ہوئے جاوید علی نے اس سے پوچھا۔

”وہ تو اسے کرنا ہی پڑے گا لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ شالنی کے پاس جا کر تمہارا کام بن جائے گا۔ میں نے صرف اس وجہ سے اس کا انتخاب کیا ہے کہ خواجہ سراؤں کے جتنے گروہ یہاں کام کررہے ہیں، ان میں سب سے زیادہ آسودہ اسی کا گروہ ہے... اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے گروہ کے خوب صورت اور نوعمر خواجہ سرا عیاش لوگوں کی دل بستگی کے لیے جاتے رہتے ہیں۔“

”تو بس ٹھیک ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہاں میرا کام بن جائے گا ورنہ میں بہانے سے اس کا گروہ چھوڑ کر کسی اور گروہ میں شامل ہونے کے لیے آپ کے پاس چلا آؤں گا۔“ جاوید علی نے جو کہ اس وقت خود بھی زنانہ لباس اور میک اپ وغیرہ کے ساتھ ایک خوب صورت خواجہ سرا لگ رہا تھا، شوخی سے اسے جواب دیا۔ اس کا جواب سن کر بوبی نے اسے گھورا اور ہنس پڑی۔

”میں نے تمہارے بارے میں بالکل صحیح رائے دی تھی لڑکے... تم واقعی بہت چالاک ہو۔“

”میں نے آپ کی رائے سے اختلاف کیا بھی نہیں تھا۔“ اس نے فوراً ہی جواب دیا۔

”تو چلو چلتے ہیں شالنی سے ملنے۔ دیکھتی ہوں کہ تم کیسے اسے چالاکی سے اپنے قابو میں کرتے ہو۔“ ساڑی کا پلو شانے پر ڈالتی ہوئی بوبی کھڑی ہوگئی۔ جاوید علی نے فوراً اس کی پیروی کی پھر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بوبی کی رہائش گاہ سے باہر نکل آئے۔

شالنی کی قیام گاہ تک کا سفر انہوں نے ہلکی پھلکی گفتگو میں گزارا۔ جس علاقے میں شالنی رہتی تھی، وہ تنگ و تاریک گلیوں پر مشتمل تھا لیکن شالنی کا گھر اندر سے اس سے بہت مختلف ثابت ہوا جیسا کہ ان گلیوں میں موجود کسی گھر کے متعلق خیال کیا جاسکتا تھا۔ باہر سے پرانا اور خستہ حال نظر آنے والا گھر اندر سے بہت خوب صورت اور سجا ہوا تھا۔ فرش پر بچھے قالین سے لے کر کارنس پر سجے آرائشی گل دانوں تک ہر چیز خوب صورت اور بیش قیمت تھی۔ جاوید علی نے اس بات کو خاصی معنی خیزی کے ساتھ نوٹ کیا کیونکہ ابھی کچھ دیر قبل وہ بوبی جیسے خواجہ سرا کے گھر سے اٹھ کر آیا تھا۔ خواجہ سراؤں کے گرو اور لیڈر کے طور پر بوبی خاصی مشہور شخصیت تھی لیکن اس کے گھر میں اسے یہ سج دھج نظر نہیں آئی تھی۔ بوبی کے گھر کی تزئین و آرائش میں معمولی اشیا استعمال کی گئی تھیں جبکہ اس گھر کو دیکھ کر احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں معاشرے کے پسے ہوئے محروم طبقے کا کوئی فرد رہتا ہوگا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ آخر ایک خواجہ سرا کے ذرائع آمدنی کیا تھے جن کی وجہ سے یہ ٹھاٹ باٹ ممکن ہوسکے تھے۔

اپنے ذہن میں یہ سارا حساب کتاب جوڑتا وہ بوبی کے ساتھ ایک نرم ملائم آرام دہ صوفے پر بیٹھا شالنی کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ ڈرائنگ روم کی طرز پر سجے اس کمرے تک اسے شالنی کا ایک ملازم خواجہ سرا بٹھا کر گیا تھا۔ وہ خواجہ سرا بوبی کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور نہایت عزت و احترام سے انہیں یہاں بٹھانے کے بعد خود شالنی کو ان کی آمد کی اطلاع دینے گیا تھا۔ ذرا دیر میں شالنی وہاں چلی آئی۔

”او مائی گاڈ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ بوبی دیدی خود چل کر میرے گھر تک آئی ہیں؟“ کمرے میں قدم رکھتے ہی شالنی نے اپنی خوشی اور حیرت کا مظاہرہ کیا لیکن جاوید علی نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں مصنوعی پن نمایاں ہے۔

”میں کوئی پہلی بار تو یہاں نہیں آئی ہوں۔“ بوبی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے ملتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے گلے ملنے کا منظر دیکھتے ہوئے جاوید علی نے ایک ہی نظر میں جائزہ لے لیا تھا کہ شالنی کا لباس اور زیورات بوبی کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہیں۔ شکل صورت کے اعتبار سے بھی وہ بوبی سے زیادہ خوب صورت تھی۔

”بن بلائے تو پہلی بار ہی آئی ہیں۔ اس سے پہلے تو بس ہولی، دیوالی کے فنکشن پر میرے بلانے پر ہی آتی

تھیں۔'' شالنی نے شکوہ کیا۔

''تمہیں تو میری مصروفیت کا معلوم ہی ہے۔ ہر وقت گھن چکر بنی رہتی ہوں۔ آج یہاں ہوں تو کل کہیں اور۔ دن کہاں گزر جاتے ہیں، کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔'' بوبی نے جواب دیا۔

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں دیدی۔ آپ کی مصروفیت کا تو ہمیں بھی پتا چلتا رہتا ہے۔ دو تین بار آپ کو ٹی وی پر بھی دیکھا ہے۔ بڑا کام کر رہی ہیں آپ اپنی برادری کے لیے۔ بھگوان آپ کی مدد کرے۔ آپ کامیاب ہو گئیں تو ہم سب کا بھلا ہو جائے گا۔''

''بس تم لوگ دعا کرتے رہو، ایک نہ ایک دن ہمارے دن بھی پھر ہی جائیں گے۔'' بوبی نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ اب وہ لوگ آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف تھے۔ جاوید علی نے گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا اور خاموشی سے بوبی کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ کون ہے دیدی؟'' وقفے وقفے سے جاوید علی کو پُرتجسس نگاہوں سے دیکھتی شالنی نے آخرکار اس کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

''یہ رنجنی ہے۔ اسی کی خاطر وقت نکال کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ امید ہے کہ تم اس کے سلسلے میں میری فرمائش کو رد نہیں کرو گی۔'' بوبی بھی موقع کی تلاش میں تھی، فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا۔

''حکم دیں دیدی! آپ کو انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' شالنی کے لہجے میں بناوٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔

''رنجنی جھنگ سے آئی ہے۔ اس کا سارا کنبہ وہیں رہتا ہے۔ یہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتی تھی لیکن تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہم لوگوں کا اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے گھر والے اسے لڑکا بنا کر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ پرچون کی دکان بھی کھول کر دے رکھی تھی لیکن گھر والوں کی کوشش سے کیا فرق پڑتا ہے، جب اللہ نے ہی اسے مکمل مرد نہیں بنایا تو یہ کیسے عام مردوں جیسا برتاؤ کر سکتی تھی۔ اوپر سے محلے کے لڑکے بالے بھی اس کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ ایک طرف بے چاری شریر لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بنتی تو دوسری طرف گھر میں باپ سختی اور مار کٹائی کرتا کہ لڑکیوں والے ناز و ادا چھوڑ دے۔ روز کی کل کل جھک جھک بے چاری کے لیے عذاب بن گئی۔ جب تک کم عمر تھی پھر بھی گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں کر پاتی تھی لیکن آخرکار اس کی برداشت جواب دے گئی اور ایک دن یہ گھر چھوڑ کر نکل بھاگی۔ جھنگ سے نکل کر مجھ تک پہنچنے تک بے چاری بڑی خوار ہوئی اور دھکے کھائے۔ میری ہی ایک شاگرد اسے لے کر میرے پاس آئی تھی۔ میں نے رحم کھا کر رکھ لیا کہ سماج کے دھتکاروں کو اگر ہم ہی سہارا نہیں دیں گے تو یہ بے چاریاں کہاں جائیں گی۔ اپنے طور پر میں نے کوشش بھی کی کہ یہ میرے پاس آرام سے رہے لیکن میرے ہاں کا ماحول تمہیں معلوم ہے۔ لڑکیاں چاہے کچھ کریں لیکن نماز روزے کی پابند ہیں۔ یہ بے چاری ٹھہری ہندو ذات۔ میرے پاس نہ اس کے لیے بھگوان کی مورت ہے نہ تصویر۔ کرنے کو میں انتظام کر دیتی لیکن میری والیوں کو اچھا نہیں لگتا۔ دوسرے یہ خود بھی وہاں ان سب کے بیچ عجیب سا محسوس کرتی ہے۔ میں نے کہا چل تجھے شالنی کے پاس لے چلتی ہوں۔ اگر اس نے تجھے قبول کر لیا تو تیری مشکل آسان ہو جائے گی۔ اب تو بتا کہ میری بات رکھ کر اسے قبول کرے گی یا نہیں؟'' بوبی نے سوچی سمجھی کہانی سناتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیوں نہیں دیدی! آپ اسے اپنے ساتھ لے کر آئی ہیں تو مجھے تو اسے سویکار کرنا ہی ہے۔ آپ اسے میرے پاس چھوڑ جائیں۔ میں اس کا پورا خیال رکھوں گی۔'' شالنی نے فوراً ہی ہامی بھر لی۔

''لو بھئی رنجنی! مبارک ہو۔ تمہارا کام تو بن گیا۔ یہاں آرام سے رہو۔ میری یاد آئے تو شالنی کو بتا دینا، یہ تمہیں مجھ سے ملوانے کے لیے لے آئے گی۔'' بوبی نے فوراً جاوید علی کی طرف رخ کر کے اسے مبارک باد دی۔

''دھنیواد جی۔'' جاوید علی نے شرمیلے انداز میں شکریہ ادا کیا۔ اس کی آواز اور انداز دونوں میں خواجہ سرا والی بات تھی اور یہ بوبی کی کروائی مشق کا نتیجہ تھا۔ اس نے جاوید کو قلیل عرصے میں اچھی خاصی ٹریننگ دے دی تھی۔ وہ تھا بھی ذہین اس لیے جلد ہی بہت کچھ سیکھ گیا تھا۔

''تیرا نام شروع سے رنجنی تو نہیں ہوگا۔ گھر والے لڑکا بنا کر رکھنا چاہتے تھے تو کوئی مردانہ نام ہی رکھا ہوگا؟'' شالنی نے براہِ راست اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

''جی۔ پتاجی نے میرا نام رنجیت رکھا تھا اسی لیے میں نے اسے بدل کر رنجنی کر لیا۔'' جاوید علی نے شرمیلے لہجے میں جواب دیا۔

''جھنگ میں کس جگہ رہتے ہیں تمہارے گھر والے؟'' کائیاں شالنی، بوبی سے ہامی بھرنے کے باوجود اس طرح تفتیش کر رہی تھی جیسے اپنی تسلی کرنا چاہتی ہو۔

''کیوں جی، آپ کہیں مجھے ان کے پاس واپس تو نہیں بھیج دیں گی؟'' جاوید علی بھی کم نہیں تھا۔ خوف زدہ نظر آنے کی اداکاری کرتے ہوئے سوال کا جواب گول کردیا۔ اس موقع پر بوبی نے بھی اس کی مدد کی اور بیچ میں دخل دیتے ہوئے بولی۔

''تو فکر نہ کر شالنی! میں نے اس کا سب آگا پیچھا معلوم کرلیا ہے، تب ہی تو یہاں لے کر آئی ہوں۔ اگر مجھے اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا تو اسے لے کر آتی بھلا۔''

''ٹھیک ہے دیدی! آپ اس کی گارنٹی دے رہی ہو تو پھر میں کچھ نہیں پوچھتی۔ اسے رکھنے کے لیے تو میں پہلے ہی ہاں کرچکی ہوں۔'' شالنی نے سوال جواب کا سلسلہ روک دیا۔ اسی وقت اس کی ملازمۂ خاص لوازمات اور چائے سے لدی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی شالنی!'' بوبی نے بھری ٹرالی دیکھ کر اسے ٹوکا۔

''ایسا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے دیدی! آپ اطلاع دے کر آتیں تو میں آپ کے لیے خصوصی پکوان تیار کرواتی۔ ابھی تو جو کچھ گھر میں تھا، وہ سیوا کے لیے حاضر کردیا ہے۔'' شالنی کی انکساری لوازمات سے بھری ٹرالی کے ساتھ میل نہیں کھارہی تھی اور وہاں انکساری تھی بھی کہاں؟ ایک جتاتی ہوئی سی کیفیت تھی کہ دیکھو ہم بن بلائے اچانک چلے آنے والے مہمانوں کی بھی کیسی ضیافت کرتے ہیں۔

''چلیں بس اب تکلف نہ کریں اور میری خوشی کے لیے اچھی طرح کھائیں پئیں۔'' اسی بناوٹی لہجے میں اس کا اصرار جاری تھا کہ ایک اور خدمت گار اجازت لے کر اندر داخل ہوئی اور جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

''شما کیجیے گا دیدی! ایک ضروری فون آیا ہے، سن کر ابھی حاضر ہوتی ہوں۔ آپ جب تک آرام سے چائے وغیرہ پئیں۔'' ملازمہ کی سرگوشی سن کر وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور رسمی سا جملہ بول کر باہر نکل گئی۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی ملازمۂ خاص نے میزبانی کے فرائض سنبھال لیے اور اصرار کرکے بوبی اور جاوید علی کو مختلف اشیا کھلاتی رہی۔ شالنی کی فون کال خاصی طویل ثابت ہوئی تھی۔ وہ کئی منٹ گزار کر واپس آئی تو ایک بار پھر معذرت کرنے لگی۔

''کوئی بات نہیں شالنی! مجھے معلوم ہے کہ کوئی ضروری فون ہوگا جب ہی تم نے اتنا وقت لگا دیا۔ بہرحال، اب تم مجھے اجازت دو، مجھے کچھ دوسرے کام بھی ہیں۔ رنجنی کی ذمے داری اب تمہارے حوالے۔'' بوبی نے وقار سے اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔

''آپ کو اتنی جلدی جانے دینے کو من تو نہیں چاہ رہا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ آپ کا وقت کتنا قیمتی ہے۔ بس میں یہی کہوں گی کہ یہاں سے بالکل شانت ہوکر جائیں۔ رنجنی آپ نے میرے حوالے کی ہے۔ میں اسے من سے لگا رکھوں گی۔'' شالنی نے جواباً ایک بار پھر اس سے اپنی عقیدت مندی کا مظاہرہ کیا اور پھر اسے رخصت کرنے کے لیے باہر تک اس کے ساتھ گئی۔ بوبی کے جانے کے بعد وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئی۔ جاوید علی ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ شالنی اس کے روبرو بیٹھ گئی اور اپنا دایاں پیر میز پر رکھ دیا پھر سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور دھواں فضا میں چھوڑا۔ اس سارے عمل کے دوران اس کی نظر ایک پل کے لیے بھی جاوید علی پر سے نہیں ہٹی تھی۔ سر جھکا کر سامنے بیٹھا جاوید علی کن انکھیوں سے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔

''رنجنی...'' شالنی نے ایک اور کش لینے کے بعد اسے پکارا تو وہ زبان سے کچھ بولنے کے بجائے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں آج شام کی فلائٹ سے کراچی جارہی ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے بھی اپنے ساتھ لے کر چلوں گی۔ تو وہاں ہماری دوسری ساتھیوں کے ساتھ رہنا۔'' اس کی بات سن کر جاوید علی کو جھٹکا لگا۔ وہ تو یہاں پچھلے ان کے نیٹ ورک کو ٹریس کرنے کے لیے ان میں شامل ہوا تھا اور وہ اسے کراچی بھیجنے کی بات کررہی تھی۔

''چنتا نہ کر۔ وہاں یہاں سے اچھا ماحول ہے۔ ویسے بھی میں گرو ہوں اور تجھے یہ تو بوبی نے بتا ہی دیا ہوگا کہ گرو بات ماننی کتنی ضروری ہوتی ہے۔ گرو کو انکار کرنے والوں گروہ میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ اور جاوید علی کو گمان بھی نہیں تھا کہ پہلے ہی مرحلے پر ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بوبی کے جاتے ہی شالنی کے تیور یک دم ہی بدل گئے تھے اور وہ اس سے کچھ عجیب ہی طرح کا برتاؤ کررہی تھی۔

''کہیں شالنی کو مجھ پر شک تو نہیں ہوگیا؟'' اچانک ہی یہ خیال اس کے دماغ میں ابھرا اور وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا اس صورتِ حال سے نکلنے کی تدبیر سوچنے لگا۔

یہ پرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

انجام

بابر نعیم

بعض اوقات انتہائی کوشش اور محتاط روی کے باوجود نادانستگی میں ایسا فعل سرزد ہوجاتا ہے... جو نظروں سے اوجھل ہوکے بھی قابلِ گرفت ٹھہرتا ہے... ایک ایسے ہی جرم کی گرہیں... جو سلجھنے کے بجائے الجھتی جارہی تھیں۔

اپنے کام میں ماہر ایک سراغ رساں کی قابلِ ستائش کارکردگی

وکٹورین طرز کا وہ مکان کول اور ہائیز اسٹریٹ کے سنگم پر واقع تھا۔ برائے فروخت کے کالم میں اس کی قیمت بیس لاکھ ڈالرز لکھی گئی تھی۔ اس مکان کی ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے یہ قیمت انتہائی مناسب تھی۔ اس کی نہ صرف نئے سرے سے تزئین و آرائش کی گئی تھی بلکہ مکینوں نے اسے بہت اچھی حالت میں رکھا ہوا تھا۔ محلِ وقوع کے اعتبار سے بھی یہ مکان انتہائی اہمیت کا حامل تھا اور یہ یونیورسٹی آف فرانسسکو، گولڈن گیٹ پارک اور ایش بری سے چند قدم کے فاصلے پر واقع تھا لیکن موجودہ صورتِ حال میں بہت مشکل نظر آرہا تھا کہ اس مکان کی منہ مانگی قیمت مل سکے۔

گو کہ میں جائداد کی خرید و فروخت کا ماہر نہیں ہوں اور اس معاملے میں میرا تجربہ بالکل صفر ہے لیکن اتنا سمجھ سکتا ہوں کہ جس مکان میں قتل ہو جائے، اس کی قیمت گر جاتی ہے۔ ہمارے سامنے بھی ایک خوب صورت لڑکی کی لاش پڑی ہوئی تھی اور میں قاتل کی سنگ دلی پر حیران ہو رہا تھا کہ اسے ایسی خوب صورت لڑکی کو قتل کرتے ہوئے ذرا بھی ترس نہیں آیا۔ اگر میں قاتل کی جگہ ہوتا اور وہ لڑکی میری دشمن ہوتی تب بھی میں اسے قتل نہ کرتا بلکہ میری کوشش یہی ہوتی کہ کسی طرح یہ دشمنی، دوستی میں بدل جائے۔

مرنے والی ریبکا بیلن ایک اسٹیٹ ایجنٹ تھی۔ اس کی عمر ستائیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے جسم کے بالائی حصے پر کوئی کپڑا نہیں تھا جبکہ سر بھی ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ عام طور پر ایڈریان مونک ایسی عورتوں کی طرف نہیں دیکھتا جو ٹاپ لیس لباس پہنتی ہوں لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ وہ لڑکی مُردہ حالت میں پائی گئی تھی اور مونک اس کی لاش کا مختلف زاویوں سے معائنہ کر رہا تھا۔

مونک کا کمال یہ تھا کہ وہ بعض اوقات غیر اہم چیزوں کے ذریعے واردات کا سراغ لگا لیتا ہے۔ مثلاً دانتوں کے درمیان پھنسا ہوا کوئی تنکا، قمیص کا بٹن یا کان میں چھید وغیرہ وغیرہ، اسی لیے اسے لاش پر ہونے والے وحشیانہ تشدد کے نشانات دیکھ کر کوئی پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں آج تک یہ باتیں نہیں آئیں حالانکہ میں اس کے ساتھ کئی سالوں سے بہت کم معاوضے پر مختلف نوعیت کے کام کر رہا ہوں میں بیک وقت اس کا معاون، ایجنٹ، ڈرائیور، بازار سے سودا لانے والا اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ یہ بھی میرے فرائض میں شامل تھا کہ مشکل معاملات میں اس کی..... مدد کروں... اگر وہ کسی مشکل میں گرفتار ہو جائے تو اس کا حل بھی تلاش کروں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھ پر ایسی کیا افتاد آن پڑی تھی کہ انتہائی معمولی معاوضے کے عوض میں اس کے لیے مختلف نوعیت کی خدمات انجام دے رہا تھا... تو مجھے صرف ایک ہی لالچ تھا کہ اس کے ساتھ رہ کر ایک نہ ایک دن خود بھی سراغ رساں بن جاؤں گا لیکن مجھے یہ منزل بہت دور نظر آ رہی تھی کیونکہ مونک کا کام کرنے کا انداز ہی ایسا تھا جسے میں سر توڑ کوشش کے باوجود نہیں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

میرا اندازہ یہی تھا کہ عریاں حالت میں پڑی ہوئی ریبکا کی لاش کو وہ ایک عورت نہیں بلکہ کسی بے جان شے کی طرح دیکھ رہا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کے ذہن میں جو سوالات اٹھ رہے تھے، ان کا جواب تلاش کر رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا۔ تک یہ معلوم نہ کر لے کہ اس عورت کے ساتھ کیا حادثہ پیش تھا اور اس کا قاتل نہ پکڑا جائے۔ اس مصروفیت میں مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑتا کیونکہ کچھ سیکھنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہمیشہ کی طرح مونک یہ کیس بھی حل کر لے گا۔

یہ حقیقت تھی کہ پولیس کیپٹن اسکاٹ اس پر بہت زیادہ تکیہ کرتا تھا اور اسی لیے اس نے مونک کی خدمات مستعار لینے کے لیے اپنے محکمے میں کئی مرتبہ لڑائی کی تھی اور یہی وجہ تھی مونک کی بے سروپا حرکتوں پر صبر کا مظاہرہ کرتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے نتیجے میں مونک کیس کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتا۔ یہی سوچ کر وہ اسے برداشت کرتا اور معاف کر دیتا تھا۔

اس قتل کے بعد بھی اس نے ہفتے کی دھند آلود صبح میں ہمیں اس مکان پر پہنچنے کی ہدایت کی تھی جہاں وہ لیفٹیننٹ ایمی ڈیولن کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

"یہ مکان بیلن کے پاس تھا اور وہ اسے فروخت کرنا چاہ رہی تھی۔" ڈیولن نے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ "اس سلسلے میں ایک جوڑا اس مکان کو دیکھنے کے لیے صبح دس بجے آیا تو انہیں دروازہ کھلا ہوا ملا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو سامنے فرش پر یہ لاش پڑی ہوئی نظر آئی۔"

"ہم نے اس جوڑے کو پولیس کار میں بٹھا رکھا ہے۔ اگر چاہو تو ان سے کچھ سوالات کر سکتے ہو۔" کیپٹن اسکاٹ مونک سے مخاطب ہو کر بولا۔ وہ میرے برابر میں کھڑا، ٹوتھ پک سے اپنے دانتوں میں خلال کر رہا تھا۔ اس نے شکنوں سے بے نیاز سوٹ پہن رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ڈیوٹی پر نہیں بلکہ ڈسکو جانے کے لیے تیار ہوا ہے۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" مونک نے کہا۔ "تم انہیں گھر بھیج سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ قتل انہوں نے نہیں کیا پھر ان سے پوچھ گچھ کرنے کا کیا فائدہ؟"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" ڈیولن ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ بال بڑی بے ترتیبی سے ترشے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ اس نے ہیئر سیلون جانے کے بجائے خود ہی انہیں تراشنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پرانی جینز اور نیلے رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔

"لاش کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس لڑکی کی موت کم از کم آٹھ گھنٹے پہلے واقع ہوئی ہے۔" مونک نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اسے رات میں قتل کر دیا ہو اور صبح دوبارہ آ کر لاش دیکھنے کی اطلاع پولیس کو دے دی تاکہ ان پر کسی قسم کا شبہ نہ کیا جائے۔"

وہ بے صبری سے مونک کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے تھے۔ اس طرح جیکٹ اوپر ہو جانے سے اس کی بیلٹ میں لگا ہوا ریوالور اور شناختی بیج نظر آنے لگا حالانکہ وہاں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو ان چیزوں سے متاثر ہوتا۔ اس کا حال ہی میں ہومی سائڈ میں تبادلہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہیڈ آفس میں معمولی اور غیر اہم نوعیت کے کام کیا کرتی تھی۔ شاید اسی لیے وہ اپنے آپ کو پولیس افسر ظاہر کرنے کے لیے ان چیزوں کی نمائش کر رہی تھی۔

کیپٹن نے پوچھا۔ "کیا تم اس جوڑے کے بارے میں سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی ہو جنہوں نے اس لاش کو سب سے پہلے دیکھا تھا؟"

"نہیں۔" ڈیولن نے کہا۔ "لیکن عام طور پر مونک ایسے ہی نامعقول نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس لیے میں کہہ رہی تھی کہ ان سے بھی پوچھ گچھ کر لی جائے۔ ممکن ہے کہ کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔"

"جب وہ کسی نتیجے پر پہنچتا ہے تو وہ عموماً درست ہی ہوتا ہے۔" میں نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

کیپٹن اسکاٹ نے مجھے سرد نگاہوں سے گھورا۔ اسے یہ بات پسند نہیں تھی کہ میں اس کے سامنے مونک کی تعریف کروں۔ وہ جانتا تھا کہ ڈیولن اور مونک میں کھٹ پٹ چلتی رہتی ہے۔ میں خود یہ نہیں سمجھ سکا کہ ڈیولن کو مونک سے کیا پرخاش تھی۔ بہرحال، مجھے ان باتوں سے کوئی غرض نہیں تھی اور میں مونک کی حمایت کرنے سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔

اگر مونک نے ڈیولن کا تبصرہ سنا تھا، تب بھی اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر لاش کے گرد چکر لگایا اور کچھ کہے بغیر ملحقہ لیونگ روم میں چلا گیا۔

ڈیولن نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیا معما ہے؟"

"یہی کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔" اسکاٹ نے کہا۔

"میں نہیں سمجھتی کہ اس کی موت ایک ایسا معما ہے جسے حل کرنے کے لیے ہمیں باہر کے کسی آدمی کی ضرورت ہے۔"

اس کی بات میں وزن تھا اور میں بھی دل ہی دل میں اس کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اب تک کا میرا مشاہدہ یہی تھا کہ کیپٹن اسکاٹ نے مونک کو صرف انہی کیسوں کے سلسلے میں بلایا جو انتہائی مشکل، غیر معمولی اور پیچیدہ ہوا کرتے تھے

دوراندیش

سردار جی درخت پر چڑھے تو وہاں موجود بندر نے غرا کر پوچھا۔ "درخت پر کیوں چڑھے ہو؟"

"امرود کھانے!" سردار جی نے اکڑ کر جواب دیا۔

"امرود کھانے!" بندر نے طنز سے کہا۔ "مگر یہ تو آم کا پیڑ ہے۔"

سردار جی زور سے ہنسے اور بولے۔ "تم رہے بندر کے بندر... مجھے معلوم ہے کہ یہ آم کا پیڑ ہے... میں اپنے ساتھ تھیلی میں امرود لے کر آیا ہوں... یہ پیڑ امرود کا ہوتا اور اس میں لگے ہوئے سارے امرود کچے ہوتے تو میں بھلا کیا کھاتا... میں ہر معاملے میں دوراندیشی سے کام لینے کا عادی ہوں!"

اسلام آباد سے عائشہ عمر کا چٹکلا

لیکن جب سے کیپٹن نے دوسری شادی کی تھی، اس نے مونک کو عام نوعیت کے کیسوں میں بھی بلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی نئی نویلی بیوی پر اس حد تک فریفتہ تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اسے اپنے ساتھ دفتر ہی لے آتا۔ وہ مونک پر اسی لیے بہت زیادہ انحصار کرتا تھا کہ وہ اکثر و بیشتر کیس موقع پر ہی حل کر دیا کرتا تھا جبکہ کسی دوسرے سراغ رساں کو انہیں حل کرنے میں ایک دو بلکہ اس سے بھی زیادہ دن لگ جاتے تھے۔

مونک کی عادت تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بہت اہمیت دیتا تھا جس پر کیپٹن کو غصہ آ جاتا اور وہ بعض اوقات یہ سمجھنے لگتا کہ مونک محض اپنی اہمیت جتلانے کے لیے ایسا کرتا ہے لیکن ان دنوں کیپٹن نے مونک کے بارے میں اس طرح کے ریمارکس دینا بند کر دیے تھے کہ وہ اور اس کے سراغ رساں، مونک کی مدد کے بغیر بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔

البتہ ایمی ڈیولن کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ گو کہ اس نے کبھی مونک کی صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا لیکن وہ اس کی حرکتوں سے چڑتی تھی اور چاہتی تھی کہ اپنا کام خود کرے، چاہے اس میں کچھ زیادہ ہی دیر کیوں نہ لگ جائے۔

چونکہ مونک لیونگ روم میں ٹہلنے میں مصروف تھا اس لیے اسکاٹ نے اپنی توجہ مجھ پر مرکوز کر دی اور بولا۔ "تمہارے خیال میں کیا ہوا ہوگا؟"

"بیلن نے رات کو یہاں قیام کیا تھا تاکہ آج صبح

آنے والے گاہکوں کو دکھانے کے لیے مکان کو ٹھیک ٹھاک کر سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ دروازہ بند کرنا بھول گئی یا پھر کوئی شخص مکان دیکھنے کے بہانے اندر چلا آیا۔ اس نے بیلن پر جنسی حملہ کرنے کی کوشش کی اور مزاحمت پر کسی بھاری چیز سے اس کے سر پر ضرب لگادی اور فرار ہوگیا۔''

مونک لیونگ روم سے باہر آگیا اور ہماری جانب بڑھنے لگا۔

''کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو مونک؟'' کیپٹن اسکاٹ نے پوچھا۔

''نہیں، میں فوری طور پر اس مکان کے مالکان سے ملنا چاہتا ہوں۔'' مونک نے کہا۔

اب تک اس معاملے میں کسی نے مالکان کی جانب اشارہ نہیں کیا تھا اس لیے میرا حیران ہونا فطری امر تھا۔ اس جرم میں اسے ایسی کیا بات نظر آئی تھی کہ وہ ان کی جانب متوجہ ہوگیا؟

''تمہارے خیال میں ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے؟'' میں نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔

''بالکل نہیں۔'' مونک بولا۔ ''وہ سب معزز، شریف اور اچھے کردار کے لوگ ہیں۔ ان کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔''

''تم ان کے نام تک نہیں جانتے اور نہ ہی کبھی ان سے ملے ہو۔'' ڈیولن بولی۔ ''پھر تم ان کے کردار کے بارے میں رائے کس طرح قائم کرسکتے ہو؟''

''تم خود دیکھ سکتی ہو کہ وہ کس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سب کچھ بہت صفائی، خوب صورتی اور عمدگی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ ایک غیر معمولی خاندان ہے اور میں خود بھی اپنی زندگی میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔''

مونک نے کافی کی میز سے ایک فریم شدہ خاندانی تصویر اٹھائی جس میں ایک شادی شدہ جوڑا دو بچوں اور دو شکاری کتوں کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ گھر کے بھی افراد جینز اور سفید قمیصوں میں ملبوس تھے۔

''ان کی طرف دیکھو، کتنے مطمئن اور خوش نظر آرہے ہیں۔ اگر سب لوگ ان کی طرح ہوجائیں تو مجھے یقین ہے کہ ہمارے معاشرے میں طلاق اور جرائم کی شرح بے حد کم ہو جائے گی۔''

''عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟'' وہ بھویں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟ کیا یہ آسمان سے اترے ہوئے ہیں۔ فرشتے ہیں کہ عام لوگ ان کی تقلید نہیں کرسکتے؟'' وہ اس بارے میں تفصیل سے بات نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اسے انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کے بارے میں بالکل بھی معلومات نہیں تھیں۔ اس لیے وہ بہت سی باتوں کو نظرانداز کرگیا تھا۔

میں نے اسے سمجھانے کے لیے کہا۔

''یہ آسمان سے اترے ہوئے ہیں اور نہ ہی فرشتے بلکہ یہ ماڈل ہیں۔''

''پھر تو ہم سب کو ان کی تقلید کرنا چاہیے۔ یہ حقیقی امریکی ہیں۔''

''میرا مطلب ہے مسٹر مونک کہ اس خاندان کا کوئی وجود نہیں بلکہ یہ پروفیشنل ماڈل ہیں جنہیں ان تصویروں کے لیے بلایا گیا تھا جس طرح ہم اخبارات اور ٹیلی ویژن پر مختلف اشیا کے اشتہارات دیکھتے ہیں، بالکل اسی طرح اس مکان کی فروخت کے لیے یہ تصویریں بنوائی گئی تھیں۔''

مونک نے اطراف کا غور سے جائزہ لیا اور بولا۔

''گویا تم یہ کہہ رہی ہو کہ ایجنٹ نے بہت بڑا فراڈ کیا تھا۔ تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟''

میں جواب دینے والا ہی تھا کہ ڈیولن مجھ سے پہلے بول پڑی۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ اسے مونک کو نیچا دکھانے کا موقع مل گیا ہے۔ اس نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ اس میں ہر چیز بہت صفائی اور ترتیب سے رکھی ہوئی ہے اور یہ ایک مکمل گھر کی عکاسی کرتی ہے جبکہ عام طور پر لوگ اس طرح اپنے گھروں میں نہیں رہتے۔''

''یہ ایک خاص گھر ہے۔'' اسکاٹ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مالک مکان نے اسے خرید کر اس کی تزئین و آرائش کی پھر ایک کمپنی کی خدمات حاصل کیں کہ وہ اسے ایک فلم کے سیٹ کی طرز پر اس طرح تیار کرے کہ خوبیاں نمایاں اور خامیاں چھپ جائیں اور گاہکوں کے لیے اس میں کشش نظر آئے۔''

مونک نے ایک بار پھر تصویر کو دیکھا اور افسردگی سے بولا۔ ''کاش، یہ میرا خاندان ہوتا۔''

''یہی بنیادی نکتہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے پوری طرح کوشش کی کہ اس مکان کو پرکشش بنایا جائے کیونکہ ہم لوگ کوئی بھی چیز خریدتے وقت حقائق سے زیادہ جذبات پر توجہ دیتے ہیں۔ اب دیکھو نا، اس مکان کو خریدنے کے لیے جتنے بھی لوگ آئیں گے وہ اس کی ظاہری آرائش سے ہی متاثر ہوکر قیمت لگادیں گے۔ کوئی یہ جاننے

کی زحمت گوارا نہیں کرے گا کہ اس مکان کی تعمیر میں کیا سامان استعمال ہوا ہے اور اس کو بناتے وقت تعمیراتی اصولوں پر کس حد تک عمل کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔''

''گو کہ اسے قتل کردیا گیا لیکن ان لوگوں کے بارے میں سوچو جنہیں اس نے دھوکا دے کر بے وقوف بنایا۔''

''تم ہی واحد شخص ہو۔'' ڈیولن بولی۔ ''ورنہ کوئی بھی اتنا بے وقوف نہیں ہے۔ یہ بالکل اشتہار کی طرح ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ بناوٹی منظر ہے۔''

''لیکن یہ حقیقی بھی ہوسکتا ہے۔'' مونک نے کہا۔ ''اگر ہر شخص اس طرح تھوڑی بہت کوشش کرے۔''

''اس وقت تو حقیقت یہ ہے کہ یہاں فرش پر ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔'' ڈیولن نے اس لایعنی بحث سے اکتاتے ہوئے کہا۔

''بہتر ہوگا کہ ہم اپنی توجہ اس قتل پر رکھیں۔'' کیپٹن اسکاٹ نے کہا۔ ''مونک! تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟''

مونک نے تصویر واپس میز پر رکھی اور بولا۔ ''کوئی ہمیں غلط راستے پر ڈال رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم بھی اس واردات کے بارے میں اسی طرح سوچیں جیسا کہ لیفٹیننٹ ڈیولن سمجھ رہی ہے۔ لیکن یہ قتل اس طرح نہیں ہوا۔''

''تم کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہو؟'' ڈیولن بولی۔

''آلۂ قتل کوئی بھاری چیز تھی جو غائب ہے اور کیونکہ یہاں ہر چیز ترتیب اور سلیقے سے اپنی اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہے، اس لیے یقیناً وہ پہلے سے یہاں موجود نہیں ہوگی کہ قاتل اشتعال میں اسے اٹھا کر مقتولہ کے سر پر مار دیتا۔ یہاں ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے جہاں اسے ہونا چاہیے۔''

''اس کمرے کی ترتیب سے اس چیز کا کوئی تعلق نہیں۔'' ڈیولن نے کہا۔ ''حملہ آور وہ ہتھیار اپنے ساتھ لے کر آیا اور واپس لے گیا۔''

''اگر وہ اپنے ساتھ آلۂ قتل لے کر آتا تو اینٹ یا بلّے کے بجائے ریوالور یا چاقو کا انتخاب کرتا۔''

''لیکن میں اس امکان کو نظرانداز نہیں کرسکتی۔'' ڈیولن نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس نے لڑکی کو قابو کرنے کے لیے اس کے سر پر زوردار ضرب لگائی ہوگی۔''

''اگر ایسا ہوتا تو وہ بار بار اس پر نہ جھپٹتی۔'' مونک نے کہا۔ ''یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ حملہ آور نے اس کے مرنے کا انتظار کیوں نہیں کیا۔''

''ممکن ہے کہ وہ اسے مارنا نہ چاہتا ہو اسی لیے اپنا مقصد پورا ہونے کے بعد چلا گیا۔ شاید وہ اسی طرح لطف اندوز ہونے کا عادی ہو۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' مونک نے ڈیولن سے کہا۔ ''لیکن خون کہاں ہے؟ اس کے سر کے بال خون آلود ہیں لیکن فرش پر بہت تھوڑا خون نظر آرہا ہے جبکہ سر پر چوٹ لگنے کی صورت میں کافی خون بہہ جاتا ہے۔ اس لیے یہاں تو خاصی مقدار میں خون ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح دیواروں پر بھی خون کے چھینٹے نظر آنے چاہیے تھے لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں ہے اور یہ جگہ بالکل بے داغ نظر آرہی ہے۔''

''کیونکہ اس نے ٹیلی ویژن پر جرائم کی فلمیں دیکھ رکھی ہوں گی اس لیے اس نے خود ہی اس جگہ کی صفائی کر دی۔''

''لیکن مجھے تو یہاں کسی محلول کی بُو محسوس نہیں ہورہی۔'' مونک نے کہا۔

''شاید تمہاری ناک میں کوئی خرابی ہو۔'' ڈیولن نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

کیپٹن اسکاٹ اس بے نتیجہ بحث سے بور ہونے لگا۔ وہ بولا۔ ''پھر تم کیا کہتے ہو مونک! یہ قتل کس طرح کیا گیا؟''

''یقیناً اسے کسی دوسری جگہ قتل کر کے لاش یہاں پھینک دی گئی ہے۔'' مونک نے کہا۔ ''جس طرح اس گھر کو فلم کے سیٹ کی شکل دی گئی ہے، اسی مناسبت سے قتل کا ڈراما بھی اسٹیج کیا گیا ہے۔''

''بہتر ہوگا کہ ہم اپنے طور پر حقائق تلاش کریں۔'' اسکاٹ نے کہا۔

☆☆☆

فائیو اسٹار ریئلٹی کا دفتر گیری کے علاقے میں واقع ایک چار منزلہ عمارت کے گراؤنڈ فلور پر تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک ریسیپشن تھا جس کے سامنے لکڑی کا پارٹیشن بنا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دو درجن کے قریب کیبنٹز بنے ہوئے تھے اور دیوار کے ساتھ پانچ دفتر اور ایک کانفرنس روم تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس وقت بھی وہاں ایک درجن کے قریب پراپرٹی ایجنٹس موجود تھے۔ اسی سے اس کمپنی کے کاروبار کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ استقبالیہ ہال میں کئی مکانوں کی تصویریں آویزاں تھیں جن پر برائے فروخت کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اس میں اس مکان کی تصویر بھی تھی جہاں بیلن قتل ہوئی تھی۔

اس کی سامنے والی دیوار پر پانچ فریم شدہ تصاویر آویزاں تھیں جو کمپنی کے پانچوں پارٹنرز کی تھیں۔ وہ سب اپنے دفتر میں اس طرح کا پوز بنائے بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی اہم کام

میں مصروف ہیں۔ شاید فوٹو گرافر کی خواہش پر انہوں نے اس طرح کے پوز بنائے ہوں لیکن ان کا یہ انداز مصنوعی اور کاروباری لگ رہا تھا۔ اگر وہ اس طرح کا پوز دینے کے بجائے پورٹریٹ بنواتے تو دیکھنے والوں پر اچھا تاثر قائم ہوتا۔

جب کیپٹن اسکاٹ اور ڈیولن نے اپنا سروس کارڈ استقبالیہ کلرک کو دکھایا تو مونک ان پانچ تصویروں کی جانب متوجہ ہو چکا تھا جو ایک قطار میں دیوار پر آویزاں تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر ان تصویروں کو دیکھا پھر انہیں ایک ایک کر کے سیدھا کرنے لگا۔ پانچویں تصویر پر پہنچ کر وہ رک گیا پھر اس نے اسے دیوار سے اتارا اور استقبالیہ کلرک کے حوالے کر دی۔ وہ بیس سال کی ایک شوخ سی لڑکی تھی جس نے انتہائی چست منی اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگ تو اسے دیکھ کر ہی مکان خریدنے پر آمادہ ہو جاتے ہوں گے۔

''اسے رکھ لو۔'' مونک نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

وہ تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیوں؟ کیا یہ ٹوٹ گئی ہے؟''

''یہ پانچویں تصویر ہے۔'' مونک عجیب سے لہجے میں بولا۔

''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

ڈیولن کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اسکاٹ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ ماضی میں بھی اس طرح کی صورت حال سے گزر چکا تھا اور میرے لیے بھی یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں اور وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ مونک کو اس کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔

''پانچ کچھ عجیب سا عدد ہے اور اسی لیے اعداد میں سب سے برا سمجھا جاتا ہے۔''

''لیکن ہمارے پانچ پارٹنرز ہیں۔'' وہ بولی۔ ''اس لیے اس کمپنی کا نام فائیو اسٹار ریئلٹی ہے۔''

''تمہیں اس کمپنی کا نام بدل دینا چاہیے۔ تم اس تصویر کو دوبارہ اپنی جگہ پر لگا سکتی ہو جب چھٹا پارٹنر بھی آجائے اور کمپنی کا نام سکس اسٹار ریئلٹی رکھ لیا جائے۔''

''میرا خیال ہے کہ پارٹنرز اسے پسند نہیں کریں گے۔'' وہ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ تصویریں اس وقت سے یہاں لگی ہوئی ہیں جب دو سال پہلے یہ دفتر کھولا گیا تھا۔''

اسی وقت ایک آدمی کانفرنس روم سے نکل کر ہماری طرف بڑھا۔ اس نے اپنے بال بڑے بے ڈھب انداز میں ڈائی کیے ہوئے تھے جس کی وجہ سے سفید بال جگہ جگہ سے جھلک رہے تھے۔ اس نے خاکی پتلون، براؤن شوز اور مونوگرام والی قمیص پہن رکھی تھی۔

''میرا نام کیمرون گولڈ ہے اور میں اس کمپنی کا ایک پارٹنر ہوں۔'' اس نے کیپٹن اسکاٹ کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ ہم سب ابھی تک صدمے کی کیفیت میں ہیں، اس کی موت کا یقین نہیں آرہا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ لوگ اُسے پسند کرتے تھے۔'' اسکاٹ نے کہا۔

''بہت زیادہ۔ اس کاروبار میں وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جو سچے، کھرے اور خوش اخلاق ہوں۔ بیلن میں یہ سب خوبیاں موجود تھیں۔''

اچانک ہی اس کی نظر دیوار پر گئی اور وہ بولا۔ ''میری تصویر کس نے اتاری؟''

''تم پانچویں پارٹنر ہو؟'' مونک نے کہا۔

''اس کی باتوں کا خیال نہ کرنا۔'' ڈیولن بولی ''ہمارے جانے کے بعد تم یہ تصویر دوبارہ اپنی جگہ پر لگا سکتے ہو۔ ہم صرف یہ جاننا چاہ رہے ہیں کہ ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے جس کی بنا پر کوئی شخص بیلن کو نقصان پہنچانا چاہتا ہو۔ کیا کسی کے ساتھ اس کا لین دین کے سلسلے میں تنازعہ تھا؟''

''میرے خیال میں تو ایسی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ بیلن بہت ہی ہوشیار ایجنٹ تھی اور کبھی کسی کے ساتھ دھوکا یا فریب نہیں کرتی تھی۔ اس کی کامیابی کا راز ہی یہ تھا کہ وہ ہر سودے میں دونوں پارٹیوں کو مطمئن کر دیتی تھی۔''

''تم یہ تصویر دوبارہ نہیں لگا سکتے۔'' مونک نے کیمرون کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''اس سے پہلے تمہیں ایک اور پارٹنر کو اپنے ساتھ شامل کر کے کمپنی کا نام تبدیل کرنا ہوگا۔''

''مونک پلیز! خاموش ہو جاؤ۔'' اسکاٹ نے کہا پھر کیمرون سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس مکان کے مالکان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس قتل کے ذریعے انہیں دھمکانے کی کوشش کی گئی ہو؟''

''یہ مکان ایک ایسے شخص نے خریدا تھا جو وکٹورین طرز کے مکانوں کی بحالی کی وجہ سے اس فیلڈ میں مقبول ہے۔ اس کا کوئی دشمن نہیں، البتہ مداح بہت ہیں۔''

''لیکن تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہے۔'' مونک بولا۔ ''جب سے تم نے یہ دفتر کھولا ہے، تمہیں غصے سے بھرے ہوئے خطوط، دھمکی آمیز فون کالز اور مشتعل لوگوں کی آمد سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔''

''بالکل نہیں۔'' کیمرون بولا۔ ''تم نے یہ کہاں سے سنا؟''

''میں نے باہر لگا ہوا تمہارا بورڈ دیکھا ہے۔'' مونک اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''فائیو اسٹار ریئلٹی... اس علاقے میں رہنے والے اور یہاں سے گزرنے والے اسے پڑھ کر کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کرتے۔ تم جتنی جلدی ممکن ہو، یہ نام بدل لو تو بہتر ہے۔''

''مونک!'' کیپٹن اسکاٹ نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر گولڈ اپنے ایک ساتھی کے قتل کی وجہ سے پریشان ہیں۔ یہ موقع ایسا نہیں کہ تم ان کی کمپنی کے نام پر اعتراض کرو۔''

''میں اس سے اختلاف کرتا ہوں۔'' مونک بولا۔ ''اس نام کی وجہ سے ہی اس دفتر میں کچھ ایسے شیطانی اور غیر اخلاقی کام ہوتے ہیں جن کا سہرا بیلن کی دہشت ناک موت سے ملتا ہے۔''

''بہت ہو گیا مونک... اب بس کرو۔'' اسکاٹ نے کہا۔

مونک پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے برعکس اس نے جو کچھ کیا، وہ ہمیں حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے اور اسکاٹ کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا۔

''تمہیں ایک چھٹا پارٹنر بھی شامل کرنا چاہیے۔'' مونک نے گولڈ سے کہا لیکن اس کی نظریں کانفرنس روم پر جمی ہوئی تھیں۔ ''کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں بیلن کا قتل ہوا تھا؟''

چار آدمی کانفرنس روم سے برآمد ہوئے اور گولڈ کے ساتھ آکر کھڑے ہو گئے۔ میں انہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ کمپنی کے دوسرے چار پارٹنرز ہیں جن کی تصویریں دیوار پر لگی ہوئی ہیں۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے کیم؟'' ان میں سے ایک نے کہا۔ اس کے بالوں میں بھی سفیدی جھلک رہی تھی لیکن اس نے اسے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''ہاں، ایک بہت بڑا مسئلہ تھا لیکن اس نے تمہاری خاطر اسے حل کر دیا ہے۔'' مونک مڑا اور اس نے وہ تصویر اٹھائی جو تھوڑی دیر پہلے استقبالیہ کلرک کو دی تھی۔ ''اب تم اپنی کمپنی کا نام فور اسٹار ریئلٹی رکھ سکتے ہو۔''

کیمرون نے اسکاٹ اور ڈیولن کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ دیوانہ کیا کہہ رہا ہے؟''

''مجھے کچھ اندازہ نہیں۔'' ڈیولن نے کہا۔

''یہ دیکھو...'' مونک اس کی طرف تصویر بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اس سے تمہیں بہت کچھ اندازہ ہو جائے گا۔''

''تم کسی شخص کو محض اس لیے گرفتار نہیں کر سکتے کہ اس کی دیوار پر پانچ تصویریں لگی ہوئی ہیں یا پانچ کا عدد تمہارے خیال میں عجیب ہے۔'' ڈیولن تلخی سے بولی۔

''کسی روز یہ نام بھی تبدیل ہو جائے گا۔'' مونک بولا۔ ''لیکن فی الحال تم اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر سکتی ہو۔''

ڈیولن نے اسکاٹ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''کیپٹن! تم اسے سمجھاؤ۔ شاید یہ تمہاری بات سمجھ سکے۔''

''مونک ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' اسکاٹ نے کہا۔

وہ حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم تھوڑی دیر کے لیے سنجیدہ نہیں ہو سکتے؟''

''اگر مونک کہہ رہا ہے کہ اس شخص نے بیلن کو قتل کیا ہے تو پھر ایسا ہی ہوا ہوگا۔''

کیمرون کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں لیکن دوسرے پارٹنرز اس سے زیادہ حیران نظر آرہے تھے۔

''تمہارا خیال ہے کہ کیمرون نے بیلن کو قتل کیا ہے کیونکہ اس کی تصویر دیوار پر پانچویں نمبر پر لگی ہوئی ہے؟''

''ہاں۔'' مونک نے کہا۔

''تم نے سنا کیپٹن! یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' ڈیولن بولی۔

''ہاں، میں سن رہا ہوں۔'' اسکاٹ نے جواب دیا۔

''اب بھی تم یہی چاہتے ہو کہ میں کیمرون کو گرفتار کر لوں؟''

''ہاں۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتی۔'' ڈیولن نے کہا۔ ''جب تک میرے پاس اس کی گرفتاری کا کوئی جواز موجود نہ ہو۔''

''تم کس بنیاد پر کہہ سکتے ہو کہ میں نے بیلن کو قتل کیا ہے؟'' کیمرون اکڑتے ہوئے بولا۔ ڈیولن کے الفاظ سے اسے شہ مل گئی تھی۔

''تمہاری یہ تصویر گزشتہ دو سال سے اس دیوار پر آویزاں ہے جس میں تم اپنی میز پر بیٹھے ہوئے ہو۔'' مونک نے کہا۔

''ہاں، یہ تصویر اس وقت سے یہاں لگی ہوئی ہے جس روز یہ دفتر کھولا گیا تھا۔'' کیمرون نے کہا۔ ''اور جہاں تک میں جانتا ہوں، یہ کوئی جرم نہیں ہے۔''

''آج صبح تمہاری ٹھوڑی پر شیو کرتے ہوئے زخم آگیا تھا۔''

"کیا تم مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ یہ بھی ایک جرم ہے؟"

"اس کا مطلب ہے کہ آج صبح تم نے دیوار پر لگی ہوئی تصویر تبدیل کی ہے کیونکہ اس تصویر میں بھی تمہاری ٹھوڑی پر زخم کا نشان نظر آرہا ہے۔"

میں اور اسکاٹ دونوں ہی ڈیولن کی طرف بڑھے اور اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھنے لگے۔ گو کہ نشان واضح نہیں تھا لیکن لگ رہا تھا کہ شیو کے دوران میں اس کی ٹھوڑی پر کٹ لگ گیا ہے۔

"میری ٹھوڑی ابھری ہوئی ہے اور شیو کرنے کے دوران اکثر کٹ جاتی ہے۔" کیمرون نے کہا۔ "ایسا آج پہلی بار نہیں ہوا ممکن ہے کہ دو سال پہلے بھی ایسا ہوا ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"بہت فرق پڑتا ہے ورنہ تم نیا منظر تخلیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ تم نے آج صبح دوسرے لوگوں کے آنے سے پہلے ہی پرانی تصویر ہٹا کر اس کی جگہ پر نئی تصویر لگا دی۔" مونک نے کہا۔ "تم نہیں چاہتے تھے کہ ہمیں کسی ایسی شے کا علم ہو جو پرانی تصویر میں تو نظر آرہی ہے لیکن اب تمہاری میز پر نہیں ہے۔"

"یہ تصویر دو سال پرانی ہے اور اس میں جو چیزیں نظر آرہی ہیں، ان میں سے کئی ایک میری میز پر نہیں ہیں۔"

"آلۂ قتل کے سوا سب کچھ ویسا ہی ہے۔" مونک نے دوسرے چار پارٹنرز کی تصویروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم سب کی میزوں پر ایک جیسے ڈیسک سیٹ رکھے ہوئے تھے لیکن تمہاری تصویر میں ماربل کا قلم دان نظر نہیں آرہا۔"

کیپٹن اسکاٹ نے حیرت سے سر ہلایا اور بولا۔ "میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

سفید بالوں والا پارٹنر ہماری طرف آیا اور تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "صرف یہی نہیں بلکہ دو سال پہلے تمہارے بال بھی ایسے نہیں تھے جیسا کہ اس تصویر میں نظر آرہے ہیں۔"

"سورج کی روشنی سے اس تصویر کا رنگ مدھم ہو گیا ہے۔" کیمرون نے کہا۔ "ورنہ یہ وہی دو سال پرانی تصویر ہے۔"

"تمہارے دفتر میں خون کے دھبوں کی موجودگی کچھ اور ہی ثابت کرتی ہے اور انہیں صاف کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔" مونک نے کہا۔ "اگر تمہاری نظر ان پر نہیں گئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اب وہاں موجود نہیں ہوں گے۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فارنسک ٹیم تمہارے دفتر میں جا بجا پھیلے ہوئے خون کے دھبوں کو تلاش کر لے گی۔"

"اس کے لیے تمہیں سرچ وارنٹ کی ضرورت ہو گی۔" کیمرون نے کہا۔ "اور کوئی بھی جج محض ایک تصویر کی بنیاد پر اس طرح کا وارنٹ جاری نہیں کرے گا۔ تمہیں یہاں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس شخص کو تلاش کرنا چاہیے جس نے بیلن کے ساتھ زیادتی کرنے کے بعد اسے قتل کر دیا۔"

"اس وارنٹ کے لیے تصویر کی ضرورت نہیں ہو گی۔" مونک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم خود ہی اس کا اعتراف کر چکے ہو۔"

"اب تم میرے منہ میں اپنے الفاظ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہاں ایک درجن سے زیادہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے میرا کہا ہوا ہر لفظ سنا ہے۔"

مونک کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ وہ تیکھے انداز میں بولا۔ "یہ تو اور اچھی بات ہے۔ وہ تصدیق کر سکتے ہیں کہ تمہارے کہنے کے مطابق بیلن کے قاتل نے اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

ڈیولن نے اپنی جیب سے ہتھکڑیاں نکالیں اور بولی۔ "ہم نے تو ابھی تک یہ نہیں کہا کہ قاتل نے اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی تھی پھر تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم ہی وہ شخص ہو جس نے بیلن پر جنسی حملہ کیا اور جب اس نے مزاحمت کی تو تم نے مشتعل ہو کر اس کے سر پر ماربل کا قلم دان دے مارا۔ تمہاری میز پر تو وہ قلم دان موجود نہیں ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم خود ہی اس کے بارے میں بتا دو۔"

کیمرون کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور وہ خوف کے عالم میں اپنے ناخن چبانے لگا۔

"اپنے ہاتھ پیچھے کی جانب کر لو۔" ڈیولن بولی پھر آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ جب وہ اپنا کام کر چکی تو مونک نے کیمرون کے چہرے پر انگلی رکھی اور بولا۔ "اگر تم تصویر تبدیل نہ کرتے تو شاید ہمارے لیے اصل قاتل تک پہنچنا اتنا آسان نہ ہوتا۔ تم نے جس چیز کو چھپانے کی کوشش کی، اسی نے تمہارا پردہ فاش کر دیا۔"

پھر وہ حیرت زدہ ایجنٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔ جو لوگ موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

☆

موقع شناس

کنزی یونس

ناگہانی آفت کسی بھی وقت ... کسی کی بھی منتظر ہو سکتی ہے... وہ بھی رونما ہونے والی اس اچانک صورتِ حال سے یکسر لاعلم تھی...

جانے انجانے لمحوں میں شناسائی رکھنے والوں کا انداز

چاند نکلا ہوا نہیں تھا اور باغ میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سیکیورٹی لائٹ بھی آن نہیں ہوئی تھی حالانکہ اسے روشن ہو جانا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ باہر کوئی موجود تھا۔

تاریکی میں مجھے صرف ٹارچ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

چور!

یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں خاموشی سے اندھیرے میں چلا گیا۔ مجھے یہی کرنا تھا۔ گھر میں نوادرات بھرے ہوئے تھے۔ میں اسے کئی بار ہوشیار کر چکا تھا۔ چوروں کے خطرے کا احساس دلا چکا تھا لیکن وہ میری سنتی کب تھی؟

ٹارچ کی روشنی کا حلقہ قریب تر آتا جا رہا تھا اور اب مجھے کنکر اور ریت پر قدموں کی چرچراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں بدستور اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔

کمرے کی کھڑکی کے اوپر تلے شیشے کے کھسکنے والے یہ چوکھٹے صحیح طور پر بند نہیں تھے۔ یہ میری غلطی تھی۔ میں نے یقینی طور پر چوروں کے لیے کام آسان کر دیا تھا۔

اور پھر کھڑکی کے نچلے چوکھٹے کو اوپر کھسکانے والے کی آواز آئی۔ پھر اور ہلکی آوازیں ابھریں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ چور چھجے پر چڑھ کر کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو رہا ہے۔ اس کی فلیش لائٹ کمرے میں گھوم رہی تھی۔ وہ

نوادرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

یہ نوادرات قدیم پینٹنگز، چاندی کے پرانے ظروف اور ایلین کو ترکے میں ملی ہوئی قیمتی اشیا پر مشتمل تھے۔ ایلین کے تمام رشتے دار بے حد امیر تھے۔ وہ چور باری باری ہر جگہ رک رہا تھا۔

میں اس صورتِ حال سے کس طرح نمٹوں؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ مجھ سے بے حد قریب تھا لیکن ابھی تک اس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ میں گھپ اندھیرے میں تھا اور حقیقت میں مجھے اس کی سانسوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

جب میری آنکھیں اندھیرے سے زیادہ مانوس ہو گئیں تو میں نے اس چور کے قد و قامت اور وزن کو جانچنے کی کوشش کی۔ وہ خاصا لمبا چوڑا اور کسی باکسر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

اس چور سے ٹکر لینا اور اس پر قابو پانا بے حد مشکل نظر آ رہا تھا۔ ویسے بھی لوگ کہتے ہیں کہ بے دھڑک جرأت مندی کبھی راس نہیں آتی۔

میری واحد امید ساکت اور خاموش کھڑا رہنا تھی۔ میری کوشش یہی تھی کہ میں اس کی توجہ خود پر مبذول نہ کرا سکوں۔ جب وہ چلا جائے گا... چاہے وہ کچھ بھی حاصل کرنے کے ارادے سے یہاں آیا ہو تو پھر میں ایکشن لے سکوں گا۔

کسی بھی صورت میں مکان میں موجود اشیا چاہے وہ کتنی ہی قیمتی کیوں نہ تھیں، میرے لیے اس وقت ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس وقت سب سے اہم چیز اپنی جان بچانا تھی۔ اس وقت کسی قسم کی احمقانہ بہادری جان پر کھیل جانے کے مترادف ہوتی۔

اب وہ چور دبے پاؤں اور تن دہی کے ساتھ کمرے میں حرکت کر رہا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پہلے بھی اس قسم کی چوری کی وارداتیں کر چکا ہے۔ وہ کوئی شوقین یا اناڑی قسم کا چور ہرگز نہیں تھا۔

فلیش لائٹ کی ایک جھلک... لمحے بھر میں کسی شے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا اور پھر پھرتی کے ساتھ فن کے اس نمونے کو اپنے بیگ میں منتقل کرنا... یہ کام کوئی ماہر اور اپنے فن میں یکتا چور ہی کر سکتا تھا۔

بلا مبالغہ!

میں خود کو ساکت اور خاموش رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ آگے بڑھنا اور کوئی حرکت کرنا خودکشی کے مانند ہوتا۔ لیکن کوئی بھلا کس وقت تک اپنی سانس روک کے رکھ سکتا ہے؟

تب اچانک خاموشی میں ایک آواز سنائی دی... ساتھ ہی قدموں کی آہٹ... پھر دروازہ کھلنے کی آواز ابھری۔ دوسرے لمحے سیڑھیوں پر تیز تیز قدموں کی چاپ آنے لگی۔ کوئی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

"کیا یہ تم ہو سائمن؟ تمہیں اتنی دیر ہو گئی۔ شام کے جھگڑے پر میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ کیا تم نے مجھے معاف کر دیا؟"

پھر کمرے کا دروازہ کھلا اور ہال کی روشنی کے ہالے میں ایک عورت کا ہیولا نمودار ہوا۔ وہ مبہوت دکھائی دے رہی تھی۔

چور نے اب خاموشی اختیار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس نے لپک کر اپنا بیگ جس میں قیمتی اشیا بھر چکا تھا، اٹھایا اور اسی کھڑکی کی جانب دوڑ پڑا جس کے راستے کمرے کے اندر داخل ہوا تھا۔ چھجے پر چڑھتے ہوئے وہ لڑکھڑا گیا۔ اپنے مقصد میں عارضی سی ناکامی پر وہ مغلظات بکتا ہوا دوبارہ کھڑکی پر چڑھا اور بیگ اٹھائے باہر کود گیا۔ اس دوران میں وہ مجھ سے ٹکراتا ہوا اور مجھے ٹھوکر مارتا ہوا گزرا تھا لیکن اس نے مجھ پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ اسے تو موقع سے بھاگ نکلنے کی پڑی ہوئی تھی۔

عورت کی چیخ نکل گئی۔ یہ ایک دل خراش چیخ تھی لیکن ابھی مزید بدتر ہونا باقی تھا۔

شاید گھبراہٹ کے عالم میں یا بھولنے کے باعث اس عورت نے لائٹس ابھی تک آن نہیں کی تھیں۔

میں انتظار کر رہا تھا۔

"کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟"

لیکن چور تو بھاگ چکا تھا۔ اب اس کی طرف سے کسی قسم کا خطرہ یا خوف نہیں تھا۔

تب وہ عورت دھیرے دھیرے کھلی ہوئی کھڑکی کی جانب بڑھنے لگی۔ میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اندھیرے میں میری بیوی کو صرف اس چاقو کے پھل کی چمک دکھائی دی جو میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا اور میں اس پر بھرپور وار کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا!

اور پھر اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتی، میں نے چاقو اس کے سینے میں اتار دیا۔

کارنامہ

تنویر ریاض

انسان زندگی کی مسافتیں طے کرتا ہے تو اسے کئی طرح کے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے... زندگی کے تجربات و تغیرات نے اسے چہرہ شناسی کا ہنر سکھا دیا تھا... اور وقت کی لہروں نے اسے امتحان کے ساحل پر لا کھڑا کر دیا...

ایک بے بس شخص کا قصہ جو زمانہ ستم کی بے مہری کا شکار ہو گیا

ایڈی جیکب نے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے منہ بنایا اور بولا۔ "میں ان لوگوں سے تنگ آ چکا ہوں۔"

نارمن اولیور نے پلٹ کر دیکھا۔ باہر ایک عورت پرانا سا کوٹ پہنے اس کی کار کے برابر میں کھڑی تھی۔ سخت سردی میں اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

وہ ایڈی کی جانب مڑا اور اس نے جیب سے آٹھ ڈالر نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے ایڈی کی دکان سے اپنی کار کا انجن آئل تبدیل کروایا تھا۔

"تمہارا اشارہ کن لوگوں کی جانب ہے؟" اس نے ایڈی سے پوچھا۔

ایڈی نے باہر کھڑی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ جو منہ اٹھائے یہاں چلے آتے ہیں۔ کیا تم اخبار نہیں پڑھتے؟ فیڈرل کاسترو نے کیوبا میں ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ لوگوں کو جیلوں میں ڈالنا اور انہیں موت کے

گھاٹ اتارنا معمول بن گیا ہے۔ ادھر پاناما کے باغی بھی ہماری فوجوں سے لڑ رہے ہیں۔ انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ نہر پاناما ہم نے ہی تعمیر کی تھی۔"

نارمن مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم نے جو کچھ کہا، وہ سچ ہے۔ یہ سال بین الاقوامی لحاظ سے کچھ اچھا ثابت نہیں ہوا لیکن باہر جو عورت کھڑی ہے، وہ کیوبا یا پاناما کی نہیں بلکہ دیکھنے میں میکسیکن لگتی ہے۔ لگتا ہے اسے مدد کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی کار خراب ہوگئی ہو اور وہ اس امید پر یہاں آئی ہو کہ تم اس خرابی کو دیکھ سکو۔"

نارمن نے پیسوں کی رسید اٹھا کر جیب میں رکھی اور ایڈی کے کیبن سے باہر نکل گیا۔ اپنی کار کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ عورت بھی اسی کی جانب چلی آرہی ہے۔ اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی وہ سمجھ گیا کہ وہ کسی مشکل میں ہے۔

تیس سال تک پولیس کانسٹیبل کی ملازمت کرنے کے بعد اب وہ اپنے چھوٹے سے فارم پر کام کر رہا تھا۔ اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر وہ بہ آسانی لوگوں کے چہرے پڑھ لیتا اور ان کی مشکلات کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس عورت کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کی جلد بادامی اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ وہ عورت اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

"مسٹر اولیور! کیا میں تم سے کچھ باتیں کر سکتی ہوں؟"

نارمن اولیور کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ عورت اس کا نام کیسے جانتی ہے لیکن پھر بھی وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں، ہاں کیوں نہیں... لیکن معاف کرنا میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔"

وہ عورت افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں تمہیں جانتی ہوں، کیونکہ تم خاصے مشہور ہو۔"

نارمن خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "میرا نہیں خیال کہ بہت زیادہ مشہور ہوں۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ملازمت سے ریٹائر ہو چکا ہوں اور کھیتی باڑی کر کے اپنا گزارہ کرتا ہوں۔"

اس عورت نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ "نہیں اولیور، تمہارے کارناموں کی شہرت دور دور تک ہے۔ خاص طور پر گزشتہ جون کے بعد جب تم نے بے چارے تھامسن کو بچایا تھا۔"

نارمن نے اس کی جانب دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلایا اور بولا۔ "ٹھیک ہے۔ یہ سب کچھ تو زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"میرا شوہر ریمن بہت مشکل میں ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "پولیس نے اسے گرفتار کر لیا ہے اور اس پر ایک آدمی کو قتل کرنے کا الزام ہے۔"

"ریمن، ریمن ایمنڈ؟" نارمن نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

"ہاں، وہی میرا شوہر ہے۔"

نارمن کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا بلکہ اس نے فصل کی بوائی اور کٹائی کے دنوں میں اس کے فارم پر کام بھی کیا تھا۔ وہ انتہائی محنتی اور دیانت دار شخص تھا اور اس کی مدد کے بغیر نارمن کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ آلو اور ٹماٹر کی فصل کو بازار میں فروخت کر سکتا۔

"تم یہاں تک کیسے پہنچیں؟" نارمن نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں مل سکتا ہوں؟"

اس عورت کے چہرے پر ایک افسردہ مسکراہٹ ابھری اور نارمن کو یقین کرنا پڑا کہ وہ بے حد خوب صورت عورت ہے۔

"یہاں تک آنے میں خدا نے میری مدد کی۔ میں بس میں یہاں سے گزر رہی تھی کہ میں نے تمہاری گاڑی کھڑی دیکھی۔ ڈرائیور بھلا آدمی تھا جس نے میرے کہنے پر اسٹاپ کے بغیر ہی بس روک دی تاکہ میں یہاں اتر سکوں۔ اب میری تم سے التجا ہے کہ میرے شوہر کی مدد کرو۔ اسے بچا لو۔"

وہ زار و قطار رو رہی تھی اور آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ جنہیں اس نے صاف کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اس نے نظریں جھکا لیں پھر وہ آہستہ سے بولی۔ "اولیور! ہمارا اس کے سوا کوئی نہیں۔ اس کے بغیر میں بالکل تنہا ہوں۔"

☆☆☆

"میں تو بھول ہی گیا تھا کہ ریمن تمہارے پاس کام کرتا رہا ہے۔ تمہارے فون کرنے پر مجھے یاد آیا۔" پولیس چیف بل کارٹر نے کہا۔ نارمن اس وقت کارٹر کے سامنے اس کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ جگہ نارمن کے لیے اجنبی نہیں تھی کیونکہ وہ خود تیس برس تک پولیس ڈپارٹمنٹ کے اس چھوٹے سے دفتر میں کانسٹیبل کے طور پر کام کر چکا تھا۔

"ہاں، جب میرے پاس کام کی زیادتی ہوتی تو میں اسے روزانہ کی بنیاد پر بلا لیا کرتا تھا جیسا کہ قصبے کے دوسرے کسان کرتے ہیں۔ وہ بہت ہی محنتی اور ہوشیار بندہ ہے۔"

کارٹر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "میرا اس سے

صرف ایک مرتبہ واسطہ پڑا تھا جب بوبی نے گزشتہ اکتوبر میں لاک اپ میں بند کیا تھا لیکن وہ کوئی قتل جیسا سنگین معاملہ نہیں تھا بلکہ اس کا معمولی سا جھگڑا ہو گیا تھا اور اس کے گھونسے کی ضرب سے مدمقابل کی آنکھ کے نیچے نیل پڑ گیا تھا۔"

نارمن نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر کہنے لگا۔ "ہاں، میں نے بھی اس واقعے کے بارے میں سنا تھا۔ میرے خیال میں تمہارے ڈپٹی بوبی نے وہی غلطی کی جو عام طور پر نوجوان پولیس افسر کیا کرتے ہیں۔ یعنی لڑائی میں غالب آنے والے کو پکڑ لیا اور یہ جاننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ جھگڑے کا آغاز کس جانب سے ہوا تھا۔"

کارٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ گو کہ میں وہاں نہیں تھا لیکن تمہاری بات درست معلوم ہوتی ہے۔"

نارمن منہ بناتے ہوئے بولا۔ "حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک میکسیکن اور مقامی گورے کا جھگڑا تھا اس لیے ریمن کو کوئی مدد نہ مل سکی۔"

کارٹر افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "ممکن ہے کہ تمہارا خیال درست ہو لیکن ایک آزاد ملک اور بہادروں کی سرزمین پر ایسا ہو ہی جاتا ہے۔"

نارمن آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "خدا کا شکر ہے کہ ہم آزاد ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے جنگ کے دنوں میں بہادری کا مظاہرہ کیا ہے... لیکن ہمیں دوسرے بہادر لوگوں کو بھی اپنے ملک میں قبول کرنا چاہیے جو ہم سے مختلف ہیں لیکن ہماری طرح ہی عمل کرتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے ملک کو صحیح معنوں میں بہادروں کی سرزمین بنا سکیں گے۔"

☆☆☆

کارٹر کے دفتر سے نکلنے کے بعد نارمن اپنی کار میں سوار ہوا۔ اب اس کا رخ فارمنگ ڈیل کے قصبے کی جانب تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ پولیس چیف ڈالٹن کے پاس بیٹھا تھا۔ علیک سلیک اور رسمی گفتگو کے بعد اس نے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"چیف ڈالٹن، کیا بل کارٹر نے تمہیں بتایا تھا کہ میں تم سے ملنے کیوں آیا ہوں؟"

ڈالٹن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، اس نے صبح فون کر کے بتایا تھا کہ تم مجھ سے ملنے کے لیے آنے والے ہو۔"

"اور تمہیں میرے یہاں آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا؟"

"نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری تفتیش مکمل ہو چکی ہے اور میرا نہیں خیال کہ تم اس میں ہماری کوئی مدد کر سکتے ہو۔" ڈالٹن نے سخت اور سرد لہجے میں کہا۔

"اس کے باوجود تم مجھ سے ملنے پر آمادہ ہو گئے، کیوں؟"

"کیونکہ کارٹر نے مجھ سے ایسا کرنے کے لیے کہا تھا۔ ویسے بھی تم کافی عرصے تک پولیس میں ملازمت کر چکے ہو اس لیے میں نے تم سے ملنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔"

نارمن نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ "بہت بہت شکریہ۔"

پولیس چیف بھاری آواز میں بولا۔ "گزشتہ جون میں تم نے جو کارنامہ انجام دیا تھا، یہ کیس اس سے بالکل مختلف ہے اور اس میں کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ ایک سائنس داں کا قتل ہوا اور مجرم پکڑا گیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔"

"میں اپنے طور پر تفتیش کرنا چاہتا ہوں... اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو؟"

"میری بات رہنے دو لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ میں تمہیں تھوڑا سا پس منظر سمجھا دیتا ہوں۔ یہاں سے ایک میل مشرق میں ری پبلک ایوی ایشن کے دفاتر ہیں۔ وہاں دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں پی 47 تھنڈر فائٹر بنائے جاتے تھے۔ اب گزشتہ چار سال سے ایف 105 تھنڈر چیف بنائے جا رہے ہیں۔ یہ ایک فائٹر بمبار طیارہ ہے۔ اب میں نے سنا ہے کہ ری پبلک کے انجینئر اسے جدید بنانے کے لیے کچھ کام کر رہے ہیں جو کہ خفیہ نوعیت کا ہے۔ اسی لیے ایف بی آئی والے بھی اس قتل کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے آئے تھے جو ریمن نے کیا ہے لیکن ایف بی آئی والے ہماری تفتیش سے مطمئن ہو کر چلے گئے۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ کیس بہت مضبوط ہے اور اس کا اندازہ تمہیں بھی ہو جائے گا۔"

نارمن نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "میں صرف سچ جاننا چاہتا ہوں۔ ریمن میرے پاس کام کرتا تھا۔ اس نے کافی وقت میرے گھر پر گزارا۔ یہاں تک کہ وہ میرے پوتے کو ایک دو مرتبہ مچھلیاں پکڑنے کے لیے دریا پر بھی لے گیا اس لیے میرے لیے یہ تصور کرنا بہت مشکل ہے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہوگا۔"

ڈالٹن ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارا مسئلہ ہے کہ تم نے اپنے پوتے کو اس کے ساتھ دریا پر بھیج دیا لیکن یہاں جو کچھ ہوا، وہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تین دن پہلے ڈاکٹر مورگن اپنے دفتر سے اٹھا، وہ ایف 105 پر انجینئر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ موسم سرد ہونے کے

ساتھ ساتھ اندھیرا بھی پھیل چکا تھا۔ ری پبلک پر کام کرنے والے زیادہ تر لوگوں کی ڈیوٹی آٹھ سے چار ہوتی ہے۔ لہٰذا پارکنگ لاٹ تقریباً خالی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور شخص بھی پسنجر سیٹ والے دروازے سے کار میں داخل ہوا۔ میرا اندازہ ہے یا ممکن ہے کہ وہ شخص پہلے سے کار کے اندر موجود تھا۔ یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا البتہ اتنا جانتا ہوں کہ وہ ریمن تھا۔ اس نے مورگن کو لوٹنے کی کوشش کی اور مزاحمت کرنے پر اسے قتل کر دیا۔ مورگن کے ہاتھوں پر زخموں کے نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ ریمن نے چاقو سے پانچ وار کیے جن میں سے ایک اس کے گلے پر لگا اور اس کی گردن کے بائیں جانب گہرا زخم آیا۔ پھر ریمن نے مورگن کا پرس نکالا اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ اپنی پرانی پک اپ میں سوار ہوا اور لوریل ایونیو میں واقع اپنے کرائے کے گھر پہنچ گیا۔“

ڈالٹن نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا پھر بولا۔ ”مسئلہ یہ ہے کہ کسی نے اسے ہاتھ میں چاقو پکڑے فرار ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ اپنی پک اپ میں سوار ہوا اور تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔“

نارمن نے پوچھا۔ ”اسے کس نے فرار ہوتے دیکھا... کیا کوئی چشم دید گواہ موجود ہے؟“

ڈالٹن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میں نہیں جانتا۔ اس وقت کوئی عورت پارکنگ لاٹ میں موجود تھی اس نے پارکنگ لاٹ کے باہر پے فون سے یہ اطلاع دی اور پک اپ کا نمبر بھی بتایا۔ اس طرح ہم ریمن تک پہنچ گئے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس گاڑی کے تمام کاغذات قانونی ہیں۔ یہاں تک کہ اس نے انشورنس بھی کروایا ہوا ہے۔ ورنہ عام طور پر اس طرح کی وارداتوں میں جعلی نمبر پلیٹ والی گاڑیاں استعمال کی جاتی ہیں۔“

”اور تم اس عورت کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے؟“ نارمن نے پوچھا۔

”نہیں... لیکن اس کی اطلاع درست نکلی۔ میں نے دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور راستے میں کارٹر کو بھی ساتھ لینے کے لیے رکا کیونکہ ریمن کا مکان اسی کے علاقے میں آتا ہے۔ اس کی پک اپ گھر کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ پسنجر سیٹ کی طرف والے دروازے اور ہینڈل پر خون کے دھبے نظر آئے۔ اسی طرح دروازے کے اندرونی ہینڈل پر بھی خون لگا ہوا تھا۔ لیبارٹری رپورٹ کے مطابق یہ خون کے دھبے مورگن کے خون سے ملتے ہیں۔ ریمن نے یقیناً دستانے پہن رکھے ہوں گے اسی لیے مورگن کی کار پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہیں مل سکے۔“

نارمن نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تمہیں اس عورت کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے؟“

”ہاں، ہم اس سے مزید پوچھ گچھ نہیں کر سکے۔ جب اس نے فون پر اطلاع دی تو بتایا کہ وہ پارکنگ لاٹ کے باہر موجود ہے اور جو کچھ اس نے دیکھا وہ بتا دیا۔ جب میرے آدمیوں نے اس کا نام جاننا چاہا تو وہ بولی... میں یہاں ایک کام کے سلسلے میں صرف ایک دن کے لیے آئی تھی اور مجھے فوراً ہی نیویارک کے لیے روانہ ہونا ہے اس لیے میں اس معاملے میں شامل نہیں ہو سکتی۔“ یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

”کیا یہ کال آپریٹر کے ذریعے موصول ہوئی تھی؟“

”نہیں، اس نے براہِ راست ڈیسک پر مامور سپاہی سے بات کی تھی۔“

”اس کی شناخت کے بارے میں ری پبلک سے معلوم کیا جا سکتا ہے اگر وہ وہاں کسی کام کے سلسلے میں آئی تھی۔“

ڈالٹن اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں احمق نہیں ہوں نارمن... میں نے چیک کر لیا ہے، وہ اس عورت کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے۔ ویسے بھی یہ اتنا آسان نہیں۔ ان کا واسطہ روزانہ کئی لوگوں سے پڑتا ہے۔ ہر ایک کی شکل اور آواز تو ذہن میں نہیں رہتی۔“

نارمن اپنا کان کھجاتے ہوئے بولا۔ ”اور کوئی خاص بات جو تمہارے ڈپٹی نے اس عورت کے بارے میں نوٹ کی ہو؟“

”ہاں۔“ ڈالٹن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لب و لہجے سے وہ کوئی پڑھی لکھی ماڈرن عورت معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے انتہائی شستہ انگریزی میں بات کی تھی۔“

”کیا تمہیں وہ چاقو اور دستانے مل گئے؟“

”نہیں۔“ ڈالٹن نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”شاید اس نے راستے میں یہ دونوں چیزیں کہیں پھینک دی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چیزیں اب بھی وہیں پڑی ہوں۔ اگر کسی کی نظر ان پر پڑی تو وہ ہمیں فون کر دے گا۔“

نارمن نے آہستہ سے کہا۔ ”اس کے خلاف کوئی اور ثبوت؟“

ڈالٹن نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”تمہیں مزید ثبوت چاہئیں تو میں تمہیں بتا دوں کہ ہمیں اس کی پک اپ کی سیٹ کے نیچے سے مورگن کا پرس ملا ہے جبکہ نقد رقم گلو باکس میں رکھی تھی، بیالیس ہزار ڈالرز۔ سوچنے کی بات ہے کہ ریمن وہاں

موسمِ سرما میں کام کرتا تھا اور اس کی تنخواہ اڑتالیس ڈالرز فی ہفتہ ہے۔ اس لیے مورگن کو لوٹنے کا جواز سمجھ میں آتا ہے۔“

یہ کہہ کر ڈالٹن آگے کی طرف جھکا اور نرم لہجے میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم ریمن کی مدد کرنا چاہتے ہو، واقعی تم بہت شریف انسان ہو۔“ پھر وہ اپنی سیٹ پر سیدھا ہوا اور کہنے لگا۔ ”لیکن ڈاکٹر مورگن کا قتل ایک سانحہ ہے۔ وہ اسی قصبے میں رہا کرتا تھا اور میری اس سے ایک دو بار تقریبات میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھا اور ایسے ہتھیاروں کی تیاری میں مدد دے رہا تھا جو دشمنوں کو ہم سے دور رکھ سکیں۔ اس کے باوجود بھی تم اس میکسیکن کی مدد کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں... لیکن اسے برقی کرسی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“

☆☆☆

ڈالٹن کے دفتر سے نکل کر وہ پولیس ہیڈ کوارٹر کے مرکزی ہال میں آیا اور ریمن کی فائل دیکھنے لگا۔ اس نے وہ رنگین تصاویر بھی غور سے دیکھیں جو فارنسک ڈپارٹمنٹ نے بنائی تھیں۔ ریمن کی شیورلیٹ پک اپ کے بائیں دروازے اور ہینڈل پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ اسی طرح ہینڈل کو دبانے والے بٹن پر بھی خون آلود انگوٹھے کا نشان تھا۔ نارمن نے چشمہ لگا کر قریب سے ان تصویروں کو دیکھا جیسا کہ ڈالٹن نے بتایا تھا... کہ دستانوں کی وجہ سے کہیں بھی انگلیوں کے نشانات نظر نہیں آ رہے تھے۔

اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا بھی بغور جائزہ لیا جس کے مطابق مقتول کے دونوں ہاتھوں پر مزاحمت کے دوران میں لگنے والے زخموں کے نشانات تھے۔ اس کے علاوہ چاقو کے بھی پانچ زخم تھے۔ گردن کی بائیں جانب گہرا زخم آیا تھا جو اس کی موت کا سبب بنا۔

نارمن واپس ڈالٹن کے کمرے میں آیا اور اس نے پوچھا کہ ایک ایسا شخص جو قتل کر کے فرار ہو رہا ہو؟ اپنی گاڑی میں پسنجر سیٹ والے دروازے سے کیوں داخل ہوگا؟ اس پر ڈالٹن نے جواب دیا۔ ”پک اپ ایسی پوزیشن میں کھڑی تھی کہ ڈرائیور سیٹ والے دروازے پر، بلندی پر لگی ہوئی روشنی براہِ راست پڑ رہی تھی لہٰذا ریمن نے گاڑی میں سوار ہونے کے لیے پسنجر سیٹ کے ساتھ والے دروازے کا انتخاب کیا تاکہ کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔“

اگلے روز نارمن کاؤنٹی لاک اپ میں ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ریٹائرڈ پولیس کانسٹیبل ہونے کی رعایت سے ڈپٹی شیرف نے اسے ریمن سے ذاتی ملاقات کی اجازت دے دی تھی۔

نارمن نے مسکراتے ہوئے ریمن کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تمہاری بیوی بہت خوب صورت ہے۔ وہ میرے پاس مدد کے لیے آئی تھی۔ حیرت ہے کہ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملا۔ تمہیں میرے پاس کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟“

ریمن کے چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولا۔ ”اگلے موسمِ بہار میں پانچ سال ہو جائیں گے۔ بشرطیکہ میں اس مقدمے سے بری ہو گیا۔“

”مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔“ نارمن نے پورے وثوق سے کہا۔ ”کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ وقوعہ والے روز کیا ہوا تھا؟“

ریمن منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے کیونکہ میں اس قتل میں ملوث نہیں ہوں۔ اس روز بھی میں نے معمول کے مطابق اپنا کام ختم کیا اور مسٹر فشر کو بتانے گیا کہ میں گھر جا رہا ہوں لیکن وہ اپنے دفتر میں نہیں تھے۔ لہٰذا میں ٹرک میں بیٹھ کر گھر آ گیا۔ روزا کھانا بنا چکی تھی لہٰذا ہم سب نے ساتھ بیٹھ کر ڈنر کیا۔ اس کے بعد بچے اسکول کا کام کرنے بیٹھ گئے اور میں روزا کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اسی وقت پولیس آ گئی اور انہوں نے مجھ پر گن تان لی۔ اور مجھے گرفتار کر کے لے گئے۔“

”یہ بتاؤ کہ کیا تم کبھی مورگن سے ملے تھے؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟“

ریمن نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”نہیں، ری پبلک ایوی ایشن کا دفتر اور فیکٹری کئی عمارتوں میں پھیلی ہوئی ہے اور وہاں بہت سے کارکن کام کرتے ہیں۔ اس کا رقبہ سو ایکڑ سے بھی زیادہ ہے۔ مورگن اسلحہ اور ہتھیار ساز فیکٹری میں کام کرتا تھا جبکہ میری ڈیوٹی اس عمارت میں ہے جہاں ایندھن رکھا جاتا ہے اور یہ دونوں عمارتیں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہیں۔“

نارمن نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور بولا۔ ”کیا تم نے اس رات کسی اور کو پارکنگ لاٹ میں دیکھا تھا... مثلاً کوئی خوش لباس عورت وغیرہ وغیرہ؟“

”نہیں، میں نے وہاں کسی کو نہیں دیکھا۔ اس وقت وہاں سناٹا تھا۔“

نارمن نے سر ہلایا اور بولا۔ ”تم اپنی پک اپ میں کس طرح سوار ہوئے تھے؟“

ریمن اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں، نارمن جس طرح سب لوگ گاڑی میں سوار ہوتے ہیں، اسی طرح میں نے بھی دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔“

''وہ تو ٹھیک ہے۔ میرا مطلب ہے تم کس طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی میں سوار ہوئے تھے؟''

''ظاہر ہے کہ ڈرائیونگ سائڈ والا دروازہ کھول کر ہی میں گاڑی میں بیٹھا تھا۔''

نارمن نے سر ہلایا اور بولا۔ ''اچھا، اچھا۔ ابھی تم نے کسی مسٹر فشر کا ذکر کیا تھا۔ یہ کون ہے؟''

''وہ میرا باس ہے۔ وہاں کا ہیڈ کسٹوڈین۔''

''اچھا۔'' نارمن جلدی سے بولا۔

ریمن آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''میرے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ پولیس چیف کا کہنا ہے کہ مجھے موت کی سزا ہو گی اور میرے بیوی بچوں کو میکسیکو بھیج دیا جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔''

نارمن کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ ایک بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ تم نے کسی کو قتل نہیں کیا اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں بجلی کی کرسی پر نہیں بٹھایا جائے گا۔''

☆☆☆

نارمن اپنی کار میں سوار ہوا اور ریڈیو آن کر دیا۔ اس کا رخ ایلن فشر کے مکان کی طرف تھا۔ اس نے لیونگ روم کے آتش دان پر ایک نظر ڈالی اور ایلن فشر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہارا فون نمبر اور ایڈریس پولیس فائل سے حاصل کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ مجھے تم سے ملنا چاہیے۔''

''بالکل نہیں۔ مجھے خوشی ہو گی اگر میں ریمن کے کسی کام آسکا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے بے چارے ڈاکٹر مورگن کو کیوں قتل کیا؟''

نارمن اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''گویا تم بھی اسے قصوروار سمجھتے ہو؟''

فشر الجھتے ہوئے بولا۔ ''جو کچھ میں نے اخبارات میں پڑھا، اس کے مطابق سارے ثبوت اس کے خلاف ہیں۔ پھر پولیس چیف ڈالٹن اور ایف بی آئی والے اس پر متفق ہیں کہ ریمن نے ڈکیتی کی کوشش ناکام ہونے پر اسے قتل کر دیا۔ ان شواہد کی روشنی میں اسے ہی قصوروار سمجھا جائے گا۔ اس کے باوجود میں اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' نارمن طنزیہ انداز میں بولا۔ ''چیف ڈالٹن اسے قصوروار سمجھتا ہے لیکن میرے خیال میں اسے غیر ملکی پسند نہیں اور ویسے بھی مورگن کے ساتھ اس کے پرانے تعلقات تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ وہ اس کیس میں تھوڑا سا جانب دار ہو گیا ہو۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' فشر نے کہا۔ ''میں ریمن کو اچھا آدمی سمجھتا ہوں۔ اگر تمہارے خیال میں وہ بے قصور ہے اور میں اس کی مدد کر سکتا ہوں تو ضرور کروں گا۔''

''میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ ریمن کو کب سے جانتے ہو؟''

فشر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''گزشتہ تین برس سے۔ اسے موسم سرما میں کام کی ضرورت تھی، لہٰذا میں نے اسے عارضی ملازمت دے دی۔ وہ بہت اچھا کارکن ہے۔ میں نے اسے سب کچھ سکھا دیا۔ حالانکہ اس نے کبھی ویکیوم کلینر یا دوسرے صفائی کرنے والے برقی آلات استعمال نہیں کیے تھے لیکن وہ بہت جلد سیکھ گیا۔''

نارمن نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میرا بھی کچھ ایسا ہی تجربہ ہے۔ میرے فارم پر بھی کام کے دوران میں اس نے مشینوں اور برقی اوزاروں کا استعمال بہت جلد سیکھ لیا تھا۔''

اسی وقت دروازے پر ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس نے بھاری کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ اپنے دستانے چڑھاتے ہوئے بولی۔ ''ایکسکیوز می... مداخلت کے لیے معافی چاہتی ہوں لیکن میرا جانا ضروری ہے کیونکہ میں نے ہیئر سیلون سے وقت لے رکھا ہے۔''

نارمن اور فشر دونوں ہی کھڑے ہو گئے۔ فشر نے اس کا تعارف اپنی بیوی کی حیثیت سے کروایا۔ نارمن نے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑتے ہوئے بولی۔ ''ہمارے مہمان کی اچھی طرح خاطر کرنا۔ میں جلد ہی واپس آجاؤں گی۔''

اس کے جانے کے بعد نارمن نے فشر سے پوچھا۔ ''جس روز یہ قتل ہوا، اس کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟''

فشر نے اپنے ہونٹ سکیڑے اور بولا۔ ''جیسا کہ میں نے پولیس کو بھی بتایا ہے کہ ریمن کی ڈیوٹی صبح سات بجے سے سہ پہر تین بجے تک ہوتی تھی لیکن وقوعہ والے روز میں نے ریمن کو کام کے سلسلے میں روک لیا کیونکہ اگلے ہفتے ہونے والی کرسمس پارٹی کے لیے مجھے دوسری منزل پر واقع کانفرنس روم تیار کروانا تھا لہٰذا میں نے ریمن سے کہا کہ وہ کمرے کا فرش صاف کرنے کے علاوہ میز پر پالش بھی کر دے۔ اس کے لیے میں نے اسے دو گھنٹے کا اوور ٹائم دینے کا وعدہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح اسے کرسمس کے موقع پر کچھ اضافی آمدنی ہو جائے گی۔ اگر میں اسے کام کے لیے نہ روکتا تو وہ تین بجے گھر چلا جاتا جبکہ ڈاکٹر مورگن کا قتل پانچ بجے کے قریب ہوا تھا۔

ممکن ہے کہ وہ آج بھی زندہ ہوتا اگر میں...''

نارمن اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں پچھتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ ریمن کی تاخیر سے روانگی اور ڈاکٹر مورگن کے قتل میں کوئی تعلق ہے۔''

فشر نے اپنی بھویں اٹھائیں اور بولا۔ ''میں نے تو اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔''

نارمن جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ ''بہت بہت شکریہ مسٹر فشر! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

فشر بھی کھڑا ہو گیا اور اسے چھوڑنے گھر کے دروازے تک آیا۔

''آج صبح میں نے ایف 105 کے بارے میں سنا ہے۔'' نارمن نے دروازے پر پہنچ کر کہا۔ ''ری پبلک کے لوگوں کو اس کارنامے پر فخر کرنا چاہیے۔''

فشر نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بے شک لیکن اس سے پہلے ستمبر میں ہم اس سے بھی بڑی خبر سن چکے ہیں۔''

''وہ کیا تھی؟'' نارمن نے پوچھا۔

فشر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہم لوگ دوسروں کے کارناموں کو کوئی کریڈٹ نہیں دیتے۔ گزشتہ ستمبر میں روسیوں نے اپنا خلائی جہاز چاند پر اتارا تھا۔''

نارمن جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔ ''واقعی، یہ حیران کن بات ہے۔''

☆☆☆

نارمن اپنی سوچوں میں گم ری پبلک ایوی ایشن کی پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھ رہا تھا جو فشر کے گھر سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر تھی۔ اس نے اپنی کار کو کین اسٹریٹ پر کھڑی کی اور اس فون بوتھ کی طرف بڑھنے لگا جو پارکنگ لاٹ کے مرکزی دروازے کے باہر واقع تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے کسی نامعلوم عورت نے ریمن کے بارے میں پولیس کو فون کر کے اطلاع دی تھی۔ نارمن بوتھ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور وہاں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ اسے وہاں ایک سادہ سا سیاہ رنگ کا پے فون، ایک اسٹول اور ایک شیلف نظر آیا جس پر فون رکھا ہوا تھا۔ نارمن نے ایک بار پھر تمام چیزوں کو غور سے دیکھا اور بوتھ سے باہر آگیا۔

☆☆☆

پیر کی صبح وہ اپنے فارم ہاؤس میں ناشتے کی میز پر ٹیلی فون کانوں سے لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر! جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں مورگن کی گردن کی بائیں جانب جو زخم ہے وہ سوراخ کا ہے کسی چہرے کا نہیں۔''

دوسری جانب سے کاؤنٹی میڈیکل ایگزامنر ڈاکٹر اینڈریو غراتے ہوئے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ میں سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ اسے پڑھ لو۔ وہ سوراخ کا ہی نشان ہے۔''

نارمن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر! میں وہ رپورٹ پڑھ چکا ہوں۔ دوبارہ چیک کرنا چاہ رہا تھا۔ ایک بات کی اور وضاحت چاہتا ہوں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کہتی ہے کہ حملہ آور ممکنہ طور پر پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے ڈاکٹر مورگن پر چاقو سے حملہ کیا۔ تو کسی بھی زاویے سے حملہ کرنے کی صورت میں کٹ کا نشان تو لگ سکتا ہے مگر سوراخ نہیں ہو سکتا۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر نے بے صبری سے پوچھا۔

''ریمن الٹے ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے اس لیے اس کے چاقو کا وار مورگن کی گردن کی دائیں جانب لگنا چاہیے تھا جبکہ سوراخ بائیں جانب ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ڈاکٹر؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ سوراخ گردن کے بائیں جانب ہی ہے لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ حملہ آور نے کون سا ہاتھ استعمال کیا ہو گا۔''

''تمہارے خیال میں اس نے کون سا ہاتھ استعمال کیا ہو گا؟''

ڈاکٹر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''ایسی صورت میں اس نے سیدھا ہاتھ استعمال کیا ہو گا کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص الٹے ہاتھ سے چاقو کا وار کرے اور زخم گردن کی بائیں جانب آئے۔''

فون رکھنے کے بعد نارمن اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اسے چھ مہینے پہلے شائع ہونے والے میگزین کی تلاش تھی تاکہ وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے خیالات کی تصدیق کر سکے۔

☆☆☆

دو دن بعد نارمن ایک بار پھر بل کارٹر کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ جواب میں کارٹر نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب تمہاری درخواست پر یہاں جمع ہوئے ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم کیا کہنے والے ہو۔''

نارمن نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور باہر ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ فارمنگ ڈیل کا پولیس چیف ڈالٹن اپنے

ایک نائب کے ہمراہ اس کے دائیں جانب بیٹھا ہوا تھا اور ان کے برابر میں فشر اور اس کی بیوی حیران و پریشان بیٹھے ہوئے تھے... جبکہ اس کی بائیں جانب والی کرسیوں پر وکیلِ صفائی اور ریمن ایمنڈ بیٹھے ہوئے تھے۔ ریمن کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی جبکہ اس کے عقب میں دو پولیس والے کھڑے ہوئے تھے۔ دس فٹ کے فاصلے پر عقبی دیوار کے ساتھ روزا ریمن بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی گشتی پولیس آفیسر بوبی کھڑا تھا۔

ڈالٹن بے صبری سے بولا۔ ”جلدی کرو نارمن، میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ نارمن نے کہا۔ ”میں اس مفروضے کی بنیاد پر بات شروع کر رہا ہوں کہ ریمن بے قصور ہے۔ میں اس شخص کو جانتا ہوں۔ یہ انتہائی ایمان دار آدمی ہے اور کبھی کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ یہ اور اس کی بیوی محنت کر کے اتنا کما لیتے ہیں کہ اپنا گزارہ کر سکیں۔ یہ بہت زیادہ امیر نہیں لیکن میکسیکو کے مقابلے میں یہاں رہ کر یہ لوگ اپنے بچوں کی ضروریات بہ آسانی پوری کر سکتے ہیں۔ ریمن اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک ایسے شخص کو لوٹنے کی کوشش کرے جو اسی جگہ پر کام کرتا ہے اور نہ ہی اپنی شناخت چھپانے کے لیے کسی کو قتل کر سکتا ہے۔ یہ کام کسی بال بچے والے شخص کے بس کا نہیں۔ لہٰذا اگر اس نے یہ قتل نہیں کیا تو مورگن کا قاتل کوئی اور ہے۔ کوئی ایسا شخص جو اچانک ہی کسی کو قتل کر دے جیسا کہ پچھلے دنوں شہر میں اس طرح کی وارداتیں ہوئی ہیں۔ لیکن ایسا ہوتا تو ریمن کی پک اپ پر خون کے دھبے نہ پائے جاتے اور نہ ہی مورگن کا پرس وہاں سے ملتا۔ اس لیے یہ اچانک یا اتفاقیہ قتل کی واردات نہیں تھی بلکہ اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی تھی۔“

ڈالٹن نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”یہ ایک تصوراتی خاکہ ہے۔ تمہیں اس کہانی کو لکھ کر کچھ پیسے کمانے چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ تم ٹی وی کے لیے لکھنا شروع کر دو۔“

نارمن نے سر ہلایا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”لہٰذا اب میں اس کیس کو اس زاویے سے دیکھ رہا ہوں۔ ڈالٹن نے تو مقدمے کی سماعت شروع ہونے سے پہلے ہی فیصلہ سنا دیا۔ وہ نارمن کو نامکمل ثبوتوں کے ساتھ حوالات میں بند کر کے خوش ہے۔ صرف اس لیے کہ ریمن غیر ملکی ہے اور ڈالٹن انہیں پسند نہیں کرتا۔ اس لیے یہ فرض کر لیا گیا کہ اسی نے چاقو استعمال کیا ہوگا۔“

کارٹر نے سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر بھی غصے کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ تمہارے پاس واضح ثبوت ہوں لیکن کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ بعد میں تمہیں پچھتانا نہ پڑے۔“

ڈالٹن نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں سنی جو ان ثبوتوں کو غلط ثابت کر سکے۔ تمہاری باتوں سے صرف ریمن کی محبت ٹپک رہی ہے۔“

نارمن مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے ہم اس خاتون گواہ کی بات کرتے ہیں جس نے فون کر کے قتل کی اطلاع دی تھی۔ ری پبلک ایوی ایشن میں کام کے سلسلے میں آنے والی عورتوں کی تعداد برائے نام ہوتی ہے۔ اس لیے ایسی اگر کوئی عورت وہاں آئے تو اسے یاد رکھنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ لہٰذا میں نے ری پبلک فون کر کے اس عورت کے بارے میں معلوم کیا۔ ان کے ریکارڈ کے مطابق قتل والے روز کوئی عورت کام کے سلسلے میں وہاں نہیں آئی۔ پھر وہ عورت کون تھی جسے ائر پورٹ پہنچنے کی جلدی ہو رہی تھی تاکہ نیویارک جانے کے لیے جہاز میں سوار ہو سکے۔ اسی طرح پارکنگ لاٹ کے باہر واقع پے فون سے کال کا معما بھی حل نہیں ہوا۔“

”کیا وہاں سے کسی نے فون کیا تھا؟“ اس بار فشر نے پوچھا۔

”ہاں۔“ نارمن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس ٹیلی فون بوتھ سے پولیس ہیڈ کوارٹر کو براہِ راست فون کال کی گئی تھی جبکہ میں نے خود اس بوتھ کا معائنہ کیا ہے۔ وہاں مجھے کوئی ٹیلی فون ڈائریکٹری نظر نہیں آئی۔ مجھے حیرت ہے کہ ایک ایسی عورت جس کا تعلق اس شہر سے نہیں ہے اور جو یہاں اپنے کام کے سلسلے میں صرف ایک دن کے لیے آئی تھی، یہ یقین کر لیتی ہے کہ اس نے جرم ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور ٹیلی فون بوتھ میں جا کر مقامی پولیس ڈپارٹمنٹ کو براہِ راست فون کرتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے پاس یہاں کا ٹیلی فون نمبر کہاں سے آیا؟ عام طور پر لوگ ایسی صورت میں زیرو ڈائل کر کے ٹیلی فون آپریٹر سے رابطہ کر کے کہتے ہیں کہ انہیں پولیس سے بات کرنی ہے۔ آپریٹر ان کے مقام کی شناخت کر کے پولیس ڈپارٹمنٹ سے کال ملا دیتا ہے اور وہاں متعلقہ آفیسر یہ فون ریسیو کرتا ہے۔ میں نے اپنی تیس سال کی ملازمت کے دوران ایسی سیکڑوں فون کالیں موصول کی ہیں جو سب آپریٹر کے ذریعے آتی تھیں۔“

اس بار ریمن کے وکیلِ صفائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کے علاوہ بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

”ہاں، بہت کچھ۔“ نارمن بولا۔ ”اب ہم ریمن کے

بارے میں بات کرتے ہیں۔ میں نے اس کے ساتھ کئی سال گزارے ہیں اور اسے اپنے فارم پر استعمال ہونے والے آلات اور مشینوں کے بارے میں سکھایا ہے اور اس دوران میں نے نوٹ کیا کہ ریمن الٹے ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے۔ اس کی وجہ سے کچھ پیچیدگی ہو سکتی تھی کیونکہ برقی آلات اس طرح ڈیزائن کیے جاتے ہیں کہ انہیں صرف سیدھے ہاتھ سے کام کرنے والے ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ لہٰذا بائیں ہاتھ سے کام کرنے والوں کو اس بارے میں خصوصی احتیاط کرنا پڑتی ہے اور اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ ریمن بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے۔“

ڈالٹن نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے نارمن؟“

”اس کیس کی فائل بتاتی ہے کہ ڈاکٹر مورگن کی گردن کی بائیں جانب چاقو کا زخم لگا اور یہ حملہ پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے اس شخص نے کیا جو بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے۔ ایسی صورت میں تو ڈاکٹر مورگن کی گردن کے دائیں جانب زخم آنا چاہیے تھا۔“

”آگے بتاؤ۔“ وکیلِ صفائی کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

”اس فائل میں جو تصویریں ہیں، ان میں سے ایک میں ریمن کی پک اپ پر خون کے دھبے نظر آ رہے ہیں۔ پسنجر سیٹ کے دروازے پر ان دھبوں کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے؟ ایک آدمی قتل کر کے بھاگتا ہے، اسے ایک عورت پارکنگ لاٹ سے گزر کر پک اپ کی جانب جاتے ہوئے دیکھتی ہے پھر وہ اپنی پک اپ میں سوار ہونے کے بجائے پسنجر سیٹ کی طرف والا دروازہ کیوں کھولے گا؟ ڈالٹن کا یہ کہنا درست نہیں کہ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے ایسا کیا۔ اگر وہ اتنا ہی پُرسکون ہوتا تو دوڑنے کے بجائے اطمینان سے چلتا ہوا اپنی پک اپ تک جاتا اور وہ عورت اس پر یہ الزام نہ لگاتی۔“

نارمن نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولا۔ ”وہ داغ وہاں جان بوجھ کر لگائے گئے تھے تاکہ ریمن پک اپ میں سوار ہوتے ہوئے انہیں نہ دیکھ سکے اور یہ کام اس دوران ہوا جب وہ اوور ٹائم کرنے میں مصروف تھا۔ اس وقت پارکنگ لاٹ میں سناٹا تھا لہٰذا جس کسی نے بھی یہ حرکت کی، وہ نظروں میں نہ آ سکا۔ واقعی یہ کام بڑی مہارت سے کیا گیا تھا لیکن تصویر پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خون کے دھبے دروازے کے ہینڈل کے نیچے پائے گئے ہیں۔ اگر الٹا ہاتھ استعمال کرنے والا کوئی شخص پسنجر سائڈ کا دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل کا بٹن دباتا ہے تو اس کے بائیں انگوٹھے کا رخ کار کے پچھلے حصے کی جانب ہوگا اور اس کی خون آلود ہتھیلی کی بقیہ چار انگلیوں کے نشانات بھی ہینڈل کے نچلے حصے پر ہونے چاہئیں۔“

ڈالٹن مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دروازہ اس شخص نے کھولا ہے جو بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے۔“

”جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ تمام چیزیں سیدھا ہاتھ استعمال کرنے والوں کو ذہن میں رکھ کر بنائی جاتی ہیں۔ اگر ریمن الٹے ہاتھ سے دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا تو وہ کار کی باڈی اور دروازے کے درمیان پھنس جاتا۔ اس لیے اسے بھی دروازہ کھولنے کے لیے دایاں ہاتھ استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی تاکہ وہ بہ آسانی پک اپ میں سوار ہو سکے۔ ایسی صورت میں خون کے دھبے ہینڈل کے اوپری حصے پر نظر آنے چاہیے تھے۔ لگتا ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر یہ دھبے وہاں لگائے ہیں تاکہ ظاہر کیا جا سکے کہ دروازہ بائیں ہاتھ سے کھولا گیا تھا۔“

سب لوگ خاموشی اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ نارمن نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ”میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ قاتل نے اتنا لمبا چکر کیوں چلایا؟ اگر وہ مورگن کو مارنا چاہتا تھا تو اسے گولی مار کر بھی ہلاک کر سکتا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ جس جگہ قتل ہوا ہے، وہ ایک خفیہ دفاعی ادارہ ہے اور قاتل نہیں چاہتا تھا کہ معاملہ اتنا بڑھ جائے کہ اس میں ایف بی آئی اور دوسری ایجنسیاں ملوث ہو جائیں۔ وہ اس کیس کو مقامی پولیس تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پولیس آفیسرز کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”اب میں ایک بار پھر اس عورت کی طرف آتا ہوں جس نے فون پر پولیس کو اطلاع دی تھی۔ کال وصول کرنے والے آفیسر کا کہنا ہے کہ وہ اپنے لب و لہجے سے خوش گفتار، پڑھی لکھی اور ماڈرن لگ رہی تھی۔ میں فشر کے گھر پر اس کی بیوی سے مل چکا ہوں اور اس کے کچھ جملے یہاں دہرانا چاہتا ہوں... مثلاً ”مداخلت کے لیے معافی چاہتی ہوں، میں نے ہیئر سیلون سے وقت لے رکھا ہے، ہمارے مہمان کی اچھی طرح خاطر کرنا وغیرہ وغیرہ۔“ ہمارے یہاں کے لوگ اس طرح کی گفتگو نہیں کرتے۔ یہاں شوہر نہیں بلکہ بیوی مہمانوں کی خاطر کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ مسز فشر کی طرح ماڈرن نہ ہوں لیکن حقیقت یہی ہے۔“

اس کے بعد وہ فشر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ ایسا بروکلین میں ہوتا ہوگا کیونکہ تم دونوں وہیں پلے بڑھے ہو۔“

فشر کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ غصے سے بولا۔ ”کیا تم میری بیوی کا تعلق اس واقعے سے جوڑنا چاہ رہے ہو؟“

نارمن اس کی خفگی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ تم بچپن سے ہی وہاں کی بیس بال ٹیم ڈوجرز کے پرستار تھے۔ گو کہ میں نیویارک ٹیم کی کو پسند کرتا ہوں لیکن میری بیوی بھی بروکلین کی ٹیم پر فدا ہے اور وہ ان کے بارے میں مکمل معلومات رکھتی ہے۔“

”تو کیا ہوا؟“ فشر نے پوچھا۔

”تم نے کہا تھا کہ گل ہوجز اور پی وی ریس، اس ٹیم کے بہترین کھلاڑی تھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پی وی ریس کبھی بھی ڈوجرز کی طرف سے نہیں کھیلا۔ حالانکہ میں دوسری ٹیم کا طرف دار ہوں لیکن یہ بات تو میرے علم میں بھی ہے جبکہ تم ان کے پرستار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس حقیقت سے لاعلم رہو۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید تمہیں کھلاڑیوں کے ناموں کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ ایک ایسا شخص جسے ڈوجرز کے مشہور کھلاڑیوں کے نام بھی معلوم نہیں، وہ کیوں اپنے آپ کو اس ٹیم کا پرستار ظاہر کر رہا ہے اور اس کی بیوی اتنی اچھی انگریزی بولتی ہے جو یہاں کے رہنے والے نہیں بول سکتے اور مجھے یقین ہے کہ بروکلین میں بھی ایسی انگریزی نہیں بولی جاتی ہوگی۔“

نارمن رازدارانہ انداز میں فشر کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”ایک ایسا شخص جو تین ماہ پہلے روسیوں کے چاند پر پہنچنے کا تذکرہ فخریہ انداز میں کر رہا تھا لیکن گزشتہ جمعے جب اس کی کمپنی کے تیار کردہ ہوائی جہاز نے تیز ترین رفتار کا عالمی ریکارڈ قائم کیا تو اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی حالانکہ وہ خود اس کمپنی میں ملازم ہے۔“

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”پہلے میں نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن جب میں نے ان تمام باتوں پر غور کرنا شروع کیا تو مجھے چند ماہ پہلے لائف میگزین میں شائع ہونے والا ایک آرٹیکل یاد آ گیا۔“

ڈالٹن نے پوچھا۔ ”اس میں کیا لکھا ہوا تھا؟“

”اس میگزین میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق روسیوں نے ماسکو سے تیس میل دور ایک تربیتی کیمپ قائم کر رکھا ہے جسے روس کی خفیہ ملٹری ایجنسی چلاتی ہے۔ اس میگزین میں یوٹو طیاروں کی مدد سے لی گئی اس کیمپ کی ایک درجن تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔ یہ کیمپ امریکا کے چھوٹے سے شہر کی مکمل تصویر ہے۔ وہاں رہنے والا ہر شخص چوبیس گھنٹے انگریزی بولتا ہے۔ امریکی خوراک لیتا اور امریکن کاریں چلاتا ہے۔ وہ امریکی فلمیں اور ٹی وی شوز دیکھتے ہیں۔ انہیں بیس بال اور والٹ ڈزنی کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ یہ سب جاسوس ہیں جنہیں اس کیمپ میں تربیت دی جاتی ہے اور ان میں سے ایک یہاں موجود ہے۔ ان کا سارا پس منظر مصنوعی ہے۔“

نارمن نے براہِ راست فشر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ معلوم کرنا ابھی باقی ہے کہ تم نے اس حساس اور خفیہ ادارے میں یہ معمولی ملازمت کس طرح حاصل کی؟ شاید تمہارے نقطۂ نظر سے یہ اس لیے فائدہ مند تھی کہ چوٹی کے سائنس دانوں، تجربہ گاہوں اور اسٹور روم کی صفائی کے بہانے تمہیں اہم معلومات تک رسائی ہو سکتی تھی۔“ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تم اب تک کتنا نقصان پہنچا چکے ہو۔“

اچانک ہی مسز فشر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ سراسر زیادتی ہے۔ تمہیں میرے شوہر پر ایسا سنگین الزام لگانے کی جرأت کیسے ہوئی؟“

چیف ڈالٹن نے آہستگی سے اپنا چہرہ عورت کی طرف کیا اور بولا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

فشر نے اپنی نظریں ڈالٹن کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟“ اس کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔ ”ہم یہاں اس لیے آئے تھے؟“

نارمن بھی اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”آرام سے بیٹھو۔ تمہاری حقیقت بہت جلد واضح ہو جائے گی اور اس سلسلے میں کارروائی شروع کر دی گئی ہے۔ چیف کارٹر نے ری پبلک ایوی ایشن کی فائل میں تمہاری ملازمت کی درخواست دیکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایلن فشر نے بروکلین کے اسٹریٹ ہائی اسکول سے 1937ء میں گریجویشن کیا تھا۔ اسکول کے ریکارڈ میں اس کی تصویر بھی موجود ہے جس کی ایک کاپی اسکول کے پرنسپل نے مقامی پولیس اسٹیشن کو بھیج دی ہے جو ایک دو روز میں ہمیں مل جائے گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہاری شکل اس تصویر سے کس حد تک ملتی ہے، کیا اتنا کافی نہیں ہے؟“

فشر نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”ہاں۔“ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ اپنے کوٹ کی جیب کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”رک جاؤ۔“ اچانک ہی ایک پولیس اہلکار نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا سروس ریوالور نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”کوئی حرکت مت کرنا۔“

☆☆☆

اگلے ہفتے نارمن پولیس چیف بل کارٹر اور ڈالٹن کے ہمراہ بار میں بیٹھا ہوا تھا۔ کھڑکی سے باہر کرسمس کی سرخ اور سبز بتیاں روشن تھیں جبکہ پورے چاند کی روشنی میں ہلکی ہلکی برف باری نے سماں باندھ رکھا تھا۔ دور کہیں سے ٹرین کی سیٹی کی آواز سنائی دی تو نارمن گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سات چالیس کی ٹرین اپنے صحیح وقت پر آ رہی ہے۔“

بل کارٹر مسکرایا اور بار ٹینڈر کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”تین بلیک لیبل۔“ پھر وہ نارمن کی طرف مڑا اور بولا۔ ”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ٹرین وقت پر ہی آ رہی ہے۔“

اس کے برابر میں بیٹھا ہوا ڈالٹن غراتے ہوئے بولا۔ ”کم از کم اس دنیا میں کوئی کام تو صحیح ہو رہا ہے۔“

نارمن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اب تو تمہیں مطمئن ہو جانا چاہیے کہ اور بھی بہت سے کام صحیح ہو رہے ہیں۔“

ڈالٹن تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، جیسے ایک روسی جاسوس میرے شہر میں رہ کر فوجی راز چراتا رہا۔ تم نے سنا کہ ایف بی آئی والے کیا کہہ رہے تھے کہ ہمارے ایف 105 جہازوں میں جو بہتری لائی گئی، اس کے آٹھ دس مہینے بعد روسی جہازوں میں بھی حیرت انگیز طور پر وہی تبدیلی دیکھنے میں آئی اور شاید ڈاکٹر مورگن بھی اس کھیل میں شامل تھا جو عین میری ناک کے نیچے کھیلا جا رہا تھا۔“

کارٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ ویسے ابھی مورگن کا رول بھی واضح نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے فشر کے کہنے پر عمل نہ کیا ہو اور اسی لیے اسے خاموش کر دیا گیا۔ یہ ایلن فشر کی غلطی تھی کہ اس نے اسی رات اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس مقصد کے لیے ریمن کو اوور ٹائم پر روکا گیا پھر اس نے اپنی بیوی کو فون کال کرنے کے لیے بلایا اور مورگن کو قتل کر کے خون کے دھبے ریمن کی پک اپ پر پھیلا دیے۔“

ڈالٹن نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”شاید ایسا ہی ہوا ہو۔“

نارمن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سب سے اہم بات یہ ہے کہ فشر اور اس کی بیوی حوالات میں بند ہیں جبکہ ریمن رہا ہو چکا ہے پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس دنیا میں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو رہا؟“

ڈالٹن اور کارٹر دونوں نے ہی اثبات میں سر ہلا دیے۔ نارمن نے ایک مختصر وقفے کے بعد پوچھا۔ ”تازہ ترین صورتِ حال کیا ہے؟“

کارٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ 1937ء میں ایلن فشر نام کے کسی طالب علم نے اس اسکول سے گریجویشن نہیں کیا تھا۔ روسیوں نے جس اصلی ایلن فشر کا نام چرایا ہے، وہ 1943ء میں پاس ہوا تھا، اس کا ڈینٹل ریکارڈ آ رہا ہے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ ہمارا ایلن فشر جعلی ہے۔ ایف بی آئی والے اصلی ایلن فشر کو تلاش کر رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ کیلی فورنیا سے باہر گیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بروکلین کاؤنٹی کے دفتر میں ایلن فشر کا شادی کا سرٹیفکیٹ بھی دیکھا ہے اور اس پر کیے گئے دستخط ان دھوکے بازوں کے دستخط سے مختلف ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بہت جلد ساری حقیقت واضح ہو جائے گی۔“

نارمن نے کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ میں خود بھی اس سارے معاملے سے تنگ آ چکا ہوں۔“

اب ڈالٹن کے مسکرانے کی باری تھی۔ وہ بولا۔ ”نارمن! تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اگر تم بیچ میں نہ آتے تو شاید میں ایک بے گناہ شخص کو بجلی کی کرسی پر بھیج چکا ہوتا اور وہ روسی ہماری جڑوں میں بیٹھا میرے ملک کو نقصان پہنچاتا رہتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یہ بات کبھی بھول سکوں گا؟“

نارمن نے قہقہہ لگایا اور بیئر کا گلاس اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”اس حقیقی ہیرو کے نام جسے ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔“

ڈالٹن نے حیرانی سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”رئیل ہیرو... وہ کون ہے؟“

”پی وی ریس۔“ نارمن مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ایلن فشر نے اپنے آپ کو ڈوجرز کا پرستار ظاہر کرتے ہوئے اس کا نام لیا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ڈوجرز کی طرف سے نہیں کھیلا اور یہیں سے مجھے شک ہوا کہ ایلن فشر وہ نہیں جو خود کو ظاہر کر رہا ہے۔“

ڈالٹن اور کارٹر نے قہقہہ لگایا اور اپنے گلاس اٹھاتے ہوئے یک زبان ہو کر بولے۔ ”اجنبی ہیرو پی وی ریس کے نام۔“

نارمن نے ایک طویل گھونٹ لیا اور خوشی کے عالم میں بولا۔ ”امریکا کے نام جو دنیا کا سب سے بہترین ملک ہے اور صحیح معنوں میں بہادروں کا دیس ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔“

ڈالٹن اور کارٹر نے ایک دوسرے کو دیکھا اور وہ یہی سمجھے کہ نارمن کا اشارہ اپنی جانب ہے اور وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھا۔ واقعی اس نے ایک بے گناہ کو بچا کر بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ وہ اس کارنامے پر جتنا بھی فخر کرے، وہ کم ہے۔

✱

للکار

ان عاشق پروانوں کا ماجرا جو للکار سننے اور للکارنے کے عادی تھے

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے...... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی...... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے...... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے...... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے...... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے...... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے...... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے...... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر...... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے...... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر...... ایک للکار ہے۔

طاہر جاوید مغل

انتیسویں قسط

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا...... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے میں اوجھل ہو گیا۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں، زرگاں اور تل پانی۔ بعد ازاں مجھے زرگاں میں پگوڈا پہنچا دیا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ پھر مجھے پگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہمیں ایک عجیب و الخلقت آدمی ملا۔ جس کا ایک ہاتھ اور ناک کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعد ازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔

ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں جا پہنچے۔ میرا آپریشن ہو گیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ میں اور عمران میڈم صفورا کے پاس پہنچ گئے۔ پھر میں نے جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کر ڈالا۔ میں نے ایک روز عمران کو اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ عمران کی کہانی نے مجھے افسردہ کر دیا۔ میں نے جارج کو جہنم واصل کر دیا۔ پھر ہمیں حمید و سمیت زرگاں سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر حکم کے سپاہی ہمارے پیچھے آنے لگے۔ تاہم اس موقع پر عمران کی چھپائی ہوئی جیپ ہمارے کام آئی اور ہم اپنے تعاقب میں آنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے اور بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں رہتے ہوئے میں نے سلطانہ کو آفتاب سے چوری چھپے ملتے دیکھا۔ میں نے سلطانہ اور آفتاب کا پیچھا کیا۔ سلطانہ اور آفتاب ایک گاؤں کے شفا خانے میں گھس گئے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آفتاب، ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ آفتاب کے بات نہ ماننے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ ماریا موجود تھی جو آفتاب کے قبضے میں تھی۔ ہاشم رازی کو بحفاظت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ پھر عمران نے ایک انگریز افسر اینڈرسن کو قائل کر لیا کہ وہ سلطانہ کے بدلے ماریا کو وہاں سے بحفاظت نکال سکتا ہے۔ وہ راضی ہو گیا اور ہمیں خاموشی سے اسپتال کے قریب ایک گھر میں پہنچا دیا گیا۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلا دی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کر کے اس سے مذاکرات کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سلطانہ بھی چھوٹی نال والی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ اچانک کہیں سے فائر ہوا۔ آفتاب کو گولی لگی۔ آفتاب نے بھی فائر کھول دیا اور ماریا ماری گئی۔ آفتاب اور سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ پھر انور خاں بھی زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ ہمیں جیل سے قاسمیہ چوک لے جایا گیا۔ ہمیں سولی چڑھایا جانا تھا۔ اچانک طلال فائرنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ہم بھی حرکت میں آ گئے۔ میارڈ اور اسٹیل مارے گئے۔ ہم وہاں سے نکل کر پرانے قلعے میں آ گئے۔ ہم لوگ شفا خانے گئے تو وہاں زخمیوں کے بیچ رنجیت پانڈے موجود تھا۔ وہ ہم سے قلعے کا دروازہ کھلوانا چاہتا تھا۔ تاہم ہم نے رنجیت پانڈے کو ہلاک کر دیا۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکلے اور طویل سفر کے بعد ہم اللہ آباد پہنچ گئے مگر وہاں مجھے اور عمران کو ڈی ایس پی سجاد نے گرفتار کر لیا اور ہمیں اپنی رہائش گاہ پر لے گیا۔ ہمیں اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ ہمیں لاہور لے آئے۔ بعد ازاں ہم فرح اور عاطف سے ملے۔ پھر وہاں اچانک میڈم صفورا اور دیگر لوگ پہنچ گئے۔ ایک روز پیر احمد تھانوی صاحب کے ہاں میں نے ثروت کی بہن نصرت کو دیکھ لیا۔ ہم نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے نتیجے میں مجھے ثروت نظر آ گئی۔ اس کی شادی ہو گئی تھی اور اس نے مجھ سے دوبارہ نہ ملنے کا کہا۔ پھر میں نصرت سے ملا اور ثروت کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ وہاں ہم پر سیٹھ سراج کے ایک ساتھی نے حملہ کیا مگر وہ بھاگ نکلا۔ نصرت نے مجھے ثروت کے حالات سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ میں نے ثروت سے ملاقات کی۔ اس کی زبانی نصرت کی بیماری کا پتا چلا۔ ہم نے اس کے علاج کا بندوبست بیرونِ ملک کر دیا۔ پھر ہمیں ریان ولیم کی جانب سے ایک کام کی آفر ہوئی۔ ہمیں سہراب جلالی نامی عمر رسیدہ شخص کے پاس کسی خاص شے کے موجود ہونے کا پتا لگانا تھا۔ اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ ”خاص چیز“ کیا ہے۔ میں اور عمران باورچی کے روپ میں سہراب جلالی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے دو خوب صورت ڈاکٹرز بھی موجود تھیں۔ میں نے ڈاکٹر مہناز کو کریدنے کی کوشش کی۔ اسے بھی اس اہم شے کے بارے میں معلومات نہیں تھیں۔ وہاں ایک شخص نے ہماری باتیں سننے کی کوشش کی۔ میں نے اسے پکڑنا چاہا مگر اس نے پستول نکال لیا۔ شہناز نے اسے گلدان دے مارا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میرے ساتھ دھینگا مشتی میں وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ڈاکٹر مہناز کو ہم پر شک ہو گیا تھا کہ ہم جو نظر آ رہے ہیں، وہ نہیں ہیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں اسے بعد میں حقیقت بتا دوں گا۔ پھر میری آنکھوں نے ایسا منظر دیکھا کہ میں مبہوت ہو گیا۔ سہراب جلالی ڈاکٹر مہناز سے ملنے چھت پر آئے۔ جواں سال ڈاکٹر مہناز، جلالی صاحب کے ساتھ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے جلالی صاحب کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ ان کا چہرہ مہناز کے جسمانی گداز میں دھنسا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ جنسی تعلق ہے یا رومانی تعلق۔ ڈاکٹر مہناز کی والدہ کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

وہ جلالی صاحب کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے اسی طرح لیٹی رہی۔ مدھر ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ اس کی زلفوں کو ہوا میں اڑا رہے تھے۔ چھت پر مکمل خاموشی تھی۔ تاریک آسمان پر ستارے چمکتے تھے اور حیرت سے پلکیں جھپکتے تھے، جیسے وہ بھی اس منظر کو دیکھ کر ششدر ہوں... انسان بھی کیا چیز ہے۔ اس کے دل و دماغ کی گہرائی کو ناپنا ناممکن ہے۔

آٹھ دس منٹ اسی طرح گزر گئے پھر شاید ڈاکٹر مہناز نے محسوس کیا کہ جلالی صاحب سکون سے سو گئے ہیں۔ اس نے بڑی آہستگی کے ساتھ خود کو جلالی صاحب سے جدا کیا۔ کوئی آواز پیدا کیے بغیر فوم کے بیڈ سے اتری۔ اپنایت بھری نظروں سے جلالی صاحب کو دیکھتی رہی۔ اپنے بال درست کیے۔ ایک بھاری چادر سے جلالی صاحب کا سکڑا سمٹا جسم کندھوں تک ڈھانپ دیا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں تاریک سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔

میں نے سارا ماجرا عمران کو سنایا۔ وہ بھی اس ساری صورتِ حال پر حیران نظر آیا... یہ باکس ایک معما بنتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف جلالی اور ڈاکٹر مہناز کا رشتہ بھی کچھ عجیب نوعیت کا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جلالی صاحب کے

قیلولے کا ٹائم ٹھیک ایک بج کر پینتالیس منٹ پر شروع ہو جاتا تھا۔ اس دوران میں کوٹھی کے اندر ہر طرف خاموشی کا راج ہوتا تھا۔ کسی کو کھانسی یا چھینک بھی آ جاتی تو وہ لرز جاتا۔ ڈھائی بجے کے لگ بھگ مجھے ڈاکٹر مہناز سے پھر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھی۔ کل والے خوفناک واقعے کے اثرات ابھی تک اس کے سرخ و سپید چہرے پر عیاں تھے۔ مختار ملک کا اچانک ہمارے سامنے آنا اور پھر لڑائی کے دوران میں اس کے سر کا پختہ دیوار سے زوردار تصادم، یہ سب کچھ یقیناً مہناز اور لائبہ کے لیے دہلا دینے والا تھا۔ میں کچن سے ایک ”کک بک“ لے آیا تھا... میں ڈاکٹر مہناز کے صوفے کے پاس ہی ایک کشن پر بیٹھ گیا اور ”کک بک“ اپنے سامنے پھیلا لی۔ ہم دونوں کا انداز ایسا ہی تھا جیسے ڈاکٹر مہناز میرے ساتھ کسی خاص ڈش کی کوکنگ پر بات چیت کر رہی ہو۔

میں نے اس امر کا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ میں نے کل رات جلالی صاحب اور مہناز کو ایک ہی بستر پر دراز دیکھا ہے۔ میں نے بات وہیں سے شروع کی جہاں سے منقطع ہوئی تھی۔ جس وقت جلالی صاحب کے آنے سے ہماری گفتگو کو بریک لگے تھے، اس وقت مہناز مجھے بتا رہی تھی کہ تین چار ہفتے پہلے اس پُراسرار باکس کی خاطر کچھ سخت گیر لوگوں نے یہاں کوٹھی میں کیا اودھم مچایا تھا۔ انہوں نے نہ صرف عمر رسیدہ جلالی صاحب پر تشدد کیا بلکہ ان کے قریبی ملازموں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا۔

میں نے پکوانوں کی کتاب پر جھکے جھکے ڈاکٹر مہناز سے کہا۔ ”کیا اس رات ان لوگوں نے آپ سے بھی پوچھ گچھ کی تھی؟“

”آپ پوچھ گچھ کی بات کر رہے ہیں، ان خبیثوں نے باقاعدہ تشدد کیا۔ بال کھینچے، تھپڑ مارے... مجھے تین گھنٹے سردی میں ننگے پاؤں کھڑا رکھا گیا۔ خوفناک دھمکیاں دیں۔ لائبہ اور دوسری عورتوں کو بھی بُری طرح ہراساں کیا گیا۔ ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں تھا، ہم کیا بتاتے؟ اور جس کو معلوم تھا، وہ بتا کر نہیں دے رہا تھا۔ میرا مطلب جلالی صاحب سے ہے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ باکس ان کے پاس ہے لیکن اگر ان کے ٹکڑے بھی کر دیے جائیں تو وہ بتائیں گے نہیں۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جلالی صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ ان لوگوں کو لگا کہ جلالی صاحب کی صورت میں باکس کا جو واحد سراغ موجود ہے، وہ ناپید ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ روک لیے لیکن یہ صرف ایک ہی بار نہیں ہوا۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔

”تین روز بعد یہ لوگ دوبارہ کوٹھی میں گھس آئے۔ اس مرتبہ جلالی صاحب پر تو ہاتھ ہلکا رکھا گیا لیکن ملازمین کی بہت کم بختی آئی۔ ڈرائیور ریاض کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا۔ اس کے بچے کی کنپٹی پر بندوق رکھی گئی۔ مالی خورشید سے بھی بُرا سلوک کیا گیا۔ اس کی بیوی کے کپڑے پھاڑ دیے گئے۔ ملازموں کے ہاتھوں میں کدالیں اور کسیاں تھمائی گئیں اور ان سے کوٹھی اور فارم میں مشتبہ جگہوں پر کھدائی کرائی گئی۔ کوٹھی میں موجود سب لوگوں کے سیل فون ایک جگہ جمع کر لیے گئے تھے اور لینڈ لائن فون کے تار کاٹ دیے گئے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”لگتا ہے یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اب شاید عارضی طور پر نرم ڈپلومیسی سے کام لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

”ایسا ہی ہے۔“ ڈاکٹر مہناز نے کتاب پر نظریں جمائے جمائے کہا۔ ”پرسوں جو فیشن ایبل عورت ایک یورپین کے ساتھ یہاں آئی تھی، اس کا نام دُرِشہوار ہے۔ چار ہفتے پہلے بھی یہ اپنے ساتھی مائیکل کے ساتھ یہاں پہنچی تھی۔ تب ان کے ساتھ ان کا باس جاوا اور دیگر دس پندرہ بندے بھی شامل تھے۔“

”جاوا... یہ کون ہے؟“

”بڑا خطرناک بندہ ہے۔ قتل پہلے کرتا ہے، نام بعد میں پوچھتا ہے۔ سرحد کے آر پار آتا جاتا رہتا ہے۔ ابھی تک کسی کو ٹھیک سے پتا نہیں کہ یہ اصل میں انڈین ہے یا پاکستانی۔ انڈین فلم انڈسٹری میں جن دو چار لوگوں کے نام کا سکہ چلتا ہے، ان میں ایک یہ جاوا بھی ہے۔ شوبز کے بڑے بڑے گرو گھنٹال اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہیں اور اپنے مسئلوں کے حل کے لیے اس کی طرف دیکھتے ہیں۔“

”تو کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ یہاں جو باکس کا چکر چل رہا ہے، اس کا تعلق کسی طور فلم انڈسٹری یا شوبز وغیرہ سے ہے؟“

”ایسا ہو سکتا ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں۔ جاوا جیسے لوگ پیسے کی خاطر کسی بھی کام میں ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ اس سارے کام میں دو چار سفید فام لوگ بھی ملوث ہیں۔ اس سے شک ہوتا ہے کہ شاید اس باکس والے معاملے کا تعلق شوبز سے نہ ہو بلکہ... یہ کوئی اسمگلنگ وغیرہ کا چکر ہو۔“

”یہ جاوا نامی بندہ کتنی بار یہاں آیا ہے؟“ میں نے

پوچھا۔

''میرے علم کے مطابق تو دو بار آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی آیا ہو لیکن مجھے خبر نہیں۔ جب یہ دوسری بار آیا تھا تو بڑے طیش میں تھا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ اس کا جلالی صاحب پر بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ان کے جسم کی بوٹی بوٹی علیحدہ کر دیتا۔ طیش میں آ کر اس نے ڈرائیور ریاض کو بُری طرح پٹوایا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ مالی خورشید اور اس کے بھائی کی ایک ایک ٹانگ سے رسّی باندھ کر انہیں ایک گھنٹے تک الٹا لٹکائے رکھا، یہاں تک کہ خورشید بے ہوش ہو گیا۔ جاوے کے کہنے پر خورشید کی جواں سال بیوی کے کپڑے پھاڑ دیے گئے۔ اسے بے عزت کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس موقع پر دُرِشہوار آگے آئی اور اس نے مالی کی بیوی کی جان بچائی۔ اس موقع پر انگریز مائیکل نے بھی اس کا ساتھ دیا بلکہ جاوا سے ہلکا سا جھگڑا بھی کیا۔ اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ سارا بھی ایک ڈراما تھا۔ ان لوگوں نے جاوے کی نسبت نرم رویّہ دکھایا اور اس طرح یہاں واپس آنے کے لیے راستہ بنایا۔''

''آپ کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔ پرسوں دُرِشہوار اپنے ساتھ جلالی صاحب کے لیے نایاب چڑیوں کا تحفہ بھی لائی تھی۔''

''لیکن جلالی صاحب کی یادداشت اتنی کمزور نہیں اور نہ ہی وہ اتنے سیدھے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ خطرہ بدستور اپنی جگہ موجود ہے۔ یہ لوگ اس باکس تک پہنچنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے آزما رہے ہیں۔''

''کیا اس حوالے سے جلالی صاحب نے پولیس میں رپورٹ وغیرہ بھی کروائی ہے؟''

''انہوں نے نہیں کروائی تھی۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ ان کا خیال ہے کہ مقامی پولیس کے دو چار لوگ بھی ان گینگسٹرز کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مقامی تھانے دار معاملہ پوچھنے کے لیے یہاں آیا تو جلالی صاحب نے اسے بے نقط سنائیں۔ وہ دُم دبا کر نکل گیا۔ بعد میں یہ بات اوپر تک پہنچی۔ لاہور میں دو تین اعلیٰ پولیس آفیسر ایسے ہیں جو جلالی صاحب کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایس ایس پی حمزہ صاحب ہیں۔ حمزہ صاحب چند دن پہلے خود یہاں آئے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ ایف آئی آر درج کروائی اور کوٹھی کی حفاظت کے لیے گارڈز مہیا کیے۔ بہرحال جلالی صاحب اس سلسلے میں بالکل بے پروا ہیں۔ کبھی کبھی وہ بالکل نوجوانوں کی طرح بے خوف اور پُرجوش ہو جاتے ہیں۔ پرسوں بھی وہ شام کی چائے کے بعد اکیلے ہی واک پر نکل گئے اور کوئی دو گھنٹے بعد واپس آئے۔ میرے منع کرنے سے بھی کوئی اثر نہیں لیتے۔''

''آپ نے کہا ہے کہ دونوں بار جاوا اور اس کے ساتھی یہاں آئے تو ان کے ساتھ کوئی مقامی پولیس والا بھی تھا۔ اس کا پتا چلا؟''

''کہتے ہیں کہ وہ ایک ریٹائرڈ پولیس افسر ہے۔ مقامی پولیس والوں سے اس کی دوستی وغیرہ ہے۔ ایف آئی آر میں اس کا نام بھی آیا ہے۔''

اس دوران میں، میں نے دیکھا کہ عمران کوریڈور میں سے گزرا۔ اس نے دو ایرانی بلّیاں اپنی بغلوں میں دے رکھی تھیں اور ان سے لاڈ کرتا ہوا لان کی طرف جا رہا تھا... جلالی صاحب بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ نہایت قیمتی و نایاب بلّیاں تھیں۔ ان کی آنکھوں کے رنگ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

''یہ کدھر جا رہے ہیں؟'' میں نے مہناز سے پوچھا۔

''آپ کا یہ ساتھی چھپا رستم ہی لگتا ہے۔ بڑی تیزی سے جلالی صاحب کے قریب آتا جا رہا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اسے جانوروں سے دلچسپی ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ جلالی صاحب بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔''

''ذرا دیکھیں یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

مہناز نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دبے قدموں کوریڈور میں پہنچے اور پھر لان کی طرف چلے آئے۔ عمران اور جلالی صاحب جانوروں والے پورشن کی طرف موجود تھے۔ ایک ملازم نے ایرانی بلّیوں والے پنجرے کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر چلے گئے۔ یہاں دو اور بلّیاں بھی موجود تھیں۔ جلالی صاحب بڑی بے تکلفی سے آلتی پالتی مار کر پنجرے کے فرش پر ہی بیٹھ گئے۔ عمران نے بھی تقلید کی۔ وہ دونوں ایک موٹی تازی بلّی کو کوئی دوا کھلانے میں مصروف ہو گئے۔ دوا کو دودھ میں ملایا گیا تھا۔ غالباً یہ وہی تندمزاج حاملہ بلّی تھی جسے چند روز میں بچے دینے تھے۔ بلّی عمران کی گود میں آ کر مست ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ جلالی صاحب کے لیے خوشی اور اطمینان کا باعث تھا۔ بلّیوں سے فارغ ہو کر عمران اور جلالی صاحب ایک قریبی پنجرے میں داخل ہو گئے۔ یہاں زیبرے کا ایک خوب صورت جوڑا تھا۔ مادہ جانور کے پاؤں میں شاید کوئی تکلیف تھی۔ وہ اپنے پنڈے پر ہاتھ نہیں لگانے دے رہی تھی۔ عمران نے آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ کو سہلایا۔ وہ رام نظر آنے لگی۔ تب عمران اور جلالی صاحب نے اس کے

پاؤں کا معائنہ کیا۔ جلالی صاحب نے ڈیجیٹل کیمرے سے پاؤں کی دو تین تصویریں کھینچیں اور کوئی میڈیسن لگائی۔ وہ دونوں آپس میں بڑی محویت اور بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے لیکن پھر اچانک صورتِ حال بدلی ہوئی نظر آئی۔ جلالی صاحب کا مخصوص چڑچڑاپن ان کے چہرے پر جھلک دکھانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مشتعل ہو گئے۔ وہ کسی بات پر عمران کو ڈانٹ رہے تھے۔ عمران صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم ذرا آگے گئے تو یہ آوازیں ہمارے کانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔

جلالی صاحب گرجے۔ ''اگر تم نے اس طرح کی باتیں کرنی ہیں تو چھٹی کر لو۔ ابھی کر لو چھٹی... جسٹ گیٹ آؤٹ۔''

عمران نے کہا۔ ''سر! میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں نے یہاں زیادہ ٹائم دیا تو کچن کا کام سست پڑ جائے گا اور...''

''کیوں سست پڑ جائے گا؟ کیوں پڑ جائے گا؟ کیا وہ تمہارا ساتھی، باورچی نہیں ہے؟ وہ اندھا اور اپاہج ہے؟ تم تو اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہو۔ کیا جھوٹ بولتے ہو تم؟''

''نہیں سر! وہ کر تو لے گا لیکن اسے میری ماتحتی میں کام کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔''

''یہاں عادتیں نہیں چلیں گی۔ وہی کچھ چلے گا جو میں کہتا ہوں۔ اور میں کہتا ہوں کہ کچن سے زیادہ یہاں ''ZOO'' میں تمہاری ضرورت ہے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک نیا ڈاکٹر ہمیں جوائن نہیں کر لیتا۔ اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو پھر تم فارغ ہو اور تمہارا وہ اسسٹنٹ بھی۔'' وہ ایک دم بھنائے ہوئے تھے۔

''سوری سر! میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ آپ جیسا کہتے ہیں، ویسا ہی ہو گا۔ میں کچن کا کام تابی کے سپرد کر دیتا ہوں۔ وہ گزارہ کر لے گا۔''

جلالی صاحب تیوریاں چڑھائے ہوئے اٹھے اور واپس چلے گئے۔ ان کے جسم سے جیسے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ عمران کھوپڑی سہلا کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد میں اور وہ کچن میں موجود تھے۔ عمران نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''یہ تو مصیبت کھڑی ہو گئی ہے۔ بابا جی تو آگ کا گولہ ہیں اور تمہیں ننگا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اب تم سے کھانا پکوائیں گے اور تم ایسا کھانا پکاؤ گے کہ ہمارا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوٹے گا اور بابا جی اچھل اچھل کر چھت کو لگیں گے۔''

''یار! تم ضرورت سے زیادہ پریشان ہو رہے ہو۔ تم مجھے پوری ترکیب کاغذ پر لکھ کر دے دو۔ میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔''

''اوئے باندر! کھانا پکانا پینٹنگ کرنے کی طرح ہوتا ہے۔ اگر میں تمہیں رنگ، برش، ایزل وغیرہ دے دوں اور انہیں استعمال کرنے کی پوری ترکیب بھی بتا دوں تو کیا تم کوئی شاہکار تصویر بنا لو گے؟''

''آلو، بینگن اور مونالیزا میں کافی فرق ہوتا ہے یار۔''

''یہ بڑا اشکی بابا ہے۔ تم اس کو نہیں سمجھتے۔ اگر...''

اچانک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ڈاکٹر مہناز دلکش مسکراہٹ بکھیرتی ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس نے اپنے خوب صورت بال جوڑے کی صورت میں سمیٹے ہوئے تھے اور باقاعدہ ایپرن باندھ رکھا تھا۔ ''ہیلو! گڈ ایوننگ۔'' اس نے کہا۔

''آپ یہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ لوگوں سے کچھ سیکھوں۔ آپ لوگوں کے ہاتھوں میں منفرد ذائقہ ہے۔ ایک دم کلاسیکل انڈین ٹچ۔ آج دوپہر ہم کک بک میں جو ڈش دیکھ رہے تھے، وہ بھی انڈین اسٹائل ہی کی تھی نا؟'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''یعنی آپ میری مدد کرنا چاہ رہی ہیں؟'' میں نے گہری سانس لی۔

''دراصل میں اپنی ہی مدد کر رہی ہوں۔'' وہ مسکرائی۔ ''اگر ہم دونوں مل کر کھانا نہیں بنائیں گے تو جلالی صاحب کا پارا ساتویں آسمان سے کافی اوپر چلا جائے گا۔ ان کی طبیعت بگڑے گی اور پھر بھگتنا مجھے ہی پڑے گا۔''

''تھینک یو۔'' عمران نے کہا۔

''ویسے آپ دونوں ابھی تک اپنی اصلیت کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہے۔'' مہناز کا لہجہ پھر معنی خیز تھا۔

میں نے کہا۔ ''پلیز ڈاکٹر! اس کے لیے تھوڑا سا انتظار کر لیں۔''

مجھ سے کوکنگ سیکھنے کے بہانے ڈاکٹر مہناز نے میرے ساتھ مل کر کھانا تیار کیا اور یہ خاصا بہتر کھانا تھا۔ ہم نے آلو، بینگن کے ساتھ، دیسی مرغ کی یخنی تیار کی اور فرنی بنائی۔ ڈاکٹر مہناز ایک خوش اخلاق اور معاملہ فہم لڑکی کے طور پر سامنے آئی تھی۔ پرسوں یہاں جو سنگین واقعہ رونما ہوا، اس میں مہناز کا کردار قابلِ ذکر تھا۔ اس نے مختار ملک کے ہاتھ پر

گل دان سے کاری ضرب لگائی اور یوں مجھے اس پر حملہ کرنے کا موقع ملا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہاں صورت حال کوئی بھی رخ اختیار کرسکتی تھی۔ ڈاکٹر مہناز قدرے مختلف لڑکی تھی۔ کچھ عرصہ قبل اس کی منگنی ہوئی تھی۔ دو سال بعد یہ منگنی ٹوٹ گئی۔ اب ڈاکٹر مہناز تقریباً چھبیس سال کی تھی۔ اسے اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ وہ اس حوالے سے کچھ بیزار سی ہے۔

میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر مہناز! ایک بات کہوں، اگر آپ برا نہ مانیں تو؟“

”میں زیادہ تر برا نہیں مانتی۔“ وہ مسکرائی۔

”آپ اپنی ہم عمر ڈاکٹرز کے مقابلے میں کافی مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کی گفتگو، آپ کا رہن سہن، آپ کی دلچسپیاں۔“

”آپ نے یہاں میری کون سی دلچسپی دیکھی ہے؟“ اس نے الٹا سوال کیا۔

میں کہنے کو تو بہت کچھ کہہ سکتا تھا کیونکہ میں نے بہت کچھ دیکھا تھا... کل رات والا واقعہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا جب وہ جلالی صاحب کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ مگر میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ”آپ شہر میں جاب کرنے کے بجائے اور کوئی کلینک چلانے کے بجائے یہاں اس فارم میں جلالی صاحب جیسے مشکل بندے کے ساتھ وقت گزار رہی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”بس اتنی سی بات پر آپ نے مختلف کہہ دیا ہے حالانکہ خود آپ میں بھی کئی ایسی باتیں ہیں جن کی بنیاد پر آپ کو نہایت مختلف کہا جاسکتا ہے۔“

”میں ٹھیک سے سمجھا نہیں۔“

اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھاما اور اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ایسے سخت بلکہ کرخت ہاتھ پاؤں بہت کم لوگوں کے دیکھے ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ نے اپنے جسم کے ان حصوں پر بہت ظلم کیا ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ آپ سخت فرش پر سوتے ہیں۔ شدید تکلیف کی صورت میں بھی دوا وغیرہ نہیں لیتے۔“

میں نے کہا۔ ”بس کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک استاد ملا تھا۔ یہ اسی کے دیے ہوئے اسباق ہیں ڈاکٹر صاحبہ! میرا استاد ورد خور تھا۔ اس نے مجھے بھی ورد خور بنا دیا۔“

”ورد خور؟ یہ کیا لفظ ہوا؟“

”ورد سہنے والا۔ درد کھانے والا۔ درد سے پیار کرنے والا۔ میں کبھی اپنے ... گزرا ہوں جن میں بند ہر

جاتا ہے یا پھر انوکھا ہو جاتا ہے۔ شاید مجھ میں بھی انوکھا پن آگیا ہے۔ اپنے دل و دماغ اور خاص طور سے جسم کو اذیت دینا بہت عرصے سے میرا معمول بن چکا ہے۔ اب یہ سب کچھ مجھے بالکل نارمل سا لگتا ہے۔“

”شاید مارشل آرٹ وغیرہ کی بہت کڑی مشقیں کی ہیں آپ نے۔ جسمانی طور پر آپ گرانڈیل نہیں، یعنی نارمل ہی ہیں۔ لیکن پرسوں آپ نے جس طرح اس خونی کو گھمایا اور دیوار سے مار کر ٹھنڈا کر دیا، ایک دم حیران کر دینے والا تھا۔ وہ جسمانی طور پر آپ سے کم از کم ڈیڑھ گنا تو تھا۔“

”لیکن اس میں آپ کا کردار بھی تو ہے۔ اگر اس کے ہاتھ سے پسٹل نہ گرتا تو میرے لیے کچھ کرنا ممکن نہیں تھا۔“

”مارشل آرٹ میں بیلٹس وغیرہ ہوتی ہیں۔ کیا آپ کے پاس بھی کوئی بیلٹ ہے؟“

”میرے اندر کے زخم ہی میری بیلٹس ہیں۔ کچھ زخم چھوٹے ہیں لیکن ایک دو بہت بڑے ہیں۔ ان بڑے زخموں کو آپ میری بلیک بیلٹس کہہ سکتی ہیں۔“

”آپ اچھی گفتگو کرتے ہیں اور آپ کی کہانی بھی دلچسپ لگتی ہے۔ اگر زندگی رہی تو تفصیل سے سنیں گے۔“

”زندگی رہی کیا مطلب؟ آپ اتنی پریشان اور مایوس کیوں ہیں؟“

”جو کچھ یہاں کے حالات ہیں، ان میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”آپ حالات کی فکر چھوڑیں۔ اس فکر کے لیے ہم جو ہیں یہاں۔ انشاء اللہ بال بھی بیکا نہیں ہوگا یہاں کسی کا۔ آپ آرام سے جاکر سوئیں اور یہ یقین رکھیں کہ ہم جاگ رہے ہیں۔“

میرے پُراعتماد لہجے نے اسے متاثر کیا۔ اس نے پُرتشکر نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”آپ دونوں اپنا بہت خیال رکھیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا... وہ مجھے کچن میں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ بہت متناسب جسم کی مالک تھی۔ پُرکشش بھی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ ڈاکٹر تھی۔ کوئی بھی نوجوان اس کے حصول کو اپنی خوش قسمتی سمجھ سکتا تھا۔

عمران کا کمرا تبدیل ہو گیا تھا۔ اب اسے ZOO کی طرف اپارٹمنٹ دے دیا گیا تھا۔ مجھے یہ اکیلا پن اچھا نہیں لگا۔ عمران کے ساتھ رہنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ میں دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ یہ بہار کی ایک پُرفسوں رات تھی

کھڑکیوں سے باہر رات کی رانی کے پھول مہک رہے تھے۔ میں کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا... ثروت کی یاد نے دل کے دروازے پر دستک دی۔ وہ ملی بھی تھی لیکن یوں کہ دل کے زخم کچھ اور گہرے کر گئی تھی۔ وقت کا دریا اسے بہا کر مجھ سے بہت دور لے گیا تھا... اور وہ ایک منجدھار میں بھی تھی۔ ایک سنگین منجدھار تھی لیکن وہ اس کی سنگینی کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ یہ بہار کا موسم تھا اور بہار میں تو پھولوں کے ساتھ ساتھ زخم بھی کھل اٹھتے ہیں۔ سوختہ جگری مہک جاتی ہے۔ مجھے بھی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آرہی تھیں۔ ایک دوسرے کے لیے ہمارا دیوانہ پن... کیلنڈر پر سے تاریخیں کاٹنا اور شادی کے دن کا انتظار کرنا۔ پھر وہ طوفان جس نے سب کچھ الٹ پلٹ دیا۔ ایک بظاہر چھوٹا سا واقعہ جو زندگی بھر کا ناسور بن گیا۔ وہ ایک شب جو ثروت کو گھر سے باہر گزارنا پڑی... اور وہ ایک شب ہماری ساری زندگی پر محیط ہوگئی۔ پھر وقت کا پُرشور ریلا ثروت کو بہا کر جرمنی لے گیا اور مجھے بھانڈیل اسٹیٹ۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے وہ ساڑھے تین برس یاد آئے جن کا ہر ہر پل حوادث اور بے چارگیوں سے عبارت تھا۔ اور وہ لڑکی بھی یاد آئی جو اپنی فطرت میں انوکھی تھی۔ جس نے بھانڈیل اسٹیٹ میں مجھے نئی زندگی دی۔ میرے مصائب کے سامنے ڈھال بنی اور میرے بچے کی ماں بھی۔ اور پھر کیا ہوا؟ پھر ایک دن وہ بھی بچھڑ گئی۔ مجھے بالو کی صورت میں ایک محبت بھری نشانی دے کر اور ایک پیغام دے کر... اسے تلاش کرنا مہروج... اس کا کھوج لگانا... وہ تمہیں ملے گی... کیونکہ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو اور جب وہ کسی خوب صورت دن کی سنہری دھوپ میں تم سے ملے تو اس سے کہنا... ہندوستان کے ایک دور دراز راجواڑے میں تمہاری ایک بہن تھی...

الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ سلطانہ اور ثروت کے چہرے میری نگاہوں میں گڈمڈ ہوتے رہے۔ اچانک میں چونک گیا۔ میری نظر سامنے دیوار پر ٹنگے کیلنڈر پر پڑی۔ آج تو میری پیدائش کا دن تھا۔ ہاں، یہ سالگرہ تھی میری۔ وقت کی دھول میں کیا کچھ گم ہوا تھا۔ اتنے اہم دن بھی اب پہچانے نہیں جاتے تھے۔ خاموشی سے آتے اور گزر جاتے تھے۔

میں کتنی ہی دیر نیم تاریک کمرے میں گم صم لیٹا رہا۔ نیند مجھ سے کتنی دور ہوگئی تھی۔ بہار کے سارے رنگ بجھتے محسوس ہوئے اور ساری خوشبوئیں ماند پڑنے لگیں۔ جب بھی مایوسی طاری ہوتی تھی تو مجھ پر وہی خود اذیتی کی خواہش

غالب آجاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی صحرا ہو یا برفستان جس میں، میں برہنہ بدن بھاگتا چلا جاؤں۔ میرے پاؤں خون اگلنے لگیں، میرے پھیپھڑے چاک ہونے لگیں اور میں بے دم ہو کر گر جاؤں۔

میں لیٹا رہا، بالکل خاموش۔ اتھاہ سوچوں میں ڈوبا رہا۔ اچانک موبائل فون کی وائبریشن ہوئی۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور بُری طرح چونک گیا۔ یہ آسٹریا کا نمبر تھا۔ میں نے کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ کو اچھی طرح بند کیا اور کمرے کے ڈریسنگ روم میں جاکر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے نصرت کی آواز آئی۔

”ہیلو۔“

”ہیلو نصرت! کیسی ہو؟“ میں نے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں بھائی... اور آپ کو سالگرہ مبارک۔“ اس نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

”تھینک یو نصرت کہ تم نے یاد رکھا۔“

”کاش، ہم ایک ساتھ ہوتے۔“

”گھبراؤ مت، انشاء اللہ وہ وقت بھی جلد آئے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اور تمہاری ٹریٹ منٹ کیسی جارہی ہے؟“

”ابھی تو ٹیسٹ ہی ہوئے جارہے ہیں بھائی جان... روزانہ ایک لیٹر خون نکال لیتے ہیں میرا۔“ وہ ٹھنک کر بولی۔

نصرت کو اس کی بیماری کے بارے میں سب کچھ بتایا جاچکا تھا اور اس نے یہ سب کچھ جھیل بھی لیا تھا۔ اب وہ کافی حد تک نارمل محسوس ہوتی تھی اور اپنی بیماری سے لڑنے کے لیے پُرعزم بھی تھی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ دل کڑا کر کے مریض کو اس کی تکلیف کے بارے میں بتا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔

نصرت کے بعد میری بات ثروت سے ہوئی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خوش گوار سا احساس موجود تھا کہ شاید نصرت کو میری سالگرہ کا دن یاد کرانے والی ثروت ہی ہے۔ اُس سے پہلے تو نصرت کو کبھی یہ دن یاد نہیں رہا تھا۔ ثروت سے میری گفتگو سنجیدہ نوعیت ہی کی رہی۔ اس نے تھوڑا سا نصرت کے علاج کے بارے میں ڈسکس کیا پھر مجھے اپنے شوہر کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے بولی۔ ”یوسف بھی منگل تک یہاں آرہے ہیں۔ انہوں نے دو دن پہلے کچھ رقم بھی بھیجی ہے پاکستان سے۔“

”چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ تقریباً روزانہ ہی فون کررہے ہیں۔ یہاں ویانا میں ان کا ایک پاکستانی ڈاکٹر دوست بھی ہے۔ اس سے بھی

ڈسکس کر رہے ہیں۔‘‘ ثروت نے اطلاع دی۔

’’نصرت کے علاج والی آزمائش کافی بڑی ہے ثروت! ہمیں یہ لڑائی مل جل کر لڑنا ہوگی۔ اللہ اسے جلد سے جلد صحت دے۔‘‘

’’جو کچھ بھی ہے تابش! اس کی شروعات تو آپ ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ میں اس کے لیے شکریے کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی ہوں۔‘‘ اس کی آواز قدرے بھرّا گئی۔

’’شکریہ غیروں کا ادا کیا جاتا ہے۔ کیا اب میں تمہارے لیے اتنا ہی اجنبی ہو چکا ہوں؟‘‘

’’لیجیے انکل احمد سے بات کیجیے۔‘‘ ثروت نے جلدی سے فون چچا احمد کو تھما دیا۔

’’ہیلو تابی! کیسے ہو... سالگرہ مبارک۔‘‘ انہوں نے کہا۔

’’تھینک یو انکل... نصرت کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟‘‘

’’لگتا ہے کہ ابھی وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ٹرانسپلانٹیشن کے حوالے سے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نصرت کو ’’اسٹے ایبل‘‘ رکھنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں اور لگتا ہے کہ اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ نصرت کی حالت اب کافی بہتر ہے۔ درد میں افاقہ ہے اور کھا پی بھی رہی ہے۔‘‘

چچا احمد شاید باتیں کرتے کرتے نصرت کے کمرے سے باہر آگئے تھے۔ اسی لیے کھل کر گفتگو کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد گفتگو کا رخ ثروت کے شوہر یوسف کی طرف مڑ گیا۔ چچا احمد کو میں نے تقریباً وہ سارے معاملات بتا دیے تھے جو ثروت کے گھر میں چل رہے تھے۔ یوسف جس طرح اپنی ٹین ایجر جرمن بیوی کے عشق میں گم تھا اور جس طرح ثروت کا استعمال کر رہا تھا، وہ سب کچھ چچا احمد کے علم میں تھا اور جو میں نے نہیں بتایا تھا، اس کا اندازہ انہوں نے خود لگا لیا تھا۔

وہ فون پر گفتگو کرتے ہوئے بولے۔ ’’تابی! یہ یوسف کافی تیز بندہ لگتا ہے۔ دو تین دفعہ فون پر اس سے بات بھی ہوئی ہے میری۔ نصرت کے علاج اور صحت سے تو اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں لگتی لیکن وہ ثروت کو ہر صورت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ وہ دیکھ چکا ہے کہ نصرت کا علاج شروع ہو چکا ہے اور خرچے کا انتظام بھی ہوتا جا رہا ہے، اب وہ اس میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ روپے کا ایک ڈرافٹ بھیجا ہے اس نے۔ چند دن تک شاید خود بھی یہاں آئے گا۔‘‘

’’بس جو بھی ہے چچا جان! یوسف کو یہ شک نہیں ہونا چاہیے کہ نصرت کے علاج کا خرچہ کہیں اور سے ہو رہا ہے۔‘‘

’’لیکن وہ ہے بہت کائیاں... مجھ سے میرے کام کے بارے میں سوال جواب کر رہا تھا۔ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میری انکم کیا ہے، اخراجات کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔‘‘

’’آپ اس کے لیے کوئی معقول سا جواب تلاش کر چھوڑیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے حال ہی میں اپنا کوئی اثاثہ بیچا ہو۔‘‘

’’ہاں، میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی۔ اگر وہ بال کی کھال اتارنے پر آگیا تو پھر ایسا ہی کوئی جواب دینا ہوگا۔‘‘

چچا احمد سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے دیکھا۔ فون پر ایک بڑا اچھا میسج آیا ہوا تھا۔ یہ فرح اور عاطف کی طرف سے تھا۔ مجھے سالگرہ کی پُرجوش مبارک باد دی گئی تھی اور بہت سی نیک تمناؤں کا اظہار کیا گیا تھا۔ آخر میں بالو کی طرف سے ایک فقرہ تھا... ’’پیارے ابو! آج کے دن آپ کو بہت یاد کر رہا ہوں۔ سالگرہ مبارک۔‘‘

میں نے فرح اور عاطف کے اس میسج کو ’’ڈیلیٹ‘‘ کر دیا، اس کے علاوہ چچا احمد اور ثروت والی کال کا ریکارڈ بھی ’’ڈیلیٹ‘‘ کر دیا۔ اس کے بعد میں اپنے فرشی بستر پر لیٹ گیا۔ نہ چاہنے کے باوجود ثروت کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ رات عجیب سرور کی سی کیفیت میں گزری۔ اس سرور کی وجہ یقیناً یہ خیال تھا کہ نصرت کو میری سالگرہ کا دن یاد کرانے والی ثروت ہی تھی۔

صبح مجھے ناشتا اکیلے ہی تیار کرنا تھا اور ایک بار پھر اس کام کا میرے ذہن پر بہت بوجھ تھا لیکن ڈاکٹر مہناز میری مشکل آسان کرنے کے لیے پھر آن موجود ہوئی۔ اس نے میرے ساتھ مل کر ناشتا تیار کیا اور پورے سات بجے خود بھی ناشتے کی ٹیبل پر پہنچ گئی۔ جلالی صاحب ناشتا زیادہ تر ڈاکٹر مہناز کے ساتھ ہی کرتے تھے۔ ان کا ٹیڈی کتا بھی عین اسی وقت ناشتے کی میز کے نیچے اپنا ناشتا کرتا تھا۔ وہ بڑا پھرتیلا کتا تھا اور جلالی صاحب اسے واکنگ اسٹک کی طرح استعمال کرتے تھے۔ جلالی صاحب اور ڈاکٹر مہناز کے تعلق کی کچھ اور گرہیں میرے سامنے کھلی تھیں۔ وہ اس کوٹھی میں جیسے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ جلالی صاحب کو گاہے بگاہے ڈاکٹر مہناز کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ وہ اس کو آوازیں دیتے تھے اور کبھی کبھی بہت سخت بھی بولتے تھے۔ دوسری طرف مہناز بھی ہر وقت ان کی طرف سے باخبر رہتی تھی۔ وہ کیا کھا رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں؟ وہ کئی ایک دوائیں کھاتے تھے اور ان دواؤں کا طویل ٹائم ٹیبل مہناز کو ازبر تھا۔ جلالی صاحب اچھے موڈ میں ہوتے تو پاس بیٹھی مہناز کا ہاتھ تھام لیتے اور جیسے بے خیالی میں اس کے ہاتھ اور بازو کو سہلاتے رہتے۔ کسی وقت اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے اور نرمی سے اس کے کندھے کو مسلتے رہتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ سلسلہ صرف ڈاکٹر مہناز کے ساتھ ہی نہیں تھا۔ ایک دن میں نے انہیں اسی طرح ڈاکٹر لائبہ کا ہاتھ تھامے ہوئے دیکھا۔ پھر ایک دن جب وہ اچھے موڈ میں سیکریٹری ندیم سے باتیں کر رہے تھے، میں نے دیکھا کہ ایک نوخیز ملازمہ رخشی ان کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے اور جلالی صاحب کا بازو اس کے کندھوں پر ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مشکل ’’بزرگوار‘‘ تھے۔ ڈاکٹر مہناز کو اس لحاظ سے بھی جلالی صاحب کی قربت حاصل تھی کہ وہ ان کا علاج معالجہ کرتی تھی۔ ملازمین نے اپنی کوئی مشکل بات جلالی صاحب تک پہنچانا ہوتی تو اس کے لیے ڈاکٹر مہناز کا سہارا لیتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ جلالی صاحب دونوں ڈاکٹرز اور خاص طور سے ڈاکٹر مہناز کی بات تحمل سے سنتے ہیں لیکن مہناز بھی سو فیصد ڈانٹ ڈپٹ سے محفوظ نہیں تھی... کبھی کبھی جلالی صاحب کا خراب موڈ مہناز کی بھی ایسی تیسی کر ڈالتا تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد جلالی صاحب ڈاکٹر مہناز، ڈاکٹر لائبہ اور سیکریٹری ندیم کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ جلالی صاحب کو اپنا چیک اپ کرانا تھا۔ ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد عمران آدھمکا۔ اس کے کپڑوں سے وہی بو آ رہی تھی جو چڑیا گھر میں سے آتی ہے۔

میں نے کہا۔ ’’بس دم کی کسر رہ گئی ہے۔ ورنہ میں یہی سمجھتا کہ کمرے میں بن مانس گھس آیا ہے۔‘‘

’’مادہ بن مانس کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے۔‘‘ اس نے تیزی سے جواب دیا پھر اپنے موبائل کی اسکرین کو گھورنے لگا۔

’’کیوں خیریت ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ریان ولیم صاحب کا فون آ رہا ہے۔ وہاں اور لوگ بھی تھے۔ میں سن نہیں سکتا تھا۔ لگتا ہے کہ کوئی ضروری بات کرنا چاہ رہے ہیں۔‘‘

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کل اس نے ریان صاحب سے رابطہ کیا تھا؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے دریافت کیا۔ ’’مختار ملک کے بارے میں بھی کوئی بات ہوئی؟‘‘

’’ہاں، میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمہارے زورِ بازو کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ شکر کرو کہ مختار ملک کا تعلق ریان اینڈ کمپنی سے نہیں نکلا۔ ورنہ اپنے ہی ساتھی کو مارنے کے جرم میں ہمیں لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔‘‘

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ عمران مسلسل اپنے موبائل کے ساتھ مصروف تھا۔

کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے خود ریان صاحب کو کال ملائی۔ چند سیکنڈ بعد رابطہ ہو گیا۔ ’’ہیلو ایمران!‘‘ ریان ولیم کی آواز اس کے جسم ہی کی طرح بھاری بھرکم تھی۔

’’جی سر... آئی ایم سوری۔ مصروف تھا اس لیے دو بار آپ کی کال کا ٹائپڑ ی۔‘‘ عمران نے انگلش میں کہا۔

’’کوئی بات نہیں۔‘‘ ریان نے جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ’’کل جو کچھ تم نے بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم حسبِ توقع بڈھے کے قریب جانے میں کامیاب رہے ہو۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق ’’زو‘‘ کے جانور تم دونوں کی مشترکہ دلچسپی ٹھہرے ہیں۔‘‘

’’جی ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔‘‘ عمران نے کہا۔ ’’میں ابھی زو میں ہی تھا۔ ایک زیبرے کے پاؤں کا زخم دھو رہا تھا۔‘‘

ریان ولیم نے کہا۔ ’’میرا خیال ہے اب وہ وقت آگیا ہے کہ تمہیں اس معاملے کے بارے میں کچھ اور بتا دیا جائے۔ اس سے تمہیں اس سارے ’’ایشو‘‘ کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور تمہیں آگے کام کرنے میں بھی آسانی رہے گی۔ کیا تم فی الوقت ایسی محفوظ جگہ پر ہو کہ میں اپنی بات جاری رکھ سکوں؟‘‘

’’بالکل جناب! جلالی صاحب، ان کی دونوں ڈاکٹرز اور سیکریٹری ندیم فارم سے باہر ہیں۔ میں اس وقت علیحدہ کمرے میں موجود ہوں۔‘‘

’’تمہیں پتا ہے کہ یہاں کوٹھی میں دو تین جگہ سی سی ٹی وی کیمرے بھی ہیں؟‘‘

’’اس طرف سے بالکل تسلی رکھیں جناب۔ ہم اس کمرے کو اچھی طرح چیک کر چکے ہیں۔‘‘

’’ہاں، میں کہیں بھول نہ جاؤں۔ اس سیکریٹری ندیم کی طرف سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ جتنا ہوشیار نظر آتا ہے، اس سے کہیں زیادہ ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے سر۔‘‘ عمران نے کہا۔

ریان ولیم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ذہن میں بھی یہ سوال بہت مرتبہ ابھرا ہوگا کہ اس باکس میں کیا ہے جس کے لیے یہ ساری جدوجہد اور بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ اس باکس میں ایک بہت قیمتی دھات ہے۔ صرف ''ایک دھات'' لیکن بہت قیمتی... کم از کم میں تو اسے دھات ہی کہوں گا کیونکہ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ تم سن رہے ہو؟''

''جی ہاں۔ پوری توجہ سے۔'' عمران نے کہا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''کہنے کو وہ ایک مورتی ہے۔ اسے آراکوئے کہا جاتا ہے۔ آراکوئے برما میں بولی جانے والی ایک زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے اپنی حفاظت خود کرنے والا۔

''اس مورتی کے حوالے سے مشہور ہے کہ یہ نہ صرف صدیوں سے اپنی حفاظت خود کر رہی ہے بلکہ یہ جس مقام پر موجود ہوتی ہے اس کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اب تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ یہ کس چیز کی مورتی ہے؟ یہ دراصل بدھا کا ایک دو فٹ اونچا مجسمہ ہے...''

ریان ولیم بول رہا تھا۔ اس کے الفاظ موبائل فون میں سے نکل کر ہم دونوں کے کانوں تک پہنچ رہے تھے اور ان الفاظ نے جیسے ہم دونوں کو گھما کر رکھ دیا تھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ یہ ہم کیا سن رہے تھے؟ جو کچھ ریان ولیم بڑی رازداری کے انداز میں بتا رہا تھا، وہ ہمارے لیے نیا نہیں تھا۔ اس دھاتی مجسمے کے بارے میں ہم سے زیادہ کون جانتا تھا۔ یہی بدھا تو تھا جس نے ہمیں میڈم صفورا جیسی شاطر عورت اور صدیقی جیسے منافق بندے سے ٹکرایا تھا۔ اسی نایاب بدھا کی خاطر بھانڈیل اسٹیٹ کے رنجیت پانڈے جیسے خطرناک کمانڈوز پاکستان آئے تھے اور انہوں نے مار دھاڑ کی تھی۔ اسی بدھا کو چرانے کی سزا میں ہمیں یعنی مجھے، صفورا اور صدیقی کو پاکستان سے اٹھا کر انڈیا کی اس دور دراز اسٹیٹ میں پھینکا گیا تھا۔ اس اسٹیٹ میں حالات نے جو رخ بھی اختیار کیا اور جو واقعات بھی رونما ہوئے، اس کی اصل بنیاد تو یہی فاسٹنگ بدھا تھا۔ یہی نایاب مورتی جسے لوگ آراکوئے کہتے تھے۔ یہ بات پورے یقین سے کہی جاتی تھی کہ آراکوئے اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور اسے ناجائز طور پر اپنے قبضے میں رکھنے والے برباد ہوتے ہیں۔ ہماری آخری اطلاعات کے مطابق یہ بدھا بھانڈیل اسٹیٹ میں تھا۔ وہاں کے بڑے پگوڈا میں... لیکن اب یہ سفید فام ریان ولیم ہم پر انکشاف کر رہا تھا کہ وہ یہاں ہے۔ شیخوپورہ کے اس فارم میں یا کہیں آس پاس۔ ایک مستطیل چوبی ڈبے میں بند اور کچھ خطرناک لوگ اس کے پیچھے ہیں۔

عمران نے اپنے ''ری ایکشن'' سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ریان ولیم بدستور فون پر بول رہا تھا۔ ''... یہ مجسمہ آراکوئے کچھ لوگوں کے لیے بے حد قیمتی ہے۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس مجسمے کے بہت سے مداح ابھی اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہ یہاں پاکستان میں لاہور کے قریب موجود ہے۔ اگر یہ نیوز پھیل گئی تو یہاں بہت ہنگامہ ہو سکتا ہے۔ بہت سے ملکی اور غیر ملکی گروہ اس علاقے کا رخ کر سکتے ہیں۔ ہم اس کام کو جتنی جلدی نمٹا لیں، اتنا ہی اچھا، گا۔''

عمران نے کہا۔ ''ذہن میں بہت سے سوال ابھرتے ہیں جناب! سب سے اہم سوال تو یہی ہے کہ یہ خاص بدھا یہاں پہنچا کس طرح اور یہ کس کی ملکیت ہے؟''

ریان بولا۔ ''میری معلومات بھی اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اس حوالے سے کسی ابرار صدیقی کا نام لیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہی شخص یہ بدھا انڈیا سے یہاں لایا ہے۔ اب یہ صدیقی کہاں ہے، اس کا بھی کسی کو کچھ پتا نہیں۔ تم نے بھی کل بتایا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کے بیان کے مطابق یہ بدھا ایک چاندنی رات میں ایک تیز رفتار گاڑی میں سے نہر کے کنارے جھاڑیوں میں گرا تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ صدیقی ہی اس بدھا کو لے کر کہیں جا رہا ہو اور کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ ان لوگوں سے مجسمے کو بچانے کے لیے اس نے اسے جان بوجھ کر پھینک دیا ہو۔''

شاید ریان ولیم کی گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر کسی وجہ سے سگنل خراب ہو گئے اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ہم سناٹے میں تھے۔ یہاں فارم ہاؤس میں آنے کے بعد ہم نے پُراسرار باکس کے بارے میں کئی بار سنا تھا لیکن ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس باکس کا تعلق نایاب مجسمے کی اسمگلنگ کے ان واقعات سے نکل آئے گا جن کو ہم تقریباً بھول چکے ہیں۔

عمران نے کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا گڑ گوٹالا ہو گیا ہے جگر! آراکوئے کا بھوت پھر زندہ ہو گیا ہے نہ صرف زندہ ہو گیا ہے بلکہ زرگاں سے ترت یہاں شیخوپورہ روڈ کے اس فارم میں بھی آ پہنچا ہے۔ تمہاری سوگند، میری بدھی چکرا گئی ہے۔ بدھی کا مطلب سمجھتے ہو نا تم؟''

میں نے کہا۔ ''صدیقی کا نام آنے کے بعد اس معاملے میں شبہے کی گنجائش کم ہی رہ گئی ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہاں صدیقی اور بدھا کا نام ساتھ ساتھ آ رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ صدیقی ہی بدھا کو پھر انڈیا سے پاکستان لے آیا ہو۔''

''بڑا مبارک دن ہے۔ کئی مہینوں کے بعد تم نے کوئی عقل کی بات کی ہے۔'' عمران نے کہا اور پریشان بکری کی طرح سر جھکا لیا۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''یار! وہی جو تم کہنا چاہ رہے ہو۔ تمہیں یاد ہوگا جب ہم اسٹیٹ سے واپس روانہ ہونے لگے تھے تو صدیقی کو بہت تلاش کیا تھا۔ میڈم صفورا نے پورے دو دن اس کو کھوجنے میں لگائے تھے۔ پھر ایسے شواہد ملے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ صدیقی ہم سے پہلے ہی اسٹیٹ سے نکل چکا ہے۔ یاد ہے نا تمہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑ کر بولا۔ ''اگر سچ پوچھتے ہو تو مجھے اسی وقت شبہ سا ہوا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ یہ بندہ اگر واقعی یہاں سے گیا ہے تو پھر جاتے جاتے کوئی کارنامہ انجام دے گیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ صدیقی نے اسٹیٹ سے نکلتے نکلتے وہ بدھا پھر چرا لیا ہے جس کے لیے وہ وہاں سزا کاٹ رہا تھا اور جس کی چوری نے چار سال پہلے ہر جگہ تہلکہ مچایا تھا۔''

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔''

''لیکن یہ کام کچھ آسان تو نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''تم بھول رہے ہو کہ ایڈووکیٹ صدیقی ایک شاطر ترین شخص کا نام ہے۔ اس کے چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ ہے اور پھر ان دنوں اسٹیٹ میں جس طرح کے حالات تھے تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ حکم اور اس کے حواری گوروں کو شکست ہو چکی تھی۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ حفاظتی انتظام درہم برہم ہو چکے تھے۔''

''لیکن پھر بھی آراکوئے کی بڑی اہمیت تھی یار! اگر اسے غائب کیا جاتا تو چند گھنٹوں کے اندر زرگاں میں تہلکہ مچ جاتا۔''

''تمہارے اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں جگر... یہ بھی تو ممکن ہے کہ پگوڈا کے اندر اصلی مورتی کی جگہ اس کی نقل رکھ دی گئی ہو۔''

عمران کی بات میں وزن تھا۔

ایک دم ہی صدیقی کا کردار ہماری نظروں میں زبردست اہمیت اختیار کر گیا تھا اور کسی حد تک صفورا کا کردار بھی۔ صفورا اور صدیقی نوادرات کے حوالے سے دو پرانے دوستوں کی طرح تھے۔

میں اور عمران اس بارے میں دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ باکس والے معاملے میں ہماری دلچسپی ایک دم ہی بہت بڑھ گئی تھی۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ 16 ملین ڈالرز کے انعامی مقابلے اور فربہ اندام ریان ولیم سے شروع ہونے والے واقعات کے ڈانڈے یوں اس فارم ہاؤس اور پھر آراکوئے سے جا ملیں گے۔ ریان ولیم کو بھی کوئی خبر نہیں تھی کہ اس نے عمران کو جس کام پر مامور کیا ہے اور جس چیز کا کھوج لگانے کو کہا ہے، اس چیز سے عمران کا پہلے ہی گہرا واسطہ رہا ہے۔ بہرحال، اب بھی آراکوئے کی یہاں موجودگی کے بارے میں ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

عمران اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ تیزی سے سگریٹ بھی پھونک رہا تھا۔ اپنی خوب صورت ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے بولا۔ ''یار! یہ تو بڑا قضیہ شروع ہو جائے گا۔ سارے کے سارے حالات پلٹ آئیں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ انڈیا سے پھر خطرناک کمانڈوز آئیں گے اور آراکوئے کو ڈھونڈیں گے؟''

''بالکل ایسا ہی ہو سکتا ہے... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، ریان ولیم جیسے لوگ بھی اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر کیا ہونا چاہیے؟''

''یہ بدھا اگر واقعی جلالی کے آس پاس ہے تو پھر اسے جلد از جلد برآمد ہونا چاہیے اور ہماری حفاظت میں آنا چاہیے... لیکن یہ بابا جی... اپنی ذات شریف میں خود ایک بہت بڑی مصیبت ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ آسانی سے کچھ بتا کر دیں گے۔''

''اور سختی کر کے ان سے پوچھنا ممکن ہی نہیں۔ یہ چلتا پھرتا مدعا ہیں... آناً فاناً اللہ کو پیارے ہو سکتے ہیں۔''

''اصل مسئلہ تو یہی ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''ورنہ ریان اور جاوا جیسے لوگ دو گھنٹے میں ان کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیتے۔''

''کوئی ترکیب سوچو۔''

وہ کش لے کر بولا۔ ''شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید ڈاکٹر مہناز سے جلالی کا لگاؤ کچھ کام آ سکتا ہے۔ یعنی اگر مہناز کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو اسے بچانے کے لیے یہ حضرت اپنی زبان کھول دیں گے لیکن اب اندازہ ہوا ہے کہ ایسے معاملوں میں یہ بالکل بے حس ہیں۔ ان حضرت نے رشتوں ناتوں کے حوالے سے اپنے اندر کوئی کمزوری رہنے

ہی نہیں دی۔ مہناز اور دوسری جوان ملازماؤں کو یہ اپنے سکون اور راحت کے لیے استعمال ضرور کرتے ہوں گے لیکن ان کے لیے کوئی جذباتی وابستگی یہ اپنے اندر نہیں رکھتے۔"

"پھر تو ایک ہی حل سمجھ میں آتا ہے۔ کسی طرح باکس کا اصل مالک سامنے آجائے۔ یعنی وہ بندہ جس نے چلتی گاڑی سے باکس پھینکا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی انجان شخص کو ساری بات سمجھا کر اور باکس کا مالک بنا کر جلالی صاحب کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ انہیں مطمئن کر دے؟"

"یہ حضرت کچی گولیاں نہیں کھیلے بلکہ پکے گولے کھیلے ہوئے ہیں۔ تمہیں بتایا ہے نا کہ کچھ عرصہ فوج میں رہے ہیں۔ انہیں الو بنانا آسان نہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ دس پندرہ دن پہلے ایک پینٹ کوٹ والا شخص "مالک" بن کر آیا تھا یہاں۔ پورا پورا ڈراما کیا اس نے۔ لیکن جلالی صاحب نے باکس کے بارے میں تفصیل پوچھی۔ باکس کا رنگ کیا ہے؟ تالا کس کمپنی کا لگا ہوا ہے؟ باکس کے اندر مجسمہ کس چیز میں لپٹا ہوا ہے؟ اس پر کوئی داغ ہے یا وہ بے داغ ہیں ہے؟"

"پھر کیا ہوا؟"

"اس بندے کو بھی ڈاکٹر راشد کی طرح صرف ایک چڈی میں یہاں سے بھاگنا پڑا۔ گرے ہاؤنڈ کتے اس کی گاڑی کو کافی دور تک "سی آف" کرنے گئے۔"

"واقعی یار! اگر یہ بابا جی کہیں اللہ کو پیارے ہو گئے تو... آرا کوئے تو ایک معما بن کر رہ جائے گا۔"

رات کو کھانے کے بعد میں عمران کا کمرا دیکھنے چلا گیا۔ یہ شاندار کمرا تھا۔ ڈبل بیڈ، فریج، ٹی وی سب کچھ موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ کمرا اس سے پہلے چھوٹے ویٹرنری ڈاکٹر لطیف کا تھا۔ عمران نے کہا۔ "مجھے مبارک باد دو۔ میری ترقی ہوگئی ہے۔ میں باورچی سے ڈاکٹر بن گیا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"سنا ہے کہ نیا ڈاکٹر عقیل یہاں آنے سے مکر گیا ہے۔ اب جونیئر ڈاکٹر لطیف ہی جانوروں کی دیکھ بھال کا کام سنبھالے گا۔ مجھے اس کے اسسٹنٹ کا درجہ دے دیا گیا ہے اور اس کا کمرا بھی مجھے عنایت کر دیا گیا ہے۔ وہ خود بھگوڑے ڈاکٹر راشد کے کمرے میں منتقل ہو گیا ہے۔"

"ڈاکٹر عقیل کیوں نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

"کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے یہاں کے گڑبڑ حالات کا پتا چل گیا ہو۔ آج کل جو کچھ یہاں چل رہا ہے، وہ کسی کے لیے بھی پسندیدہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن میرے لیے بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔"

"کیوں، تمہیں جنگلی بھینس کا دودھ دھونا پڑتا ہے؟"

"نہیں یار! جب میں کسی اچھے آرام دہ کمرے میں ہوتا ہوں اور وہاں ڈبل بیڈ بھی ہوتا ہے تو مجھے کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی ساتھی ہو۔"

"تو فتح محمد کو ساتھ سلا لیا کرو۔"

"حس لطافت تو تمہیں چھو کر نہیں گزری۔ کھوتے! کسی خوبرو لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔ چلو، وہ اس ڈبل بیڈ پر نہ آئے لیکن کم از کم کوئی آس امید تو ہو۔"

"تو کوئی یارانہ جوڑ لو یہاں بھی۔ یہ تمہارے لیے کون سا مشکل کام ہے۔"

"یہاں ڈاکٹر مہناز کے سوا کوئی نظر ہی نہیں آتی اسٹینڈرڈ کی۔ اب سوچو نا جس نے ریما اور نرگس جیسی دل کش خواتین کے ساتھ وقت گزارا ہو، اس کا کوئی معیار تو ہوگا۔ ویسے لڑکی یہ مہناز بھی ٹھیک ہے۔ کل لان میں ڈاکٹر لائبہ، سیکریٹری ندیم اور کچھ دوسرے ملازموں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہی تھی۔ میں تو بس کھڑکی میں سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اتنی خوب صورتی سے دوڑ کر رن بناتی ہے کہ فیلڈر گیند ہاتھ میں پکڑ کر تکتا رہ جاتا ہے۔ رن آؤٹ کرنا ہی بھول جاتا ہے۔"

"پھر کیا ارادے ہیں؟"

"یار! اسے باؤلنگ کرانے کو دل چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ کیچ پکڑا ہی دے۔"

"وہ باؤلر کو بیک ڈرائیو مارے گی اور تمہاری مڈل اسٹمپ اڑا دے گی... میں اس کے مزاج کو کچھ کچھ سمجھتا ہوں۔ لگتا ہے کہ اپنی منگنی ٹوٹنے کے بعد اسے ہر جواں مرد سے الرجی ہوگئی ہے۔ وہ جلالی صاحب کے ساتھ بہت مطمئن ہے۔"

"لیکن جگر! جلالی صاحب نے تو زیادہ سے زیادہ رمضان شریف تک اللہ کو پیارے ہو جانا ہے۔"

"وہ ہو بھی گئے تو وہ ہم جیسوں کو گھاس نہیں ڈالے گی۔ کوئی اور ادھیڑ عمر ڈھونڈ لے گی اور شاید شادی بھی کر لے۔"

"اچھا، دوسری ڈاکٹر لائبہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ ذرا ماٹھی ہے لیکن گزارہ کر جائے گی۔ تھوڑی لفٹ بھی کرا رہی ہے۔ کل اس نے..."

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ ایک دم اپنی چیسٹ پاکٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں موبائل فون موجود تھا۔ وہ چونک کر بولا۔ "اوئے، یہ کیا؟ یہ موبائل تو ابھی آن ہے..."

گاڈ... یہ تو بند ہی نہیں ہوا۔“

اس نے جلدی سے موبائل آف کر دیا۔ میں نے دیکھا اسکرین پر شاہین کا نمبر تھا... وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔ اب یہ ساری گفتگو اس نے شاہین کو سنانے کے لیے کی تھی اور ظاہر یہ کیا تھا جیسے غلطی سے موبائل کھلا رہ گیا ہے۔

”تم بہت بے ہودہ اور خبیث شخص ہو۔ جو لوگ اپنی ناسمجھی کی وجہ سے تمہیں ہیرو کہتے ہیں، اس لفظ کی توہین کرتے ہیں۔“

”اور تم کیا کر رہے ہو۔ تم ”توہینِ چینل“ کر رہے ہو۔ یاد رکھو بعض اوقات اس کی سزا توہینِ عدالت سے بھی کڑی ہوتی ہے۔“

”ماشاء اللہ! کیا سزا ہوتی ہے اس کی؟“

”تمہارا کارٹون بنایا جائے گا اور اسے انڈیا کے کسی آئٹم سانگ پر رقص کرایا جائے گا۔ وہ سانگ بھی ایسا ہوگا جس کے بول پوری طرح سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ اور تمہیں پتا ہی ہے جب ایسے گانوں کے بول پوری طرح سمجھ میں نہیں آتے تو سننے والوں کے ذہنوں میں کیسے کیسے گندے خیالات آتے ہیں... وہ گانا...“

عمران کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گیا۔ ایک دم اس کے چہرے کی ساری غیر سنجیدگی سمٹ کر اس کی آنکھوں میں کہیں غائب ہو گئی۔ وہ کچھ سن رہا تھا۔ میں نے بھی اس کی سماعت کا تعاقب کیا۔ یہ چکور کی آواز تھی جو سناٹے میں بلند ہوئی تھی۔ یہ آواز فارم ہاؤس کی باؤنڈری کے باہر سے آئی تھی۔

”سن رہے ہو؟“ عمران نے پوچھا۔

”ہاں، چکور کی آواز ہے شاید۔“

”چکور ہی کی ہے لیکن اصلی نہیں۔ کوئی یہ آواز نکال رہا ہے۔“ وہ یقین سے بولا۔

جانوروں کے حوالے سے عمران کی معلومات کو جھٹلانا بہت مشکل تھا۔ یہ بالکل چکور کی آواز تھی لیکن عمران کہتا تھا کہ نہیں ہے۔ تو کیا درختوں کی تاریکی میں کوئی شخص کسی دوسرے کو کوئی اشارہ وغیرہ دے رہا تھا؟ یہ کوئی پہرے دار ہو سکتا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی غیر متعلق شخص ہو۔ میں اور عمران دونوں اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ میری شلوار کے نیفے میں ابھی تک وہ پسٹل موجود تھا جو مختار ملک سے لڑائی کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا۔ ہم تیزی سے باہر نکلے۔ جانوروں کے پنجرے کے درمیان سے ہوتے ہوئے فارم کے بڑے گیٹ کی طرف آئے... ابھی ہم گیٹ سے تیس چالیس قدم دور تھے کہ پہلا فائر سنائی دیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ پستول کا فائر تھا۔ فوراً بعد دو اور گولیاں چلیں، یہ رائفل کی تھیں۔ یہ شوٹنگ بھی سو ڈیڑھ سو گز دور ہو رہی تھی۔ ان آوازوں نے ایکا ایکی فارم ہاؤس میں تہلکہ سا مچا دیا۔ پنجروں میں پرندے پھڑپھڑانے لگے اور کئی چوپایوں نے چلانا شروع کر دیا۔ گارڈز بھی آوازوں کی طرف لپکے۔ ہم مین گیٹ سے نکلے اور درختوں کی طرف بڑھے۔ باؤنڈری وال کے اردگرد بیس تیس میٹر جگہ بجلی کی ٹیوبس سے نیم روشن تھی مگر اس کے بعد گہری تاریکی تھی۔ کوئی سو میٹر آگے جانے کے بعد ہمیں ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں نے دیکھ لیا، یہ سیکریٹری ندیم کی سفید مہران تھی۔ وہ کچے راستے پر آڑی ترچھی کھڑی تھی۔ پھر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے ندیم بھی دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ حواس باختہ تھا۔

”کیا ہوا ندیم صاحب؟“ فتح محمد نے بلند آواز میں پوچھا۔

”وہ نکل گئے۔“

”کون تھے؟“

”پتا نہیں، انہوں نے مجھ پر گولی بھی چلائی ہے۔“

اس وقت ہم نے دیکھا کہ مہران کار راستے سے اتری ہوئی تھی اور اس کا ایک پہیا گڑھے میں تھا۔ غالباً ندیم نے کسی کے پیچھے جانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام ہوا تھا۔

دو تین اور گارڈز بھی دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ہمیں تھوڑے فاصلے پر لوہے کی چھوٹی سی ہتھ ریڑھی بھی نظر آ رہی تھی۔ ایسی ریڑھیاں مزدور، تعمیراتی سامان ڈھونے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ فتح محمد نے ٹارچ کی روشنی میں ہانپتے کانپتے ہوئے ندیم کا معائنہ کیا۔ وہ زخمی ہونے سے محفوظ رہا تھا۔ ہاں، گاڑی کی ونڈ اسکرین میں گولی کا سوراخ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”ہوا کیا ہے ندیم صاحب؟“ فتح محمد نے دوبارہ پوچھا۔

وہ اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولا۔ ”میں پُلیا کی طرف سے آ رہا ہوں۔ روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ دو بندے ہتھ ریڑھی میں سے کچھ نکال کر جیپ میں رکھ رہے تھے۔ یہ کوئی بڑا تھیلا سا تھا۔ بڑی جلدی میں نظر آ رہے تھے وہ۔ میں نے آواز دے کر پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ وہ جواب دینے کے بجائے جلدی سے جیپ میں بیٹھ گئے۔ ہتھ گاڑی بھی وہیں چھوڑ دی۔ میں نے ان کی طرف جانا چاہا تو انہوں

نے فائر کر دیا۔ یہ مجھے ڈرانے کے لیے تھا۔ میں نے بھی گاڑی سے رائفل نکال لی اور جیپ کے ٹائر کو نشانہ بنانا چاہا... اس کے بعد فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں اس بڑے درخت کے پیچھے تھا جو ہتھ گاڑی کے پاس نظر آ رہا ہے۔ چار پانچ گولیاں چلانے کے بعد انہوں نے جیپ بھگا دی۔ میں نے مہران پر ان کے پیچھے جانے کی کوشش کی لیکن ریورس کرتے ہوئے یہ ٹائر یہاں کھڈے میں چلا گیا۔“ ندیم نے تاسف سے کہا۔

فتح محمد نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، اعشاریہ تین آٹھ... کی ایک گولی ونڈ اسکرین میں لگی تھی جبکہ ایک گولی نے پچھلے دروازے میں سوراخ بنایا تھا۔

ہم سب فوراً واپس کوٹھی میں پہنچے۔ جلالی صاحب سلیپنگ گاؤن میں تھے اور بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ انہیں ساری صورتِ حال بتائی گئی۔ دو گاڑیاں فوراً مشتبہ جیپ کی تلاش میں روانہ ہوئیں۔ جلالی صاحب نے دونوں گاڑیوں سے موبائل فون پر رابطہ رکھا ہوا تھا۔ قریباً ڈھائی گھنٹے بعد دونوں گاڑیاں گھوم پھر کر واپس آ گئیں۔ مشتبہ جیپ کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

تنہائی ملی تو میں نے عمران سے پوچھا۔ ”یہ کیا چکر چل رہا ہے؟“

”کافی سنگین چکر لگتا ہے۔ جلالی صاحب بھی پریشان ہیں۔“

”کہیں یہ وہی باکس والا معاملہ ہی تو نہیں؟“

”ہو بھی سکتا ہے۔ اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ آرا کوئے والا باکس باباجی کے ہاتھ سے بھی نکل گیا ہے۔“

”کیا اسے اتنی آسانی سے ڈھونڈ لیا گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا تابی! یار لوگوں نے صدام کو بھی ڈھونڈ نکالا تھا مگر ہم میں سے کچھ نکتہ چیں اب بھی ماننے کو تیار نہیں۔ بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ صدام کے بجائے اس کے کسی ہم شکل کو پھانسی دی گئی تھی۔ انسان چاند پر قدم رکھ چکا لیکن ہم اسے اب بھی ڈراما قرار دیتے ہیں۔ نائن الیون کے حوالے سے بھی نئی نئی موشگافیوں کی فیکٹریاں ہم نے لگا رکھی ہیں۔ میرے اور ٹنڈولکر کے بارے میں بھی کئی بے ہودہ خبریں لوگ پھیلاتے رہتے ہیں۔“

”تمہارا اور ٹنڈولکر کا کیا میل ہے؟“ میں مسکرایا۔

”اسی کو تو بے ہودہ اور بے بنیاد خبر کہتے ہیں۔“ وہ دانائی سے بولا۔ ”نہ میں ٹنڈولکر کی طرح کرکٹ کھیلتا ہوں، نہ وہ کسی نیوز چینل کا اینکر ہے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلی فرصت میں ریان ولیم کو فون کر کے یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہیے۔“

”ہاں، یہ تو ضروری ہے۔“ میں نے تائید کی۔

اس نے سگریٹ سلگایا۔ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ کچھ دیر تک کمرے میں گہری خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ ”ویسے تابی! ہمیں اس صورتِ حال کا ایک اور پہلو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے... سچویشن کا ایک دوسرا اینگل بھی ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیا؟“

اس نے محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا، تب دھیمے لہجے میں بولا۔ ”یہ امکان بھی ہے کہ جلالی صاحب کو ٹریپ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔“

”وہ کس طرح؟“

”ہم کچھ دیر کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ جلالی صاحب نے آرا کوئے والے باکس کو حفاظت کی غرض سے فارم ہاؤس کے اردگرد کہیں چھپا رکھا ہے۔ انہوں نے یہ کام اکیلے کیا ہے اور اس جگہ کی خبر ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر کچھ دیر پہلے جو واقعہ ہوا ہے، اس نے یقیناً جلالی صاحب کو بہت پریشان کیا ہوگا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر وہ کیا چیز تھی جسے کچھ لوگوں نے ہتھ گاڑی سے نکال کر جیپ میں رکھا اور پھر بھاگ گئے۔ نہ صرف بھاگے بلکہ خود کو بچانے کے لیے باقاعدہ فائرنگ بھی کی۔“

”ہاں، بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ ان کا دھیان ”باکس“ کی طرف بھی جا سکتا ہے۔“

”بالکل جا سکتا ہے... بلکہ گیا ہوگا۔ اب سوچو... وہ کیا کرنا چاہیں گے؟ وہ تصدیق کرنا چاہیں گے کہ باکس اپنی جگہ پر موجود ہے یا نہیں۔“

میں نے سنسنی محسوس کی۔ عمران کی بات میں زبردست منطق موجود تھی۔

میں نے کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ جلالی صاحب کا پیچھا کیا جائے گا؟“

”اللہ تمہیں نرینہ اولاد دے۔ میرا مطلب بالکل یہی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اگلے ایک دو دن میں ہمیں جلالی صاحب کی آمد و رفت پر نظر رکھنی ہوگی۔“

”یقیناً... خاص طور پر اس وقت جب وہ کہیں اکیلے

روانہ ہوں۔"

"فرض کیا وہ روانہ ہوتے ہیں اور ہمیں پتا بھی چل جاتا ہے، تو پھر؟" میں نے پوچھا۔

"پھر ان کا پیچھا کیا جا سکتا ہے۔ "زو" میں تین پک اپ گاڑیاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک کی چابی میرے پاس موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک اسکوٹر بھی قابلِ استعمال حالت میں ہے۔"

"یہ لمبا چوڑا کھیل لگتا ہے عمران۔ جاوا جیسے لوگ اس میں ملوث ہیں۔ فرض کیا سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا ہم نے سوچا ہے۔ ہم نے جلالی صاحب کا پیچھا بھی کر لیا لیکن جب جلالی صاحب موقع پر پہنچے اور پندرہ بیس مسلح بندے وہاں آدھمکے تو پھر؟"

"یار! تم سب کچھ پہلے ہی تو مت سوچ لو نا۔ کچھ فیصلے موقع پر بھی کیے جاتے ہیں۔ اگر ہمیں محسوس ہوا کہ جلالی صاحب کے آس پاس زیادہ گڑبڑ ہے تو ہم انہیں آگے جانے سے روک بھی سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم انہیں بتا سکتے ہیں کہ انہیں ٹریپ کیا جا رہا ہے۔ وہ جہاں جا رہے ہیں، وہاں کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ لیکن ابھی تو یار یہ سب مفروضہ ہی ہے نا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی چکر ہی اور ہو۔"

وہ رات گزر گئی۔ اگلے دن بھی کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ فارم ہاؤس کے اردگرد چوکیداروں کی تعداد بڑھا دی گئی تھی۔ حسبِ سابق اس واقعے کی رپورٹ بھی جلالی صاحب نے پولیس میں درج نہیں کرائی۔ تاہم وہ پریشان نظر آتے تھے اور یہ پریشانی واضح طور پر محسوس ہوتی تھی۔ یہ تیسرے دن کا واقعہ ہے۔ عمران ڈاکٹر لطیف کے ساتھ لاہور گیا ہوا تھا۔ ایک ایرانی بلی بھی ساتھ گئی تھی۔ اس کا کوئی چیک اپ ہونا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں جانوروں کے لیے کچھ ادویات بھی لے کر آنا تھیں۔ ان کی واپسی شام کے فوراً بعد ہو جانا تھی لیکن پھر عمران کا فون آیا کہ قیمتی ایرانی بلی کو مزید ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے اور وہ کل سہ پہر سے پہلے واپس نہیں آسکیں گے۔ یہ وہی حاملہ بلی تھی جس کو بچے جنم دینے تھے۔

رات کوئی دس بجے کا وقت ہوگا۔ کوٹھی کی بیشتر روشنیاں گُل ہو چکی تھیں۔ وسیع و عریض لان بھی خالی تھا۔ میں دوسری منزل پر واقع اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ یہاں سے مجھے کوٹھی کا پورچ صاف نظر آتا تھا۔ وہ شیورلیٹ بھی دکھائی دیتی تھی جسے جلالی صاحب زیادہ تر سفر کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پچھلے تین دن سے میں نے مسلسل پورچ پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ عمران بھی یہی کر رہا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمیں جلالی صاحب کی آمد و رفت کی خبر رہے لیکن وہ ان تین دنوں میں کہیں نکلے ہی نہیں تھے۔ صرف ایک صبح پیدل نکلے تھے۔ طرح دار ڈاکٹر مہناز بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ تھوڑی سی چہل قدمی کر کے واپس لوٹ آئے تھے۔

اچانک میں چونکا۔ مجھے جلالی صاحب کی شیورلیٹ کے قریب ایک سایہ سا نظر آیا۔ شیورلیٹ کے قریب ہی چھوٹی پوٹھوہار جیپ کھڑی تھی۔ سائے نے جیپ کے گرد مشکوک انداز میں ایک چکر لگایا۔ چند سیکنڈ بعد نیچے جھکا جیسے اگلے پہیے کی ہوا چیک کرنا چاہتا ہو۔ وہ قریباً آدھ منٹ تک وہیں رہا۔ مجھے لگا کہ اس نے کچھ کیا ہے۔ پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شاید کوٹھی کے اندر چلا گیا تھا۔ بظاہر یہ عام سا واقعہ تھا لیکن موجودہ حالات میں اسے ہرگز نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں زیادہ الرٹ ہو گیا اور پورچ کو مسلسل اپنی نگاہ میں رکھا۔ تقریباً آٹھ دس منٹ بعد میرے دل کی دھڑکن اچانک بڑھنا شروع ہو گئی۔ میں نے پوٹھوہار جیپ کے قریب ایک اور سایہ دیکھا۔ یہ یقیناً جلالی صاحب تھے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے سے آئے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ وہ اکیلے کہیں جا رہے تھے۔ ان کی عمر اور ان کی جسمانی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ وہ اس طرح رات کے وقت کہیں اکیلے نکلیں لیکن انہیں روکنے ٹوکنے کی جرأت کون کر سکتا تھا؟ ایک دم میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یہاں کچھ ہونے والا تھا اور عمران یہاں نہیں تھا۔ مجھے اس کی بے وقت غیر موجودگی پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر سیڑھیاں اتر کر تیزی سے نیچے آیا۔ عمران نے کہا تھا کہ ہم اسکوٹر پر جلالی کا پیچھا کریں گے لیکن اس وقت تو اسکوٹر نظر آرہا تھا اور نہ ہی وہ پک اپ جس کی چابی عمران کے پاس تھی۔ اب تو ایک ہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ جلالی صاحب کو جانے سے روکا جائے۔ وہ کسی جال میں پھنسنے والے تھے۔

میں احاطے میں پہنچا تو ان کی سفید پوٹھوہار جیپ مین گیٹ سے نکل رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا گیٹ کی طرف گیا۔ میں نے گارڈز کو پکار کر کہا کہ وہ جلالی صاحب کو روکیں لیکن انہوں نے میری بات نہیں سنی۔ جلالی صاحب نکل گئے۔ میں گیٹ پر پہنچا تو گارڈز نے مجھے روک لیا۔ وہ ششدر تھے۔

"کیا بات ہے؟" فتح محمد نے گرج کر پوچھا۔

"جلالی صاحب کو روکو۔ ان کے لیے مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔"

"کیا مسئلہ ہے؟" وہ جھلا کر بولا۔

"تم پہلے ان کو روکو۔" میں نے بھی جھلا کر کہا۔

"کیا تماشا لگا رہے ہو؟ کیا چاہ رہے ہو؟" اس نے مجھے دھکا دیا۔

میں نے بھی جواباً اسے دھکا دیا۔ اسے مجھ سے ایسے شدید دھکے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ادھ کھلے گیٹ سے ٹکرایا اور پلٹ کر ایک اسٹول پر گرا۔ میں اندھا دھند جیپ کے پیچھے بھاگا۔ جیپ کافی آگے درختوں میں پہنچ چکی تھی۔ وہ رفتار پکڑ چکی تھی۔ شاید میرے لیے اسے روکنا ممکن نہ ہوتا مگر اسی دوران میں سامنے ایک ٹارچ چمکی، کوئی گارڈ موجود تھا۔ میں نے پکار کر کہا۔ "جلالی صاحب کو روکو۔"

بات گارڈ کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے جیپ کے سامنے آکر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ دھیمی ہوئی اور پھر رک گئی۔ میں ہانپتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جلالی صاحب موجود تھے اور حیرت آمیز غصے سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے اجازت طلب کیے بغیر جیپ کا دروازہ کھولا اور ان کے برابر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے؟" وہ پھنکارے۔

"صاحب جی! آپ نہ جائیں۔ آپ کے لیے کوئی بڑا مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

"کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ اور تم مجھے روکنے والے کون ہو؟"

"میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔ پلیز، آپ فارم میں واپس چلیں۔"

"میں سب سمجھ گیا۔ ڈاکٹر مہناز نے بھیجا ہے نا تمہیں؟ اسی کے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہے۔ وہ کیا سمجھتی ہے... میں بڈھا ہوں، ناکارہ ہوں، اپنے آپ کو بھی نہیں سنبھال سکتا؟ کون ہوتی ہے وہ مجھ پر پابندیاں لگانے والی؟ میری موت جب آنی ہے، وہ آجائے گی۔ وہ اسے روک نہیں سکتی۔ بے وقوف کی بچی..."

"نہیں سر! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ اس معاملے سے ڈاکٹر مہناز کا کوئی تعلق نہیں۔ لگتا ہے کہ کچھ لوگ آپ کو ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں سب کچھ۔ آپ واپس چلیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے آپ کی جیپ میں کوئی گڑبڑ کی گئی ہے۔"

میرے آخری فقرے سے جلالی کا پارا تھوڑا سا نیچے

آیا۔ اس نے عینک کے پیچھے سے گھور کر مجھے دیکھا۔ "تمہیں کیسے پتا ہے... کہاں دیکھا ہے تم نے؟"

میں نے اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا ہے جناب... اور مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ لوگ آپ کا پیچھا کرنا چاہ رہے ہیں۔ کیا آپ کسی خاص جگہ پر جا رہے تھے؟"

"کیا بک رہے ہو تم؟ میرا پیچھا کون کرے گا؟ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ گاڑی میں گڑبڑ کی گئی ہے، اب کہہ رہے ہو کوئی پیچھا کر رہا تھا؟"

"آپ گاڑی کو چیک کریں۔ اس کا بریک وغیرہ تو فیل نہیں یا اسٹیئرنگ میں کوئی مسئلہ ہو؟"

جلالی نے وہیں بیٹھے بیٹھے بریک پیڈل دبا کر دیکھا، وہ بالکل صحیح تھا۔ اندرونی لائٹ جلا کر اس نے اسٹیئرنگ کے نیچے کراس کو دیکھا۔ یہ بھی ٹھیک تھا۔ اس دوران میں فتح محمد اور دیگر گارڈز بھی ہانپتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ فتح محمد کا ایک بازو چھلا ہوا تھا اور ناک سے خون رس رہا تھا۔ وہ مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے جلالی صاحب کو بتایا۔

"یہ مجھے دھکا دے کر آپ کے پیچھے بھاگا ہے۔ صادق تو اس پر گولی چلانے لگا تھا، میں نے روکا۔"

میں نے کہا۔ "جلالی صاحب! میں آپ کے سارے سوالوں کے جواب دیتا ہوں۔ پلیز، آپ گاڑی واپس لے جائیں۔ اگر میرا کہا غلط نکلے تو جو سزا چاہیں مجھے دے لیں۔"

جلالی صاحب کچھ دیر تک مجھے گھورتے رہے۔ پھر انہوں نے جیپ کو یوٹرن دیا اور واپس فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ جلالی صاحب نے اپنی سیٹ کے قریب ایک شاندار "بیکال" رائفل بھی رکھی ہوئی تھی۔ اب پتا نہیں کہ وہ بوقتِ ضرورت اس کا گھوڑا دبانے کی طاقت اپنے اندر رکھتے تھے یا نہیں۔

جیپ واپس پورچ میں پہنچ گئی۔ کئی ملازم ہمارے اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ ان میں سیکریٹری ندیم، ملازم خاص فتح محمد اور ہیڈ گارڈ صادق علی وغیرہ بھی شامل تھے۔ رکھوالی کے کتے اپنی دموں کو گردش دیتے ہمارے اردگرد چکرانے لگے۔

جلالی صاحب نے کڑکتے لہجے میں کہا۔ "ہاں بتاؤ، کیا بتانا چاہتے ہو؟"

میں جیپ کے اگلے پہیے کے پاس بیٹھ گیا اور مڈگارڈ کے نیچے اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ مجھے وہاں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آئی۔ میں نے پہیے کے نٹ بھی دیکھے، وہ ٹھیک

کسے ہوئے تھے۔ میں نے خود کو پزل محسوس کیا۔ اگر میں کوئی خاص تبدیلی نہ ڈھونڈ سکتا تو میری بات غلط ثابت ہو جاتی۔ ایسے میں جلالی صاحب میری کم بختی لاسکتے تھے۔ یقیناً فتح محمد کا پارا بھی چڑھتا جارہا تھا۔ میں نے فتح محمد کے ہاتھ سے ٹارچ لی اور پشت کے بل جیپ کے نیچے لیٹ کر اس کے اگلے حصے کا معائنہ کرنے لگا۔ یکایک میں چونک گیا۔ مڈگارڈ کے پلاسٹک کور میں اندر کی طرف درز نظر آرہی تھی، میں نے اس درز کو کھولا تو ایک چھوٹی سی براؤن ڈبیا گاڑی سے چپکی نظر آئی۔ میں نے یہ ڈبیا سیکریٹری ندیم کو بھی دکھائی اور پھر اسے اکھاڑ لیا۔

''یہ کیا ہے؟'' جلالی صاحب بھی اب چونک گئے تھے۔

''مجھے کیا پتا جی۔ میں تو کھانا پکانا جانتا ہوں۔ بس میں نے جو دیکھا تھا، آپ کو بتا دیا ہے۔''

سیکریٹری ندیم نے اس ''چھوٹی ماچس'' کے سائز کی ڈبیا کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ''یہ تو کوئی الیکٹرانک ڈیوائس لگتی ہے۔ شاید اس سے کوئی سگنل وغیرہ نشر ہوتا ہو۔''

جلالی صاحب کو ایک دم صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ انہوں نے سیکریٹری ندیم کے سوا سب کو پورچ سے باہر نکال دیا۔ باہر نکلنے والوں میں فتح محمد بھی شامل تھا۔ وہ اب بھی مجھے گھور رہا تھا لیکن اس گھورنے میں پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' جلالی صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''جناب! میرا کام تو باورچی کا ہے۔ ایسی باتوں کا مجھے زیادہ پتا نہیں لیکن مجھے شک پڑ رہا ہے کہ یہ سازش ہے۔ اس سازش کا تعلق اسی باکس سے ہے جس کے پیچھے کچھ لوگ ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس رات کو جو کچھ ہوا، وہ بھی ایک ڈراما ہی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ ندیم صاحب کو جان بوجھ کر ناٹک دکھایا گیا ہو۔ اس طرح آپ کو شک میں ڈالا گیا ہو کہ آپ نے جس جگہ باکس چھپایا ہے، شاید اب وہ وہاں موجود نہیں ہے...''

جلالی صاحب ایک دم گم صم نظر آئے۔ وہ بار بار اپنی عینک کو ناک پر درست کر رہے تھے۔ یقیناً بات ان کی سمجھ میں آرہی تھی۔ سیکریٹری ندیم بھی متحیر تھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''اگر واقعی یہ سازش ہے تو بڑی گہری ہے جناب... ان لوگوں نے سوچا ہو گا کہ آپ باکس کے بارے میں فکرمند ہوں گے اور دیکھنا چاہیں گے کہ وہ محفوظ ہے یا نہیں۔ وہ آپ کا پیچھا کریں گے اور لوکیشن دیکھ لیں گے۔ پیچھا کرنے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے یہ سگنل دینے والا ٹریگر گاڑی پر لگا دیا۔''

جلالی صاحب بے دم سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کی باڈی لینگویج گواہی دے رہی تھی کہ جو کچھ کہا جارہا ہے، وہ درست ہے۔

''یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟'' کچھ دیر بعد انہوں نے نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ کوئی گھر کا بھیدی ہی ہے۔'' ندیم نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم چشم دید گواہ ہو۔ تم نے بندے کو دیکھا ہے، کچھ اندازہ ہے تمہیں؟''

''نہیں جی، میں نے بس ہیولا سا دیکھا تھا۔ میں تو شاید یہ بھی ٹھیک سے نہ بتا سکوں کہ وہ مرد کا ہیولا تھا یا عورت کا۔''

ندیم نے ٹارچ جلائی اور گرد آلود فرش پر پاؤں کے نشان ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ وہی جگہ تھی جہا روانگی سے پہلے پوٹھوہار جیپ پارک تھی۔ زمین پر بہت سے قدموں کے نشان نظر آرہے تھے مگر گڈمڈ تھے۔ ان میں ایک دو نشان لیڈیز جوتے کے بھی تھے۔ جلالی صاحب بالکل گم تھے۔ شاید وہ میری تعریف میں کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن انہوں نے کہا کچھ نہیں۔ ماچس نما ڈیوائس لے کر اندر چلے گئے۔

اگلے روز میں نے ڈاکٹر مہناز کے ساتھ مل کر ناشتا تیار کیا۔ ڈاکٹر مہناز نے کہا۔ ''کل جو کچھ ہوا ہے، وہ ظاہر کرتا ہے کہ باکس کو ڈھونڈنے والے اس تک پہنچنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما رہے ہیں۔ جلالی صاحب آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ عقل و دانش کسی کی جاگیر نہیں ہوتی۔ ایک باورچی کے دماغ میں وہ بات آگئی جو ہم میں سے اور کسی کے دماغ میں نہیں آئی۔''

میں خاموش رہا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس ہوشیاری میں بھی مجھ سے زیادہ عمران کا عمل دخل ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ بول اٹھی۔ ''میں نے جلالی صاحب کو بتا دیا ہے کہ آپ دونوں باورچی وغیرہ نہیں ہیں بلکہ ایک خاص مشن پر یہاں موجود ہیں۔ کچھ خاص لوگوں نے آپ کو یہاں بھیج رکھا ہے۔''

میں نے چونک کر ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ میرا پورا جسم تھرا گیا تھا۔ پھر ایک دم میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ وہ ہنسی اور اس کے موتیوں جیسے دانت چمک اٹھے۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ایسا غضب نہ کرنا ڈاکٹر صاحبہ! سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔ جناب ہتھے سے اکھڑ گئے تو کھڑے کھڑے لات مار کر کوٹھی سے باہر کر دیں گے اور کیا پتا کپڑے بھی اتروا لیں۔''

''لیکن تابش صاحب! ایک بات ہے۔ آپ لوگوں کو کم از کم میرا سسپنس تو دور کرنا چاہیے۔ میں آپ پر اعتماد کر رہی ہوں، آپ مجھ پر نہیں کر رہے۔ مختار ملک والا کتنا بڑا واقعہ ہو گیا لیکن آپ نے مجھے ابھی تک اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ کون تھا؟ کیا یہاں اکیلا تھا یا اس کا کوئی بھی ساتھی ہے؟ اس کی ضمانت دے کر اسے یہاں نوکری دلانے والا کون ہے؟''

میں نے کہا۔ ''سچی بات یہ ہے ڈاکٹر مہناز کہ ابھی تک اس حوالے سے میں بھی اندھیرے میں ہوں۔ عمران پتا چلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ مختار کا ضامن کون تھا لیکن اس بارے میں بھی کوئی چونکا دینے والا انکشاف نہیں ہونے والا۔ مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ مختار کا تعلق جاوا سے ہی ہو گا۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، ایک ملازم نے آکر بتایا کہ ناشتے کا ٹائم شروع ہونے میں صرف آٹھ منٹ رہ گئے ہیں۔

مجھے اور ڈاکٹر مہناز کو تیزی سے ہاتھ چلانا پڑے۔ ناشتا تیار ہوتے ہی مہناز اپنا ایپرن اتار کر اور ہاتھ وغیرہ دھو کر کھانے کے کمرے کی طرف لپک گئی۔ ناشتے کی ٹیبل پر وہ روزانہ جلالی صاحب کے ساتھ ہوتی تھی۔ دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ وہی ملازم پھر آگیا۔ اس مرتبہ وہ مجھے بلانے آیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں صاحب جی کھانے کے کمرے میں بلا رہے ہیں۔''

''یا اللہ خیر۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

جلالی صاحب کے روبرو جانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا تھا۔ ان کے موڈ کے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشا والا معاملہ تھا۔ ایک دم بھڑک اٹھتے تھے اور پھر انہیں سنبھالنا دشوار ہو جاتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں ناشتے میں کوئی کسر رہ گئی ہے جس کے لیے یہ نادر شاہی حکم آیا ہے۔ میں کھانے کے کمرے میں پہنچا تو انہوں نے ایک عجیب آرڈر جاری کیا۔ ''یہاں بیٹھو کرسی پر۔''

میں ٹھٹک گیا۔ وہ مجھے اپنے برابر، ناشتے کی میز پر بٹھا رہے تھے۔ میں تھوڑا سا تذبذب دکھانے کے بعد بیٹھ گیا۔

''ہمارے ساتھ ناشتا کرو۔'' انہوں نے پھر حکم جاری کیا۔

میں جانتا تھا کہ مجھے ویسا ہی کرنا ہو گا جیسا وہ کہہ رہے ہیں، ورنہ یہ عزت افزائی کسی بھی وقت زبردست تذلیل میں بدل سکتی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آگئے۔ ''مجھے وہ لوگ پسند ہیں جو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں۔ کل تم نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی۔ ہم میں سے کسی کا دماغ اس طرف نہیں گیا جس طرف تمہارا گیا۔ شروع میں جب تم نے مجھے باہر جانے سے روکا تو مجھے بہت غصہ آیا تھا لیکن بعد میں وہی کچھ درست نکلا جو تم نے کہا تھا۔ وہ ڈبیا جو کل جیپ کے نیچے سے نکلی ہے، ایک الیکٹرانک ٹریگر ہے۔ قریباً سات آٹھ کلومیٹر کے ایریا میں اس کا سگنل آسانی سے ریسیو کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ یہ سب کچھ ایک سازش کا حصہ تھا۔ تم بہت دور کی کوڑی لائے ہو۔ میں پوچھنا پسند کروں گا کہ یہ سب کچھ تمہارے دماغ میں آ کیسے گیا؟''

میں نے انکساری کے انداز میں کہا۔ ''سچ بات تو یہ ہے جناب کہ اس بارے میں بھی استاد جی نے ہی اپنا دماغ دوڑایا تھا۔ استاد عمران نے کافی عرصہ ایک بڑے انڈین پولیس افسر کے گھر میں بھی ملازمت کی ہے۔ شاید یہ وہاں کے ماحول کا ہی اثر ہے کہ انہیں ایسے معاملوں میں سوچ بچار کی عادت پڑ گئی ہے۔ شکل و صورت سے بندے کے کریکٹر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں اکثر اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ جس رات درختوں میں ندیم صاحب اور جیپ والوں میں فائرنگ ہوئی، اسی رات استاد جی نے مجھ سے کہا تھا کہ اس میں کوئی چکر ہو سکتا ہے۔''

جلالی صاحب نے لمبی سانس لیتے ہوئے اپنی اونچی ناک پر موٹے چشمے کو درست کیا اور بولے۔ ''یہ تمہارا استاد ہرفن مولا شخص لگتا ہے۔ پتا نہیں کہ کس کس گھر میں کام کر چکا ہے اور کیا کیا سیکھ چکا ہے۔ جانوروں کے بارے میں بھی اسے کافی جانکاری ہے۔ بتا رہا تھا کہ مشہور شکاری تہور علی صندوقی صاحب کا باورچی بھی رہ چکا ہے اور ان کے شکار کیے ہوئے ہر طرح کے حلال جانوروں کا گوشت پکاتا رہا ہے۔ خاص طور سے ہرن کی ڈشیں تیار کرنے میں اسے خاص الخاص مہارت حاصل ہے۔''

''جی ہاں لیکن استاد جی کو جانوروں سے پیار بھی بہت

ہے اور جانور بھی ان سے بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔ آج کل ان کو یہ شوق چرایا ہوا ہے کہ ہوا میں اڑتی پھرتی چڑیاں ان کے ہاتھ سے لے کر دانہ کھائیں۔ یہ کوشش کر رہے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ اس میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔''

''ہاں، کچھ لوگ ایسا کر لیتے ہیں۔ میں نے خود ایک ڈاکومینٹری فلم میں دیکھا تھا۔ اٹلی کے شہر ''پیسا'' کا ایک سین دکھایا گیا تھا۔ ایک شخص ہوا میں اڑتی پھرتی چڑیوں کو اپنے ہاتھ سے ''فیڈ'' کر رہا تھا۔ بعض لوگوں میں جانوروں کے لیے خاص کشش پائی جاتی ہے۔ یہ تمہارا استاد بھی ان میں سے ایک ہے۔ میرے خیال میں تو اسے باورچی کا کام چھوڑ دینا چاہیے۔ ذہین بندہ ہے، یہ کام چھوڑ کر زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔ ہماری قوم کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام نہیں کر رہے۔ جس کو موٹر مکینک ہونا چاہیے، وہ ڈاکٹر بننے کی کوشش کر رہا ہے، جس کو ڈاکٹر ہونا چاہیے، اس کے پاس وسائل نہیں... وہ کھڑکیاں ویلڈنگ کر رہا ہے۔''

''لیکن جناب! کھانا پکانا تو استاد عمران کا خاندانی کام ہے... ان کے والد...''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' جلالی صاحب نے تیزی سے میرا فقرہ کاٹا۔ ''کسی کا باپ ڈکیت رہا ہے تو کیا اسے ڈکیتی ہی زیادہ راس آئے گی؟ چور سے قطب اور قطب سے چور پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کیا بات کہی تم نے کہ یہ اس کا خاندانی کام ہے۔ خاندانی کام کا مطلب کیا یہ ہوتا ہے کہ ایک نسل کے بعد دوسری اور پھر تیسری مکھی پر مکھی مارتی رہے۔ تمہارے باپ کا خاندانی کام کیا تھا؟'' انہوں نے غصے سے پوچھا۔

ڈاکٹر مہناز نے مجھے اشارے سے سمجھایا کہ میں بحث میں الجھنے کی کوشش نہ کروں۔ میں نے ڈھیلے انداز میں کہا۔ ''وہ تو باورچی نہیں تھے جی... وہ درزی کا کام کرتے تھے۔''

''تو پھر تم کیسے باورچی بن گئے اور ایک اچھے باورچی بنے۔ یہ ناشتا تم نے ہی بنایا ہے نا... یا کسی اور نے بنا کر دیا ہے تمہیں؟''

مہناز کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے ہی بنایا ہے جی۔''

''تو پھر...؟ اس میں خاندانی فن کاری کہاں سے آ گئی۔ یا پھر یہ ہوگا کہ تمہاری ماں باورچن ہوگی یا پھر تمہاری پڑدادی یا لکڑدادی بہادر شاہ ظفر کے لیے بریانی بناتی رہی ہو گی۔ یہ کس حساب سے تم نے کہا ہے کہ خاندانی کام خاندانی کام ہوتا ہے...''

مہناز نے آنکھ بچا کر مجھے پھر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں جی۔ ایویں غلط بات کر دی میں نے... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں...''

جلالی صاحب کچھ دیر تک تلملاتے رہے اور مجھے گھورتے رہے۔ یوں لگتا تھا کہ اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مہناز نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اب خالی برتن اٹھا کر باہر نکل جاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

ویسے اندر ہی اندر میں بھی سٹپٹایا ہوا تھا۔ باباجی کس وقت اور کس بات پر ہتھے سے اکھڑیں گے، اس کے بارے میں اندازہ لگانا بڑا مشکل تھا۔ اب وہ چھوٹے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور ڈاکٹر مہناز کے ساتھ باتوں میں معروف تھے۔ میں نے عمران کے لگائے ہوئے ڈکٹا فون کا ریسیور آن کر دیا۔ واضح آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بالکل یوں لگا جیسے ریڈیو کے کسی ٹاک شو میں دو افراد بول رہے ہوں۔ ایک ایک لفظ پوری وضاحت کے ساتھ کانوں تک رسائی حاصل کر رہا تھا۔ میں نے آواز کا حجم اپنی ضرورت کے مطابق کر لیا۔ جلالی صاحب کا موڈ شاید اب تک آف تھا۔ وہ سخت لہجے میں مہناز سے کہہ رہے تھے۔ ''جو کچھ بھی ہے، مجھے اس رات والا کام پسند نہیں آیا۔ وہ کھلی چھت تھی، کوئی کمرا تو نہیں تھا... کوئی بھی تمہیں میرے ساتھ لیٹے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ آئندہ ایسا نہ ہو تو اچھا ہے۔''

مہناز کی آواز ابھری۔ ''معافی چاہتی ہوں۔ میری بات کا غصہ نہ کیجیے گا۔ اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو کیا ہوتا۔ یہ کوئی پہلا واقعہ تو نہ ہوتا۔ سب جانتے ہیں کہ آپ پہلے بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔ یہ بس آپ کی عادت ہے۔ اس میں کوئی خاص جذبہ تو نہیں ہوتا...''

''تم کیا جانتی ہو میری اس عادت کے بارے میں؟'' جلالی کا لہجہ تلخ تھا۔

''کچھ زیادہ نہیں جی۔ بس اتنا پتا ہے کہ اس سے پہلے آپ رخشی کے ساتھ بھی اسی طرح لیٹتے رہے ہیں اور اس سے پہلے ایک استانی شائستہ آئی تھی یہاں... جو ملازموں کے بچوں کو پرائمری کے امتحان کی تیاری کراتی تھی۔ اس کے ساتھ بھی آپ کا ایسا ہی تعلق تھا... اور شاید اس کے علاوہ بھی ایک دو ہوں گی۔''

''میں نے کب کہا ہے کہ میں ایسا نہیں کرتا رہا ہوں... لیکن تمہاری وجہ سے یہ معاملہ کچھ اور رنگ اختیار کرتا جا رہا ہے اور مجھے اس وجہ سے پریشانی ہے۔''

''کیا آپ کچھ وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟'' مہناز نے کہا۔ لگتا تھا کہ آج وہ بھی اپنے خوف کو پسِ پشت ڈال کر کھلی باتیں کرنا چاہ رہی ہے۔

جلالی صاحب نے پُرطیش کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''دیکھو مہناز! میں تمہیں ایک بات بالکل صاف صاف بتا دوں۔ میں وہ ضدی گھوڑا ہوں جس نے کسی بڑے سے بڑے سورما کو بھی خود پر سواری نہیں کرنے دی اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کسی طرف سے کمزور نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں جس روز جلالی کی کوئی کمزوری دنیا والوں کے ہاتھ آ جائے گی، جلالی... جلالی نہیں رہے گا۔ تم جس طرح ہر وقت میرے آگے پیچھے پھر رہی ہو، میرے ذاتی معاملوں میں دخل دے رہی ہو، یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔''

چند سیکنڈ تک مکمل خاموشی رہی۔ پھر ریسیور پر ڈاکٹر مہناز کی آواز ابھری۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''سر! جب آپ کے دل میں کچھ ہے ہی نہیں تو پھر میری ذات آپ کی کمزوری کیسے بن سکتی ہے؟ میں بھی تو ان دوسری عورتوں کی طرح ہی ہوں جو آپ کے اردگرد ہیں، آپ کی خدمت گار ہیں اور جن کے ساتھ آپ کسی وقت ایک خاص قسم کے رویّے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کو اپنے ساتھ سلاتے ہیں یا انہیں اپنے بہت قریب رکھتے ہیں۔''

''تم مجھ سے بحث کرنا چاہتی ہو، زبان چلانا چاہتی ہو میرے ساتھ؟'' ایک دم جلالی صاحب پوری طرح ہتھے سے اکھڑ گئے۔

''میری اتنی جرأت کہاں سر! میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے یہ خاص اہمیت کیوں دے رہے ہیں جبکہ میری کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔''

''کیا اس طرح تم مجھ سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ تمہاری خاص اہمیت ہے؟'' وہ بدستور بپھرے ہوئے تھے۔

''نہیں سر! میں ایسا نہیں چاہتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' وہ بجھی بجھی سی آواز میں بولی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر جلالی صاحب نے قدرے بدلے ہوئے لب و لہجے میں کہا۔ ''اور اگر میں کہوں کہ ایسا ہے یا ایسا ہو رہا ہے تو پھر؟''

''کک... کیا؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟'' مہناز نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کپکپاہٹ کی تہ میں کہیں شاید خوشی کی ہلکی سی لہر بھی تھی۔

''وہی جو تم سن رہی ہو... اگر میں تمہارے ساتھ یہ ساری بکواس کر رہا ہوں اور اپنا مغز کھپا رہا ہوں تو اس کی کوئی وجہ ہے۔ میں تمہارے سلسلے میں پریشان ہوں۔ میں تم سے دو دفعہ پہلے بھی گزارش کر چکا ہوں کہ یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تم چلی جاؤ... کم از کم کچھ دنوں کے لیے ہی چلی جاؤ لیکن تم یہاں سے ہل نہیں رہی ہو۔''

جلالی صاحب کے اندازِ گفتگو نے مہناز کو کچھ حوصلہ دیا۔ وہ ذرا اٹھلا کر بولی۔ ''اور میں جاؤں گی بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جان ہی جائے گی نا... لیکن میں آپ کی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ کے پاس بہت پیسا ہے۔ زمین ہے، شہر میں کروڑوں کی پراپرٹی ہے۔ آپ کے قریب رہوں گی تو کچھ نہ کچھ فائدہ تو مجھے بھی ہوگا نا۔'' وہ مسکراتے لہجے میں بولی۔

''میں جانتا ہوں۔ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، سب کچھ اس کے الٹ ہے۔ تمہیں ان چیزوں کا لالچ نہیں اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ تم کچھ علیحدہ ٹائپ کی لڑکی ہو۔ اپنے من کی موج میں بہنے والی۔ اپنے بنائے ہوئے رستے پر چلنے والی۔''

وہ پھر مسکراتے لہجے میں بولی۔ ''لیکن کسی کے دل کا کیا پتا ہوتا ہے سر! ہو سکتا ہے کہ میرے دل میں کچھ ایسی باتیں ہوں جو آپ کی سوچ سے مختلف ہوں۔''

''میں نے یہ بال اور یہ بھویں وغیرہ دھوپ میں سفید نہیں کیں۔'' جلالی صاحب نے اپنے مخصوص بھاری بھرکم انداز میں کہا۔

لگتا تھا کہ ان باتوں نے مہناز کو دل سے خوش کیا ہے۔ وہ بولی۔ ''اچھا، اب آپ یہیں بیٹھیں۔ آپ کی معدے والی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے پاؤں کا مساج بھی کرنا ہے۔ کل بھی ناغہ ہو گیا تھا۔ میں ابھی آئنٹمنٹ لے کر آتی ہوں۔''

''لیکن جانے سے پہلے میری ایک بات ذرا دھیان سے سن لو۔'' جلالی صاحب کے لہجے میں پھر گہری سنجیدگی آ گئی۔

''جی۔'' مہناز نے کہا۔

''یہ جو تم میرا ایکسٹرا دھیان رکھتی ہو، یہ چھوڑ دو۔ اسی طرح نظر آؤ جیسے دوسرے نظر آتے ہیں۔ اسی میں میرا اور تمہارا بھلا ہے۔ اگر میری بات نہیں مانو گی تو پھر کچھ غلط ہوا تو اس کی ذمے دار تم خود ہو گی۔''

''ٹھیک ہے جی۔ میں احتیاط کروں گی۔'' مہناز نے

کہا پھر اس کی اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ وہ چھوٹے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر جارہی تھی۔

جی چاہ رہا تھا کہ میں یہ ساری گفتگو ریکارڈ کرسکتا اور عمران کو سنا سکتا۔ یوں اسے بھی مہناز اور جلالی صاحب کے تعلق کو سمجھنے میں مدد ملتی۔ عمران کا کہنا تھا کہ جلالی ایک سخت دل اور کسی حد تک ایک بے حس شخص کا نام ہے۔ وہ کسی شخص یا چیز کو اپنی کمزوری نہیں بننے دیتا۔ بعض اوقات وہ اپنی خوب صورت ملازماؤں کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق پیدا کرلیتا ہے۔ ان کو اپنے قریب رکھتا ہے، ان کے ساتھ لیٹتا ہے لیکن ان کے بارے میں کوئی نرم جذبہ کبھی اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اس کے لیے بس اجرتی ملازم ہی رہتی ہیں اور ڈاکٹر مہناز بھی ان میں شامل ہے۔ لیکن آج جو گفتگو میں نے پوشیدہ مائکروفون کے ذریعے سنی تھی، وہ اشارہ کررہی تھی کہ اس صورتِ حال میں مہناز کے حوالے سے کچھ نہ کچھ چینج موجود ہے۔ ''باباجی'' کے نزدیک اگر وہ زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت اہمیت ضرور رکھتی ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا کسی طرح اس ''اہمیت'' کو باباجی کی زبان کھلوانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ یا پھر یہ اہمیت ابھی اتنی توانا ہی نہیں کہ اس سے کوئی کام لیا جاسکے؟

دو چھٹیاں ساتھ ساتھ آرہی تھیں۔ ان میں تیئس مارچ کی چھٹی بھی تھی۔ معلوم ہوا تھا کہ جلالی صاحب کیلنڈر پر موجود ساری روایتی چھٹیاں بڑے اہتمام کے ساتھ مناتے ہیں۔ اس موقع پر بھی انہوں نے خاص انتظام کروا رکھا تھا۔ فارم سے پانچ کلومیٹر دور ایک نہر گزرتی تھی۔ یہاں چکور کے شکار کا پروگرام بنا۔ شکار کے پروگرام سے پہلے کھلی فضا میں ''باربی کیو'' ڈنر کا اہتمام بھی تھا۔ نہر کے ساتھ ساتھ پانچ چھ خیمے لگائے جانے تھے اور جنریٹر بھی لے جایا جارہا تھا۔ آج پھر عمران کی صلاحیتوں کا امتحان تھا۔ ایک باورچی کی حیثیت سے ہم دونوں سہ پہر کے کچھ دیر بعد ہی موقع پر پہنچ گئے اور کھانے کا انتظام شروع کردیا۔ حسبِ معمول سارا کام عمران ہی کررہا تھا۔ وہ مجھے ثانوی حیثیت کے کام سونپ رہا تھا اور دیکھنے والے کو لگتا یوں تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ برابر کا مصروف ہوں۔

ایک بڑے دیگچے میں چمچہ چلاتے ہوئے وہ بولا۔ ''اب تو جی چاہتا ہے کہ کسی کماؤ لڑکی سے شادی کرلوں۔ وہ باہر کا کام کرے، میں گھر میں کھانا پکاؤں اور بچوں کو سنبھالوں۔''

میں نے چکن کے ٹکڑوں کو دہی میں بھگوتے ہوئے کہا۔ ''تو کماؤ لڑکی ہے نا تمہارے پاس۔ رات دن ریما جی کے قصیدے پڑھتے ہو یا نہیں۔''

''یار! وہ تو مجھے لگتا ہے کہ دو مولویوں میں مرغی حرام ہو چکی ہے۔ نرگس، ریما کو کچا کھا جائے گی یا ریما، نرگس کو شوٹ کرڈالے گی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی میرے حوالے سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اب تو کوئی تیسری ہی ڈھونڈنی پڑے گی۔'' بولتے بولتے اس نے ایک دم چونک کر بائیں طرف دیکھا اور بولا۔ ''لو، دیکھو وہ آگئی تیسری بھی۔''

ڈاکٹر مہناز پوٹھوہار جیپ سے اتر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی بلی اس کی گود میں تھی۔ وہ اسے بار بار سہلا رہی تھی اور اپنے ساتھ لگا رہی تھی۔ ڈوبتی شام میں اس کا چہرہ کچھ اور بھی گلابی نظر آتا تھا۔ براؤن سن گلاسز چہرے پر جچ رہے تھے۔ عمران نے سرد آہ بھری اور بولا۔ ''کاش، میں ایک بلی ہوتا اور اس خوب صورت شام میں... میرا سر عین اس جگہ پر ہوتا... جہاں بلی کا ہے۔''

''حالانکہ میں تمہیں سب کچھ بتا بھی چکا ہوں۔ یہ لڑکی کسی اور کے کام کی نہیں رہی۔ جلالی صاحب کے بڑھاپے پر عاشق ہوچکی ہے۔ اس ناتے سے تم تو اس کے نزدیک کل کے بچے ہو بلکہ بلونگڑے ہو۔''

عمران نے آہ بھری۔ ''یار! یہ عورت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ جلیبی کی طرح گول، پیاز کی طرح تہ در تہ اور امربیل کی طرح الجھی ہوئی۔ یہ کب کیا کرگزرے گی، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

میں نے کن انکھیوں سے ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ وہ کل سے بڑے اچھے موڈ میں تھی اور موڈ کی یہ تبدیلی اس گفتگو کے بعد سے دکھائی دے رہی تھی جو جلالی صاحب کے ساتھ اس نے ڈرائنگ روم میں کی تھی۔ سورج ڈوبنے میں ابھی آدھ گھنٹا باقی تھا۔ کافی روشنی تھی۔ کوٹھی کے نوجوان ملازم، ڈاکٹر لائبہ اور ندیم وغیرہ کے ساتھ کھلی جگہ پر کرکٹ کھیلنے لگے تھے۔ ڈاکٹر مہناز بھی ان میں شامل ہوگئی۔ سب خوش گوار موڈ میں تھے۔ ڈاکٹر مہناز نے ڈرائیور رشید کو ایک زوردار شاٹ مارا اور گیند نہر میں جاگری۔ گیند نکالنے کی کوشش میں مالی رمضان کا بیٹا سلیم نہر میں گر گیا۔ خوب ہنسی مذاق ہوا۔ کھیل دوبارہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر مہناز آؤٹ ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

عمران نے سرد آہ بھری۔ ''کاش، میں اس ماہ جبیں کو باؤلنگ کراتا اور کلین بولڈ کرتا۔ لیکن افسوس اے حسن کی شہزادی! میں اس محل سرا کا ایک ادنیٰ باورچی ہوں۔ سرد

آہیں تو بھر سکتا ہوں لیکن تیرے ساتھ کرکٹ نہیں کھیل سکتا۔''

''تم کسی کے ساتھ بھی نہیں کھیل سکتے۔ تم بارھویں کھلاڑی بن چکے ہو جو بس فیلڈنگ کرسکتا ہے۔''

''چلو یار! فیلڈنگ ہی کروں لیکن کچھ تو ہو۔ ڈاکٹر مہناز جیسی لڑکی کا کیچ پکڑ لیا تو سمجھو پورا میچ جیت لیا۔''

میں اور عمران ایک بڑے چکن پیس کے چھوٹے ٹکڑے کررہے تھے۔ چھری عمران کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کراہ کر بولا۔ ''یار! ذرا دھیان رکھنا، مہناز جی کے حسن میں کھو کر کہیں میں تمہاری انگلی ہی نہ کاٹ ڈالوں۔''

میں نے کہا۔ ''بڑے کھوچل عاشق ہو۔ انگلی بھی کاٹو گے تو کسی اور کی...'' پھر میں نے چونک کر اس کی چیسٹ پاکٹ کی طرف دیکھا۔ ''کہیں آج بھی فون تو آن نہیں کررکھا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بھئی۔'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''شاہین کی بچی نے تو اس دن سے بات کرنا ہی چھوڑ دی ہے۔ صاف کہہ دیا ہے کہ اگر تمہیں ریما اور نرگس مل رہی ہیں تو مجھے بھی کوئی اکشے کمار یا عامر خان مل جائے گا۔''

''دیکھو عمران! وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے اور تم بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔ پیار کرنے والوں کو اس طرح ستایا نہیں کرتے۔ وہ تم کیا کہا کرتے ہو، مسجد ڈھادے، مندر ڈھادے پر دل نہ کسے دا ڈھائیں...''

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، ہوہا کی زوردار آواز سنائی دی۔ مالی کے بیٹے قیوم نے ایک زوردار ہٹ لگا کر گیند جھاڑیوں میں پھینک دی تھی۔ سب اسے تلاش کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اب اندھیرا اتر آیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''جلالی صاحب ہر جگہ اپنی مرضی کرتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی مرضی خطرناک بھی ہوتی ہے۔ اب جس قسم کے حالات یہاں چل رہے ہیں، اس آؤٹ ڈور پروگرام کی بھلا کیا تک تھی۔ سیکیورٹی کے لحاظ سے یہ کسی طور مناسب نہیں۔''

''تم یہی بات باباجی کے سامنے فرمانا۔ تمہیں نہر کے کنارے ساری رات کے لیے مرغا نہ بنادیں تو میرا نام بدل دینا۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے کہنے کی؟ مگر کوئی تو ان کو سمجھانے والا ہونا چاہیے۔''

''اب یہ سمجھنے سمجھانے کی حد سے گزر چکے ہیں۔ خوامخواہ دل جلانے سے فائدہ نہیں۔ بس ہوشیار رہو اور آنکھیں کھلی رکھو۔ کوئی گڑبڑ ہو تو ہمیں اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ مختار ملک والا پسٹل ہے نا تمہارے پاس؟''

''ابھی تک تو ہے۔'' میں نے قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے کو ٹٹولا پھر ذرا توقف سے کہا۔ ''دیکھو، ابھی تک ہمیں یہ پتا بھی نہیں چل سکا کہ مختار ملک کا تعلق کس سے تھا اور وہ کس مشن پر یہاں موجود تھا۔''

''مشن کے بارے میں تو کوئی شبہ ہے ہی نہیں تابی ڈیئر... لکڑی کے باکس میں وہی دو فٹ کا فتنہ ساز آرا کوئے ہمارے آس پاس موجود ہے اور کچھ لوگوں نے اس کے پیچھے سر دھڑ کی بازی لگائی ہوئی ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دو پارٹیاں ہیں۔ ایک تو وہی پارٹی ہے جس نے ہمیں بھی ہائر کیا ہوا ہے۔ یعنی ریان ولیم اور پروفیسر رچی وغیرہ۔ دوسری پارٹی انڈین گینگسٹر جاوا کی ہے۔ اس میں دُرِ شہوار اور انگریز مائیکل وغیرہ شامل ہیں۔''

''لیکن مختار ملک کا تعلق کس سے تھا؟ ریان ولیم اینڈ کمپنی سے یا جاوا سے؟''

''یہ سوال ابھی جواب طلب ہے۔ لیکن ایک بات تو میرے نزدیک کلیئر ہے۔ شروع میں گوشت کے پہاڑ ریان ولیم نے ہمارے ساتھ سراسر جھوٹ بولا تھا کہ وہ باکس کو ڈھونڈنے والا کام کسی اور کے لیے کررہا ہے۔ دراصل وہ خود ہی باکس کے پیچھے ہے۔ شاید تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یہ شخص نسل کے اعتبار سے یہودی ہے۔ سونے پر سہاگا یہ کہ خالص کاروباری ذہانت بھی رکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جس کام میں بھی پیسا نظر آتا ہے وہ اسے کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ چاہے وہ کوئز شو ہو، جوئے بازی ہو، بھتا خوری ہو یا کوئی بزنس۔''

''یار! یہ ساری معلومات تمہیں حاصل کیسے ہوجاتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، اقبال اور جیلانی وغیرہ کسی قبرستان میں بیٹھ کر بھنگ گھوٹ رہے ہیں۔ بھئی وہ کام کر رہے ہیں... اور اچھا کام کررہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اطلاعات اکٹھی کرنے کے لیے تمہارا اپنا نیٹ ورک موجود ہے۔''

''بالکل۔ یہی وجہ تو ہے کہ فساد پلس اس وقت پاکستان کا نمبر ون چینل ہے۔''

''تم ایک دم جلیبی کی طرح گول ہو۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تمہاری۔ مجھے تو پھر ابن صفی والی بات یاد آرہی ہے۔ اگر محترم حیات ہوتے تو تمہیں دیکھ کر ضرور حیران ہوتے... بلکہ دانتوں میں انگلی دباتے کہ ان کا تخیلاتی کردار زندہ حالت

میں آموجود ہوا ہے۔''

''تم ان رائٹرز لوگن کو نا ہیں جانتے۔ یہ انسپائر ہووت ہیں بھیّا۔ پہلے کسی چیز کو دیکھت ہیں پھر اس کی نقل اتار کر کہانیوں میں پیش کر دیوت ہیں۔ ان ابنِ صفی صاحب نے بھی یقیناً میری نقل اتاری ہووے گی۔''

''تم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔''

''یہی تو ہوشیاری ہوتی ہے ان لوگن کی۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی نقل اتار لیوت ہیں۔ ویسے بھی پیدا ہونے سے پہلے بندے کی آتما تو موجود ہوتی ہے نا۔ کسی رات میری آتما محترم لکھاری صاحب کے کمرے میں چلی گئی ہووے گی۔ انہوں نے جھٹ اس کا خاکہ اتار لیا ہووے گا...'' وہ بھانڈیل اسٹیٹ کے لہجے کی نقل کر رہا تھا۔

ایک باوردی گارڈ ٹہلتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ ہم خاموش ہو گئے۔

پروگرام کے مطابق نہر کے کنارے کافی ہلاّ گلاّ رہا۔ کوئلوں پر دیسی مرغی اور دیسی بکرے کا گوشت بھونا گیا۔ سیخ کباب بنائے گئے۔ پرانے طرز کے گراموفون پر سہگل، ثریا بیگم اور نور جہاں کے گانے سنے گئے۔ جلالی صاحب نے اپنے جدید ٹینٹ میں قدیم فلم جگنو دیکھی اور کئی ساتھیوں کو بھی زبردستی دکھائی۔ ان میں ڈاکٹر مہناز، لائبہ، ندیم اور ڈرائیور رشید وغیرہ شامل تھے۔ چاندنی رات تھی۔ چکور کا شکار بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ میں نے سحر انگیز چاندنی میں ڈاکٹر مہناز کو نہر کے پانی میں پاؤں ڈبو کر بیٹھے دیکھا۔ وہ ڈاکٹر لائبہ اور ندیم کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی اور جلدی سے جلالی صاحب کے ٹینٹ کی طرف دوڑ گئی۔ غالباً جلالی صاحب کی کسی دوا کا وقت ہو گیا تھا۔

رات دھیرے دھیرے کھسکتی رہی اور خیریت سے گزر گئی۔ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ رات کے آخری پہر سب لوگ سو گئے تھے۔ بس گارڈز ہی پہرا دیتے رہے۔ نو دس بجے تک یہ لوگ وہیں اوپن ایئر میں ناشتے سے فارغ ہو گئے اور واپس فارم ہاؤس روانہ ہوئے۔

جب ہماری گاڑیاں فارم ہاؤس کے سامنے رکیں، کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ گیٹ پر ہر وقت دو باوردی گارڈز موجود رہتے تھے جو اب نہیں تھے۔ جلالی صاحب کے ڈرائیور رشید نے تین چار بار شیور لیٹ کا ہارن دیا لیکن گیٹ نہیں کھولا گیا۔ پھر گارڈز جیپ سے اترے، انہوں نے گیٹ کھٹکھٹایا اور آوازیں دیں۔ کافی تاخیر سے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا اور ایک گارڈ نظر آیا۔ اسے دیکھ کر سب بُری طرح چونک گئے۔ وہ شدید زخمی تھا۔ اس کے کندھے پر گولی لگی ہوئی تھی اور ایک ٹانگ بھی بُری طرح گھائل تھی۔ دروازہ کھولنے کے بعد وہ وہیں لڑکھڑا کر گر گیا۔ سب گاڑیوں سے اترے اور اس کی طرف لپکے۔ ڈاکٹر مہناز پیش پیش تھی۔ ندیم نے زخمی کو سہارا دے کر بٹھایا۔ وہ مدھم آواز میں بولا۔

''انہوں نے سب کچھ برباد کر دیا۔ بہت ساروں کو زخمی کر دیا، کچھ کو مار ڈالا۔ ہم نے بڑی کوشش کی... ہم... مگر...'' اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ اس کی گردن سے خون بہنے لگا۔ تب ہم نے دیکھا کہ اس کی گردن میں بھی گولی لگی ہوئی تھی۔ یہ گولی اس کی گردن کے سائڈ مسلز کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ شاید اسی لیے وہ زندہ تھا۔

ہم اسے چھوڑ کر کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف لپکے۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور تھے، ہر طرف کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کمروں کے اندر تکیے پھٹے ہوئے اور گدّے ادھڑے ہوئے تھے۔ قالین الٹ پلٹ کر دیے گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھی کے ایک ایک انچ کی تلاشی لی گئی ہے اور یقیناً یہ کام دو چار بندوں کا نہیں تھا۔ یہاں کئی درجن افراد نے ہلاّ بولا تھا۔

''یار! کہیں ہماری چوری بھی نہ پکڑی گئی ہو؟'' عمران نے میرے کان میں سرسراتی سرگوشی کی۔

ہم چھوٹے ڈرائنگ روم کی طرف لپکے۔ ڈرائنگ روم کے عین سامنے ایک ملازمہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سر پر کسی وزنی شے سے بڑی کاری ضرب لگائی گئی تھی۔ اس کے کھچڑی بال خون سے رنگین ہو رہے تھے۔ چھوٹے ڈرائنگ روم کی حالت بھی ابتر تھی۔ صوفے اور میز الٹے پڑے تھے۔ ہر طرف تباہی کا منظر تھا۔ جس سینٹر ٹیبل کے نیچے ''ڈکٹافون'' نصب کیا گیا تھا، وہ بھی الٹی پڑی تھی۔ تاہم ڈکٹافون محفوظ تھا۔ دراصل عمران نے اسے اس طریقے سے نصب کیا تھا کہ وہ لکڑی کے ایک دو انچ موٹے کالر کے پیچھے آگیا تھا۔ میز الٹنے کے باوجود وہ کسی کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ عمران نے میز کو سیدھا کر دیا۔ یکایک رونے چلاّنے کی آوازیں آئیں۔ ہم ڈرائنگ روم سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف آئے۔ یہاں کا منظر دہلا دینے والا تھا۔ نوجوان گارڈ مشتاق کی لاش سیڑھیوں کے آغاز میں پڑی تھی۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ اس کے ہاتھوں پر ہلکی سی مہندی بھی نظر آرہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق مشتاق نامی اس گارڈ کی شادی پانچ چھ ہفتے پہلے ہی ہوئی تھی۔ مشتاق کو دیکھ کر ہی پتا چل گیا کہ وہ اپنی زندگی کا سفر پورا کر چکا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اسے سیڑھیوں کے اوپر

سے دھکاّ دیا گیا ہے۔ اس کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی اور شاید رخسار کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی خون آلود چپل اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ دو عورتیں اس کی لاش پر بین کر رہی تھیں۔ یہ مشتاق کی قریبی رشتے دار ہی تھیں۔

بڑے ڈرائنگ روم کی حالت بھی ابتر تھی۔ ایک دیوار پر جلالی صاحب اور ان کے تین چار بزرگوں کی فریم شدہ تصویریں آویزاں تھیں۔ ان ساری تصویروں پر رائفل کی گولیاں برسائی گئی تھیں اور انہیں چکنا چور کر دیا گیا تھا۔

سیکریٹری ندیم نے دانش مندی کا مظاہرہ کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جلالی صاحب یہ سارے اندوہناک مناظر دیکھیں اور اپنی حالت بگاڑ لیں۔ وہ انہیں فوراً لفٹ کے ذریعے فرسٹ فلور کے ایک کمرے میں لے گیا۔ ڈاکٹر مہناز اور لائبہ زخمیوں کی طرف متوجہ تھیں اور انہیں ابتدائی طبی امداد دے رہی تھیں۔ شدید زخمیوں کو لاہور منتقل کرنے کے لیے انہیں پورچ کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ابھی تک صرف ایک لاش ملی تھی مگر زخمی ہونے والے زیادہ تھے۔

ندیم دانش مندی کا مظاہرہ کر کے جلالی صاحب کو اوپر والے ایک علیحدہ کمرے میں تو لے گیا تھا مگر جلالی صاحب کو نارمل رکھنے کی اس کی یہ کوشش بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ جب ہم اوپر پہنچے تو جلالی صاحب کی سانس تیزی سے چل رہی تھی اور وہ ندیم سے بار بار پوچھ رہے تھے۔ ''کیا کوئی اور بھی زخمی ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ، کسی کی جان تو نہیں گئی؟ تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم مجھے نیچے جانے دو۔''

''سر! سب ٹھیک ہے۔ چار پانچ بندوں کو چوٹیں آئی ہیں۔ دونوں ڈاکٹرز ان کی مرہم پٹی کر رہی ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

وہ دہاڑے۔ ''تم کہہ رہے ہو چوٹیں آئی ہیں۔ وہ گارڈ اشرف تو آخری سانسیں لے رہا ہے۔''

''اشرف کے سوا کسی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا جناب۔ زخم ضرور لگے ہیں لیکن خطرے کی بات نہیں۔''

وہ مختلف ملازموں کے نام لے کر ان کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ندیم اور ڈرائیور رشید گول مول جواب دیتے رہے۔ پھر جلالی صاحب اپنے پالتو جانوروں کے بارے میں پوچھنے لگے۔ انہیں زیادہ پریشانی ایرانی بلیوں کی طرف سے تھی۔ عمران نے انہیں بتایا کہ دیگر جانوروں کی طرح بلیاں بھی بالکل محفوظ ہیں۔ اس نے جلالی صاحب کو بتایا کہ کل رات جانے سے پہلے وہ چاروں بلیوں کو حفاظت کی غرض سے بالائی منزل کے پنجرے میں چھوڑ گیا تھا۔ وہ بالکل خیریت سے ہیں۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے اٹھک پٹخ کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگا جیسے کوئی بند دروازے کو دھکے دے رہا ہے یا ٹھوکریں مار رہا ہے۔ اس کے ساتھ ''اُوں اُوں'' کی منہ بند صدائیں بھی سنائی دیں۔ ''یہ کیا ہے؟ یہ تو کوئی عورت ہے۔'' جلالی صاحب نے ٹھٹکی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم ساتھ والے کمرے میں پہنچے۔ دروازہ کھولا تو آنکھیں بند کرنا پڑیں۔ جلالی صاحب کی دو جوان ملازمائیں رخشی اور زرینہ بالکل برہنہ حالت میں موجود تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں ٹیلی فون کے تار سے باندھے گئے تھے اور نیلگوں نشان ان کے جسموں پر نظر آرہے تھے۔ انہیں بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ہم نے فوراً ان کے جسموں پر چادریں ڈال دیں۔ رخشی تو نیم بے ہوش تھی۔ وہ قالین پر کھڑکی کے قریب پڑی تھی۔ یہ زرینہ ہی تھی جس نے بند دروازے کو ٹھوکریں رسید کر کے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ دونوں کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے گئے تھے۔ کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، شراب کے پوّے اور کٹے پھٹے زنانہ لباس پورے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔

زرینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے گندمی چہرے اور گردن پر گہری خراشیں نظر آرہی تھیں۔ عمران نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔ وہ بلکی۔ ''انہوں نے ہمیں برباد کر دیا۔ کہیں کا نہیں چھوڑا۔ یااللہ مجھے موت آجائے۔ میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گی۔'' زرینہ کی آہ و بکا دل دوز تھی۔

''کون تھے وہ؟'' عمران نے زرینہ کا سر گود میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ان کتوں نے اپنے منہ کپڑوں اور ٹوپیوں میں چھپا رکھے تھے۔ ایک دوسرے کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔ وہ ساری رات یہاں کمرے میں رہے ہیں۔ میرے کاکے کو دیکھو، وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ خدا کے لیے اس کو دیکھو۔'' اس نے اپنے چہرے کی مدد سے کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں ایک چھوٹی چارپائی پر ایک کھیس سا پڑا تھا۔ اس کے نیچے کچھ تھا۔ چھوٹا سا ایک بچہ۔ میں نے کھیس اٹھایا۔ قریباً ایک سالہ بچہ بالکل ساکت پڑا تھا۔ بہت گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ وہ زندہ تھا لیکن نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھا۔ وہ میرے زور سے جھنجوڑنے کے

باوجود جاگا نہ رویا۔ اس کے ادھ کھلے منہ سے کسی دوا کی تیز بو آرہی تھی۔ پھر میری نگاہ اس دوا پر پڑی۔ یہ کھانسی کا ایک نہایت تیز اثر شربت تھا۔ بالغ شخص بھی اس کے دو چمچ پی کر چار پانچ گھنٹے کے لیے اتنا غفیل ہوسکتا تھا۔ بچے کو غالباً زیادہ مقدار میں یہ شربت پلادیا گیا تھا۔

میں نے باہر جا کر اسے ڈاکٹر لائبہ کے حوالے کیا۔ وہ اسے فوراً طبی امداد دینے میں معروف ہوگئی۔ کمرے میں واپس آیا تو زرینہ۔۔۔ کے ہاتھ کھولے جاچکے تھے۔ کمرے کے درمیان ایک چادر سی تان دی گئی تھی اور ہمارے ساتھ پکنک پر جانے والی دو ملازمائیں زرینہ اور بے ہوش رخشی کو کپڑے وغیرہ پہنارہی تھیں۔ زرینہ کی آہ وزاری جاری تھی۔ اس کی اپنی حالت بھی بُری تھی لیکن اسے زیادہ فکر اپنے بچے کی تھی۔

میں نے آواز دے کر اسے بتایا۔ ”زرینہ! تیرا بچہ بالکل ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر لائبہ نے اسے ٹیکا لگایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں جاگ جائے گا۔ کچھ نہیں ہوا اسے۔“

دونوں ملازماؤں کی حالت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ کئی شرابی مردوں نے ان کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا ہے اور دیر تک اس کمرے میں رہ کر اپنے چہروں پر گناہ اور نحوست کی کالک ملتے رہے ہیں۔

رخشی کی حالت زیادہ بُری تھی۔ اسے اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور وہ گاہے بگاہے عجیب انداز سے کراہ اٹھتی تھی۔

عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”تابی! مجھے تو لگتا ہے، یہ سب کچھ ٹریکٹر ڈرائیور اور مخبر مختار ملک کا بدلہ لینے کے لیے کیا گیا ہے۔“

”یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟“

”مشتاق کی لاش سے۔“ عمران نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ لاش عین اس جگہ پڑی ہے جہاں تم نے مختار ملک کو مارنے کے بعد ڈالا تھا۔“ میرے جسم میں سرد لہری سی دوڑ گئی۔ یہ قابلِ غور بات تھی۔

مشتاق کا چھوٹا بھائی اعجاز بھی زخمی ہوا تھا۔ اسے اس کے ایک ساتھی سمیت غسل خانے میں بند کردیا گیا تھا۔ اس کے ساتھی کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ ان دونوں کی گھڑیاں، موبائل اور نقدی وغیرہ سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ تھپڑوں کے نشان ابھی تک ان دونوں کے چہروں پر واضح تھے۔ ان کے تین دیگر زخمی ساتھی بھی ایک غسل خانے کا تالا توڑ کر نکالے گئے۔ اعجاز نے روتے ہوئے کہا۔ ”وہ کوئی تین درجن بندے تھے۔ ڈکیتوں کی طرح ان سب نے اپنے منہ چھپا رکھے تھے۔ ایک لمبے قد کے بندے کے سوا وہ سب پنجابی بولتے تھے۔ لمبے قد والا پٹھانی اردو بولتا تھا۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی سب سے پہلے مین گیٹ کے گارڈز کو بے بس کیا۔ جس نے بھی ان کو روکنا چاہا، اس کی ٹانگوں پر گولیاں ماریں اور ناکارہ کردیا۔ جب انہوں نے زرینہ سے اس کا بچہ چھینا اور اس کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کی تو بھائی مشتاق ان کے سامنے آگیا۔ اس نے چاقو چلایا جس سے ان کے دو بندے پھٹل (زخمی) ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے بھائی کو پکڑ لیا اور بڑی بیدردی سے مارا۔ بابے طفیل نے بھائی کو چھڑانے کی کوشش کی تو اس کی داڑھی کھینچی گئی اور اس کی عمر کی پروا کیے بغیر اسے فرش پر لٹا کر جانوروں کی طرح مارا گیا۔ بھائی ادھ موا ہو کر گر گیا تو ان کا سرغنہ بولا۔۔۔ خو، اسے پار کردو۔ وہیں پہنچادو جہاں امارا ساتھی گیا ہے۔“ ہم سمجھتے تھے کہ وہ بھائی کو گولی مارنے لگے ہیں۔ لیکن وہ اسے سیڑھیوں پر لے گئے۔ غسل خانے کی کھڑکی میں سے ہم کو سب کچھ نظر آرہا تھا۔ بھائی آخر تک خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ انہوں نے اسے پندرہ سیڑھیوں سے نیچے پکے فرش پر پھینک دیا۔ وہ اسے سر کے بل گرانا چاہتے تھے مگر وہ کندھوں کے بل گرا۔ انہوں نے نیچے جا کر دیکھا۔ اس میں ابھی جان باقی تھی۔ اوکھے اوکھے سانس لے رہا تھا۔ وہ ظالم اسے اٹھا کر پھر اوپر لائے۔ پھر اسی طرح اسے اٹھا کر نیچے پھینکا۔ اس مرتبہ وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑا رہا۔ شاید اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا تھا۔ میرے بھائی کو بڑی تکلیف دی ہے انہوں نے۔۔۔“ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اسی دوران میں مالی کے بیٹے امین نے ہمارے کان میں بتایا کہ کوٹھی کے پچھواڑے اور چڑیا گھر کی پچھلی طرف دور تک کھدائی کی گئی ہے اور وہاں مٹی کے ڈھیر پڑے ہیں۔ میں اور عمران کوٹھی کی چھت پر گئے۔ فتح محمد اور ندیم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ امین کی بات درست تھی۔ کوٹھی کے پچھواڑے اور شمال کی باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ کئی جگہ کھدائی کی گئی تھی۔ یہ کھدائی باقاعدہ ”ڈگنگ مشین“ کے ذریعے ہوئی تھی۔ مشین کے بڑے بڑے ٹائروں کے نشان بھی جگہ جگہ دکھائی دیتے تھے۔

ندیم نے طویل سانس لی اور کہا۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ یہ اسی موٹے ریان ولیم اور اس کے ساتھیوں کی کارستانی ہے۔ ان میں مرجان خان نام کا ایک لمبے قد کا بدمعاش بھی تھا۔ وہ پٹھانی لہجے میں اردو بولتا ہے۔“

”یہ ریان ولیم کون ہے؟“ میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

”یہ وہ دوسری پارٹی ہے جو باکس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ایک رات یہ لوگ بھی ہمارے بن بلائے مہمان بنے تھے۔ ریان کوئی غیر ملکی جواری ہے۔ بہت موٹا شخص ہے اور صرف انگریزی بول سکتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ دو تین مقامی بندے بھی لایا تھا۔ یہ لوگ بھی پہلے نرمی سے جلالی صاحب کو گھیرنے کی کوشش کرتے رہے پھر سختی پر اتر آئے۔ اس ریان نامی شخص نے جلالی صاحب کو دھمکی دی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ باکس کے لیے اس سارے فارم ہاؤس کو کھود کر رکھ دے گا۔“ کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر ہم دوسری طرف متوجہ ہوگئے۔ سب سے اہم کام زخمیوں کو اسپتال پہنچانا تھا۔ ہم نیچے آئے اور اس سلسلے میں دیگر افراد کی مدد کی۔ ایک اسٹیشن ویگن، ایک ڈبل کیبن اور ایک جیپ اس کام کے لیے استعمال کی گئی۔ پانچ بندے ایسے تھے جن کی ٹانگوں میں گولیاں لگی تھیں۔ چھٹا شخص شدید زخمی تھا۔ یہ وہی گارڈ اشرف علی تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ دو عورتیں بھی شدید زخمی تھیں۔ ان میں سے ایک تو رخشی ہی تھی جسے زرینہ کے ساتھ زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کی ذہنی حالت بھی درست نہیں لگ رہی تھی۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں وہ بار بار عجیب انداز میں بڑبڑانے لگتی تھی۔

کوٹھی اور فارم ہاؤس میں عام طور پر چالیس پینتالیس ملازم ہر وقت موجود ہوتے تھے۔ ان میں سے بیس پچیس تو گارڈز ہی تھے۔ لیکن واردات کے وقت کچھ لوگ تو ہمارے ساتھ نہر کے کنارے خیموں میں موجود تھے اور کچھ چھٹیوں کی وجہ سے غیر حاضر تھے۔ ورنہ ممکن تھا کہ اس واردات کی وجہ سے زیادہ جانی نقصان ہوتا۔ سیکریٹری ندیم نے جلالی صاحب کو بتائے بغیر ہی پولیس کو فون کردیا۔ ظاہر ہے کہ کوٹھی میں ایک لاش بھی موجود تھی اور اس کی فوری رپورٹ کرنا ضروری تھی۔ اس دوران میں عمران نے باریک بینی سے مختلف شواہد اکٹھے کیے، میں بھی اس کی مدد کررہا تھا۔ میں نے عمران کی توجہ نیم بے ہوش رخشی کے ایک ہاتھ کی طرف دلائی۔ ناخنوں میں گوشت کے باریک ریزے سے پھنسے ہوئے تھے جیسے اس نے خود پر حملہ کرنے والے کو نوچا ہو۔ دوسری ملازمہ زرینہ نے روتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ رخشی نے زیر ہونے سے پہلے لمبے قد والے پٹھان کی سخت مزاحمت کی تھی۔ جواباً اس شخص نے بھی رخشی کو اپنا خصوصی نشانہ بنایا تھا۔ رخشی کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی تقریباً ساری ذمے داری اسی شخص پر آتی تھی۔

آدھے گھنٹے میں پولیس جیپ سائرن بجاتی کوٹھی میں پہنچ گئی۔ مقامی ایس ایچ او چوڑے جبڑوں اور موٹی توند والا ایک روایتی سا تھانیدار تھا۔ سب سے پہلے تو جلالی صاحب نے اس کی کلاس لی۔ انہوں نے اسے بے نقط سنائیں۔ بولے۔ ”تم زنانے بن کر تھانے میں گھسے رہتے ہو۔ کھڑکی کے پیچھے سے وارداتیں ہوتی دیکھتے ہو اور جب سب کچھ ہو جاتا ہے تو توندیں مٹکاتے پہنچ جاتے ہو۔ یہ چور، ڈاکو تمہارے بھائی بند ہیں۔ چلے جاؤ یہاں سے، نکل جاؤ میرے گھر سے۔“

ندیم اور ڈاکٹر مہناز وغیرہ نے بمشکل جلالی صاحب کو سنبھالا لیکن وہ بدستور طیش میں تھے۔ فتح محمد تھانیدار اکرام خان کو ایک طرف لے گیا اور کچھ دیر تک کھسر پھسر کرتا رہا۔ مجھے کئی دفعہ فتح محمد پر عجیب سا شبہ ہوتا تھا۔ یہ شخص دوسرے ملازموں سے کچھ الگ تھلگ سا تھا۔ ایک طرح سے اس کی حیثیت انچارج گارڈ کی تھی مگر وہ ڈیوٹی پر کم ہی نظر آتا تھا۔ میرے ساتھ بھی اس کا رویہ بس لیے دیے والا رہتا تھا۔ کسی وقت شک ہوتا تھا کہ شاید اس رات جلالی صاحب کی پوٹھوہار جیپ کے اردگرد گھومنے والا اور پھر مڈگارڈ کے اندر ”ٹریکر“ چپکانے والا یہ فتح محمد ہی تھا۔ موقع پر اس کے گرگابی نما جوتے کے نشان بھی موجود تھے۔ پھر جب میں جلالی صاحب کو روکنے کے لیے جیپ کے پیچھے بھاگا تھا تو سب سے پہلے میرے راستے میں آنے والا یہ فتح محمد ہی تھا۔ عین ممکن تھا کہ کل رات ہونے والی خونی واردات میں بھی اس شخص کا کردار ہو۔ اسی نے حملہ آوروں تک اطلاع پہنچائی ہو کہ جلالی صاحب رات نہر کے کنارے گزاریں گے اور کوٹھی کے اندر کی دیگر معلومات بھی اسی نے دی ہوں۔

بہرحال، ایک بات تو طے تھی کہ کوٹھی اور فارم ہاؤس میں ایک دو افراد اب بھی ایسے موجود ہیں جو اندر کی خبریں باہر دے رہے ہیں اور باہر والوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔

کچھ دیر بعد پتا چلا کہ جلالی صاحب کے جلال سے بچنے کے لیے تھانیدار اکرام خان واپس چلا گیا ہے اور اب کوئی اعلیٰ افسر ہی جلالی صاحب کو مطمئن کرنے کے لیے لاہور سے آئے گا۔ یہ افسر دو گاڑیوں کے ساتھ قریباً ایک گھنٹے میں پہنچ گیا اور یہ وہی حمزہ صاحب تھے جن کی حیثیت جلالی

صاحب کے پرانے دوست اور پرستار کی سی تھی۔ اعلیٰ سطح پر جلالی صاحب کا ایک حلقۂ احباب تھا۔ جلالی باقاعدہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھے۔ جنگلی حیات کے تحفظ پر لکھے ہوئے ان کے ریسرچ مقالے نے ماضی میں کافی شہرت پائی تھی۔ وہ امریکا میں وائلڈ لائف کی ایک ویلفیئر سوسائٹی کے بنیادی اور اہم رکن تھے۔ دس پندرہ برس پہلے تک جب ان کی صحت ٹھیک تھی، وہ اکثر بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے امریکا اور کینیڈا وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ انہیں بعض اوقات غیرملکی یونیورسٹیوں میں لیکچر کے لیے بھی بلایا جاتا تھا۔

سہ پہر کے بعد جونہی موقع ملا، عمران نے موبائل فون پر ریان ولیم سے رابطہ کیا۔ میں بھی اس کے کمرے میں موجود تھا۔ ایسے رابطے کے وقت عمران موبائل کا اسپیکر آن کر لیتا تھا تاکہ میں بھی دوطرفہ گفتگو سن سکوں۔ عمران کے ذہن میں بھی یقیناً وہی سوال مچل رہا تھا جو میرے ذہن میں بھی موجود تھا۔ اگر واقعی کل رات ہونے والی خونی کارروائی ریان ولیم کے ایما پر ہوئی تھی تو پھر ہمیں اس سے بےخبر کیوں رکھا گیا؟ یہ تو کوئی بات نہیں تھی کہ ہم ریان ولیم کے لیے کام بھی کر رہے تھے اور اس کی منصوبہ بندی سے بھی لاعلم تھے۔ اس سے پہلے بھی ریان ولیم نے ہمیں آدھا سچ بتایا تھا اور کہا تھا کہ اسے خود "باکس" میں دلچسپی نہیں بلکہ وہ کسی اور کے لیے اسے ڈھونڈنا چاہتا ہے۔

رابطہ ہونے پر عمران نے ریان ولیم کو کل رات کے واقعات کے بارے میں بتایا۔ ریان اور رچی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ان واقعات کے بارے میں جان چکے ہیں۔ بہرحال، ریان نے اس بات سے صاف انکار کیا کہ اس کارروائی میں ان کا کوئی عمل دخل ہے۔

عمران نے کہا۔ "سر! یہاں کچھ معاملات ہمیں الجھا رہے ہیں۔ اگر ہم اس الجھن میں رہے تو ہماری کارکردگی پر بھی اثر پڑے گا۔ اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو ایک دو باتوں کی وضاحت کر دیجیے۔"

"ہاں ہاں، پوچھو ایمران! بُرا لگنے کی کیا بات ہے؟"

"کیا آپ کے مقامی ساتھیوں میں کوئی مرجان خان نام کا شخص بھی ہے؟"

"تم اسے ساتھی تو نہیں کہہ سکتے، بہرحال میں گاہے بگاہے اس سے کام لے رہا ہوں۔ بےخوف شخص ہے۔ ہر کام میں کود پڑتا ہے۔"

"کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے سر کہ وہ آپ کی اجازت کے بغیر ہی یہاں شیخوپورہ پہنچے اور کسی کام میں کود پڑے؟"

"نہیں، وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"سر! کل یہاں جو خونی واردات ہوئی ہے، اس میں کم و بیش تین درجن بندے شامل تھے۔ ان سب نے شروع سے آخر تک اپنے چہرے منڈاسوں اور ٹوپیوں میں چھپائے رکھے۔ ان کا سرغنہ ایک خاصے لمبے قد کا شخص تھا اور پٹھانی لہجے میں اردو بولتا تھا۔"

ریان ولیم کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "اگر وہ شخص لمبے قد کا تھا اور خاص طرح کی اردو بولتا تھا تو اس سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ وہ مرجان خان ہوگا؟"

"میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں سر! میں نے تو وہ معلومات آپ تک پہنچائی ہیں جو مجھ تک پہنچیں۔ باقی آپ اس ساری صورتِ حال کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

"نہیں ایمران! اگر مرجان خان کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی شک ہے تو وہ نکال دو۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا اور نہ میں کسی کو ایسا کام کرنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ میرے خیال میں تو کل رات جس نے بھی کارروائی کی ہے، اس نے حماقت کی ہے۔ ایسی کسی حماقت کا نتیجہ جلالی کے ہارٹ اٹیک یا اس کی موت کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ اور اگر یہ بڈھا عدم آباد روانہ ہو گیا تو سمجھو سب کچھ چوپٹ ہو گیا۔"

"پھر آپ کے خیال میں یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں سر؟" عمران نے پوچھا۔

"تمہیں بتایا تھا نا کہ کچھ اور لوگ بھی اسی راستے پر چل رہے ہیں۔ یقیناً ان میں سے ہی کسی نے یہ حماقت فرمائی ہے۔"

"لیکن سر! یہاں کوٹھی میں مرجان خان کا نام لیا جا رہا ہے اور اس حوالے سے آپ کا نام بھی آ رہا ہے۔ پولیس تفتیش کا رخ آپ کی طرف مڑ سکتا ہے۔ آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"میری طرف سے فکر نہ کرو ایمران! میں محفوظ جگہ پر ہوں... مرجان خان بھی پچھلے کئی مہینے سے انڈر گراؤنڈ ہے۔ اس تک پہنچنا آسان نہیں۔ لیکن یہاں ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دوسرے گروہ نے تفتیش کا رخ جان بوجھ کر غلط رخ پر موڑنے کی کوشش کی ہو۔ میرا مطلب اس لمبے قد اور پٹھانی لہجے والے شخص سے ہے۔"

"یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی آ رہا ہے سر! بہرحال

آپ بھی اس بارے میں غور فرمائیں، کل پھر بات کریں گے۔"

کچھ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد بات چیت کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ عمران کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔

☆☆☆

اگلے روز سہ پہر کے وقت عمران نے مجھے بتایا۔ "لگتا ہے کہ ملازموں کی ہمت جواب دے گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"زیادہ تر ملازم کوٹھی چھوڑ کر جا رہے ہیں اور کچھ جا بھی چکے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر لائبہ اور ڈرائیور رشید وغیرہ۔ مجھے لگتا ہے کل تک یہ ساری جگہ بھائیں بھائیں کرنے لگے گی۔"

"ڈاکٹر مہناز کہاں ہے؟"

"وہ رکی ہوئی ہے۔ صبح سے جلالی صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ مسلسل ان کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لائبہ کی جگہ کسی اور کو یہاں بلائے گی۔"

"پرسوں رات والی کارروائی کے بارے میں تم کس نتیجے پر پہنچے ہو؟ یہ ریان اینڈ کمپنی کا کام ہے یا جاوا اینڈ کمپنی کا؟"

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے کہ آج مبارک دن ہے۔ تم اچھے سوال کر رہے ہو... دراصل ہم کل سے ایک نکتہ فراموش کر رہے ہیں۔ پرسوں رات کے واقعات سے اس بات کے واضح اشارے ملتے ہیں کہ اس خونی کارروائی میں کسی حد تک انتقام کا جذبہ بھی شامل تھا اور وہ انتقام تھا مخبر مختار ملک کی موت کا۔ دوسری طرف ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مختار ملک کا تعلق اپنے ریان ولیم صاحب سے نہیں تھا۔ کم از کم ریان صاحب نے تو یہی کہا تھا کہ مختار ملک کو وہ نہیں جانتے۔"

"ہاں، یہ پوائنٹ تو ہے لیکن یہ کس طرح ثابت ہوگا کہ مختار کے بارے میں ریان ولیم نے ہمارے ساتھ سچ بولا تھا؟"

"یار! میرا دل کہتا ہے کہ اس نے سچ بولا تھا۔ کم از کم اتنی سی رعایت تو دے دو میرے دل کو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "یعنی ہم پرسوں رات کی کارروائی کے لیے ریان ولیم کو اپنی "تفتیش" سے خارج فرما رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ جاوا اور اس کے ساتھیوں کی کارروائی تھی۔"

"جاوا خود تو بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ پرسوں والی کارروائی میں وہ خود تو شریک نہیں ہوا ہوگا۔ یہ اس کے ساتھیوں کا کام ہوگا۔"

"بات پھر وہیں آ جاتی ہے۔ وہ پٹھانی لہجے میں اردو بولنے والا کون تھا؟"

"ہو سکتا ہے کہ ریان ولیم کا شک درست ہی ہو۔ جاوا گروپ نے تفتیش کا رخ غلط سمت میں موڑنے کے لیے یہ "پٹھانی لہجے" والا چکر چلایا ہو۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی ہے کہ یہ بےہودہ اور سفاک کارروائی جاوا جیسے اکھڑ مزاج شخص کے ذہن میں ہی ترتیب پا سکتی ہے۔ جلالی صاحب ہوا میں رکھے ہوئے چراغ کی طرح ہیں۔ اگر اس کارروائی کے صدمے سے یہ چراغ گل ہو جاتا تو بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ جاوا کو بھی سر پیٹنا پڑتا۔"

"لیکن یار! اگر یہ جاوا کا کام ہے بھی تو اس نے جلالی صاحب کو براہِ راست تو نشانہ نہیں بنایا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے جان بوجھ کر کارروائی کے لیے پرسوں کی رات چنی تھی۔ انہیں پتا تھا کہ جلالی صاحب خود یہاں موجود نہیں۔ غالباً انہوں نے جلالی صاحب کو صرف ڈرایا ہے اور ان پر دباؤ بڑھایا ہے۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن جلالی صاحب کتنا دباؤ برداشت کر سکتے ہیں، یہ بھی تو کنفرم نہیں۔ ایسے شخص کا پٹا کا کسی بھی وقت بول سکتا ہے۔ پٹاکا سمجھتے ہو نا تم؟"

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری وہ سیڑھیوں والی تھیوری بھی درست ہی لگتی ہے۔ کارروائی کرنے والوں نے گارڈ مشتاق کو جان بوجھ کر دو بار سیڑھیوں سے گرایا اور جان سے مارا۔ وہ ہمیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ مختار ملک اتفاقاً نہیں گرا تھا، اسے قتل کر کے وہاں سے پھینکا گیا تھا یا وہاں ڈالا گیا تھا۔"

عمران بولا۔ "اب وہ سیڑھیاں خوف کا ٹریڈ مارک بن گئی ہیں۔ کچھ ملازم انہیں پُراسرار رنگ دے رہے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ یہاں سے بھاگنے والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ان سیڑھیوں کے خوف سے فرار ہوئے ہیں۔ ابھی یہاں آتے ہوئے میں نے دیکھا ہے کہ سیڑھیوں کی طرف والا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ وہاں زینوں پر تلسی کے پتے بکھیرے گئے ہیں اور ریلنگ کے ساتھ دو تعویذ بھی بندھے ہوئے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ کارروائی بابے طفیل یا اس کی بیوی کی ہے۔"

''لیکن عمران! یہ سیڑھیوں والا چکر تو کافی پہلے کا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ باکس والے معاملے سے چند مہینے پہلے بھی یہاں کے ملازم ان سیڑھیوں سے خوف کھاتے تھے۔ ندیم نے خود مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ سب سے پہلے یہاں جلالی صاحب کا ایک لاڈلا طوطا مردہ پایا گیا تھا۔ کسی کو پتا نہیں چلا کہ وہ اپنے پنجرے سے کیسے نکلا اور کیسے یہاں پہنچ کر ختم ہوا۔ پھر وہ مہمان کے گرنے والا واقعہ ہوا جس میں وہ اپنی یادداشت بالکل کھول بیٹھا اور ابھی تک اسی حالت میں ہے... دو تین دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ملازموں نے ان سیڑھیوں پر خون کے باریک باریک چھینٹے دیکھے، جیسے کوئی پھوار پڑی ہو۔ رات کے وقت سیڑھیوں سے ایسی آوازیں سنی جاتی ہیں جیسے کوئی بھاری بھرکم شخص ٹھہر ٹھہر کر اتر رہا ہو۔ اب یہ اوپر نیچے دو اموات ہو گئی ہیں یہاں۔''

''یہ تم کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہو تابش! ہمارے دیہی علاقوں میں ایسی سیڑھیاں، ایسی چھتیں، ایسے تالاب اور درخت ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ ان سے کہانیاں وابستہ کی جاتی ہیں اور پھر انہیں بڑھایا چڑھایا جاتا ہے۔ یہ سادہ لوح لوگوں کے اندر کے وہم ہی تو ہوتے ہیں۔ بعض اوقات عیار لوگ اس کمزوری کو اپنے کسی مقصد کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ تمہیں جارج اور حکم جی کی ایک اہم کارستانی تو یاد ہو گی... وہ اپنے قیدیوں کے جسموں میں ''الیکٹرانک چپ'' نصب کرتے تھے اور پھر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ قیدی آزاد ہو کر بھی حکم کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا۔''

''لیکن ایک بات تو ہے عمران! بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم اپنی سائنس کے پیمانے پر نہیں تول سکتے۔ خود سائنس بھی یہ مانتی ہے کہ بہت کچھ ابھی انسان کے ذہن اور نظر سے اوجھل ہے۔''

''میں اس کو مانتا ہوں لیکن وہم اور ماورا میں بہت فرق ہے جگر... جوں جوں انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، وہم سکڑتا جاتا ہے اور ماورا کے لیے اس کی جستجو بڑھتی جاتی ہے۔ ہپناٹزم، مسمریزم، ٹیلی پیتھی، مستقبل بینی... پہلے یہ ماورا تھے، اب یہ سارے علوم ہیں۔''

''اچھا علامہ صاحب! اب یہ فرمایئے کہ ہمیں یہاں سے بھاگنا ہے یا ٹکنا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ مبارک گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اب تم نے پھر بے وقوفی کی باتیں شروع کر دی ہیں۔ بھئی، ہم نے ریان ولیم صاحب سے ایڈوانس پکڑا ہوا ہے... کمٹمنٹ کی ہوئی ہے۔ اب ہم اس کام کو رستے میں کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ کام پورا کریں گے تو باقی پیسے بھی ملیں گے اور پیسے ملیں گے تو نصرت کا علاج اچھے طریقے سے ہو سکے گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ تم نے یہ سوال بس برائے سوال ہی پوچھا ہے۔ تم بھی جانتے ہو کہ ہم بھاگنے والے ہیں، نہ جھکنے والے، نہ بکنے والے... نہ ٹکنے والے۔''

''یہ ''ٹکنے والے'' کیوں شامل کر دیا؟''

''بھئی، سیاست میں کوئی بات بھی حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ ہر نعرے میں بچاؤ کا کوئی راستہ کھلا رکھنا چاہیے۔''

گفتگو مذاق کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ ''یار! تم عجیب گھن چکر ہو۔ ایک طرف تو اڑیل سے اڑیل اور غصیلے سے غصیلے جانور کو رام کر لیتے ہو، دوسری طرف جلالی صاحب کے ساتھ کچھ نہیں کر پا رہے۔''

''تم جلالی صاحب کو اڑیل جانور سے ملا رہے ہو۔ تمہارے ستارے گردش میں ہیں۔ اپنے اس ''طرزِ کلام'' کی وجہ سے تم نے عنقریب جلالی صاحب کے ہاتھوں مرحوم ہو جانا ہے۔''

''تو اس سے پہلے کچھ کر گزرو نا۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے پندرہ بیس دن ہو چلے ہیں لیکن ابھی تک کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔''

اس کی کشادہ پیشانی پر لکیریں نمودار ہوئیں۔ وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ''میرے خیال میں سرا ہاتھ آیا ہے اور تمہارے ہاتھ ہی آیا ہے لیکن تم غور نہیں کر رہے۔ ہم ایک ایسے پوائنٹ تک پہنچ چکے ہیں جو یہاں کسی کی نظر میں نہیں۔''

''کس پوائنٹ کی بات کر رہے ہو؟''

''جلالی صاحب اور مہناز کی وہی گفتگو جو منگل کے روز تم نے مائکروفون پر سنی ہے۔ جلالی صاحب کے ساتھ ڈاکٹر مہناز کا تعلق بظاہر تو اس کوٹھی کے رواج کے مطابق عام ہی نظر آتا ہے لیکن وہ تھوڑا سا مختلف ہو چکا ہے۔ نہ چاہنے کے باوجود عزت مآب جلالی صاحب کے دل میں اس نرم و نازک ڈاکٹر مہناز کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو چکا ہے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ گوشہ وسیع ہو رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہی وہ اہم پوائنٹ ہے جو ہمیں غیر متوقع فائدہ پہنچا سکتا ہے۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ گوشہ فائدہ پہنچائے گا؟''

''اس کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ اس گوشے کے بارے میں کسی دوسرے کو پتا نہ چلے اور دوسرا یہ

کہ یہ گوشہ واقعی وسیع ہوجائے۔ اگر ہم...“

بات کرتے کرتے اچانک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ کھانسی کی آواز سے اندازہ ہوا کہ جلالی صاحب ادھر تشریف لا رہے ہیں۔ عمران نے جلدی سے سگریٹ بجھایا۔ جلالی صاحب کی آمد پر ہم دونوں کھڑے ہوگئے۔ ان کا رنگ معمول سے زیادہ زرد نظر آرہا تھا۔ ”بیٹھو بیٹھو۔“ جلالی صاحب نے کہا اور پھر ہمارے پاس ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے ہمیں یہ افسوس ناک اطلاع دی کہ زخمی گارڈ اشرف جانبر نہیں ہوسکا۔ اس کی میت لاہور سے اس کے آبائی علاقے ایمن آباد پہنچا دی گئی ہے۔ یہ واقعی دل گرفتہ کرنے والی اطلاع تھی۔

جلالی صاحب نے دوسری اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”گارڈ مشتاق کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آگئی ہے۔ اس کے جسم پر ایسے نشان ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ سیڑھیوں سے گرانے سے پہلے بھی اسے بیدردی سے مارا پیٹا گیا تھا۔ اس کی ایک ران کا گوشت اندر سے پھٹا ہوا ہے اور پیٹھ پر ٹھڈوں کے نشان ہیں۔ مجھے نوّے فیصد یقین ہے کہ یہ اسی سفید کتّے کی کارستانی ہے۔ وہ موٹا سور... اس نے خطرناک دھمکیاں دی تھیں۔ وہ لمبے قد والا قبائلی بدمعاش بھی اس کے ساتھ تھا۔“ جلالی صاحب نے بےحد مغموم لہجے میں کہا۔ وہ کافی پریشان تھے۔ موٹے سور سے ان کی مراد ریان ولیم ہی تھا۔

جن لوگوں سے وہ مشورہ وغیرہ کرتے تھے، ان میں سے کئی ایک انہیں چھوڑ کر جاچکے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ آج یہاں اس کمرے میں بیٹھے ہم سے دکھ سکھ بیان کر رہے تھے۔

اسی دوران میں ڈاکٹر مہناز بھی انہیں ڈھونڈتی ہوئی وہاں آگئی۔ جلالی صاحب کے اشارے پر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اور عمران بھی مؤدب بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کو اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ندیم کا فون آیا ہے سر... اس نے کہا ہے کہ دوسرے قتل کی ایف آئی آر بھی درج ہوگئی ہے۔ مشتبہ افراد میں انگلینڈ کے شہری ریان ولیم اور اس کے ساتھیوں کا نام شامل کیا گیا ہے۔ دوسری طرف جاوا اور دزِ شہوار وغیرہ کا نام بھی شامل ہے۔ پولیس ان لوگوں کی تلاش میں مختلف جگہوں پر چھاپے مار رہی ہے۔“

”چھوڑو ان باتوں کو۔“ جلالی صاحب نے سخت بیزار لہجے میں کہا۔ ”یہ گھسے پٹے فقرے بہت سن رکھے ہیں ہم نے۔ ہماری پولیس تو صرف شرفا کی پگڑیاں اچھالنے کے لیے ہے۔ مجرموں کے ساتھ ان کے یارانے ہوتے ہیں۔ مجھے بہت کم امید ہے ان کی طرف سے کسی اچھی خبر کی... باقی جہاں تک اپنی حفاظت کا تعلق ہے، یہ اب میں خود کروں گا۔ اس فارم کے ایک ایک انچ پر بہترین گارڈز کھڑے کردوں گا۔ وہ جدید اسلحے سے لیس ہوں گے۔ دس پندرہ دن تک کوٹھی کی چھت پر واچ ٹاور بھی مکمل ہوجائے گا۔ وہاں سے فارم کے اردگرد چار پانچ کلومیٹر تک نظر رکھی جاسکے گی۔“

مہناز نے ہمت کر کے کہا۔ ”لیکن سر! ان قاتلوں کو بھی تو پکڑنا ہے جنہوں نے دو جانیں لیں۔ دو عورتوں کو بے آبرو کیا۔ درجن بھر افراد کو بُری طرح زخمی کیا۔ پورے فارم میں توڑ پھوڑ کر کے کروڑوں کا نقصان کیا۔ ایرانی بلیوں کو...“

مہناز کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے دیکھا تھا کہ عمران نے ٹہوکا دے کر مہناز کو فقرہ پورا کرنے سے روکا تھا۔ جلالی صاحب نے غالباً آخری الفاظ سنے ہی نہیں اس لیے انہوں نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

عمران نے مہناز کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں، حملہ آوروں کا کھوج لگنا ضروری ہے۔ ورنہ ان کے حوصلے بڑھتے جائیں گے۔“

”یہ سب بھی ہوگا... ضرور ہوگا۔“ جلالی صاحب نے وجدانی انداز میں سر ہلایا۔ ان کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ ڈاکٹر مہناز سمجھ گئی کہ اگر یہ موضوع تھوڑی دیر مزید چلا تو جلالی صاحب کا بلڈ پریشر شوٹ کر جائے گا۔ اس نے فوراً گفتگو کا رخ بدل دیا۔ وہ جلالی صاحب کو یہ بتانے میں مصروف ہوگئی کہ ڈاکٹر لائبہ کی جگہ کسی ڈاکٹر کا انتظام کر رہی ہے۔ اس طرح کی کچھ مزید حوصلہ افزا باتیں بھی اس نے جلالی صاحب کے سامنے کیں۔

اگلے روز صبح سویرے موقع ملا تو میں نے عمران سے کل والی گفتگو کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جب ڈاکٹر مہناز، جلالی صاحب کے سامنے ایرانی بلیوں کا ذکر کرنے لگی تھی تو اس نے مہناز کو روک کیوں دیا تھا؟

وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر مدھم آواز میں بولا۔ ”تم ان بلیوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”کچھ زیادہ نہیں، بس یہ سنا تھا کہ تم جلالی صاحب کو

واردات کے روز بتا رہے تھے کہ بلیوں کو حفاظت کی غرض سے کسی بالائی منزل کے پنجرے میں رکھا گیا ہے۔“

”وہ غلط بات تھی۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”بلّیاں اوپر والے پنجرے میں نہیں ہیں۔ اوپر والے پنجرے کا ذکر میں نے صرف اس لیے کیا تھا کہ جلالی صاحب دو منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا نہیں سکتے... بلّیاں مرچکی ہیں۔“

”مرچکی ہیں؟“

”ہاں، یہ خونی واقعہ بھی ان واقعات میں شامل ہے جو بدھ کی رات یہاں فارم ہاؤس میں ہوئے۔“

”چاروں بلّیاں؟“ میں نے سخت تحیّر کے عالم میں پوچھا۔

”ہاں چاروں ہی۔ ان خبیثوں نے ان پر افریقن جنگلی کتّے چھوڑ دیے۔ جنگلی کتوں کا بڑا پنجرہ بلیوں والے پنجرے کے ساتھ ہی تھا۔ انہوں نے دونوں پنجروں کی درمیانی رکاوٹ ہٹا دی۔ آٹھ عدد خونخوار کتّوں کے گروہ نے منٹوں میں بلیوں کی تکّا بوٹی کر ڈالی۔ یہ بڑے ظالم کتّے ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے چرندے درندے پر حملہ کرسکتے ہیں۔ اپنے شکار کو زندہ حالت میں ہی پھاڑنا اور کھانا شروع کر دیتے ہیں۔“

”اوہ گاڈ۔“ میں نے سر پکڑ لیا۔ وہ بڑی قیمتی اور نایاب بلّیاں تھیں۔ جلالی صاحب کو ان سے خاص اُنس تھا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے وہ نہایت سفاک تماشا دیکھا۔ کالے دھبّوں والے وہ خوفناک جنگلی کتّے نرم و نازک بلیوں پر جھپٹ رہے تھے۔ انہیں چیر پھاڑ رہے تھے۔

حملہ آوروں نے بدھ کی رات اس فارم ہاؤس میں جو درندگی دکھائی، وہ ”یادگار“ تھی۔ اب اس درندگی میں ان بلیوں والے واقعے کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ یہ بےمثل سفاکی تھی۔ جہاں بےگناہ ملازماؤں کی عصمت دری کی گئی تھی، وہاں بےزبان جانوروں کو بھی معاف نہیں کیا گیا تھا۔ دو افراد جان سے گئے اور ایک درجن کے قریب بےطرح گھائل ہوئے اور پولیس ابھی تک صرف ”چھاپے“ ہی مار رہی تھی۔ میرے خیال میں عمران نے اچھا ہی کیا تھا جو جلالی صاحب کو بلیوں والے واقعے سے ابھی تک بےخبر رکھا تھا۔ یہ اطلاع ان کے صدمے کو شدید تر کرنے کے سوا اور کیا کرسکتی تھی۔ آج کل میرے ذہن میں رہ رہ کر ابرار صدیقی کا خیال بھی آرہا تھا۔ اگر اس چاندنی رات میں واقعی اسی نے لکڑی کا باکس جھاڑیوں میں پھینکا تھا تو پھر وہ اس کی کھوج میں واپس کیوں نہیں آیا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اس بھاگ دوڑ میں کہیں مارا ہی گیا ہو؟

مشتاق کی دردناک موت اور دیگر سنگین واقعات کو اب چوتھا روز تھا۔ کوٹھی اور فارم ہاؤس پر عجیب سا سناٹا طاری تھا۔ بھاگ جانے والے ملازموں کا خلا پُر کرنے کے لیے جلالی صاحب کافی کوشش کر رہے تھے پھر بھی وہ پانچ چھ افراد سے زیادہ کا انتظام نہیں کر پائے تھے۔ درحقیقت یہاں رونما ہونے والے واقعات نے اردگرد کے سارے علاقے میں ہراس پھیلا دیا تھا اور فارم ہاؤس کے لیے زیادہ تر ملازم آس پاس ہی سے مہیا ہوتے تھے۔

ہاں، جلالی صاحب ایک اچھی سیکیورٹی کمپنی سے معاملہ طے کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس کمپنی نے جدید اسلحے سے لیس کم و بیش چالیس گارڈز فارم ہاؤس کو مہیا کر دیے تھے۔ ان گارڈز نے بارہ بارہ گھنٹے کی دو شفٹوں میں فارم ہاؤس کی نگہبانی کرنا تھی۔ ان لوگوں کے پاس واکی ٹاکی، سرچ لائٹس، دو پیٹرولنگ گاڑیاں اور اس طرح کی دیگر سہولتیں موجود تھیں۔ اب جلالی صاحب اپنی ذاتی حفاظت کی طرف سے بھی چوکس ہوگئے تھے۔ پچھلے دنوں میں وہ صرف ایک بار فارم سے باہر گئے تھے۔ اس موقع پر گارڈز کی ایک گاڑی اور دو موٹر سائیکل سوار ان کی شیورلیٹ کے ساتھ موجود رہے تھے۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کے ذہن میں کچھ پک رہا ہے۔ وہ ظلم برداشت کرنے والا شخص نہیں تھا اور یہاں ظلم ہوا تھا۔ خاص طور سے دو بےبس عورتوں کو ایک ہی کمرے میں رات بھر بےآبرو کرنے والا واقعہ عمران کے ذہن کو مسلسل کچوکے لگا رہا تھا۔ میں بھی اپنے طور پر بہت ذہنی بوجھ محسوس کرتا تھا۔ یہ کہا جاسکتا تھا کہ بدھ کی رات جو خونی واردات ہوئی، اس کی شروعات میری طرف سے ہی ہوئی تھی۔ مختار ملک سے میری لڑائی ہوئی اور وہ آناً فاناً مارا گیا۔ حملہ آوروں نے یہاں جو کچھ کیا، اس میں یقیناً مختار ملک کی موت کا غم و غصہ بھی شامل تھا۔

عمران اور میں اب بھی علیحدہ علیحدہ کمرے میں سوتے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے عمران نے مجھے فون کیا۔ ”تابی! تیار ہوجاؤ، کل ہمیں کہیں جانا ہے۔“

”کہاں؟“

”وہ کام کرنے کے لیے جو ابھی تک پولیس نہیں کرسکی۔“

”پولیس نہیں کرسکی؟“ میں نے پوچھا۔

''یار! بڑی کمزور یادداشت ہے تمہاری۔ اسی کمزوری کے بارے میں پشتو فلموں کی مشہور ہیروئن مسرت شاہین نے اپنے ایک تحقیقی مقالے میں لکھا تھا کہ جن قوموں کی یادداشت کمزور ہوتی ہے، ان پر ہر کوئی کاٹھی ڈال سکتا ہے۔''

''پتا نہیں کہاں کی بات کہاں جوڑ دیتے ہو۔ آج مسرت شاہین سے تحقیقی مقالہ لکھوا رہے ہو، کل کسی دانشور سے ڈانس کروا دو گے۔''

''تمہاری معلومات ناقص ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ کسی نامعلوم مضمون میں پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے اس نے۔ علم الابدان کی ایسی ایسی تشریح کرتی تھی کہ لوگ سر دُھنتے تھے۔ خیر، چھوڑو اس موضوع کو۔ میں اس واردات کی بات کر رہا ہوں جو بدھ کی رات ہوئی۔''

''کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''یہ پوچھو، کیا کرنے کا ارادہ نہیں۔ تمہیں کل شام کے بعد جلالی صاحب سے رخصت لینی ہے اور تیار رہنا ہے۔''

وہ زبردست موڈ میں دکھائی دیتا تھا مگر اس نے زیادہ بات نہیں کی اور فوراً ہی فون بند کر دیا۔

رات کوئی تین بجے کا وقت ہوگا۔ میں کمرے میں اپنے فرشی بستر پر سو رہا تھا۔ اچانک نیند سے جاگ اٹھا۔ کچھ دیر بے حرکت لیٹا رہا پھر اندازہ ہوا کہ موبائل فون کی مدھم گھنٹی کی وجہ سے آنکھ کھلی ہے۔ چندھیائی ہوئی نظروں سے اسکرین کو دیکھا اور مزید چونک گیا۔ آسٹریا کا نمبر تھا۔ یہ کال نصرت کے سیل فون سے تھی۔ ''ہیلو نصرت!'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔

''ہیلو تابش بھائی!'' وہ بھی بالکل مدھم آواز میں بولی۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم تو خیریت سے ہو... اتنی رات گئے فون؟''

''آپ بھول رہے ہیں جناب! یہاں بہت زیادہ رات نہیں ہوئی۔ صرف بارہ بجے ہیں، تقریباً تین گھنٹے کا فرق ہے ٹائم میں۔'' وہ بدستور سرگوشیوں میں بول رہی تھی۔

''پھر بھی آدھی رات تو ہو گئی ہے۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یوسف بھائی اور چچا احمد تو چلے گئے ہیں۔ باجی آج میرے پاس اسپتال میں رہیں گی۔ یہاں اجازت تو نہیں ہوتی ہے ساتھ رہنے کی لیکن بعض اوقات مل بھی جاتی ہے۔ بہر حال، اس وقت باجی بھی ساتھ والے کیبن میں سو رہی ہیں۔''

''ہاں... کیسے فون کیا؟''

''بھائی جان! آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز، میری بات پر غور ضرور کرنا۔''

''نصرت! جب تم بات بتاؤ گی تو پھر ہی غور ہو سکے گا نا۔''

''بھائی جان! پتا نہیں کہ مجھے یہ بات آپ سے کہنی چاہیے یا نہیں لیکن اگر آپ کو بُرا بھی لگے تو مجھے چھوٹی بہن سمجھ کر معاف کر دیجیے گا۔ پلیز بھائی۔''

''دیکھو تم خوامخواہ الجھا رہی ہو۔ میں تم سے کبھی ناراض ہوا ہوں اور نہ اب ہوں گا۔ تم جو بھی کہنا چاہتی ہو بے دھڑک کہو۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ ''تابی بھائی! بہت کچھ بدل چکا ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ آپ ابھی تک نہیں بدلے۔ آپ... اب بھی وہی تابی بھائی ہیں جو باجی کو دیوانوں کی طرح چاہتے تھے۔ رات دن بس باجی کو سوچتے تھے۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنے کے پروگرام بناتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے اور اپنے اس یقین کی وجہ سے میرے اندر ایک خوشی سی پیدا ہوتی ہے تابی بھائی... پتا ہے کیوں؟''

''تم اپنی بات مکمل کر لو، میں پھر جواب دوں گا۔''

''اس لیے تابی بھائی کہ میرے خیال میں آپ باجی ثروت کو اس دلدل سے نکال سکتے ہیں جس میں وہ گلے گلے دھنسی ہوئی ہیں۔ باجی نے ایک ایسے شوہر کے ساتھ اپنی زندگی برباد کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے جو اصل میں ان کا شوہر ہے ہی نہیں۔ میں سچ کہتی ہوں تابی بھائی جان! میں یوسف بھائی کو دیکھتی ہوں تو میرے گلے میں دھواں سا بھرنے لگتا ہے۔ آج کل بھی یوسف بھائی ہر وقت باجی کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں۔ میری تیمارداری پر بھی بڑی توجہ دے رہے ہیں، روز گلدستے آ رہے ہیں لیکن میں سب جانتی ہوں۔ یہ باجی کے ساتھ بنائے رکھنے کی کوششیں ہیں اور یہ کوششیں بھی بس اس وقت تک ہیں جب تک یوسف بھائی کا مطلب نہیں نکل جاتا۔ جس روز انکل فاروقی نے پراپرٹی ان کے نام کر دی، یا پھر انکل فاروقی کی آنکھیں بند ہو گئیں، یوسف بھائی نے کسی کچرے کی طرح باجی کو اٹھا کر اپنے گھر سے باہر پھینک دینا ہے۔ میری ہیروں جیسی باجی کی کوئی قدر نہیں انہیں۔ آپ... میری بات سن رہے ہیں نا؟''

''ہاں میں سن رہا ہوں۔''

''یوسف بھائی کے دو چہرے ہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں باجی ثروت کو بس ایک چہرہ ہی نظر آتا ہے یا پھر نظر تو آتا ہے لیکن انہوں نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ وہ یوسف بھائی سے علیحدہ ہونے والا گناہ نہیں کریں گی اور اگر کریں گی تو کسی نہ کسی صورت سزا پائیں گی۔ وہ جانتی ہیں کہ طلاق ان کے لیے ضروری ہے لیکن وہ اس کو ایک گالی کی طرح سمجھتی ہیں۔''

''کیا اب کوئی نئی بات ہوئی ہے نصرت؟'' میں نے پوچھا۔

''روز ہی نئی باتیں ہوتی ہیں تابی بھائی!'' وہ بدستور سرگوشی میں بولی۔ ''یوسف بھائی نے اب یہاں ایک نئی ''تفتیش'' شروع کی ہوئی ہے۔ انہیں شک پڑ گیا ہے کہ میرے علاج کا خرچہ چچا احمد نہیں کر رہے بلکہ کہیں اور سے ہو رہا ہے۔ وہ اس بارے میں باجی کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ وہ اپنے والد... انکل فاروقی کو بھی باجی کی طرف سے بدظن کر دیں گے۔''

''یہ بات تم کیوں کہہ رہی ہو؟''

''پرسوں وہ انکل فاروقی سے فون پر بات کر رہے تھے... اتفاقاً ان کے ایک دو فقرے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ وہ انکل سے کہہ رہے تھے... کوئی رشتے دار ہے ثروت کا۔ شاید کوئی کزن ہے... کبھی کبھی اس کا فون بھی آتا ہے۔ جواب میں انکل فاروقی نے کچھ کہا۔ یوسف بھائی بولے، کچھ بھی ہے ڈیڈی... ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے... ہم نصرت کا علاج اچھی سے اچھی جگہ پر کرا سکتے ہیں... کچھ اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔''

''تم نے یہ سب کچھ ثروت کو بتایا؟''

''تابی بھائی! ان کی آنکھوں پر تو جیسے پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ذرا سی بات کروں تو ڈانٹ دیتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ مجھے یوسف بھائی میں بس خامیاں ہی نظر آتی ہیں۔ میں جواب میں کہتی ہوں کہ آپ کو خوبیاں ہی نظر آتی ہیں جو کہیں نہیں ہیں۔ دراصل تابی بھائی! باجی کے سارے مسئلوں کی جڑ وہ خوف ہے جو انہوں نے لفظ ''طلاق'' سے جوڑا ہوا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں، خوش قسمتی سے ہمارے خاندان میں طلاق کا کبھی کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ پچھلے چالیس پچاس سالوں میں ہمارے قریبی عزیزوں میں شاید ہی کہیں ایک آدھ طلاق ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب باجی اس بارے میں سوچتی ہیں تو ان کو یہ ایک بہت ہی بُرا اور گمبھیر واقعہ لگتا ہے۔ انہیں گناہ کا احساس ہوتا ہے۔ اس احساس نے ایک جادو کی طرح انہیں جکڑ رکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے تابی بھائی! اگر کوئی باجی کو اس ''گھیرے'' سے نکال سکتا ہے تو وہ...''

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ پھر دو سیکنڈ کے وقفے سے بولی۔ ''میرے خیال میں تابی بھائی، وہ آپ ہیں جو باجی کو اس ''گھیرے'' سے نکال سکتے ہیں۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ آپ باجی کے لیے اور میرے لیے بھی ایک مسیحا کی طرح آئے ہیں۔ آپ کے آنے سے بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ ہاں تابی بھائی! بہت کچھ۔'' اس کی آواز بھرّا گئی۔

''مجھے بتاؤ نصرت! میرے بس میں کیا ہے... میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ کوشش کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے تابی بھائی! گزرا ہوا وقت واپس آ سکتا ہے... تابی بھائی! ایک عورت دوسری عورت کے دل کا حال زیادہ اچھی طرح جانتی ہے... اور باجی تو میری بہن ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ باجی کے دل کی گہرائی میں اب بھی آپ کی تصویر ہے۔ وہ آپ کو سوچتی ہیں لیکن ان کی سوچوں کے گرد دنیا اور رسم و رواج کے پہرے ہیں... آپ کو یاد ہے نا چند دن پہلے میں نے فون پر آپ کو سالگرہ کی مبارک باد دی تھی۔ آپ کی سالگرہ کا دن مجھے باجی نے ہی یاد کرایا تھا لیکن ساتھ ہی کہا تھا کہ میں آپ کے سامنے ان کا نام نہ لوں... یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے تابی بھائی! ایسی اور بہت سی مثالیں ہیں۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نصرت! ابھی تم اپنے ذہن کو ان فکروں میں نہ ڈالو تو اچھا ہے۔ اپنی ساری توجہ اپنی صحت پر رکھو اور ہمیں جلد سے جلد بھلی چنگی ہو کر دکھاؤ۔''

وہ بولی۔ ''آپ باجی کو ٹھیک کر دیں تابی بھائی... میں وعدہ کرتی ہوں، میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''نصرت! میرے خیال میں تم بالکل الٹ بات کہہ رہی ہو۔''

''میں سمجھی نہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ جب تم تندرست ہو جاؤ گی تو تمہاری باجی بھی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''نصرت! جہاں تک میں نے نتیجہ نکالا ہے، ثروت کے وہم کی بنیاد ہی تمہاری بیماری ہے۔ اس نے یوسف سے علیحدہ ہونے کا سوچا اور

انہی دنوں تمہاری بیماری ڈائیگنوز ہوئی۔ اس کے دماغ میں یہ بات گھر کر چکی ہے کہ اس کی ''غلط'' سوچوں کا بوجھ تمہاری صحت اور زندگی پر پڑا ہے۔ بس یہی وہ نفسیاتی گتھی ہے نصرت جس نے ثروت کو بے طرح الجھا رکھا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی، ثروت کی یہ نفسیاتی گتھی بھی اپنے آپ کھل جائے گی۔ اس کی سوچوں کے سارے جکڑ بند ٹوٹ جائیں گے۔ پھر وہ ایک آزاد عورت کی طرح سوچنا شروع کر دے گی۔''

وہ میری بات خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کا انداز گواہ تھا کہ وہ میری بات کو اہمیت دے رہی ہے۔

میں خاموش ہوا تو وہ دبی آواز میں بولی۔ ''آپ کے پاس باجی کا نیا موبائل نمبر ہے؟''

''نہیں۔''

''اچھا، میں ابھی آپ کو بھیجتی ہوں۔ آپ کسی وقت باجی کے نمبر پر بھی بات کیا کریں۔ یوسف بھائی پرسوں واپس چلے جائیں گے۔ پھر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ پلیز، اپنی اس بیمار چھوٹی بہن کی یہ بات مان لیں۔ ان کو فون کریں۔'' اسی دوران میں کھٹ پٹ کی مدھم آواز آئی۔ وہ بولی۔ ''اچھا میں بند کرتی ہوں، باجی شاید جاگ گئی ہیں۔''

میں بے وقت جاگا تھا اور اس کے بعد جس طرح کی گفتگو ہوئی تھی، اس نے نیند آنکھوں سے اڑا دی تھی۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پہرے دار باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ گشت پر تھے۔ رکھوالی کے کتوں کی آوازوں کے سوا تقریباً سناٹا ہی تھا۔ یوسف کا کردار اب واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ثروت کو ہر صورت اپنے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے والد کو بھی ثروت کی غیر معمولی حمایت و تائید سے روکنا چاہتا تھا۔ نصرت نے جو کچھ بتایا، اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے والد فاروقی صاحب کو ان کی بڑی بہو کے حوالے سے بدظن کرنا چاہتا ہے... اس کی ہوشیاری بھی عیاں ہو رہی تھی۔ اس نے فقط چند دنوں میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ نصرت کے علاج کے لیے رقم چچا احمد نہیں دے رہے بلکہ کہیں اور سے مہیا ہو رہی ہے۔

ثروت کی تصویر میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ میرا عشق تھی، میرا وجدان، یقین، سب کچھ وہی تھی۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکتا تھا تو مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے بغیر میری زندگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ میں چار برس تک یہ آس سینے میں کسی جوت کی طرح جگا کر زندہ رہا تھا کہ ثروت میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہوگی۔ یہ آس پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ شادی شدہ ہو چکی تھی لیکن اس صورتِ حال میں بھی ایک زبردست پھیر موجود تھا۔ اور اس پھیر نے مجھے ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس موڑ پر گہری تاریکی تھی مگر تاریکی میں آس امید کی کچھ کرنیں بھی موجود تھیں۔ کیا اب بھی وقت میرے لیے پلٹ سکتا ہے؟ کیا اب بھی میں اور ثروت بیت جانے والے موسموں کو آواز دے سکتے ہیں؟ میں نے بڑی حسرت کے عالم میں سوچا اور سینے میں فروزاں آگ کچھ اور بھی تپش دینے لگی۔

☆☆☆

میں اور عمران فارم ہاؤس سے نکلے۔ یہ رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ ہم نے ایک مشترکہ عزیز کی شادی میں شرکت کا بہانہ بنا کر جلالی صاحب سے چھٹی لی تھی۔ گارڈز کی ایک گاڑی شیخوپورہ سے شاہدرہ تک جا رہی تھی۔ ہم اسی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ یہ ایک محفوظ طریقہ تھا۔ اگر ہم اپنے طور پر سفر کرتے تو یہ اندیشہ موجود تھا کہ ہمارا پیچھا کیا جائے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

ہم شاہدرہ موڑ پر گارڈز کی جیپ سے اتر گئے اور ایک رکشا میں بیٹھ کر لاہور کے وسطی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ لاہور جگمگا رہا تھا۔ زندگی عروج پر تھی۔ ہم مینارِ پاکستان اور بادشاہی مسجد کے قریب سے گزرے۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں پہلی بار عمران سے ملا تھا۔ وہ مجھے جان لیوا مایوسی کے گھیرے سے نکال کر اپنے آشیانے کی طرف لے جا رہا تھا۔ آج کی طرح تب بھی مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ آج بھی اس نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ ایک بندے کی دُم میں نمدہ فٹ کرنا ہے۔ ان الفاظ کی تشریح میں اس سے پوچھتا ہی رہ گیا تھا۔ میری پینٹ کی جیب میں چھوٹے سائز کا لیکن ایک طاقتور پستول موجود تھا۔ عمران کی پنڈلی سے بھی ایک لوڈڈ پستول بندھا ہوا تھا۔ یہ دونوں ہتھیار عمران نے فارم ہاؤس کے اندر سے ہی حاصل کیے تھے، کیسے کیے تھے، یہ اس نے نہیں بتایا۔

فارم ہاؤس سے تو عمران میری طرح پتلون قمیص میں ہی نکلا تھا لیکن رکشا میں بیٹھنے کے بعد اس نے جیب سے ایک ٹائی نکالی اور نفاست سے باندھ لی۔ ''خیر ہے، آج کسی فلم ایکٹریس پر بجلی گرانے کا ارادہ ہے؟''

''بھئی، اپنے یار کی شادی پر جا رہے ہیں، بن ٹھن کر جائیں گے۔''

''یہ بہانہ تو جلالی صاحب کے لیے تھا۔ اصل بات کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے ایک عجیب کام کیا۔ اپنی سیاہ پتلون کی جیب میں سے ایک نو دس انچ لمبا چاقو نکالا۔ اس چاقو کا دستہ پتلا لیکن مضبوط تھا۔ یہ چاقو اس نے اپنی ٹائی کے اندر کی طرف بنی پاکٹ میں اس طرح چھپا لیا کہ اسے سامنے سے دیکھنا ناممکن ہو گیا۔

اس نے تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''بتاؤ، کسی بالی لالی ووڈ فلم میں تم نے کسی ہیرو میں اس طرح کی ذہانت دیکھی ہے؟''

''میں واقعی متاثر ہوا ہوں۔ اچھا طریقہ ہے۔'' میں نے کہا۔

یہ پتلے دستے والا چاقو واقعی ٹائی کا حصہ بن گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''لیکن اتنی زیادہ احتیاط کی کیا ضرورت ہے؟ کہیں ہماری خصوصی تلاشی ہونے والی ہے؟''

''تلاشی جیسی تلاشی۔ تم دیکھتے رہنا، ہر چیز ٹٹول لیں گے تمہاری۔''

''لیکن کون؟''

''ہمارے دوست۔ بڑے محتاط قسم کے لوگ ہیں۔''

''یار! اب تو کچھ بتا دو۔ کیوں امتحان لینے پر تلے ہوئے ہو؟'' میں نے عاجز لہجے میں کہا۔

اس نے اچھلتے کودتے رکشے میں میری صورت دیکھی اور بولا۔ ''چلو کیا یاد کرو گے، کس مہربان سے پالا پڑا ہے۔ ہم جادا صاحب کے ایک اڈے پر جا رہے ہیں۔''

''جادا کا اڈا؟ تمہیں کیسے معلوم؟''

''ایک ڈان کو دوسرے ڈان کا ٹھکانا معلوم نہ ہوگا تو کیا تم جیسے شریفے کو ہوگا۔''

''خیر، اب اتنے ڈان بھی نہیں ہو تم۔ مجھے لگتا ہے کہ تم اندھیرے میں کوئی تیر چلانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''اندھیرے میں نہیں اجالے میں... اور تیر بھی نہیں، توپ۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم جادا سے ملنے رہے ہو؟''

''جادا سے نہیں لیکن اس کے ایک بڑے گرگے سے۔ سلطان نام ہے اس کا... سلطان چٹا۔ خطرناک بندہ ہے۔ کچھ عرصے سے زیرِ زمین ہے لیکن آج کل لاہور میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم آج اس کے ساتھ چائے پی سکیں گے۔''

''کہیں زیادہ ہی تیز چائے نہ ہو؟''

''تم بھی تو اب دودھ پتی کے مرحلے سے گزر چکے ہو۔ کتنی بھی تیز ہوگی، جارج گورے سے تو تیز نہیں ہوگی۔''

''بڑی رمزیہ باتیں کر رہے ہو۔ اللہ ہی خیر کرے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

یقیناً ہم کسی خطرناک کام سے جا رہے تھے لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، اب خطرناکی میرے دل و دماغ پر کچھ زیادہ اثر نہیں کرتی تھی۔ خاص طور سے عمران کا ساتھ ہوتا تھا تو یہ سب کچھ ایک سنسنی خیز انجوائے منٹ کی طرح ہو جاتا تھا۔

رکشا، مال روڈ کے علاقے میں ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کر رک گیا۔ عمارت کا مین گیٹ بند تھا۔ لان میں گھاس اُگی ہوئی تھی اور اسے مدت سے کاٹا نہیں گیا تھا۔ کھڑکیاں، دروازے بند اور فرش پر گرد و غبار تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ بلڈنگ عرصے سے بے آباد پڑی ہے۔

ہم عمارت کے اندر جانے کے بجائے سیدھے نکلتے چلے گئے تو مجھے شک گزرا کہ شاید عمران حسبِ عادت مذاق کر رہا تھا۔ ایک چکر کاٹ کر ہم مال روڈ کے بارونق علاقے کی طرف نکل آئے۔ مین سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ ایک شاپنگ پلازا کے نیچے ایک نیم تاریک سا پارکنگ لاٹ تھا۔ ہم ڈھلوان اتر کر پارکنگ میں داخل ہو گئے۔ پارکنگ کی زیریں منزل پر بھی کافی تعداد میں گاڑیاں موجود تھیں۔ اِکّا دُکّا لوگ آ جا رہے تھے۔ ایک لاری نما بس کے عقب میں پہنچ کر عمران نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک چھوٹا سا دروازہ کھول کر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہم ایک نیم تاریک کوریڈور سے گزرے۔ یہاں بھی زیادہ صفائی ستھرائی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے کھڑے ایک ہٹے کٹے شخص نے ہمیں کڑی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''

''سلطان چٹے سے کہو، تمہارا باپ ملنے آیا ہے۔'' عمران نے اطمینان سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ہٹے کٹے شخص کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''باپ کا مطلب باپ ہی ہوتا ہے۔ بیٹے کی ماں کا خصم۔ جاؤ اسے بتا دو، وہ سمجھ جائے گا۔''

ہٹا کٹا شخص جز بز نظر آ رہا تھا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ وہ عمران پر پھٹ پڑے گا، کبھی خوف زدہ نظر آتا تھا۔ اس کے کندھے سے ریوالور جھول رہا تھا۔ عمران کو اور مجھے سرتاپا دیکھتا ہوا وہ دروازے کی دوسری طرف چلا گیا۔ بہرحال، جاتے ہوئے وہ دروازے کو دوسری طرف سے

مقفل کر گیا تھا۔
اس کی واپسی قریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں عمران سگریٹ پھونکتا رہا اور میں موبائل فون پر میسج وغیرہ چیک کرتا رہا۔ ہٹا کٹا شخص اب قدرے مرعوب اور مؤدب نظر آرہا تھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”عمران دانش... ابوسلطان چٹا۔“ عمران نے کہا۔
”آیئے۔“ اس نے تیوری چڑھائی اور ہمیں راستہ دیا۔
یہ بھی ایک راہداری تھی مگر خاصی صاف ستھری تھی، قالین بچھا ہوا تھا۔ ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس بھی ہوتا تھا۔ چند قدم آگے گھنگرالے بالوں والا ایک کرخت صورت مکرانی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید آٹومیٹک رائفل تھی۔ ساتھ میں ایک درمیانی عمر کا فربہ اندام شخص نظر آتا تھا۔ وہ بھی شکل سے جرائم پیشہ لگتا تھا۔
”سوری۔“ اس نے کہا اور عمران کی جامہ تلاشی شروع کر دی۔ عمران کی پنڈلی سے لگا ہوا پستول نکال لیا گیا۔ بعدازاں میری تلاشی ہوئی اور میرا اسٹیڈی پستول بھی ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ ”یہ دونوں ہتھیار واپسی پر آپ کو مل جائیں گے۔“ اس نے کہا۔
ہم آگے بڑھے۔ پندرہ بیس قدم آگے ایک پانچ چھ فٹ چوڑا سا گوانی دروازہ تھا۔ یہاں دو مسلح افراد نے پھر ہماری تلاشی لی۔ اس مرتبہ ہمیں موبائل فونز سے بھی محروم کر دیا گیا۔ ”سوری“ کے لفظ سے شروع ہونے والی یہ تلاشی خاصی باریک بینی سے کی گئی۔ پنڈلیاں اچھی طرح ٹٹولی گئیں اور جوتوں کو بھی شک کی نظروں سے دیکھا گیا۔ عمران کا چہرہ تمتما رہا تھا لیکن وہ بہ وجوہ خاموش تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ عمران کی ٹائی ابھی تک اس تلاشی سے محفوظ تھی۔ میں نے غور کیا اور اندازہ ہوا کہ عام طور پر سخت ”سیکیورٹی چیکنگ“ والی جگہوں پر بھی ٹائی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ عمران کی یہ ”ایجاد“ قابلِ غور تھی۔
ہم ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہم تو اسی دومنزلہ بلڈنگ کے اندر آگئے ہیں جو باہر سے مقفل اور بالکل بے آباد نظر آرہی تھی۔
”یہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟“ میں نے سرگوشی کی۔
”آج کل ہر کام بیک ڈور سے ہو رہا ہے۔ اسے بیک ڈور ڈپلومیسی کہتے ہیں جگر۔“
بظاہر اجاڑ نظر آنے والی یہ عمارت اندر سے مکمل آباد تھی۔ ایک لمبا تڑنگا گن مین قالین پوش راہداری میں ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ ہمیں ایک گول کمرے کے سامنے لے آیا۔ کمرے کا خوب صورت سا گوانی دروازہ بھی گولائی میں تھا۔ گن مین کی دستک پر جس خوبرو لڑکی نے دروازہ کھولا، وہ بھی سرتاپا خوب صورت گولائیوں کا مجموعہ تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دفعہ تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یقیناً عمران کو بھی حیرت ہوئی ہوگی۔ یہ لڑکی مشہور انڈین فلمسٹار کرشمہ کپور تھی... یا پھر اس کی ہو بہو کاپی تھی۔
”آیئے جی۔“ اس نے اپنے نیم عریاں جسم کی نمائش کرتے ہوئے بازو لہرایا۔
ہم اندر داخل ہوگئے۔ بیڈ نما صوفے سے ایک چوڑا چکلا شخص اٹھا۔ لال پری کے نشے سے اس کی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ چند سیکنڈ تک عمران کو گھورتا رہا پھر پُرتپاک انداز میں بولا۔ ”اتنی دیر کہاں رہے ہو ہیرو صاحب! مدت بعد شکل دکھائی ہے۔“
”تم بھی تو ”کتے“ کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھے۔“ عمران نے جان بوجھ کر غلط محاورہ بولا۔ دونوں نے زوردار مصافحہ کیا۔ شاید وہ عمران سے معانقہ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن عمران کنی کترا گیا۔ اس کی وجہ عمران کی ٹائی بھی ہو سکتی تھی۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ ڈراؤنی آنکھوں اور چوڑے تھوبڑے والا یہی شخص جاوے کا گرگا سلطان چٹا ہے۔
سلطان چٹے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ عمران بولا۔ ”یہ میرا دوست تابش ہے۔ یہ بھی تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق رکھتا تھا۔“
”خوش آمدید، ویلکم۔“ سلطان نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ کی سختی سے آشنا کرنے کی کوشش کی لیکن جو ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا، وہ بھی کچھ کم پتھریلا نہیں تھا۔
کرشمہ کپور ایک طرف خاموش و مؤدب کھڑی تھی۔ جمناسٹک کرنے والی لڑکیوں کی طرح اس کی ٹانگیں اور بازو لباس سے بے نیاز تھے۔ بیڈ نما صوفے کے قریب ہی مساج آئل اور تولیا وغیرہ پڑا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری آمد سے تھوڑی دیر پہلے سلطان چٹا کرشمہ کپور کے نرم و نازک ہاتھوں سے اپنے کھردرے پنڈے کی مالش کروا رہا تھا۔
سلطان چٹا کتنا بھی بڑا بدمعاش سہی مگر اتنا بڑا نہیں تھا کہ کرشمہ کپور اس کی مٹھی چاپی کرتی پائی جاتی... اس بات کو دوسرے انداز میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کرشمہ کپور کی مارکیٹ ویلیو کتنی بھی کم ہوگئی تھی مگر اتنی بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ سلطان چٹے جیسے گرگے کی خلوت میں پائی جاتی۔ یہ یقیناً اس

ہم شکل تھی۔ ذرا غور سے دیکھنے پر کرشمہ اور اس لڑکی کے خدوخال میں کچھ فرق بھی نظر آتا تھا۔ عام طور پر مشہور فلمی ستاروں کے دو چار ڈپلی کیٹ بھی ان کے اردگرد موجود رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اصل اداکاروں سے کافی مماثلت بھی رکھتے ہیں۔ یہ لڑکی بھی ان میں سے ایک تھی۔
سلطان نے کہا۔ ”ہاں جی، یہ تابش صاحب مجھ سے ملنے کا شوق کیوں رکھتے ہیں؟“ لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔
”اس کو فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے اور تمہارا باس تو بڑے بڑے نکموں کو ہیرو بنا دیتا ہے۔ تابش تو دیکھنے کا بھی اچھا بھلا ہے۔ پڑھا لکھا بھی نہیں۔ ایڈوانس لے کر بھول جاتا ہے۔ ریل گاڑی کی طرح کبھی وقت پر نہیں پہنچتا۔ سمجھو فلمستاروں کی ساری شرائط پوری کرتا ہے۔“
وہ زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ”مسخری نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ ٹائم تمہارے پاس بھی زیادہ نہیں ہوگا اور میرے پاس بھی کم ہے۔“
”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“
”مجھے پتا ہے تم جیسے لوگ مرنے کے بعد بھی سنجیدہ نہیں ہوتے، ان کے تھوڑے بہت دانت ضرور نظر آتے رہتے ہیں۔ لیکن اتنا عرصہ تم رہے کہاں ہو... اور تمہیں کیسے پتا تھا کہ میں یہاں ملوں گا؟“
”بس انڈیا میں تھا ایک لونڈیا کے چکر میں۔ اور تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے... بلکہ کبھی کبھی تو راہ کے بجائے موٹر وے ہوتی ہے۔ چیتا، کتے کی بو کافی دور سے سونگھ لیتا ہے۔“
وہ پھر زہرخند انداز میں بولا۔ ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ کتا، کتے کی بو سونگھ لیتا ہے۔“
”تم نے آدھی بات درست کہی ہے۔ چلو تمہارے جیسے کے لیے یہ بھی بڑی بات ہے۔“
سلطان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”میں اب یہاں سے نکلنے ہی والا تھا۔ مجھے بتاؤ، میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“
”کیا کیا خدمتیں ہیں تمہارے پاس؟“
”اچھا کھانا... شراب... لونڈیا... اور اگر کوئی میچ لگا ہوا ہے اور ایک دو راتیں یہاں گزارنا چاہتے ہو تو وہ بھی ہو سکتا ہے۔“
”میں لونڈیا کے بجائے ایک لونڈے کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔“
”کیا مطلب؟“
”تمہارا وہ لمبو ساتھی۔ کیا نام ہے اس کا نادر ڈی ڈی یا نادر ٹی ٹی۔“
”نادر ٹی ٹی نے کیا کر دیا ہے تمہارے ساتھ؟“
”یہی تو پتا کرنا ہے۔“ عمران نے اطمینان سے کہا۔
سلطان کچھ دیر گہری نظروں سے عمران کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے کرشمہ کپور کی طرف دیکھ کر چٹکی بجائی۔ ”نیتو! جاؤ نادر کو بلاؤ یہاں۔“
نیتو اپنی کمر کو بل دیتی ہوئی باہر چلی گئی۔ دیوار پر شاندار ایل سی ڈی موجود تھا۔ کوئی انگلش فلم چل رہی تھی۔ فٹ بال میچ کے دوران میں بار بار تالیوں کی آواز گونجتی تھی۔ سلطان کے سامنے میز پر تین سیل فون پڑے تھے۔ گاہے بگاہے کسی فون میں وائبریشن بھی ہو جاتی تھی مگر سلطان کوئی کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ سلطان کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ چٹانی جسم کا مالک، ایک خطرناک صورت بدمعاش تھا۔ خاص طور سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھنے والے کو ہراساں کرتی تھیں۔
عمران اور سلطان اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ ایک دوسرے کو ”ہم پیشہ“ کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس سے پہلے بھی ان کی دو چار دھواں دھار ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ سلطان نے تین فرنچ گلاسوں میں انڈین بیئر انڈیلی۔ سلطان اور عمران تو غٹا غٹ پی گئے، میرا گلاس وہیں دھرا رہا۔ چند منٹ بعد خوبرو نیتو پھر کمر لچکاتی آگئی۔ اس نے شاید اپنی آنکھوں کا رنگ کرشمہ کپور سے ملانے کے لیے نیلے لینز لگا رکھے تھے۔ نیتو کے عقب میں ایک دراز قد شخص چلا آرہا تھا۔ اس کا قد یقیناً ساڑھے چھ سے نکلتا ہوا تھا۔ جسم اکہرا لیکن مضبوط تھا۔ اس نے گہرے رنگوں کی پینٹ قمیص پہن رکھی تھی۔
اس نے سپاٹ لہجے میں عمران کو سلام کیا۔ عمران نے جواب دیا۔ سلطان کی ہدایت پر یہ نادر نامی شخص ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عمران نے نادر کی آنکھوں میں دیکھا اور بغیر کسی تمہید کے اچانک کہا۔ ”پچھلے بدھ کی رات دس بجے کے بعد تم کہاں تھے نادر؟“
نادر کے سانولے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ اس نے تعجب سے پہلے اپنے باس سلطان اور پھر عمران کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ نادر نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔
”تم میری بات کا جواب دو نادر... اور دیکھو،

بالکل سچ بولنا۔ جھوٹ بولو گے تو مجھے پتا چل جائے گا اور پھر جو کچھ ہوگا، وہ اچھا نہیں ہوگا۔"

سلطان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "تم پولیس میں تو بھرتی نہیں ہو گئے ہو۔ بالکل تھانیداروں کی طرح باتیں کر رہے ہو۔ اگر حکم کرو تو ہم دونوں نیچے زمین پر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ تم اچھی طرح تفتیش کر سکو۔" سلطان کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

"ضرورت پڑی تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کم از کم تمہارے اس نادرے کے ساتھ تو ضرور ہو سکتا ہے۔"

"تمہیں شبہ کیا ہے؟"

"شبے تو بہت سے ہیں سلطان جی۔ فی الوقت میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بدھ کی رات تمہارا یہ چمچہ کہاں تھا؟"

سلطان چٹے کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا مگر وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "تم بدھ کی رات کہاں تھے نادر؟"

نادر کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا ابھرا۔ وہ کچھ دیر تک سوچ کر بولا۔ "بدھ کی رات کو تو فیروزہ بائی کی کوٹھی پر پروگرام تھا۔ چھوٹے وزیر صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ میں آپ کے ساتھ ہی تھا۔"

سلطان نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، بدھ کی رات کو تو فیروزہ بائی کی چھوٹی بیٹی کا پہلا مجرا تھا۔ بڑے بڑے گلے والی محفل تھی۔ میں اور نادر وہیں تھے۔ صبح تین بجے کے قریب واپسی ہوئی تھی۔"

"تین کہاں جی، چار ساڑھے چار کا وقت تھا۔" نادر نے کہا۔

"لیکن بات کیا ہے؟ نادرے نے کسی کی ماں، بہن کے ساتھ کیا کر دیا ہے؟" سلطان خشک لہجے میں بولا۔

"کسی کی ماں، بہن والا معاملہ بھی ہے لیکن یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اس سے کہو اپنی قمیص اتارے۔"

"کیا مطلب؟"

"یار! فرانسیسی تو نہیں بول رہا۔ نہ ہی فرانسیسی گلاس میں بیئر پینے سے کوئی فرانسیسی بولنے لگتا ہے۔ اس سے کہو قمیص اتارے۔"

نادرے کی آنکھوں میں چنگاریاں نظر آنے لگیں۔ سلطان کی آنکھیں بھی کچھ اور ڈراؤنی ہو گئیں۔ وہ بولا۔ "دیکھو ہیرو! تم ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔ اس وقت تم میرے ڈیرے پر ہو۔ تمہیں برداشت کر رہا ہوں۔ برداشت کا زیادہ امتحان نہ لو۔ معاملہ بتاؤ کیا ہے؟"

"معاملے کا پتا تو قمیص اتارنے سے ہی چلے گا۔ اس لمڈھینگ سے کہو قمیص اتارے۔" عمران کا لہجہ حیران کن حد تک بے باک تھا۔

نادرے کو دوسری بار چمچے کا خطاب ملا تھا۔ وہ بھڑک اٹھا۔ ایک قدم آگے آ کر بولا۔ "اتار دیتا ہوں قمیص... کہو تو پینٹ بھی اتار دیتا ہوں۔ کیا کیا دیکھنا ہے تم نے؟"

"بڑے بے غیرت ہو۔ اپنی اس ہمشیرہ کرشمہ کپور کے سامنے ہی سب کچھ دکھا دو گے۔" عمران اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

عمران کا خطرناک انداز دیکھ کر سلطان چٹا ایک دم عمران کے سامنے آ گیا۔ "ایک منٹ... ایک منٹ۔" سلطان نے اپنے بے پناہ طیش کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

عمران پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ دراز قد نادر وہیں ساکت کھڑا رہا۔ اس کا سانولا سلونا چہرہ مختلف رنگ بدل رہا تھا۔ سلطان چٹے کے محتاط انداز سے صاف عیاں تھا کہ اس سے پہلے عمران سے اس کا واسطہ پڑ چکا ہے... اور اسے پتا ہے کہ عمران کس ٹائپ کا بندہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بات کو بڑھنے سے روکنا چاہتا تھا۔ اس نے دھیمے انداز نادرے کو مخاطب کیا اور بولا۔ "کوئی بات نہیں نادرے، یہ مہمان ہے اپنا۔ چل کر ہمارے پاس آیا ہے۔ تو کون سی لونڈیا ہے۔ مان لے بات اس کی۔"

نادرا کچھ دیر خشمگیں نظروں سے عمران کو تکتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے تو لگا کہ وہ سلطان کی بات بھی نہیں مانے گا اور اچانک عمران پر حملہ کر دے گا۔ مجھے اپنے پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوئی۔ یہاں ہمیں مار کر دفن کر دیا جاتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ یہ عمران ہی تھا جو جنگلی جانوروں کی طرح اس کچھار میں گھسا تھا اور اب بڑے اطمینان سے کشیدگی بڑھا رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد نادرے نے اپنا ہاتھ قمیص کی طرف بڑھایا۔ پہلے اسے پتلون کے اندر سے کھینچا پھر بٹن کھول کر اتار دیا۔

"بنیان بھی اتارو۔" عمران نے تحکم سے کہا۔

اس نے بنیان بھی اتار کر پھینک دی۔

ایل سی ڈی پر چلتی ہوئی فلم میں تالیوں کی زوردار آواز گونجی۔ یوں لگا جیسے یہ تالیاں، نادرے کے بنیان اتارنے پر بجائی گئی ہوں۔

عمران اٹھا۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں اس نے گھوم پھر کر نادرے کے جسم کا معائنہ کیا۔ اس کا سانولا جسم جیسے فولادی سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ کمر پر ایک ٹیٹو بھی دکھا

ہا تھا۔ عمران نے نادرے کی پتلون کے دونوں پائنچے پکڑ کر اوپر کی طرف کھینچے اور گھٹنوں تک اس کی پنڈلیوں کا معائنہ بھی کیا۔ ایک دم مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چاہ رہا ہے۔ اجتماعی زیادتی کا نشانہ بننے والی زرینہ نے بتایا تھا کہ اس نے دراز قد پٹھان کی زبردست مزاحمت کی تھی۔ زخمی کے ناخنوں میں اس کے گوشت کے ریزے بھی تھے۔ عمران شاید یہی ثبوت دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن یہ ثبوت یہاں موجود نہیں تھا۔

عمران واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ "پہن لو قمیص۔" اس نے نادر لی لی سے کہا۔

وہ غصیلی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا پھر قمیص بنیان پہننے میں مصروف ہو گیا۔

"کچھ ہمیں بھی بتاؤ تھانیدار صاحب یہ کس چیز کی تفتیش ہو رہی ہے؟" سلطان نے سخت طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اسی چیز کی جو تم جلالی کے فارم ہاؤس میں ڈھونڈتے پھر رہے ہو اور جس کی خاطر تم نے بدھ کی رات فارم ہاؤس میں خون خرابا کرایا ہے۔"

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"تمہاری سمجھ دانی اتنی چھوٹی نہیں۔ تم گھنے بن رہے ہو۔ جو کچھ تم اور تمہارا باس جاوا، فارم ہاؤس میں کر رہے ہو کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اپنے ایک بندے کی اتفاقیہ موت کا بدلہ لینے کے لیے تم نے فارم ہاؤس پر جو قیامت اٹھائی ہے، اس کا حساب بھی دینا ہوگا تمہیں۔ آج نہیں تو کل... کل نہیں تو پرسوں۔"

"تم ثبوتوں کے بغیر ایک بیکار بات کر رہے ہو ہیرو۔ اس طرح تو کسی پر کوئی بھی الزام لگایا جا سکتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ منگل کے روز سبزی منڈی میں جو بم دھماکا ہوا ہے، وہ تم نے کیا ہے... تمہارا باس جان محمد بھی تمہارے ساتھ تھا۔ اور اس سے پہلے کورروڈ پر مارے جانے والے پولیس اہلکار بھی تمہاری ہی گولیوں سے چھلنی ہوئے تھے، وغیرہ وغیرہ۔"

"میں ہوائی بات نہیں کروں گا۔ ثبوت دوں گا اور ثبوت آ جائے گا تو پھر تمہارے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں رہے گا اور نہ ہی کسی رورعایت کی توقع رکھنا۔"

"ابھی مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ تم جیسوں سے رعایت مانگوں۔ اور تم اتنی بڑی بات کرو جتنا تمہارا منہ ہے۔ زیادہ وزن اٹھا لینے سے بندہ کبھی کبھی وزن کے نیچے آ جاتا ہے۔"

"اس کا فیصلہ وقت کرے گا سلطانے... اور یہ بات اپنے گرو جاوے کو بھی بتا دینا۔ جلالی کی طرف آؤ گے تو سامنے مجھے کھڑا پاؤ گے۔"

"چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ہم جاوا صاحب کو تکلیف نہیں دیا کرتے۔ باقی تم نے اچھا کیا کہ بتا دیا کہ اب تم جلالی کے چوکیدار ہو۔" سلطان نے کہا پھر ذرا وقفہ دے کر بولا۔ "تم چل کر یہاں آئے ہو۔ تمہاری عزت کر رہے ہیں۔ ورنہ بہت سے لوگ یہاں آنے کے بعد کہیں جانے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ میں اب بھی تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ بدھ کی رات کو اگر کسی فارم ہاؤس میں کوئی واردات شاردات ہوئی ہے تو اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ بدھ کی رات..."

"تم فیروزہ بائی کے بالاخانے میں تھے... اور وہاں نوٹوں کی گڈیاں چھت والے پنکھوں میں مار رہے تھے۔" عمران نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا...

"یہ قصہ چہار درویش کسی اور کو سنانا سلطانے۔ تیرے جیسے وارداتیے واردات کی رات کو بھوت پریت بن جاتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں دو دو تین تین جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ ایسے بھوت پریتوں کو ڈنڈے مار مار کر ایک ہی قالب میں گھسانے کا فن مجھے آتا ہے..."

سلطان چٹے کا چہرہ ایک بار پھر غصے سے انگارہ ہو گیا۔ اس نے چٹکی بجائی اور گرانڈیل گن مین سے کہا۔ "ان دونوں تھانیداروں کو عزت سے باہر لے جاؤ۔ ان کے ستارے گردش میں آ گئے تو بڑی مٹی پلید ہونی ہے ان کی۔"

عمران کچھ دیر تک سلطان چٹے کی ڈراؤنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ جا رہا ہوں لیکن اگلی ملاقات بھی جلد ہی ہوگی۔"

ہم واپس مڑے۔ واپس مڑتے ہوئے عمران نے کرشمہ کپور کی ہم شکل کو آنکھ ماری۔ اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ ہم دروازے سے نکل کر قالین پوش کوریڈور میں پہنچے۔ دائیں طرف سنگ مرمر کی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ انداز ہوتا تھا کہ اوپر بھی اِکا دُکا لوگ موجود ہیں۔ ڈیکیوم کلینر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اچانک ایک مدھم آواز نے عمران کو چونکا دیا۔ یہ بلی کی آواز تھی۔ چند سیکنڈ بعد آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ یوں لگا جیسے وہ بلی پکار رہی ہے۔ وہ کس کو پکار رہی تھی؟ یکا یک میرے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بلی کی یہ خاص انداز کی آواز میرے لیے نئی نہیں تھی۔ میں

نے یہ آواز پہلے بھی فارم ہاؤس میں سنی ہوئی تھی۔ پکارتی ہوئی سی یہ آواز پھر بلند ہوئی۔ یہ نایاب ایرانی بلیوں میں سے کسی ایک کی آواز تھی۔ مجھے عمران کے چہرے پر ہیجانی تاثرات نظر آئے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور واپس سلطان کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب گرانڈیل گن مین نے عمران کی طرف گن سیدھی کرنا چاہی۔ میں گن مین سے قریب تھا۔ میں نے زور سے ٹانگ چلائی۔ گن اس شخص کے ہاتھ سے نکلی اور راہداری کا ایک شیشہ توڑتی ہوئی باہر جا گری۔ ایک دوسرے شخص نے اپنی کمر کے ہولسٹر سے پستول نکالنا چاہا مگر وہ عمران کی پھرتی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ عمران چیتے کی طرح لپک کر اس پر جا پڑا۔ دونوں اوپر نیچے نیم عریاں لڑکی نیتو کے قریب گرے۔ وہ چلّا کر صوفے پر چڑھ گئی۔ میں نے گرانڈیل گن مین کی ٹھوڑی کے نیچے بھرپور ٹکر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ دوسری ٹکر نے اس کے چہرے کا بھرتہ بنا دیا۔ یہی وقت تھا جب میں نے ایک دل ہلانے والا منظر دیکھا۔ عمران اپنے مدِمقابل کے اوپر تھا اور سلطان چٹا اسے اپنے پستول کی زد میں لے چکا تھا۔ کسی بھی وقت دھماکے کی آواز سے گولی عمران کی کمر میں داخل ہو سکتی تھی لیکن اس وقت عمران کی ''لک'' نے پھر کام دکھایا۔ صوفے پر چڑھی ہوئی نیتو عرف کرشمہ کپور کو پتا نہیں کیا ہوا، اس نے بدحواسی میں چھلانگ لگائی اور عمران کو پھلانگ کر دروازے کی طرف جانا چاہا۔ سلطان کی چلائی ہوئی گولی نیتو کی برہنہ ٹانگ میں لگی اور وہ چلّا کر دھڑام سے شیشے کی تپائی پر گری۔ عمران کے لیے اتنا وقت کافی تھا۔ اس نے اپنے جسم کی پیشہ ورانہ لچک کا بھرپور استعمال کیا... بڑی تیزی سے خود کو قالین پر رول کیا۔ سلطان کے پاؤں سے ٹکرایا اور اسے اوندھے منہ گرا دیا۔ سلطان نے گرتے ہوئے جو دوسرا فائر کیا، وہ نہ جانے کس طرف گیا۔ ایل سی ڈی پر چلتی ہوئی فلم میں ایک بار پھر زوردار تالیاں گونجیں اور نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ یہ ایک اچھا اتفاق تھا۔

بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ مزید مسلح لوگ آ رہے تھے۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ گن مین کے ہاتھوں سے جو رائفل نکلی تھی، وہ باہر جا گری تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ عمران ایک بدلا ہوا شخص نظر آیا۔ ایک لرزا دینے والی سفاکی نے اس کے چہرے کو ہی نہیں، پورے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ پتلے دستے والا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا پھل سلطان چٹے کی شہ رگ پر دھرا تھا۔ عمران کے ہاتھوں میں سلطان چٹا یکسر بے بس نظر آیا۔ سلطان کا پسٹل بھی اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ ''خبردار!'' عمران کے لہجے میں درندگی تھی۔ ''کوئی آگے آیا تو یہ مارا جائے گا۔''

لپک کر آنے والے مسلح افراد جہاں کے تہاں رک گئے۔ ان میں نادر ٹی بھی تھا۔ عمران نے سلطان کو عقب سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا ایک کونے میں لے گیا۔ اس نے چاقو کا پھل اتنی سختی سے سلطان کی گردن پر رکھا ہوا تھا کہ وہاں کٹ لگ چکا تھا اور خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ تھوڑا سا دباؤ بھی بڑھتا تو یقیناً سلطان کی اہم رگیں کٹنا شروع ہو جاتیں۔ عمران عجیب انداز میں پھنکارا۔ ''دیکھو سلطانے! یہاں ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہو گا لیکن تو اسے دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔ تیری زندگی کی ڈور بس کٹی کہ کٹی۔ اپنے ان پالتو کتوں سے کہہ، ہتھیار پھینک دیں اور چار چار قدم پیچھے ہٹ جائیں۔''

سلطان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ایک ''جنونی گرفت'' میں ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو جائے گا۔ اس کی پیشانی پر پسینا نمودار ہو چکا تھا۔ اس کی نیتو عرف کرشمہ کپور قالین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ سلطان نے نادر ٹی کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ نادر نے رائفل قالین پر پھینک دی۔ اس کے دو ساتھی گارڈز نے بھی تقلید کی اور چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ نادر کی حالت زخم کھائے ہوئے سانپ جیسی تھی۔ وہ دو تین قدم سے زیادہ پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ شاید اس کی نیت میں ابھی فتور تھا۔ عمران دہاڑا۔ ''اور پیچھے ہٹ۔ نہیں تو تیرا یہ باپ جا رہا ہے۔'' اس نے سلطان کی گردن پر تیز دھار چاقو کا دباؤ کچھ اور بڑھایا۔ سلطاناں مچلا۔ خون تیزی سے رسنے لگا... عمران کے تیور دہلا دینے والے تھے، چاقو کی کارکردگی بھی بے مثال تھی۔ نادر مزید پیچھے ہٹ گیا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا کہ میں نادر والی رائفل اٹھا لوں۔

میں نے رائفل اٹھالی... اور باقی دو رائفلوں کو پاؤں سے دھکیل کر صوفے کے نیچے پہنچا دیا۔ رائفل کو چیک کرتا ہوا میں الٹے قدموں دروازے کی طرف گیا اور اسے اندر سے لاک کر دیا۔

دروازہ بند ہو جانے کے باوجود ایرانی بلی کی مدھم آواز ہمارے کانوں تک پہنچتی رہی۔ شاید اس نے عمران کی خوشبو پالی تھی اور اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی...

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی
داستان کے بقیہ واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

''یہ آخری پے منٹ ہے جو میں تمہیں دے رہی ہوں۔'' اس نے دبیز لفافہ میز پر پٹختے ہوئے کہا اور دونوں ہاتھ اپنے پر باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ اس وقت ایک قدیم اور غیر استعمال ویئر ہاؤس میں موجود تھے۔

کو شیرائل خود کو پُرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن خوف کے مارے اس کے دل کی دھڑکن معمول کی رفتار سے تیز ہو گئی تھی۔

ٹینا یسن کر آگے کی جانب جھک گئی۔ اس کی شر انگیز آنکھیں اور سفید دانت روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے لفافہ اٹھا لیا اور اس میں رکھے ہوئے نوٹوں کو نکال کر گننے لگی۔ پھر مطمئن انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے راز کی قیمت مزید ایک لاکھ ڈالرز ہے۔''

''کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟'' شیرائل چیخ پڑی۔ ''میرے پاس اب کوئی رقم نہیں ہے۔''

''تم رقم کا بندوبست کرنے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لوگی۔ مجھے شبہ ہے کہ تمہارا نیا منگیتر اس وقت یہ دریافت کر کے بے حد خوش ہو گا کہ اس کی ہونے والی دلہن سابقہ عادی مجرم ہے جو اکثر قید کاٹ چکی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ اس قسم کا اسکینڈل اس کی انتخابی مہم پر کیا اثر ڈالے گا؟'' یہ کہہ کر وہ شیرائل کو سرد نگاہوں سے گھورنے لگی۔ ''مجھے اس ہفتے کے آخر تک پانچ ہزار

انوکھے آغاز اور اختتام کی منفرد مختصر تحریر

تحفہ

جمال دستی

تحفے دینا اور لینا روایت بھی ہے... رسم بھی اور دستور بھی... دوست احباب ایک دوسرے کو اپنی محبت... الفت اور چاہت کا احساس تحائف دے کر یاد دلانا پسند کرتے ہیں... ایک ایسے ہی دوست کا ماجرا جو اپنے جذبات کی تسکین چاہتا تھا۔

ڈالرز درکار ہیں ورنہ تمہارے عاشق کو اس کی گرل فرینڈ کے ماضی کے راز کی حقیقت سے باخبر کردیا جائے گا۔"

"صرف پانچ ہزار ڈالرز؟" شیرائل نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

"اسے کئی قسطوں میں سے پہلی قسط سمجھو۔" ٹینا نے زہرخند لہجے میں جواب دیا پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور رقم کا لفافہ اپنے پرس میں منتقل کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔ "جمعے کے روز میں جینیفر ریسٹورنٹ میں لنچ پر تمہارا انتظار کروں گی۔ نقد رقم ایک گفٹ باکس میں لے کر آنا تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔" یہ کہہ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ "اس سے زیادہ نیچرل اور کیا ہوگا کہ کوئی اپنی پرانی دوست کے لیے تحفہ لے کر آئے؟"

پھر وہ پلٹ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

شیرائل نے سوچا کہ اگر ٹینا اسے اس قدر احمق سمجھتی ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔ وہ اس کے جھانسے میں نہیں آئے گی۔ البتہ اس کے لیے تحفہ ضرور لے کر جائے گی لیکن یہ وہ تحفہ نہیں ہوگا جس کی وہ توقع کررہی ہے۔

ٹینا ولسن سے اس کی ملاقات دو سال قبل اس وقت ہوئی تھی جب وہ چوری کے الزام میں جیل میں سزا کاٹ رہی تھی پھر جب اخبارات میں شیرائل کی ہونے والی منگنی کے بارے میں آرٹیکل شائع ہوئے تو ٹینا نے کسی نہ کسی طرح اس کا کھوج لگا لیا۔

شیرائل اس بات سے بہ خوبی واقف تھی کہ اگر اس کے جیل کے ریکارڈ کی خبر عیاں ہوگئی تو اس کا ہونے والا شوہر اس بھیانک پبلسٹی سے قطعی لطف اندوز نہیں ہوگا۔

اسکاٹ ایلڈرج سے شیرائل کی ملاقات سیاسی مقصد کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کے موقع پر ہوئی تھی جہاں وہ جیب تراشی کے ارادے سے گئی تھی۔ اسکاٹ ایلڈرج کے سینیٹر بننے کے امکانات خاصے روشن تھے۔ اس نے ابتدا ہی سے شیرائل سے فلرٹ کرنا شروع کردیا تھا۔

پھر ایک طوفانی معاشقے کے بعد شادی کے لیے اس کا ہاتھ تھامنے کی پیشکش نے شیرائل کو ایک جھٹکا سا دیا اور تب اس نے خود کو بدلنے کا فیصلہ کرلیا۔

اب اس کی زندگی ایک نئی ڈگر پر چل رہی تھی اور اسے یہ قطعی گوارا نہیں تھا کہ ٹینا اس کی نئی زندگی کو تباہ کردے۔

اسے یہ بھی علم تھا کہ بلیک میل کی ان بھاری بھرکم رقوم کی ادائیگی کے بعد بھی ٹینا اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ رسواکن راز ہمیشہ پوشیدہ نہیں رہتے اور کبھی نہ کبھی عیاں ہوجاتے ہیں۔ اس مسئلے سے نجات حاصل کرنے کا بس یہی ایک راستہ تھا کہ شیرائل اصل جڑ کو ہی ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا دے۔

شیرائل کا خیال تھا کہ اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کے دن اب ماضی بن چکے ہیں۔ لیکن اب ٹینا کی بلیک میلنگ نے اسے یہ احساس دلا دیا تھا کہ ایک بار پھر لیکن آخری مرتبہ اسے اپنے مجرمانہ ماضی کا سہارا لینا پڑے گا۔ پھر وہ اپنے ماضی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دے گی۔

گھر واپس جاتے ہوئے شیرائل راستے میں ایک شاپنگ مال پر رک گئی۔ اس نے وہاں سے ایک سنہری وگ، چمڑے کا ایک سیاہ منی اسکرٹ اور بنا ہوا ٹائٹ سویٹر خریدا۔ ساتھ ہی میچنگ کی سیاہ فش نیٹ اونچی جرابیں اور لمبے سیاہ دستانے بھی پیک کروالیے۔

☆☆☆

جمعے کی صبح شیرائل نے یہ تمام آئٹمز ایک شاپنگ بیگ میں بھر لیے۔ ساتھ ہی زہر کی ایک شیشی اور ایک بڑی سی آرائشی بو بھی ساتھ رکھ لی۔

لنچ سے ذرا پہلے وہ جینیفر ریسٹورنٹ کی جانب روانہ ہوگئی۔ اس نے اپنی کار ریسٹورنٹ سے کافی پہلے ایک جگہ پارک کردی اور اس گیس اسٹیشن کی جانب پیدل چل پڑی جو ریسٹورنٹ سے قریب تھا۔

گیس اسٹیشن کے ریسٹ روم میں اس نے اپنا وہ انوکھا لباس پہن لیا جو اس نے شاپنگ مال سے خریدا تھا۔ سنہری وگ پہننے کے بعد اس نے آرائشی بو، وگ کے خالی باکس کے گرد لپیٹ دی اور اپنا معمول کا عام سا لباس جو وہ گھر سے پہن کر چلی تھی، اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ میں ٹھونس دیا۔

اب اس کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ پھر وہ ریسٹورنٹ کی جانب چل پڑی۔

جب اس نے ریسٹورنٹ کی مدھم روشنی میں ٹینا کی میز کے مقابل کی کرسی سنبھالی تو ٹینا کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات نمایاں ہوگئے۔ "تم یہ کیا ظاہر کرنے کی کوشش کررہی ہو؟" اس نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

شیرائل نے بیٹھنے کے بعد اپنا بیگ ٹینا کے قدموں کے پاس فرش پر رکھ دیا اور بولی۔ "کیا تم چاہتی ہو کہ میں ایک عوامی جگہ پر تمہارے ساتھ دیکھی جاؤں؟ تمہارے برعکس میں نے اپنی زندگی کا رخ بدل لیا ہے۔ میں نہیں چاہوں گی کہ کوئی بھی شے میری اس امیج کو داغ دار کردے۔"

ٹینا یہ سن کر مطمئن ہوگئی اور اپنے سامنے رکھے ہوئے گلاس میں سے مشروب کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ "اسی لیے تم نے یہ بہروپ اختیار کیا ہے۔" اس کا لہجہ سرگوشی کے مانند تھا۔

میں یہ بھی گوارا کرلوں گی لیکن اس وقت تک جب تک تم پیش لاتی رہو گی۔"

شیرائل نے بظاہر مینیو کارڈ پڑھنا شروع کردیا۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ وہ لمحہ جلد میسر آجائے جب وہ ٹینا کے مشروب میں چپکے سے زہر انڈیل دے۔

اور پھر وہ موقع مل گیا جب ٹینا نے اپنا رخ موڑتے ہوئے ایک ویٹر کو مزید مشروب لانے کا اشارہ کیا۔ جب ٹینا کی توجہ دوسری جانب تھی تو شیرائل نے چپکے سے زہر کی شیشی ٹینا کے گلاس میں خالی کردی۔

چند منٹ بعد ٹینا نے اپنا گلا دبوچ لیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل رہے تھے۔ وہ سانس لینے کے لیے ہانپ رہی تھی۔ اس نے اپنی کرسی پیچھے کی طرف پھینک دی اور ہاتھوں کو پٹخنے لگی۔

شیرائل کے ہونٹوں پر ایک لمحے کے لیے زہرخند مسکراہٹ عود کر آئی۔ پھر اس نے فوراً ہی مدد کے لیے پکارنا شروع کردیا۔ "پلیز، ہماری مدد کریں... کوئی ہے؟" وہ چیخ رہی تھی لیکن دل میں یہ بات جانتی تھی کہ اس کی جیل کی سابقہ ساتھی اور روم میٹ کی زندگی بچانے کی کوئی بھی کوشش لاحاصل ہوگی۔

جب ٹینا کو مدد پہنچانے کے لیے ریسٹورنٹ میں موجود لوگوں کا ایک مجمع وہاں اکٹھا ہوگیا تو شیرائل چپکے سے وہاں سے کھسک لی۔

اس نے اسی گیس اسٹیشن کے ریسٹ روم میں پہنچ کر اپنا حلیہ دوبارہ بدل لیا۔ اس نے اپنا سیاہ لباس اور وگ اتار کر اپنے پرس میں ٹھونس لیے اور وہاں سے نکل کر اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

دو گھنٹے بعد کسی کے دستک دینے پر جب شیرائل نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا تو ایک شخص اپنا بیج تھامے سامنے کھڑا تھا۔

"شیرائل اوونز؟"

"میں ہی شیرائل اوونز ہوں۔" اس نے محتاط لہجے میں کہا۔ "میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں؟"

"مس شیرائل، میں سراغ رساں لارسن ہوں۔ آپ ٹینا ولسن کی موت کے سلسلے میں پوچھ گچھ کے لیے مطلوب ہیں۔ آپ کو میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔"

شیرائل کی سانسوں کی رفتار تیز ہوگئی لیکن اس نے اپنی کیفیت پر مکمل قابو پایا ہوا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اس کے بدلے ہوئے حلیے کے باعث کوئی عینی گواہ اسے جائے حادثہ پر شناخت نہیں کرسکتا تھا خود کو ناقابلِ شناخت رکھنے کے لیے اس نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔

"میرا خیال ہے آپ کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔" اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "میں اس نام کی کسی خاتون کو نہیں جانتی۔"

سراغ رساں نے اپنے فرض سے قطعی کوئی روگردانی نہیں کی۔ اس نے سرکاری دستاویز کا ایک کاغذ جیب سے نکالا اور بولا۔ "ہمارے پاس اس فلیٹ کی تلاشی کا وارنٹ موجود ہے۔ ہمیں سیاہ چمڑے کا منی اسکرٹ اور اس سے میچنگ لباس کی اشیا مطلوب ہیں۔"

یہ سن کر شیرائل کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے سے خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اس نے بے ساختہ دروازے کا سہارا لے لیا اور بولی۔ "آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"اس گفٹ کے ذریعے میڈم۔"

شیرائل کی بھویں تن گئیں۔ وہ حیران تھی کہ ایک خالی گفٹ باکس کوئی بھی معلومات کس طرح فراہم کرسکتا ہے؟ وہ بولی۔ "گفٹ؟"

"جب ہم نے شاپنگ بیگ میں سے گفٹ باکس کو باہر نکالا تو ہمیں ایک رسید دکھائی دی جو کریڈٹ کارڈ کی رسید تھی۔ پھر جب ہم اس ڈپارٹمنٹل اسٹور میں گئے تو اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ اس سہ پہر آپ نے وہ تمام ملبوساتی اشیا وہاں سے خریدی تھیں جو مس ٹینا ولسن کے ہمراہ لنچ کے لیے آنے والی خاتون نے پہنی ہوئی تھیں اور جس کی تصدیق ریسٹورنٹ میں موجود دیگر گاہکوں نے کی ہے۔"

یہ کہہ کر سراغ رساں لارسن مسکرا دیا۔

شیرائل دم بخود یہ سب کچھ سن رہی تھی۔

سراغ رساں لارسن دوبارہ گویا ہوا۔ "میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہم ابھی تک اس واردات کے مقصد کا اندازہ نہیں لگا سکے ہیں لیکن ہم اس پر کام کررہے ہیں۔ اس دوران میں اگر ہمیں وہ ملبوساتی اشیا مل جاتی ہیں جیسا کہ ہمیں شبہ ہے کہ مل جائیں گی... تو پھر اس کیس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور جیوری کے سپرد کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

شیرائل اب بھی ہکا بکا کھڑی تھی۔

سراغ رساں لارسن نے سرچ وارنٹ شیرائل کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ "کیا ہم تلاشی لینے کے لیے اندر آسکتے ہیں؟"

✱

خونی کارٹون

مختار آزاد

کارزارِ سیاست میں قدم رکھنا تو آسان ہوتا ہے... مگر تادیر قیام کے لیے بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے... ایک ایسے ہی سیاست داں کے روز و شب کا تماشائے احوال جو اچانک ہی بھنور کی زد میں آگیا... ماضی کی پرچھائیاں اس کے تابناک حال و مستقبل کے تعاقب میں تھیں۔

خوابوں کی بنت اور تکمیل... تعبیر سے تخریب کا سفر مسلسل

''جان سے مارنے کی نہ تو یہ پہلی دھمکی ہے اور نہ ہی آخری۔ مجھے کئی بار اس طرح کی دھمکیاں ملتی رہیں مگر اس بار ملنے والی دھمکی میں بڑی حد تک سچائی پوشیدہ ہے۔'' نو منتخب گورنر آرتھر فورسٹل نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

چند لمحے توقف کے بعد آرتھر نے بڑے... سائز کا لفافہ کافی ٹیبل کی دوسری طرف بیٹھی کیلی فورنیا پولیس ڈپارٹمنٹ کی سینئر پولیس آفیسر شیلبی ونٹر کی طرف کھسکا دیا۔ وہ گورنر کی سیکیورٹی انچارج تھی۔ ''یہ گھر کے پتے پر موصول ہوا ہے۔ لگتا ہے اسے پچھلے ہفتے یا اس سے کچھ پہلے بھیجا گیا تھا۔'' اس وقت وہ اسٹڈی میں بیٹھے تھے اور ان کی نظریں لفافے پر مرکوز تھیں۔

شیلبی نے لفافہ کھولا۔ اس کے اندر ایک بڑی شیٹ رکھی تھی۔ اس نے آدھی باہر نکالی۔ سفید پیپر شیٹ کے وسط میں چار مستطیل خانے بنے تھے، سب کا سائز ایک جیسا تھا۔ یہ بالکل اسی انداز میں تھے جس طرح اخبارات میں بچوں کے لیے سیدھی پٹی میں کارٹون اسٹوری ہوتی ہے۔ شیلبی نے ایک نظر گورنر پر ڈالی اور پہلے خاکے کو دیکھنے لگی۔ خاکے میں ایک شخص بیٹھا دکھایا گیا تھا۔ اس کی گود میں روز مرہ معمولات لکھنے والی ڈائری تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ڈائری پر تھا اور وہ دوسرے ہاتھ کی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا۔ باقی تین خانے خالی تھی۔

آرتھر کی عمر صرف سینتیس برس تھی اور اسے کیلی فورنیا کا کم عمر گورنر منتخب ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ آرتھر جج تھا اور اس نے استعفا دے کر سیاست میں قدم رکھا تھا۔ بہت جلد اس نے انتخابات میں حصہ لیا اور گورنر منتخب ہوگیا۔ اپنی تقریروں کی روشنی میں وہ عوامی فلاح و بہبود کے لیے انقلابی اقدامات پر یقین رکھتا تھا مگر کچھ ایسے سیاستداں، رجعت پسند کارکن اور سیاسی پنڈت بھی تھے جنھیں وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ یہ دھمکی بھی شاید اس کے مخالفین میں سے ہی کسی نے بھیجی تھی۔ وہ کون تھا؟ اب اس بات کا پتا چلانا تھا۔ تشویش کی بات یہ تھی کہ کئی بار دھمکیوں کا سامنا کرنے والا آرتھر اس بار ملنے والی دھمکی کو غیر معمولی سنجیدگی سے لے رہا تھا مگر کیوں؟ یہ بات شیلبی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''تو شیلبی... اب تم کیا کرو گی؟'' یہ کہہ کر اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور کہنے لگا۔ ''میرے خیال میں یہ مذاق نہیں ہے۔'' اس نے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے یقین ہے، تم میری بات سے اتفاق کرو گی۔''

''پہلی نظر میں تو یہ دلچسپ کارٹون ہے۔'' شیلبی نے کہنا شروع کیا۔ ''اسے موت کی دھمکی قرار دینے سے پہلے میں مزید کچھ تحقیق کرنا چاہوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ سوچتی رہی اور پھر گورنر کی طرف استفساریہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ''جہاں تک میں جانتی ہوں، آپ کے حلقۂ احباب میں ایسا کوئی آرٹسٹ نہیں جو اس کارٹون کے ذریعے صرف مذاق کرنے کی کوشش کرے۔''

''مجھے یاد نہیں پڑتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ویسے بھی مجھے کارٹونز میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو صرف ایک کارٹون دیکھتا ہوں اور وہ ہے ڈیلی میل کے ادارتی صفحے کا۔ وہ بھی اس لیے کہ میں روزانہ اداریہ پڑھتا ہوں اور یوں اس پر بھی نظر پڑ جاتی ہے... اور بس!''

شیلبی جانتی تھی کہ کئی جرائم پیشہ اس کے مخالف ہیں۔ بطور گورنر اس کے کئی دشمن ہو سکتے ہیں۔ وہ جج بھی رہ چکا تھا۔ اسے ایسے لوگ بھی دھمکی دے سکتے تھے جنھیں اس نے سزائیں دی ہوں گی۔ وہ اب تک شیٹ ہاتھ

میں تھامے غور سے دیکھ رہی تھی۔ پہلی نظر میں وہ بہت عمدہ ڈرائنگ تھی مگر آرتھر کے بیان کی روشنی میں موت کا پیغام... جس کے بھیجنے والے کی گرفتاری اب اس کی ذمے داری تھی۔ ''آپ روزانہ ڈاک چیک کرتے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''اکثر... مگر باقاعدگی سے نہیں۔'' آرتھر نے جواب دیا۔

''میں آپ کے وہ تمام خطوط دیکھنا چاہوں گی جنھیں اب تک کھولا نہیں گیا۔'' شیلبی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا اور شیلبی کو ساتھ لے کر راہداری کے سرے پر بنے کمرے کی طرف لے کر چلا۔

''یہ دیکھو۔'' کمرے میں داخل ہو کر اس نے دھاتی بنی ایک بڑی میز کی طرف اشارہ کیا جہاں تین بڑے بڑے فائل فولڈر رکھے تھے۔ ''بند خطوط ان فولڈرز میں ہیں۔'' آرتھر نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ شیلبی فولڈرز کو قریب سے دیکھ رہی تھی۔ ''تم چاہو تو سب کو کھول کر دیکھ سکتی ہو... میری طرف سے اس معاملے میں بالکل آزاد ہو۔'' آرتھر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پرائیوسی رائٹس میں مداخلت کا حق دینے پر شکریہ۔'' شیلبی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کہا۔

''یہ سیکیورٹی کا معاملہ ہے، جس کی وجہ سے قانون ہمیں ان رائٹس کو وقتی طور پر معطل کرنے کا اختیار دیتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسا۔ ''اس وقت میں نے اپنے آپ پر اس قانون کا اطلاق کر لیا ہے۔''

''شکریہ۔'' یہ کہہ کر وہ فولڈرز کھولنے لگی۔

شیلبی نے خطوط پر مشتمل تینوں فولڈرز اٹھائے اور فرش پر بچھے قالین پر بیٹھ کر ایک ایک خط چیک کرنے لگی۔ دو تین منٹ تک آرتھر اسے کام کرتا دیکھتا رہا اور پھر کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گیا۔

''یہ دیکھو...'' تقریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد اس نے آرتھر کو مخاطب کیا۔ یہ سنتے ہی وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

''یہ بالکل دھمکی آمیز لفافے جیسا ہے۔ اسی طرح کا لیبل اور اسی طرح کا..... ٹکٹ لگا ہوا ہے۔'' اس کے دوسرے ہاتھ میں وہ لفافہ تھا جو آرتھر نے اسے دیا تھا۔ ''یہ دونوں ایک ہی شخص کے بھیجے ہوئے لگتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے برابر آکر کھڑا ہو گیا۔

''بس ایک فرق ہے، یہ لفافہ بند ہے۔'' شیلبی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ذرا اسے پکڑو، میں یہ خطوط واپس فولڈر میں رکھ دوں۔'' اس نے دونوں لفافے آرتھر کو پکڑائے اور فرش پر بکھرے خطوط سمیٹنے لگی۔

''چلو... اب اسے کھول کر دیکھتے ہیں۔'' شیلبی فولڈرز میز پر رکھنے کے بعد پلٹی اور آرتھر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

آرتھر نے کچھ کہے بنا لفافہ کھولا۔ پہلے لفافے کی طرح اسے بھی بند کرنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ ''یہ بھی ویسا ہی ہے۔'' لفافہ کھول کر اس نے اندر رکھی پیپر شیٹ آدھی باہر نکالی اور چند سیکنڈ تک دیکھنے کے بعد اسے شیلبی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''واقعی...'' شیلبی بھی کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھنے کے بعد بولی۔ اس کے لہجے سے حیرت جھلک رہی تھی۔ یہ بھی پہلی شیٹ کی طرح ہی تھا۔ اس شیٹ پر بھی چار مستطیل خانے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار دوسرے خانے میں بھی کارٹون تھا۔ ایک مرد ساحل پر عورت کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شیلبی دونوں شیٹ سامنے رکھ کر بغور تقابلی جائزہ لے رہی تھی۔ وہ یہ جاننا چاہتی کہ اس دوسرے پیغام میں وہ کیا کہنا چاہتا ہے مگر اب تک وہ کوئی سراغ لگانے سے قاصر تھی۔ کافی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر آرتھر کو دیکھا، اس کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی طاری تھی۔ ''کیا کہتے ہو؟'' اس نے دونوں شیٹس اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

آرتھر نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ ''مجھے چھوڑو، یہ بتاؤ تم نے کیا سمجھا؟'' کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

شیلبی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''مجھے باقی دو فولڈرز بھی چیک کرنا ہوں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میز کی طرف بڑھی۔ وہ ایک بار پھر خطوط کھنگال رہی تھی۔

''یہ ایک اور ملا ہے۔'' شیلبی نے بیٹھے بیٹھے کہا اور لفافہ اوپر کر کے اسے دکھایا۔ یہ بھی پچھلے دو لفافوں جیسا ہی تھا۔

''اِدھر لاؤ...'' آرتھر نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سارے چیک کر لیے ہیں؟''

''ہاں... بس یہی ملا ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی پچھلے دو لفافوں اور اس میں صرف ایک فرق تھا۔ یہ خاصا موٹا لگ رہا تھا۔

آرتھر اور شیلبی آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ان کے بیچ میں میز پر وہ لفافہ رکھا تھا۔ ''کھولو۔'' آرتھر نے حکم دیا۔

شیلبی نے لفافہ کھولا۔ اس پر بھی پچھلی دو شیٹوں کی طرح چار مستطیل خانے تھے، دو خالی اور دو میں کارٹون بنے تھے ''ذرا تم بھی دیکھو۔'' چند سیکنڈ تک اسے بغور دیکھنے کے بعد شیلبی نے اسے آرتھر کی طرف بڑھایا۔

''کچھ خاص فرق تو بظاہر نظر نہیں آرہا۔'' اس نے شیٹ بغور دیکھنے کے بعد واپس اسے شیلبی کی طرف بڑھا دیا۔

''ایک منٹ۔'' آرتھر کو جیسے اچانک کچھ یاد آیا۔ ''ذ ادھر دو۔'' اس نے بے تابی سے شیلبی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور شیٹ کا بغور جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے پر فکر مند کے آثار تھے۔ اس نے کچھ کہے بنا اگلی دونوں شیٹس لیں اد پھر تینوں کو سامنے رکھ کر ان کا تقابلی جائزہ لینے لگا۔ ''او میرے خدا!'' اچانک اس کے منہ سے نکلا۔

''کیا ہوا سر؟'' شیلبی نے پریشان لہجے میں دریافت کیا۔

''اِدھر آؤ۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے برابر کھڑا ہونے کا کہا۔ ''یہ دیکھو۔'' آرتھر نے اشارہ کیا۔

''پچھلے دو کارٹونز میں ساحل پر بیٹھے مرد کے اوپر اڑتے دو غبارے بالکل سادہ ہیں مگر تیسری شیٹ کے غباروں پر کچھ لکھا ہوا ہے۔'' آرتھر کی بات سن کر وہ بھی اس کارٹون کو بغور دیکھنے لگی۔

''ارے یہ دیکھو۔'' آرتھر پھر چلّایا۔ ''مرد کی گود رکھی ڈائری کھلی ہوئی ہے اور صفحے پر چھ دن بعد کی تاریخ ہے۔''

''ارے ہاں!'' شیلبی نے بھی حیرت کے انداز جواب دیا۔ ''غور سے دیکھو، مرد کلائی پر بندھی گھڑی وقت دیکھ رہا ہے اور ہاں... ٹائم بھی صاف نظر آرہا ہے۔''

''شیلبی... ہمیں اس کا منصوبہ ناکام بنانا ہوگا۔'' آر

کہا۔ ''میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں، وہ تقریبِ حلف برداری دوران مجھے نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ ہمیں اسے تقریب کے عقد ہونے سے پہلے پکڑنا ہوگا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت ں بچا ہے۔'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''چند روز بعد تقریب ہے جس میں وہ گڑبڑ کرے گا یا ے گی۔'' آرتھر نے شیلبی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہا۔ ''تین ہفتوں سے اس تقریب کا چرچہ تھا اور پچھلے تین وں میں تین بار اس نے اپنے پیغام بھیجے۔ پہلا مبہم تھا، سرا کم مبہم اور یہ تیسرا بالکل واضح ہے۔'' آرتھر نے میز کی ف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کل شام بھیجا گیا ہے۔'' اس نے لفافے پر لگی مہر اور وقت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

شیلبی کو احساس تھا کہ جو کچھ کرنا ہے، جلد کرنا ہوگا۔ ''بتایئے کیا کرنا چاہیے؟'' شیلبی نے پُرعزم لہجے میں آرتھر کو طب کیا۔

''سنو...'' یہ کہتے ہوئے آرتھر اسے کچھ سمجھانے لگا۔ یاد رہے کہ اس معاملے میں راز داری بہت ضروری ہے۔ میرے سیاسی کیریئر کا معاملہ ہے۔'' اس نے تاکیدی لہجے میں شیلبی سے کہا۔

''اوکے سر!'' یہ کہہ کر وہ میز پر رکھے تینوں لفافے اکٹھا کرنے لگی۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ضروری اریاں کر رہی تھی۔ اس کا دماغ بدستور کارٹونز میں پوشیدہ ھمکی آمیز بیان پر مرکوز تھا۔ اس نے کچھ ضروری فون کیے رتقریباً پون گھنٹا دفتر میں گزار کر وہ باہر نکلی۔ کچھ دیر بعد وہ مگ رہائشی علاقے میں اپنی گاڑی سے اتر رہی تھی۔

یہ پرانے طرز کی عمارتوں والا اوسط درجے کا رہائشی لاقہ تھا۔ شیلبی جس گھر کی طرف بڑھ رہی تھی، وہ تیس کی دہائی کے انداز میں تعمیر کردہ دو منزلہ مکان تھا جس کا لان اجڑ چکا ھا اور خودرو جھاڑیوں نے گھر کی تین چار فٹ بلند بیرونی وار کو بھی کسی قدر ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ کنکریٹ کی سڑک چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اس گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ یب پہنچی تو اسے اندر سے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی ی۔ وہ گیٹ پر پہنچ کر رکی۔ میل باکس پر نظر ڈال کر نام پڑھا رپھر ڈور بیل کا بٹن دبایا۔ اس نے دو تین بار گھنٹی بجائی مگر وئی جواب نہیں ملا۔ وہ ایک بار پھر گھنٹی بجانے والی تھی کہ کسی دکی آواز سنائی دی۔ وہ کتے کو چپ کرا رہا تھا۔ گھنٹی بجانے کے لیے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آگیا۔ کچھ دیر بعد کسی نے ٹبٹ میں لگی کھڑکی کھولی۔ اس کا آدھا چہرہ نظر آرہا تھا۔

''تم وہی پولیس والی ہو نا جس نے کچھ دیر پہلے مجھے ذن کیا تھا؟'' اس نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

''جی ہاں مسٹر ڈگلس... میں نے ہی تمہیں فون کیا تھا، میں ہی ہوں شیلبی... شیلبی وٹز۔''

''اندر آجاؤ، میں گیٹ کھولتا ہوں۔'' اس نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔ ''آجاؤ، آجاؤ۔'' اس نے گیٹ کھول کر کہا۔

شیلبی اندر پہنچی تو اس نے گیٹ بند کیا اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''سب مجھے ڈینی کہتے ہیں، تم بھی کہہ لوگی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''شکریہ ڈینی۔'' شیلبی نے دوستانہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر داہنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''اندر چلتے ہیں۔'' اس نے مصافحے کے بعد کہا اور شیلبی اس کے پیچھے پیچھے آگے بڑھنے لگی۔

شیلبی نے اس کا جائزہ لیا۔ ڈینی ستّر اسّی کے پیٹے میں ہوگا۔ اس کے بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے شارٹ اور پولو ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں ٹینس شوز پہن رکھے تھے جس کے بند کھلے ہوئے تھے۔

وہ پورچ سے ہوتے ہوئے آگے بڑھی تو اس نے پانچ کتّے دیکھے۔ پانچوں اعلیٰ نسل کے شیفرڈ تھے مگر وہ بھی اپنے مالک کی طرح بوڑھے اور خاصے فربہ تھے۔ شیلبی کو مالک کے ساتھ دیکھ کر کوئی نہیں بھونکا۔ سارے بیٹھے بیٹھے زبان نکال رہے تھے۔ وہ اس کے پیچھے گھر میں داخل ہوئی تو عجیب سی بساند نے اس کا استقبال کیا۔ چاروں طرف اونچے اونچے شیلف میں کامکس بکس بھری ہوئی تھیں۔ دیواروں پر جگہ جگہ کارٹونز بنے ہوئے تھے۔ ''کچن میں چل کر بیٹھتے ہیں، میں تمہیں کافی بنا کر پلاؤں گا۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پیچھے مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ شیلبی مسکرادی۔

کچن تک پہنچنے کے لیے وہ چھوٹی سی راہداری سے گزرے۔ یہ بھی پرانے رسالوں، کتابوں اور کارٹونز سے اٹی ہوئی تھیں۔ وہ کچن میں پہنچے۔ ایک طرف کچن کا کاؤنٹر اور چولہا تھا۔ دوسرے کونے میں ایک میز پر پرانا سا بڑا کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔ شیلبی نے سوچا کہ اب شاید اس کا شمار کمپیوٹر کے نوادرات میں ہوتا ہوگا۔ دیوار کے ساتھ صوفے رکھے تھے جن کے کور انتہائی میلے ہو رہے تھے۔ شیلبی کو محسوس ہوا کہ اس میں سے بدبو کے ہلکے ہلکے بھبکے اٹھ رہے ہیں۔

''شکریہ۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور کونے پر ٹک گئی۔ ڈینی اس کے سامنے والے صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''امریکن کامکس ہسٹری کے ہیڈکوارٹر میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔'' ڈینی نے بے تکلفی سے کہا اور اس انداز سے دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیسے آنا ہوا۔

''اے سنو!'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم بہت خوبصورت ہو، بالکل شہزادی ولانٹ کی طرح... جس کی مشہور ترین ڈرائنگ آرٹسٹ فوسٹر نے بنائی تھی۔''

''اس عزت افزائی کا بہت بہت شکریہ۔'' شیلبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا شرمندگی نہیں کہ میں کامکس کے بارے میں کچھ خاص نہیں جانتی بلکہ عام لوگوں سے شاید کچھ کم ہی جانتی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''میں نے کئی لوگوں سے بات کی مگر سب کا یہی کہنا تھا کہ ڈکلس سے ملو، وہی ایک آدمی ہے جو اس کام میں تمہاری مدد کرسکتا ہے۔ اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں ڈینی۔'' شیلبی نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''میرے پاس کچھ کارٹونز ہیں میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ یہ کس کے بنائے ہوئے ہیں۔'' اس نے لفافے ہینڈ بیگ سے نکالتے ہوئے کہا۔

''مجھے دکھاؤ۔''

شیلبی نے تینوں لفافے اس کی طرف بڑھا دیے۔

ڈینی نے لفافے اس کے ہاتھ سے لیے اور ان میں رکھی شیٹس باہر نکالنے لگا۔ جس ترتیب سے یہ تینوں لفافے موصول ہوئے تھے، شیلبی پہلے ہی شیٹ کے پیچھے اسی ترتیب سے نمبر لگا چکی تھی تاکہ ترتیب گڈمڈ نہ ہو۔

ڈینی نے تینوں شیٹس باہر نکالیں اور انہیں اپنے سامنے رکھی چھوٹی میز پر اس طرح پھیلایا کہ اس کی شکل ہلالی چاند کی بن گئی۔ کچھ دیر تک وہ غور سے ان کا جائزہ لیتا رہا۔ ''ارے ایک منٹ...'' اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ''میں پہلے کافی پلاؤں گا، اس کے بعد بتاتا ہوں یہ کس نے بنائے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کچن کی طرف بڑھا۔

''واہ... واقعی ڈینی تخلیق کار ہے۔'' اس نے دل میں کہا۔ ڈینی نے تینوں شیٹس اس طرح رکھی تھیں کہ ہلال چاند کی طرح تینوں کامکس اسٹرپ نظروں کے سامنے تھیں جس سے تقابلی جائزہ زیادہ آسان ہوگیا تھا۔

کچھ دیر بعد ڈینی دو مگ میں کافی لیے پلٹا اور ایک اس کی طرف بڑھایا۔ ''شکریہ... بڑی زحمت کی۔'' شیلبی نے مگ تھامتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں، تم ذرا سا دیر کردیتیں تو میں اب تک اپنی کافی بنا کر پی بھی چکا ہوتا۔'' اس نے اپنا مگ تپائی پر رکھا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ کافی مگ سے بھاپ اٹھ رہی تھی مگر وہ غور سے کارٹون دیکھنے میں منہمک تھا۔

''عمدہ بنے ہوئے ہیں۔'' اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے آپ پہچان رہے ہیں۔'' شیلبی نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

''کچھ لائنیں کلاسک انداز میں کھینچی گئی ہیں جس کا مطلب ہے کہ آرٹسٹ کامکس کلاسکس سے بھی بخوبی واقف ہے۔'' ڈینی نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں شیٹس پر مرکوز تھیں۔ کافی دیر بعد وہ سیدھا ہوا، سکون سے کافی کا مگ اٹھایا اور بڑا سا گھونٹ بھرا۔ وہ خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھیں۔ شیلبی بے چینی سے اس کے بولنے کی منتظر تھی تاہم وہ ازخود کچھ پوچھنے سے گریز کررہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈینی اس کی کسی بات کا برا منائے۔ ویسے بھی وہ جانتی تھی کہ آرٹسٹ فطرتاً حساس ہوتے ہیں اور کوئی بھی معمولی سی بات انہیں سیخ پا کرسکتی ہے۔ ڈینی سے اس کی امید وابستہ تھی۔ رہ رہ کر اس کے کانوں میں آرتھر کا وہ جملہ گونج رہا تھا۔ ''ہمارے پاس بہت کم وقت باقی بچا ہے۔'' شیلبی نے ڈینی کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور سامنے کی دیوار پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا مگ تھا۔ گاہے بگاہے وہ گھونٹ بھی بھرتا جارہا تھا۔

''میرا خیال ہے سمجھ آگیا کہ یہ کس کا انداز ہے؟'' کافی دیر بعد اس نے اپنے لب کھولے۔

''اس کا مطلب کہ تم پہچان گئے کہ یہ کس نے بنائے ہیں؟'' شیلبی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

''بڑی حد تک۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے تپائی پر مگ رکھا اور ایک بار پھر شیٹس پر نظریں مرکوز کردیں۔

''یہ انداز تو بالکل اسی کا ہے۔'' ڈینی نے خودکلامی کی۔

''کس کا؟'' شیلبی نے بےتابی سے پوچھا۔

''ملٹن نائف کا۔'' ڈینی نے نظریں اوپر کرکے اسے دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے سر جھکا کر شیٹس کو دیکھنے لگا۔ ''یہ دوسری لائنیں وینڈر کی لگتی ہیں... بالکل... ہو بہو وہی۔''

یہ سن کر شیلبی چونک گئی۔ سوچنے لگی کہ کیا دو آرٹسٹ نے مل کر اسے بنایا ہے؟ ''معافی چاہتی ہوں۔'' شیلبی نے کہا۔ وہ اسے دیکھنے لگا۔ ''جہاں تک میں سمجھ پائی ہوں، یہ کامکس اسٹرپ دو آرٹسٹوں نے مل کر بنائی ہیں۔ ذرا وضاحت کردیں کہ یہ ملٹن کی بنائی ہوئی ہیں یا وینڈر کی... مجھے نہیں لگتا کہ یہ اتنا بڑا کام ہے جسے دو آرٹسٹوں نے مل کر کیا ہوگا۔''

''یہ ملٹن نے نہیں بنائی ہوں گی اور نہ ہی وینڈر نے، البتہ ان کا انداز...'' یہ کہہ کر ڈینی مسکرایا۔ ''خیر، میں تمہیں بتادوں۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر کہنے لگا۔ ''ملٹن دو سال پہلے اٹھاسی برس کی عمر میں انتقال کرچکا ہے اور وینڈر اٹھارویں صدی کے شروع کا آرٹسٹ تھا۔ وینڈر تو یہ بنا ہی نہیں سکتا البتہ ملٹن بنا سکتا تھا مگر اس نے بھی موت سے کئی سال پہلے کامکس اسٹرپ بنانا چھوڑ دی تھیں۔'' یہ کہہ کر اس نے شیٹس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ذرا سا پرانے ضرور ہیں مگر اتنے نہیں کہ ملٹن یا وینڈر کے ہاتھوں کے بنے ہوئے ہوں۔''

''ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ...''

''میں ان کے اسٹائل کے بارے میں کہہ رہا تھا، یہ نہیں کہ وہ ملٹن کے ہاتھ سے بنے ہیں۔'' ڈینی نے قطع کلامی کرکے وضاحت کی۔ ''اسٹرپ میں جو کارٹون بنانے اور لائنیں کھینچنے کا انداز ہے، اس میں ملٹن کے انداز کی جھلک غالب ہے اور کہیں کہیں وہ کلاسکی انداز بھی ہے جو وینڈر کا خاص انداز تھا۔''

''اوہ...'' شیلبی نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''تو پھر ان کا بنانے والا کون ہوسکتا ہے؟''

''گھوسٹ کارٹونسٹ۔'' ڈینی نے فٹ سے جواب دیا۔ ''بڑے بڑے آرٹسٹوں کے پاس اکثر گمنام شوقین بھی کام کرتے ہیں۔ یہ وہ ہوتے ہیں جو صرف پیسے کمانے کے لیے استادوں کا کام کرتے ہیں اور خود پردے کے پیچھے رہتے ہیں۔ ان کے لیے یہ صرف ملازمت ہوتی ہے جو انہیں دو وقت کی روٹی دیتی ہے۔ انہیں شہرت یا نام سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ جس نے بھی یہ کارٹون بنائے ہیں وہ گھوسٹ کارٹونسٹ ہے اور اس نے جس انداز کی اِنک استعمال کی ہے، جس انداز سے رنگ بھرا اور جس طرح لائنیں کھینچی ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کبھی بطور گھوسٹ کارٹونسٹ ملٹن کے قریب تھا۔ یہ سب کچھ ہو بہو وہی ہے جیسا ملٹن کے کام میں نظر آتا ہے۔''

اس کی بات سن کر شیلبی پریشان ہوگئی۔ ''تم مجھے کچھ ایسے گھوسٹ کارٹونسٹ کا پتا دے سکتے ہو جن سے مل کر میں یہ جاننے کی کوشش کروں کہ ان کا بنانے والا کون ہوسکتا ہے؟'' شیلبی نے سوال کیا۔

''یقیناً میں ایسا کرسکتا ہوں مگر کچھ کیوں؟ تمہیں تو صرف ایک کی تلاش ہے؟'' اس نے استفساریہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

''تلاش تو ایک کی ہے مگر...''

''ایک منٹ، مجھے کچھ سوچنے دو۔'' ڈینی نے اسے بولنے سے روک دیا اور خود کنپٹی کو انگلی سے دباتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

''تم چارلی سے ملو۔'' تقریباً دو منٹ بعد اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ ''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔''

''یہ کون ہے؟'' شیلبی نے تجسس بھرے انداز میں سوال کیا۔

''کارٹونسٹ سوسائٹی میں اس سے بڑا استاد اس وقت کوئی نہیں ہے۔ جس آرٹسٹ کی چاہو، وہ اس کے انداز کی ہو بہو نقل بنا کر دے دے گا۔ اس کا دھندا بہت اچھا چل رہا ہے۔ کئی گھوسٹ کارٹونسٹ اس کے پاس کام کرتے ہیں۔ وہ لگ بھگ سب کے ہاتھ اور کام کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔''

''کہاں ملے گا چارلی؟''

''وہ کاپی کیٹز کے نام سے جانا جاتا ہے۔'' ڈینی نے کہنا شروع کیا۔ ''تم آئیوی ریستوران کی طرف جاؤ، وہاں ایک بلڈنگ ہے رابرٹسن نام کی... جہاں درجنوں پاپارازی فلمی ستاروں کی ٹوہ لگاتے ہوئے تمہیں نظر آئیں گے۔ وہاں کسی سے بھی پوچھ لینا کاپی کیٹز کہاں ملے گا، وہ تمہیں اس سے ملوا دے گا۔ ویسے وہیں پر اس کی گیلری بھی ہے۔ تم چاہو تو اس کا پتا اور فون نمبر بھی نوٹ کرلو۔'' یہ کہہ کر اس نے کاپی کیٹز کا پتا اور فون نمبر لکھوا دیا۔

شیلبی نوٹ بک بند کرکے بیگ میں رکھ رہی تھی کہ اسی دوران ایک شیفرڈ آکر ڈینی کی ٹانگوں سے لپٹنے لگا۔ ''ایک منٹ سلیگو۔ مہمان رخصت ہو تو کھانا دیتا ہوں۔'' اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں اب چلتی ہوں۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''مدد کا شکریہ۔''

''کوئی بات نہیں، چلو ہم دونوں تمہیں باہر تک چھوڑنے چلتے ہیں۔''

ڈینی گیٹ کھولنے لگا تو شیفرڈ پھر اس کی ٹانگوں سے

لپٹ گیا۔ ’’ایک منٹ سلیگو۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے گیٹ کھولا۔ ’’تمہیں معلوم ہے کہ میں نے سلیگو نام کہاں سے لیا؟‘‘
شیلبی نے نفی میں سر ہلا دیا۔
’’چھوڑو... پھر تو تم نینسی کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی ہوگی؟‘‘
’’بائے...‘‘ شیلبی نے اس کی کہی اَن سنی کی اور آگے بڑھ گئی۔ اسے فوراً ہی اپنے پیچھے گیٹ بند ہونے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

☆☆☆

شیلبی نے ڈینی کا دیا ہوا نمبر ملایا مگر فون ریکارڈنگ سے منسلک تھا۔ ’’مسٹر کیٹز اگلے دس روز کے لیے چھٹیوں پر ہیں اور گیلری بند ہے۔ برائے مہربانی اپنا پیغام ریکارڈ کروا دیں۔‘‘ اس نے ایسا ہی کیا اور پھر تین منٹ بعد اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔
دوسری طرف شخص نے خود کو کیٹز کا اسسٹنٹ بتاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ ’’میرا نام ویسلے کاڈ ہے۔ کیا میں آپ کے کام آسکتا ہوں؟‘‘
اس کے انداز سے ایسا لگا جیسے وہ کسی گیلری کا آرٹسٹ نہیں کسی سپر اسٹور کا سیلز مین ہے جو گاہک کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔
’’شاید...‘‘ شیلبی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر کیٹز نہیں تو شاید یہ ہی اس کے کام آجائے۔
فون ملنے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد شیلبی کیٹز کے دفتر سے پچاس میٹر کی دوری پر ’نو پارکنگ‘ میں اپنی کار پارک کر رہی تھی۔ اس نے ڈیش بورڈ پر اپنا پولیس شناختی کارڈ چسپاں کر دیا تاکہ کوئی ٹریفک پولیس اہلکار پرائیویٹ کار دیکھ کر چالان ٹکٹ نہ چسپاں کر جائے۔
شیلبی کاپی کیٹز کے دفتر پہنچی تو دروازہ بند تھا۔ البتہ شیشے کی بڑی سے کھڑکی میں چار بڑی پینٹنگز نظر آرہی تھیں دو کو وہ پہچان گئی۔ یہ آئل پینٹنگز ریمبرانٹ اور پکاسو کے فن پاروں کی نقل تھیں۔ اس نے اصلی پینٹنگز کنٹری میوزیم آرٹ گیلری میں دیکھی تھیں۔ دو کو وہ پہچان نہ سکی۔ اس نے شیشے سے اندر کی طرف جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بیل بجائی۔ دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر آیا۔ ’’شیلبی؟‘‘
’’ویسلے...؟‘‘
’’جی ہاں... اندر آیئے۔‘‘ اس نے ایک طرف ہوتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں بعد وہ لاؤنج میں ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان شیشے کی بنی کافی ٹیبل پر درجن بھر رسالے اور کاپی کیٹز کے بروشر رکھے ہوئے تھے۔
’’میں تو سمجھی تھی کہ یہاں دیواروں پر ہر طرف مسٹر کیٹز کے بنے کارٹونز آویزاں ہوں گے۔‘‘ شیلبی نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے بات شروع کی۔ ’’مگر یہاں تو پینٹنگز لگی ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے سامنے دیوار پر نظر دوڑائی جہاں مائیکل اینجلو کی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ ’’مجھے لگا جیسے میں غلطی سے کیٹز گیلری کے بجائے کسی میوزیم میں آگئی ہوں۔‘‘
’’تم نے ٹھیک کہا مگر یہ سب نقلیں ہیں۔‘‘ اس نے مسکرا کر کہا۔ ’’بات یہ ہے کہ مسٹر کیٹز بہت اعلیٰ پائے کے فن کار ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی نقل ہو بہو اصل ہوتی ہے۔ آرٹ کے جو شوقین مہنگی پینٹنگز خرید نہیں سکتے، وہ مسٹر کیٹز کی ان نقول سے ہی جی خوش کر لیتے ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ’’آپ یہ بات کسی سے کہیے گا نہیں۔‘‘ اس نے چہرہ آگے جھکاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا۔
’’بے فکر رہیے، ایسا کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔‘‘ شیلبی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
’’خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔‘‘ ویسلے نے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات سجاتے ہوئے کہا۔ ’’آپ نے فون پر پیغام ریکارڈ کرایا تھا کہ مسٹر کیٹز سے کسی کامکس اسٹرپ پر بات کرنا چاہتی ہیں، کیا معاملہ ہے؟‘‘
’’کیٹز اب بھی کامکس اسٹرپ بناتے ہیں یا نہیں۔‘‘ شیلبی نے استفساریہ لہجے میں کہا۔ ’’میں نے مسٹر ڈینی سے پوچھی تھی یہ بات مگر انہیں کچھ ٹھیک سے معلوم نہیں۔‘‘ اس نے وضاحت کی۔
’’اوہ ڈینی...‘‘ ویسلے نے مسکرا کر کہا۔ ’’وہ تو شہنشاہ ہے اس میدان کا۔ ہم سب کا نہیں، استادوں کا استاد ہے وہ۔ مسٹر کیٹز نے اس کے پاس بہت کام کیا ہے۔ اس کی وجہ سے اُس نے بھی ٹھیک ٹھاک پیسے کمائے۔ ڈینی کا کاروبار اور ساحل والا گھر دراصل کیٹز کے ذریعے کمائی گئی آمدنی سے ہی بنا تھا۔‘‘ ڈینی کا ذکر سنتے ہی ویسلے نہایت تفصیل سے ڈینی اور کیٹز کے کاروباری تعلق کو بیان کرنے لگا۔ شیلبی کو اس تذکرے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
’’کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس شعبے میں آپ کی مہارت کیا ہے؟‘‘ شیلبی نے قطع کلامی کی۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس کی بات نہ کاٹی تو وہ باتونی نہ جانے کب اپنی زبان کو

بریک لگائے گا۔
’’میں یہاں کام کمیشن پر دیتا ہوں۔‘‘ ویسلے نے مسکرا کر کہا۔ ’’اور کام بہت زیادہ ہو تو خود بھی ہاتھ کی صفائی دکھا دیتا ہوں۔‘‘ اس نے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑا۔ ’’مجھے یقین ہے کہ جس کام کے لیے آپ مسٹر کیٹز سے ملنا چاہتی تھیں، اس میں، میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔‘‘
شیلبی نے اس پر گہری نظر ڈالی۔ وہ چالیس کے پیٹے میں ہوگا۔ عمدہ تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس تھا جس سے اس کی معقول آمدنی کا پتا چلتا تھا۔ ’’میں ایک کامکس اسٹرپ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی تھی۔‘‘ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
’’یہ تو آپ نے فون پر ہی بتا دیا تھا۔ وہ ذرا مجھے بھی تو دکھائیں۔‘‘ ویسلے نے اس کے ہاتھ میں پکڑے لفافے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں دیکھ کر... ابھی بتا دوں گا کس نے بنائے اور کس نے بنوائے تھے؟‘‘ اس کی بات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جس کارٹونز کی بات ہو رہی ہے، وہ یقیناً اسی لفافے میں ہوں گے جو شیلبی کے ہاتھ میں تھا۔
اس کے پاس ویسلے کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے لفافہ کھولا اور ایک شیٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ ویسلے نے شیٹ لی اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔
’’پہچان گیا...‘‘ کچھ دیر کے بعد اس نے شیٹ پر سے سر اٹھایا اور شیلبی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’یہ مسٹر کیٹز کے جادوئی ہاتھوں کا بنایا ہوا ہے اور یہ۔‘‘ اس نے شیٹ پر بنے ایک کارٹون پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ’’یہ مسٹر آرتھر فورسٹل ہیں ہمارے ہونے والے نئے گورنر۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے داد طلب نظروں سے شیلبی کو دیکھا۔
’’شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔‘‘ شیلبی نے دھیرے سے جواب دیا۔
’’خیر چھوڑیں ان باتوں کو... مجھے یہ سمجھ نہیں آرہا کہ آخر آپ یہاں کس لیے آئی ہیں؟ کیا آرتھر فورسٹل کے ساتھ کچھ کرنے کا ارادہ ہے؟‘‘ اس نے رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔
’’میں صرف یہ جاننے کے لیے یہاں پہنچی ہوں کہ کیٹز سے کس کلائنٹ نے یہ کارٹونز بنوائے تھے؟‘‘ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ’’مجھے کلائنٹ کا نام معلوم کرنا ہے، اب صرف یہ بتاؤ کہ میری مدد کرو گے یا نہیں؟‘‘ اس نے ویسلے کو خالص پولیس والوں کے انداز میں گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

شیلبی کا دھمکی آمیز لہجہ کام کر گیا۔ اس کی مسکراہٹ فوراً کافور ہوگئی۔ ’’ایک منٹ۔‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور برابر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کمرے کا بلب بھی روشن ہوگیا۔ پردہ پڑے شیشے کی کھڑکی سے اندر کی روشنی جھلک رہی تھی۔
شیلبی خوش تھی کہ کوئی سراغ تو ملا مگر اس کے باوجود وہ شش و پنج میں مبتلا تھی کہ ویسلے اسے کلائنٹ کا نام بتائے گا بھی یا نہیں۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اٹھ کر اندر کیوں گیا ہے؟ وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اس کے باہر آنے کی منتظر تھی۔
’’معذرت چاہتا ہوں۔‘‘ تقریباً چار پانچ منٹ بعد ویسلے باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں انڈیکس ڈائری تھی۔ ’’میں کلائنٹ کا نام بتا دیتا ہوں لیکن پہلے تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ کون ہو اور یہ سب کچھ کس لیے کر رہی ہو؟‘‘ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
’’میں کیلی فورنیا پولیس ڈپارٹمنٹ سے ہوں اور مسٹر آرتھر فورسٹل کی سیکیورٹی کی ذمے داری میری ہے۔‘‘ شیلبی نے کہا۔ ’’انہیں تواتر سے کچھ پُراسرار کارٹونز ڈاک سے بھیجے گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے لیے دھمکی آمیز ہیں، میرا مطلب ہے کہ ان کے ذریعے کیلی فورنیا کے نئے گورنر کو قتل کی دھمکی دی گئی ہے۔‘‘ یہ کہہ کر لمحہ بھر کے لیے شیلبی خاموش ہوئی اور ویسلے کو غور سے دیکھنے لگی۔ ’’اب ہمیں یہ پتا چلانا ہے کہ یہ کارٹون کس نے بنوائے، کیوں بھیجے اور وہ ان کے ذریعے گورنر کو کیا پیغام دینا چاہتا ہے؟‘‘
’’اوہو...‘‘ ویسلے نے حیرت سے جواب دیا۔ شیلبی کے بولنے کے دوران اس کے چہرے کے تاثرات بار بار تبدیل ہو رہے تھے۔ ’’دیکھنے میں تم پولیس افسر سے زیادہ فیشن ماڈل لگتی ہو مگر...‘‘
’’ٹھیک کہا تم نے۔‘‘ شیلبی قطع کلامی کرتے ہوئے اپنی سیاہ چمڑے سے بنی جیکٹ کی زپ کھولنے لگی۔ ’’بیس سال کی عمر میں، میں نے ٹی وی اور رسالوں کے لیے ماڈلنگ کی تھی مگر اب...‘‘ اس نے دونوں ہاتھوں سے جیکٹ کا سامنے والا حصہ کھولا۔ اس کی بغل سے سیمی آٹومیٹک پستول لٹک رہا تھا۔ ’’سمجھ گئے مسٹر ویسلے!‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے جیکٹ کی زپ بند کی۔ ’’اب میں ایک سینئر پولیس افسر ہوں۔‘‘
پستول دیکھ کر تو ویسلے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور اس پر شیلبی کا بارعب لہجہ... وہ تو جواب دینا ہی بھول گیا۔
’’کیا سوچ رہے ہو؟‘‘ اسے خاموش دیکھ کر شیلبی نے

کہا۔ ”میرا سوال سن چکے ہو... اب مجھے جواب چاہیے۔“ اس کی آواز بدستور رعب دار تھی۔ اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے جس سوال کا جواب درکار تھا، وہ ویسلے کے پاس تھا۔

”میں صرف ایک بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ کارٹونز کیٹز کے ہاتھ سے بنے ہوئے ہیں مگر اس کا ریکارڈ ڈائری میں موجود نہیں۔“ ویسلے نے کہنا شروع کیا۔ ”ممکن ہے کہ یہ فوری آرڈر پر بنائے گئے ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ اندراج کرنا بھول گئے ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ڈائری اس کے سامنے کردی۔

شیلبی نے جلدی سے ڈائری لی اور تیزی سے پڑھنے لگی۔ تین چار منٹ بعد اس نے وہ ڈائری واپس ویسلے کی طرف بڑھائی۔ ڈائری میں شیلبی کے کام کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس میں کلاسیکی مصوروں کے فن پاروں کی نقول کا ذکر تھا اور یہ لکھا ہوا تھا کہ کس مصور کی، کس پینٹنگ کی نقل کس گیلری کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بھی ایسی تحریر نہیں تھی جس سے پتا چلے کہ کیٹز نے کچھ کارٹون کسی شخص کے لیے بنائے ہوں۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کیٹز سے ملاقات کرکے یہ بات اس سے معلوم کی جائے۔

”تو یہ کارٹون کیٹز کے ہی بنائے ہوئے ہیں؟“ اس نے کافی دیر سوچنے کے بعد ویسلے سے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔

”سو فیصدی۔“ اس نے فوراً کہا۔ ”میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ ان کے ہی بنائے ہوئے ہیں۔“

”کیٹز کہاں ملے گا؟“ شیلبی نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”خدا ہی بہتر جانے۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ چھٹیوں پر ہیں۔“ ویسلے نے کہنا شروع کیا۔ ”یہ ان کی عادت ہے جب چھٹیوں پر ہوں تو پوری دنیا سے قطع تعلق کرلیتے ہیں۔“

”کوئی ذریعہ جس سے اس تک پہنچا جاسکے؟“ شیلبی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر ویسلے سوچ میں ڈوب گیا اور پھر کہنے لگا۔ ”ایک ہی ذریعہ ہے اس تک پہنچنے کا... لیزا۔“

”کیا؟“ شیلبی نے چونکتے ہوئے کہا۔

”ہاں...“ ویسلے نے سر ہلا کر کہا۔ ”مسٹر کیٹز جہاں بھی ہوں، وہ لیزا سے بدستور رابطے میں رہتے ہیں۔“

”یہ ہے کون؟“ شیلبی نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”مسٹر کیٹز کی اکلوتی بیٹی۔“ ویسلے نے کہنا شروع کیا۔ ”وہ بھی کارٹونسٹ ہے اور اکثر اس کی بنائی ہوئی چیزیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کیٹز اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ پوری دنیا میں وہی ایک ہے جس سے وہ جہاں بھی ہوں، مسلسل رابطے میں رہتے ہیں۔“

”لیزا کہاں ملے گی؟“ اس سے پہلے کہ وہ باپ بیٹی کے پیار کے بارے میں اور کچھ کہتا، شیلبی نے قطع کلامی کی۔ اس کے ذہن میں بار بار آرتھر کا جملہ گونج رہا تھا۔

”وہ بہت سر پھری لڑکی ہے، اپنے باپ سے بھی زیادہ۔“ یہ سنتے ہی ویسلے نے کہا۔ ”پانچ منٹ رکو، میں ساتھ چلتا ہوں۔ ویسے بھی وہ الجبرا کے کسی سوال سے بھی زیادہ ٹیڑھی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ تمہیں تنہا دیکھ کر وہ ملے گی یا کم از کم سیدھے منہ بات بھی کرے گی۔ وہ تو ویسے ہی اجنبیوں سے ملنے سے کتراتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، تو تم مجھے لے کر چلو اس کے پاس۔“ شیلبی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”بس ایک منٹ رکو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ڈائری اٹھائی اور واپس برابر والے کمرے میں گھس گیا۔ بتی بجھائی اور جلدی سے باہر آیا۔ ”چلو۔“

شیلبی کچھ کہے بنا آگے بڑھ گئی۔ ویسلے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

جب وہ گیلری سے نکلے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ”تم میری گاڑی کے پیچھے پیچھے آؤ۔“ ویسلے نے اپنی شاندار بی ایم ڈبلیو کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔“ یہ کہتے ہوئے شیلبی اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ اندر بیٹھتے ہی شیلبی نے اپنا پولیس شناختی کارڈ ڈیش بورڈ سے اٹھا کر جیکٹ کی جیب میں رکھا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ جیسی ہی ویسلے کی بی ایم ڈبلیو آگے بڑھی، وہ مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ پہاڑی علاقے کے دامن میں بنے مہنگے رہائشی علاقے میں داخل ہورہے تھے، چند منٹ کے بعد ویسلے نے گاڑی ایک گیٹ پر روکی۔ سرخ چھوٹی اینٹوں سے بنی چار دیواری سے شیلبی کو اندازہ ہوا کہ گھر کے مکین خاصے خوش حال ہوں گے۔ ویسلے کی کار رکتے ہی اس نے بھی گاڑی روکی۔ ویسلے کار سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ شیلبی بھی جلدی سے اتری اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

گیٹ کے سامنے پہنچ کر وہ رکا اور پھر شیلبی کو دیکھتے ہوئے ڈور بیل بجائی۔ شیلبی نے دیکھا کہ ڈور بیل کے نیچے انٹرکام بھی دیوار میں نصب تھا۔

”کون ہے؟“ کچھ دیر کے بعد ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

”گڈ ایوننگ مسز بروم فیلڈ...“ اس نے انگلی سے انٹرکام بٹن دبا کر کہا۔ ”میں ویسلے کاڈ ہوں۔ بے وقت زحمت دینے کی معذرت چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ شیلبی ونٹر آئی ہیں۔ یہ کیلی فورنیا پولیس ڈپارٹمنٹ کی سینئر پولیس افسر ہیں اور لیزا سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”اوہ میرے خدا... لیزا تو ٹھیک ہے نا۔“ ویسلے کی بات سنتے ہی خاتون کا لہجہ بدل گیا۔ اس کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔ ”کیا کچھ ہوگیا ہے اس کو؟“ اس بار اس نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اس کے لیے پریشان ہوں۔ اس کا تو کئی روز سے کچھ اتا پتا نہیں۔“

”کیا... لیزا لاپتا ہے؟“ شیلبی نے بھی چلاتے ہوئے کہا۔

”اوکے مسز بروم فیلڈ۔“ یہ کہہ کر اس نے انٹرکام سے انگلی ہٹائی اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

”وہ ہے ہی ایسی مصیبت لڑکی۔“ ویسلے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ روز پہلے ہی وہ دو ہفتے اصلاحی جیل میں گزار کر واپس آئی تھی اور اب پھر لاپتا...“

”اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟“ شیلبی نے کار کے قریب پہنچ کر رکتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔“ ویسلے نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ”کام کرنے پر آئے تو نہایت بہترین کام کرتی ہے۔ بڑی صفائی ہے اس کے ہاتھوں میں مگر جب اپنے آپ پر آئے تو ہر چیز کو لات مار کر چل دیتی ہے کہیں بھی منہ اٹھا کر۔ مسز بروم نے جب مسٹر کیٹز سے طلاق لی تو اسے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ تب وہ بچی تھی مگر دوری کے باوجود باپ سے اس کی محبت کم نہیں ہوئی لیکن کبھی کبھی تو وہ انہیں بھی نظرانداز کرکے نکل جاتی ہے۔“

”چلو... کہیں چل کر ڈنر کرتے ہیں۔“ شیلبی نے کچھ سوچنے کے بعد اسے پیشکش کی تو وہ فوراً ہی مان گیا۔ شیلبی سوچ رہی تھی کہ اب جبکہ لیزا ابھی غائب ہے اور کیٹز کا بھی کوئی اتا پتا نہیں، ایسے میں ویسلے کو اپنا بنا لینا زیادہ کارآمد ہوگا۔ کم از کم الجھی ہوئی ڈوروں میں سے کسی ایک کا سرا تو اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہی سوچ کر اس نے ویسلے کو ڈنر کی دعوت دی کہ اس طرح اسے اپنا ہمدرد بنا لینے میں مدد مل سکتی ہے۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ دونوں دریا کنارے بنے پیزا ہٹ میں بیٹھے اپنی... بھوک مٹا رہے تھے۔

”تم لیزا کے کسی بوائے فرینڈ کو جانتے ہو؟“ شیلبی نے سوفٹ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ”یہ جاننے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔“ یہ کہہ کر اس نے ڈرنک کا گھونٹ بھرا۔ ”ویسے لیزا دوستانہ لڑکی نہیں، اس کے دوست بہت ہی کم ہوں گے۔ لڑکا ہو یا لڑکی، وہ کسی کو بہت جلدی اپنا دوست نہیں بناتی ہے۔“

”تمہارے خیال میں اگر وہ کسی کے جذباتی حد تک قریب ہو تو کیا اس بارے میں تمہیں بتائے گی؟“ شیلبی نے استفساریہ لہجے میں کہا۔

”شاید... اس کے باپ کے بعد میں ہی ہوں جو اس کی ہر بات اور اس کے بارے میں ہر قسم کی شکایتوں کو بڑے سکون سے سنتا اور برداشت کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر وہ مجھے نہیں تو کم از کم فل کو ضرور بتائے گی۔“

”فل...!“ شیلبی نے حیرت سے پلکیں جھپکتے ہوئے دہرایا۔

”فل روسلو۔“ ویسلے نے پورا نام لیا اور پھر گھونٹ بھرا۔ ”کچھ عرصے وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ اسی بنا پر میں نے کہا کہ یہ میرا خیال ہے۔ ضروری نہیں کہ لیزا ایسا کرے۔ ویسے بھی وہ بہت مشکل پسند ہے۔“ ایک بار پھر اس کی بھرپور توجہ کھانے پر مرکوز تھی۔

”یہ فل روسلو ہے کون؟“ شیلبی نے تجسس بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”کامکس اسٹرپ کی دنیا سے آیا تھا مگر وہ پینٹنگ کی نقول تیار کرنے کا ماہر ہے۔ کیٹز کی وجہ سے اسے کئی بڑے مصوروں کی پینٹنگز کی نقول تیار کرنے کا موقع ملا۔ بڑا صاف ہاتھ ہے اس کا مگر کامکس اسٹرپ میں اس نے کوئی خاص کام نہیں کیا تھا پہلے۔“

”کیٹز کے پاس وہ کیسے...؟“

”پنٹر تھا مسٹر کیٹز کا۔“ ویسلے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”تھا...؟“ شیلبی نے استفساریہ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں... تقریباً سات آٹھ مہینے پہلے اس کی مسٹر کیٹز سے لڑائی ہوگئی اور پھر وہ نہ تو کبھی گیلری میں آیا اور نہ ہی میں

نے اسے دیکھا۔"

"ان کے بیچ میں کس بات پر کھٹ پٹ ہوئی تھی؟"

"پتا نہیں، البتہ کافی سخت تلخ کلامی ہوئی تھی دونوں میں۔"

"تو جب یہ سب کچھ ہوا تو لیزا کہاں تھی؟" شیلبی نے سوال کیا۔

"ان دنوں وہ پولیس کے اصلاحی مرکز میں تھی۔" ویسلے نے بتایا۔ "جب وہ باہر آئی تو اسے پتا چلا اور پھر کچھ روز بعد وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ آئی۔ اس کے پاس فل کا بنا ہوا کچھ کام تھا۔"

"تمہارے خیال میں فل کامکس اسٹرپ بنا سکتا ہے؟" ویسلے کی بات سن کر وہ چونک گئی۔

"جو مائیکل اینجلو اور لیونارڈو کے شہ پاروں کی نقل بنا سکتا ہے، اس کے لیے کارٹونز بنانا کیا مشکل چیز ہے۔" ویسلے نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"او کے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ "چلتے ہیں، مجھے کچھ اور کام نمٹانے ہیں۔" اس نے ویسلے کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ "دیکھو، تمہیں لیزا یا کیٹز کے بارے میں کچھ پتا چلے تو مجھے ضرور بتانا۔" اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

"ضرور بتاؤں گا۔" ویسلے نے کارڈ پر ایک نظر ڈال کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بائے۔" ویسلے کی طرف الوداعی ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

دو دن گزر گئے لیکن نہ تو کیٹز کا پتا چلا اور نہ ہی لیزا کی کوئی خبر ملی۔ وہ بدستور لاپتا تھی اور ویسلے نے یہ بات خود اسے فون کر کے بتائی تھی۔ البتہ اس نے یہ انکشاف کیا کہ فل کو مارکیٹ میں دیکھا گیا ہے۔ وہ ایک گیلری میں گیا تھا۔ وہ بھی کیٹز کی طرح دو نمبر پینٹنگز تیار کرتا تھا۔

آرتھر کی درخواست پر چیف جسٹس نے حلف برداری کی تقریب موخر کر دی تھی، تاہم اخبارات کو یہی بتایا گیا تھا کہ چیف جسٹس کی عدم دستیابی کے باعث تقریب ملتوی کی گئی ہے۔ عوام میں ہیجان پھیلنے سے روکنے کے لیے چیف جسٹس نے بظاہر بیمار بن کر کچھ دن کی چھٹی لے لی تھی۔ آرتھر نے انہیں یقین دلایا تھا کہ کچھ ایسے معاملات ہیں جو چند روز میں حل ہو جائیں گے۔

شیلبی دو دن گزرنے کے باوجود بدستور اندھیرے میں تھی۔ گورنر دن میں کئی بار فون کر کے اس سے پیش رفت معلوم کرتا تھا لیکن اس کے پاس بتانے کو کچھ نہیں تھا۔ تیسرے دن صبح سویرے فون کی گھنٹی بجی۔ شیلبی نے اسکرین پر نمبر دیکھا، آرتھر کا فون تھا۔ "ہیلو۔" اس نے فون اٹینڈ کیا۔

"آج کی ڈاک سے ایک اور ویسا ہی لفافہ ملا ہے۔" آرتھر نے اس طرح کہا جیسے یہ سب کچھ اُسی کا قصور ہے۔ یہ سنتے ہی شیلبی کے پاؤں تلے زمین سرک گئی۔

"میں پہنچتی ہوں۔" اس نے شرمندگی سے جواب دیا اور لائن کاٹ دی۔

اگلے ہی لمحے وہ نہایت تیزی سے نکل رہی تھی۔ وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے آرتھر کی طرف جارہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈور بیل بجاتی، دروازہ کھلا۔ سامنے آرتھر لفافہ لیے کھڑا تھا۔ اس نے خاموشی سے لفافہ اس کی طرف بڑھایا اور پلٹ گیا۔ شیلبی بھی پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اس کمرے میں پہنچ گئی، جسے آرتھر نے اپنا دفتر بنایا ہوا تھا۔

"سگریٹ پیو گی؟" اس نے پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"نہیں شکریہ۔" اس نے آہستہ سے کہا اور لفافے میں سے شیٹ نکالنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ اس پر کیا بنا ہوگا۔

"پچھلے پندرہ سالوں کے کیریئر کے دوران کئی بار مخالفین نے مجھے قتل کی دھمکیاں دیں لیکن ان میں اور اُن میں فرق تھا۔" آرتھر نے انگلی سے شیٹ کی طرف اشارہ کیا جو اب شیلبی کے ہاتھ میں تھی۔ "انہوں نے سیدھے سادھے لفظوں میں دھمکی دی مگر یہ نفسیاتی کھیل کھیل رہا ہے۔ بڑا چالاک شخص لگتا ہے۔ مجھے اس کی دھمکی میں بڑی حد تک سچائی نظر آتی ہے مگر تم اب تک..." اس نے بات ادھوری چھوڑی اور سگریٹ سلگانے لگا۔ "موت، موت ہوتی ہے۔ اب مرنے کے بعد لاکھ وجہ تلاش کرتے رہو، کوئی فائدہ نہیں۔ مرنے والا تو مر چکا ہوتا ہے۔ اسے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" یہ کہہ کر اس نے غور سے شیلبی کی طرف دیکھا۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ آرتھر کیا کہنا چاہتا ہے مگر اس کی بھی غلطی نہیں تھی۔ اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں یہ عجیب و غریب کیس تھا۔ گورنر کے مطابق ان کارٹونز میں دھمکی تھی مگر ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا تھا جس سے بھیجنے والے کا مقصد ظاہر ہوتا کہ وہ گورنر کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اب تک اندھیرے میں تھی اور آرتھر ناکامی کا ذمے دار اسے سمجھ رہا تھا۔

"جانتی ہو تمہاری کوتاہی کا نتیجہ کیا نکلے گا؟" آرتھر نے خاموشی توڑی۔ شیلبی نے شیٹ پر جھکا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے سے شرمندگی جھلک رہی تھی۔ "جتنی دیر ہوگی، اتنا ہی ایک قابل گورنر موت کے قریب پہنچتا جائے گا۔ گورنر جو حلف اٹھانے سے پہلے ہی مارا جا سکتا ہے۔" آرتھر کا لہجہ برف کی طرح سرد تھا۔

شیلبی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ جو کہہ سکتی تھی، کئی بار کہہ چکی تھی۔ اس نے خاموشی سے نظر جھکائی اور شیٹ کو دیکھنے لگی۔

اس شیٹ پر پچھلی تین شیٹوں کی طرح چار مستطیل خانے تھے اور دو کارٹونز بنے ہوئے تھے۔ کارٹون بھی دیکھنے میں ویسے ہی تھے۔ البتہ غور سے دیکھنے پر اس میں اور پچھلے کارٹونز میں کچھ فرق نظر آرہا تھا۔ سب سے پہلا خاکہ پچھلے جیسا ہی تھا، تاہم دوسرے خاکے میں موجود عورت کے اوپر غبارے کی شکل میں بنے بیضوی دائرے میں اس کا ڈائیلاگ لکھا تھا: "مجھے یقین نہیں کہ اب تم بہت دیر تک اپنا اصل چہرہ لوگوں سے چھپا سکو گے۔" اسی خاکے میں مرد کے اوپر بنے بیضوی دائرے میں اُس کا جواب بھی تحریر تھا: "مجھے ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔" دوسرا اور تیسرا دائرہ پچھلی تین شیٹوں کی طرح خالی تھا۔

"مسٹر گورنر..." کافی دیر بعد شیلبی نے سر اٹھایا اور اسے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "لگتا ہے تمہاری کسی خاتون دوست کو تم سے کوئی مسئلہ ہے۔"

"تھی ایک سابقہ خاتون دوست۔ مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ..." اس نے بات ادھوری چھوڑی اور پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ "آخری بار جب اس سے ملا تو اس نے بد دعا دی تھی موت کی۔" آرتھر کا جملہ بے ترتیب اور چہرے سے تفکرات عیاں تھے۔

"مجھے اس کا نام، پتا دیجیے۔" شیلبی نے فوراً کہا۔ "میں چیک کرنا چاہتی ہوں کہ کہیں اس کھیل کے پیچھے وہی تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں اسے بتاؤں گی کہ قانون کس طرح مجرم کے ساتھ پیش آتا ہے۔" اس بار شیلبی کا لہجہ تلخ تھا۔

"میرا خیال ہے تمہیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" آرتھر نے جواب دیا۔ "اگر اس کے پیچھے وہی ہے..." یہ کہہ کر اس نے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔ "تو اس سے پہلے کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرے، اسے قانون کی گرفت میں ہونا چاہیے۔" اس کے لہجے سے غصہ عیاں تھا۔

"مگر سر! آپ نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟" شیلبی نے سوال کیا۔

"وہ میری زندگی سے کب کی نکل چکی ہے۔" آرتھر نے بتانا شروع کیا۔ "میں اس سے بہت دور آچکا ہوں۔ اب جبکہ تم نے کہا کہ یہ کسی عورت کا معاملہ لگتا ہے تو میرا ذہن اس کی طرف چلا گیا ورنہ پہلے تو یہ بات میرے دماغ میں نہیں آئی تھی۔ ہمارے درمیان قطع تعلق کو بھی ڈیڑھ دو سال ہونے کو آرہے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے رائٹنگ پیڈ اپنی طرف کھسکایا اور کچھ لکھنے لگا۔

"یہ لو۔" رائٹنگ پیڈ سے صفحہ علیحدہ کر کے اس نے شیلبی کی طرف بڑھایا۔ "یہ اس کا نام اور پتا ہے۔ اسے کہنا کہ ہمارے راستے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ آئندہ سے وہ میری زندگی میں مداخلت کی کوشش ہرگز نہ کرے۔ ہمارے درمیان جو ہوا، اب وہ ماضی ہے۔ میں اسے بھول چکا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ سخت غصے میں لگ رہا تھا۔

شیلبی نے کاغذ پر نظر ڈالی۔ "پیگی بلونڈیل۔" اس نے زیرِ لب نام دہرایا۔

آرتھر غور سے اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس نے گہرا کش لیا اور پھر کہنا شروع کیا۔ "کیا بات ہے، تم حیران نظر آرہی ہو؟ کیا ایسا کچھ ہے جو میں نہیں جانتا یا پھر ایسا کچھ ہے جو تم نے مجھ سے چھپایا ہے؟" یہ کہہ کر اس نے غصے سے میز پر مکا مارا۔ "بتاؤ، تم جانتی ہو نا پیگی کو؟" اس نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم اسے پہلے ہی تلاش کر چکی ہو۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم اسے جانتی ہو۔ تم نے اسے کیسے تلاش کیا؟ تم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی شیلبی؟" وہ اسے گھور رہا تھا۔ "میں حکم دیتا ہوں کہ میرے سوالوں کا جواب دو۔" وہ شدید غصے میں تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔

"جیسا آپ کہہ رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "اس سے پہلے میں نے اس عورت کا نام تک نہیں سنا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی اور پھر کہنے لگی۔ "میں نے ابھی ابھی آپ کے منہ سے پیگی کا نام سنا ورنہ تو میں اب تک سب سے بڑی مشتبہ لیزا کیٹز کو سمجھ رہی تھی۔ میں تو اسی کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔"

"یہ لیزا کیٹز کون ہے؟"

"سر! یہ ایک لڑکی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ڈینی سے لے کر مسز بروم فیلڈ سے ہونے والی ملاقات تک سارا قصہ بیان کر دیا۔

"تم نے بہت سے سراغ جمع کیے ہیں مگر تمہارے

مطابق...'' اس کی بات سننے کے بعد آرتھر نے زبان کھولی۔ ''مگر بدقسمتی سے ان میں سے کسی بھی شخص کا تعلق ان دھمکیوں سے نہیں ہوسکتا۔'' اس نے ایک ہی جملے میں اس کے سارے کیے کرائے کو مسترد کردیا۔ ''برائے مہربانی یہ لیزا اور باقی سب دوسروں کو دفع کرو، صرف پیگی پر توجہ مرکوز کرو۔ یہی اصل مصیبت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے قتل کی سنگین دھمکی ملی ہے۔ جاؤ اور ملزم کو پکڑو۔'' اس نے درشت لہجے میں حکم دیا۔

شیلبی سمجھ گئی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ چکا۔ اب مزید ٹھہرنا مناسب نہیں۔ ''ٹھیک ہے سر!'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ کی ہدایات کے مطابق ملزم تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

☆☆☆

پیگی کا پتا چلانے میں شیلبی کا پورا دن صرف ہوگیا اور جب اس کا کردار سامنے آیا تو وہ حیران رہ گئی کہ آرتھر کے کس قماش کی عورت کے ساتھ تعلقات تھے۔ وہ میلن کلب میں بطور رقاصہ کام کرتی تھی۔ اسٹوڈیو سٹی کے بدنام زمانہ علاقے میں واقع وہ کلب بھی اپنی بدنامی کے سبب عیش پسند مردوں میں بہت مشہور تھا۔

شیلبی نے ٹکٹ خریدا۔ اس وقت کلب کی رونق عروج پر تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک طرف بڑھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ دروازہ اسے ڈریسنگ روم میں پہنچا دے گا۔ جب چھوٹی سی راہداری سے گزر کر وہ ایک دروازے پر پہنچی تو اس پر ٹیگ چسپاں تھا: ''ڈریسنگ روم۔''

وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس وقت کمرے میں تین رقاصائیں تھیں۔ شیلبی نے اس کی تصویر حاصل کرلی تھی۔ وہ دیکھتے ہی پیگی کو پہچان گئی۔ وہ اپنی ساتھیوں سے باتیں کررہی تھی۔ پہلی نظر میں وہ اس کی عمر کا اندازہ نہیں لگا سکی۔ اس کے چہرے پر گہرے میک کی تہ چڑھی ہوئی تھی اور وہ نہایت بھڑکیلے لباس میں ملبوس تھی۔ جب وہ اندر داخل ہوئی تو وہ سرخ بالوں کی وگ لگا رہی تھی۔ شیلبی کا خیال تھا کہ وہ چالیس سے اوپر کی ہوگی مگر میک اَپ سے خود کو بیس سال سے بھی کم عمر ظاہر کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

''مس پیگی بلونڈیل...؟'' اس نے آہستہ سے پکارا۔

یہ سنتے ہی پیگی نے گردن موڑی اور سوالیہ نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ ''مجھے مس پیگی سے آرتھر فورسل کے بارے میں کچھ بات کرنی ہے۔''

''میں ہوں پیگی بلونڈیل...!'' یہ سنتے ہی وہ اٹھی اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے استفساریہ لہجے میں پوچھا۔

شیلبی نے بنا تمہید کے سیدھی سادی بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ''مسٹر آرتھر کو تواتر سے کچھ کارٹونز ڈاک سے بھیجے گئے ہیں۔ اُن کے مطابق یہ قتل کی دھمکی ہے اور...'' یہ کہہ کر وہ رکی اور غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''مسٹر آرتھر کا خیال ہے کہ ان دھمکی آمیز کارٹونز کو بھجوانے کے پیچھے تم ہو۔'' اس نے پیگی کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بات مکمل کی۔

''وہ...'' پیگی مسکرائی۔ ''یقیناً... تو وہ پریشان ہے؟ خوشی ہوئی یہ بات سن کر... شکریہ۔''

''تو تم اعتراف کررہی ہو؟'' شیلبی نے اسے گھورا۔

''ایک منٹ!'' یہ کہہ کر اس نے شیلبی کا بازو پکڑا اور کونے میں لے گئی۔ ''یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے۔'' پیگی نے کہنا شروع کیا۔ ''میرے اور اس کے تعلقات بہت خاص تھے۔ ہم نے کئی بار ویگاس کے فینسی ہوٹل میں بہت سارے دن اور راتیں اکٹھی گزاری ہیں۔ اس کے پاس وڈیو کیمرا ہوتا تھا جس سے وہ خاص لمحات کی فلم بناتا تھا۔ میں بھی یہ سب کچھ ہنسی خوشی کرتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ صرف میرا ہے لیکن وہ گھٹیا شخص...'' اس نے غصے سے کہا اور لمحہ بھر کے لیے منہ دوسری طرف کرلیا۔ ''اس نے مجھے استعمال کیا، مجھ سے کھیلا اور پھر استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا۔'' وہ جذباتی لگ رہی تھی۔ یہ کہہ کر اس نے گردن موڑی تو شیلبی کو اس کے گالوں پر آنسو نظر آئے۔ اس کی آنکھوں کا کاجل بھی پھیل رہا تھا۔

''میرے پاس وہ فلمیں ہیں۔ میں کارٹونز کے ذریعے اسے دھمکی کیوں دوں گی؟ اسے دینے کے لیے تو دھماکا خیز مواد ہے میرے پاس۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی اور پھر شیلبی کی نگاہوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگی۔ ''کچھ عرصے پہلے مجھے دھتکارتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ وہ گورنر بننے جارہا ہے۔ وہ ماضی کا گند اپنے سر پر رکھ کر نئی زندگی میں داخل نہیں ہونا چاہتا۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹشو پیپر سے آنکھوں کے کنارے صاف کیے اور زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ''کمینہ۔''

''تم چاہتی کیا ہو اس سے؟'' شیلبی نے سوال کیا۔

''میرے پاس ان ساری خاص فلموں کی کاپیاں ہیں جو اس نے ویگاس کے ہوٹلوں میں بنائی تھیں۔''

''تو پھر...'' شیلبی نے قطع کلامی کی۔

''میں وہ ساری فلمیں یوٹیوب پر ڈال دوں گی یا پھر انٹرنیٹ پر بیچ دوں گی۔ ابھی تو وہ پریشان ہورہا ہے۔ گورنر کا حلف اٹھانے کے بعد میں اس کے ساتھ وہ حشر کروں گی کہ اس کا سارا کیریئر ختم ہوجائے گا۔'' پیگی نفرت آمیز لہجے میں بے تکان بولے جارہی تھی۔

''جج آرتھر سے تمہارے تعلقات کس طرح ختم ہوئے؟'' شیلبی نے سوال کیا۔ پوری دنیا جانتی تھی کہ گورنر کا الیکشن لڑنے سے سال سوا سال پہلے اس نے جج کی ملازمت سے استعفادے دیا تھا۔

''وہ کسی اور لڑکی کے چکر میں پڑ گیا تھا۔''

''کون تھی وہ؟'' شیلبی نے پوچھا۔

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔'' اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''شاید کسی آرٹ گیلری کے مالک کی بیٹی یا نواسی تھی۔''

''تم نے دیکھا تھا اسے؟''

''میں نے ان دونوں کو رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا تھا۔''

''وہ اس سے کیسے ملا تھا، کچھ جانتی ہو اس بارے میں؟''

''کیوں نہیں۔'' پیگی نے کہا۔ ''میں نے آرتھر کو سالگرہ کا تحفہ دینے کے لیے ایک آئل پینٹنگ بنوائی تھی۔ جب میں وہ لینے گئی تو وہاں وہ لڑکی بھی تھی۔ میں کافی پی رہی تھی، جب آرتھر نے اس لڑکی سے کہا کہ وہ گیلری گھومنا چاہتا ہے۔ یہ سن کر وہ لڑکی اسے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے چند روز بعد ہی میں نے آرتھر کو اس کے ساتھ پکڑا تھا۔ جب میں نے اسے سرزنش کی تو اس نے مجھے ایسی ایسی سنائی کہ بس!'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی اور پھر کہنے لگی۔ ''اس کے بعد ہمارے راستے جدا ہوگئے۔''

''تمہیں اس لڑکی کا نام یاد ہے؟'' شیلبی نے سوال کیا۔

''نہیں...''

''اس کا نام لیزا کیٹز تو نہیں تھا... کاپی کیٹز گیلری، رابرٹسن...'' شیلبی نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''مجھے اتنا تو یاد نہیں۔''

''وہ گیلری آئیوی ریسٹوران کے قریب تھی جہاں پر وہ دونوں تمہارے سامنے ملے تھے؟'' شیلبی نے پوچھا۔

''مجھے آرٹ سے دلچسپی ضرور ہے پر اتنی زیادہ نہیں اس لیے گیلریوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔''

پیگی سے ملنے کے بعد شیلبی باہر نکلی۔ آرتھر نے اسے پکڑنے اور مقدمہ درج کرنے کی واضح ہدایت کی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔ اس کی نظر میں پیگی من موجی عورت تھی۔ وہ بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتی تھی مگر آرتھر کا سیاسی کیریئر ختم کرکے۔ اس کام کے لیے اس کے پاس ٹھوس وجہ اور شواہد موجود تھے۔ ویسے بھی ابھی پیگی نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا جسے جواز یا ثبوت بنا کر اسے گرفتار کیا جاسکتا۔

پیگی سے مل کر ایک بات صاف ہوگئی تھی کہ وہ لیزا کیٹز اور کاپی کیٹز گیلری کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا مگر اسے یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس نے لیزا کے ذکر پر ایسا تاثر کیوں دیا جیسے وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا؟ یہ بات بھی اس کے لیے مشکوک تھی کہ اس نے سب کو چھوڑ کر صرف پیگی کے پیچھے پڑنے کا حکم کیوں دیا؟ سب سے مشکوک بات تو یہ تھی کہ وہ آرٹ کا واجبی سا شوق رکھتا تھا۔ اس نے کامکس اسٹرپ کی پہلی شیٹ دیکھتے ہی یہ کیسے باور کرلیا کہ اسے قتل کی سنگین دھمکی دی گئی ہے؟ حالانکہ جب شیلبی نے پہلی بار اس کی اسٹڈی میں وہ کارٹونز دیکھے تو اسے ایسا نہیں لگا تھا۔ پیگی سے ملنے کے بعد وہ سوچ رہی تھی کہ بات اتنی سادہ نہیں ہے جتنی وہ سمجھ رہی تھی۔

وہ دفتر پہنچی اور اب تک کی تفتیش کی روشنی میں کیس کی گتھی سلجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ بات صرف ایک ملزم تک محدود نہیں رہے گی۔

☆☆☆

ویسلے کاڈ نے جب کاپی کیٹز گیلری کا دروازہ کھولا تو اپنے سامنے شیلبی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ پھر وہاں آئے گی۔ ''آیئے، اندر آیئے۔'' اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر راستہ دیتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ شیلبی کو غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہے۔

''تم یہاں بیٹھو، میں ایک کسٹمر کے ڈریس پر کام کررہا ہوں۔ دس منٹ میں آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اسے لے کر لاؤنج میں پہنچا جہاں دو روز پیشتر ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے اکٹھے کافی پی تھی۔

''ٹھیک ہے، تم کام نمٹا لو۔'' شیلبی نے کرسی پر بیٹھ کر سامنے میز پر سے ایک رسالہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد اس نے سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت کو باہر نکلتے دیکھا۔ اس کے کچھ دیر بعد ویسلے بھی آگیا۔ ''یہ بوڑھی عورت میرے لیے پانچ سو ڈالر کا چیک ہے۔ کل مجھے اس کی پینٹنگ مکمل کرکے دینی ہے اور چیک لینا ہے۔'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے خوشی سے بتایا۔ ''ویسے

تمہیں یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی ہے۔" اس نے مسکرا کر اپنے دل کی بات آخر کہہ ہی ڈالی ..اور اس کے قریب ہونے کی کوشش کی۔

"آرام سے ٹائیگر..." اس کا لہجہ پیار بھرا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب تک اس کا کام نہیں نکل جاتا، تب تک اسے ناراض کرنا ٹھیک نہیں۔

"میں تو سمجھا تھا کہ تم مجھ سے اقرار..." اس نے ہچکچاتے ہوئے ادھوری بات کی۔ لگتا تھا کہ وہ شیلبی کی ڈنر کی دعوت کو دوسرا رنگ دے بیٹھا تھا۔

"وہ سب باتیں بعد میں کریں گے، پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟" شیلبی نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ سنتے ہی چونک اٹھا۔

"تم نے آرتھر کے بارے میں مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔" شیلبی نے اعتماد سے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" وہ گڑبڑا گیا۔

"پیگی بلونڈیل..." شیلبی کا لہجہ استفساریہ تھا۔ "جانتے ہو اسے؟" اس نے ویسلے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"نام کچھ سنا سنا سا لگتا ہے۔"

"تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔" شیلبی نے سرد لہجے میں کہا۔ "اسے بھی اور آرتھر فورسٹل کو بھی... مگر اس کے باوجود تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تمہارے ریکارڈ میں ایسا کوئی نام نہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ انڈیکس ڈائری میں یہ دونوں نام تھے مگر..." اس کے لہجے سے تاسف جھلک رہا تھا۔

"تم نے جو کہا، وہ سب کچھ درست ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ میرا کوئی قصور نہیں۔" اس نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ "لیزا میرے ساتھ کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے ہی پیگی بلونڈیل کا آرڈر لیا اور پھر اپنے بوائے فرینڈ کو وہ کام دیا۔ گیلری میں ہی آرتھر اس سے ملا اور پھر ان کے تعلقات بڑھتے گئے۔ اسی دوران میں لیزا نے کوئی غیر قانونی حرکت کی اور جیل کی نوبت آ گئی مگر آرتھر نے اس کی مدد کی اور صرف چند روز کاؤنٹی جیل میں گزارنے کے بعد اسے رہائی مل گئی۔ اس کے بعد ان کے تعلقات بہت زیادہ قریبی ہو گئے۔ اسی دوران میں نہ جانے کس طرح وہ دوبارہ پولیس کے چکر میں پھنسی۔ آرتھر نے پھر اس کی مدد نہیں کی اور اسے کئی مہینوں کی جیل ہو گئی۔" یہ کہہ کر وہ رکا اور کہنے لگا۔ "پیگی اس کی گرل فرینڈ تھی۔ کہتے ہیں کہ اس نے دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ اس کے بعد لیزا نے بھی آرتھر کو کچھ دھمکیاں دی تھیں۔" یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کو رکا۔ "جن دنوں وہ جیل میں تھی، مسٹر کیٹز نے اسے بری کرانے کے لیے آرتھر سے ملاقات کی تھی مگر اس نے سیدھے منہ جواب نہیں دیا جس پر وہ دل برداشتہ تھا۔ لیزا مسٹر کیٹز کی جان ہے۔ وہ اسے جیل میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ انہی دنوں ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آرتھر چاہتا تو لیزا بری ہو سکتی تھی مگر..." یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ شیلبی کی طرف کر لیا۔ "لیزا معصوم سی اور غیر ذمے دار لڑکی ہے مگر یہ سچ ہے کہ اسے منشیات رکھنے کے جس جرم میں پولیس نے پکڑا تھا، وہ غلط تھا۔"

"غلط... مگر پولیس ایسا کیوں کرے گی؟" شیلبی نے ٹوکا۔

"اس لیے کہ یہ جال آرتھر کا بچھایا ہوا تھا۔" اس نے رازداری سے کہا۔ "لیزا اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور وہ اس پر زور دے رہا تھا کہ اسے ضائع کروا دے مگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جو کام لیزا آرتھر کے دباؤ پر نہ کر سکی، وہ پولیس نے اسے قید کے دوران جیل میں کھانے پینے کی چیزوں میں دوائیں ملا کر کر دیا۔ وہ آرتھر کے بچے کو جنم نہ دے سکی۔"

"اوہ... تو یہ بات تھی۔" شیلبی نے کہا۔ "مگر تم یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟" اس نے ویسلے کی طرف سوالیہ نظروں سے گھورا۔

"اس لیے کہ میں ان دونوں باپ بیٹی کے بہت قریب ہوں۔"

"پھر تو تم ان دھمکی آمیز کارٹونز کے متعلق بھی جانتے ہو گے؟"

"قطعاً نہیں۔" اس نے تڑپ کر کہا۔

"لیزا کا کیا حال ہے؟"

"معلوم نہیں، فی الحال وہ اور اس کا باپ، دونوں لاپتا ہیں۔"

"کیا وہ واقعی آرتھر سے پیار کرتی تھی؟"

"یہ تو علم نہیں مگر اسے اپنے بچے کے جنم نہ لینے کا اب تک افسوس ہے اور یہ بات کیٹز بھی جانتا ہے اور اس کا بوائے فرینڈ بھی۔" ویسلے نے جواب دیا۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ وہ خاصا سنجیدہ لگ رہا تھا۔ شیلبی بھی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" کافی دیر بعد شیلبی نے خاموشی توڑی۔

"کیا خیال ہے، کسی اچھی جگہ بیٹھ کر کافی نہ پی جائے؟"

ویسلے نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ایک ہفتہ گزر گیا مگر تفتیش میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ دوسری طرف آرتھر کا دباؤ تھا کہ پیگی کو گرفتار کیا جائے، وہی اس معاملے کی مرکزی کردار ہے مگر شیلبی جان بوجھ کر اس سے گریز کر رہی تھی۔

اُس دن پیر تھا اور صبح کے دس بجے ہی اسے آرتھر نے بلا لیا۔ وہ پہنچی تو پتا چلا کہ ایک اور لفافہ ملا ہے۔ اس میں موجود کامکس اسٹرپ کے پہلے دو خاکے تو وہی تھے البتہ اس بار اس میں کچھ اضافہ ہو چکا تھا۔ خاکے میں ایک مرد اور عورت نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے اندھیرے میں تھے اور وہ کسی کمرے کے اندر تھے۔ مرد سر جھکائے کھڑا تھا اور عورت ٹانگ سے بندھے ہولسٹر سے پستول نکال رہی تھی۔ تیسرا خاکہ خالی تھا۔

شیلبی بغور خاکوں کو دیکھ رہی تھی کہ آرتھر نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا جس پر کمپیوٹر سے ٹائپ شدہ تحریر تھی:

"تمہارا مستقبل میرے ہاتھوں میں ہے۔ اکیلے ملنے کے لیے پہنچو، اگر نہیں آئے تو کوئی بات نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی نیچے وقت اور پتا درج تھا۔ خط بھیجنے والے نے اسے منگل کی رات اسٹار ٹائمز ہوٹل کے سن سیٹ میٹنگ فلور پر ملنے کا کہا تھا۔ کمرے کا نمبر بھی درج تھا۔

شیلبی وہ تحریر پڑھ کر مسکرا دی۔

"یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم ہنس رہی ہو۔" اسے مسکراتا دیکھ کر وہ سیخ پا ہو گیا۔ "میرے خیال میں اس کاغذ پر لطیفہ نہیں لکھا ہے جو تم یوں مسکرا رہی ہو۔" وہ شدید ہیجان میں مبتلا تھا۔ "تم ابھی تک کچھ نہیں کر پائیں اور یوں مسکرا رہی ہو جیسے بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی ہو۔ بتا سکتی ہو تم نے اب تک کیا کیا ہے اس کیس کے سلسلے میں؟"

"میرے خیال میں کل رات آپ کو ملاقات کے لیے جانا چاہیے۔" شیلبی نے اس کے غصے کو نظر انداز کر کے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"اور یوں مجھے اپنی جان خطرے میں ڈال دینی چاہیے۔" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ "واہ مس شیلبی ونٹر! کیا مشورہ ہے تمہارا۔" یہ کہہ کر وہ ہذیانی انداز میں قہقہے لگانے لگا۔

"تو اگر آپ کے پاس اس سے بہتر آئیڈیا ہے تو اس پر عمل کریں۔" یہ کہہ کر اس نے کہنیاں میز پر ٹکائیں اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

☆☆☆

اسٹار ٹائمز چار منزلہ رہائشی ہوٹل تھا جس کے تیسرے فلور پر بیضوی شکل میں بنے سوئمنگ پول کے اطراف میٹنگ فلور پھیلا تھا۔ اطراف میں کمرے تھے۔ پُراسرار شخص نے آرتھر کو اسی فلور پر بلایا تھا۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ اسے رات آٹھ بجے یہاں پہنچنا تھا۔ شیلبی سرِ شام ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس کی ٹیم کے ارکان نے نہایت رازداری سے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ یہ فلور اتنا بڑا تھا کہ پولیس والوں کو پوزیشن سنبھالنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ فلور پر کئی روم بنے ہوئے تھے۔ نائٹ ڈیسک کلرک سے شیلبی نے پتا کر لیا تھا کہ جس کمرے میں آرتھر کو ملاقات کے لیے بلایا گیا ہے، وہ مسز سی شلز کے نام پر بک تھا۔ کمرا ایک رات کے لیے بک کرایا گیا تھا اور ادائیگی نقد ایڈوانس میں کر دی گئی تھی۔ یہ سن کر وہ چکرا گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پے منٹ اگر کریڈٹ کارڈ کے ذریعے کی گئی ہوتی تو ملاقات سے پہلے اس پُراسرار شخص کی گردن ناپ سکتی تھی مگر وہ بھی کوئی شاطر کھلاڑی تھا۔

پونے آٹھ بجے کے قریب آرتھر خود گاڑی چلاتا ہوا ہوٹل پہنچا۔ اس نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا تیسرے فلور پر پہنچ گیا۔ شیلبی کم از کم چھ فٹ کا فاصلہ بیچ میں رکھ کر، دوسروں کی نظروں میں آئے بغیر اس کی نگرانی کر رہی تھی۔ آرتھر دروازے پر پہنچا تو اندھیرے میں دیوار سے لگی شیلبی نے اسے انگوٹھا دکھا کر دروازے پر دستک دینے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی اس نے دستک دی، فوراً دروازہ کھلا۔ سامنے نیم عریاں لباس میں ملبوس پیگی بلونڈیل کھڑی تھی۔ اس نے سیدھا ہاتھ اس کی کمر میں ڈالا اور اسے اندر کھینچ لیا۔ اسی دوران میں شیلبی کی نظر سامنے پڑی۔ نیم اندھیرے میں ایک شخص پستول سے آرتھر کا نشانہ لے رہا تھا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"ہتھیار فرش پر پھینک دو۔" یہ دیکھتے ہی شیلبی چلّائی۔

"نہیں تو میں گولی چلا دوں گی۔" وہ پستول تانے ہوئے تھی۔

شیلبی کی دھمکی کام کر گئی۔ اس نے فوراً پستول نیچے پھینکا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ "آگے بڑھو۔" اس نے حکم دیا۔

یہ سنتے ہی وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔ شیلبی کو معلوم تھا کہ خفیہ پوزیشنوں پر موجود پولیس والے بھی اسے کور میں لیے ہوں گے۔

"تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے تھے؟" وہ قریب پہنچا تو شیلبی اسے پستول کی زد پر لیے پول کی طرف بڑھی اور دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"فل... فل رِدسلو۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

فل پچیس تیس سال کا مضبوط جسم کا انسان تھا۔ اگرچہ وہ پکڑے جانے کے وقت کچھ خوف زدہ تھا لیکن اس نے یہ اعتراف کرنے میں بالکل بھی تردد نہیں کیا کہ وہ آرتھر کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے فلور کے نیم تاریک کونے میں لیے کھڑی تھی۔ اس نے فل کو باور کروادیا تھا کہ وہ نشانے پر ہے، اس لیے بھاگنے کی غلطی نہ کرے۔ اب وہ اس سے تفتیش کررہی تھی۔

"مگر کیوں... تم آرتھر کو کیوں مارنا چاہتے تھے؟" شیلبی نے سوال کیا۔

"اس نے مجھ سے لیزا کو چھینا ہے۔" اس نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

"اور تم یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"پیگی کے ذریعے۔"

"تو تم بھی اس کے..." شیلبی نے معنی خیز انداز میں کہا اور بات ادھوری چھوڑ دی۔

"صرف میں ہی نہیں، مجھ سے پہلے بھی اس کی زندگی میں کئی اور تھے اور میرے بعد بھی کئی ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "ایک کو تو تم اندر جاتا دیکھ چکی ہو۔"

"تو پیگی جانتی تھی تم آرتھر کو یہاں پر مارنا چاہو گے۔"

"وہ سب کچھ جانتی ہے۔ میرے مشورے پر ہی پیگی نے یہاں آنا قبول کیا۔" اس نے جواب دیا۔ "پیگی تو پھانس رہی ہے اسے۔ اب وہ بھاری رقم چاہتی ہے اور وہ فلمیں..." یہ کہہ کر وہ پھر طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "تم یقیناً یہ بات بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔"

"ایک بات بتاؤ۔" شیلبی نے کچھ سوچنے کے بعد اس سے سوال کیا۔ "یہ کامکس اسٹرپ کا معاملہ کیا ہے؟"

فل یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ذہن میں جواب کو ترتیب دے رہا ہے۔ "یہ اسٹرپ میں نے تیار کی تھیں۔" اس نے سر اٹھا کر شیلبی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں ہی انہیں پوسٹ کرتا رہا ہوں۔"

"غلط... اس کے پیچھے کاپی کیٹرز ہے۔"

"نہیں۔" اس نے انکار کیا۔ "یہ صرف میرا اور پیگی کا آئیڈیا تھا۔ ہم دونوں کا دشمن ایک تھا، ہم دونوں ہی اسے سکون سے گورنر کا حلف اٹھانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ ہم اسے پریشان کرنا چاہتے تھے۔"

"پیگی جانتی تھی کہ چوتھے خاکے میں کیا ہوگا؟" شیلبی نے پوچھا۔

"نہیں..." اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "یہ صرف میرے ذہن میں تھا کہ چوتھا خاکہ کیا ہوگا۔"

"رابرٹ..." یہ سن کر شیلبی نے واکی ٹاکی پر ایک افسر کو پکارا۔ "میرے خیال میں فی الحال گورنر محفوظ ہے۔ تم یہاں سنبھالو، میں ہیڈکوارٹر جارہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فل کو ہتھکڑی لگائی اور عقبی راستے سے اسے لے کر نیچے اتری اور ہیڈکوارٹر پہنچ گئی۔

"یہ لو..." کچھ دیر بعد اس نے خاکے بنانے والے مختلف پین اور چوتھی بار ملنے والے کامکس اسٹرپ کی شیٹ اس کے سامنے رکھی۔ اس وقت وہ ہیڈکوارٹر کے تفتیشی روم میں تھے۔ "چوتھا خاکہ کیا ہوتا، بنا کر دکھاؤ۔"

کچھ ہی دیر میں فل نے خاکہ مکمل کردیا۔ شیلبی نے باقی تینوں خاکوں کا چوتھے خاکے سے تقابلی جائزہ لیا۔ کارٹونز کی بناوٹ ایک جیسی تھی۔ اسے یقین ہوگیا کہ یہ کام اسی کا ہے۔

چوتھے خاکے میں تقریب کا منظر تھا۔ ایک شخص بائبل پر حلف لے رہا تھا۔ ایک مبہم نقوش والا شخص اس پر گولی چلا چکا تھا۔ گولی لگنے کے بعد آرتھر سینہ پکڑے زمین پر گر رہا تھا۔ حلف لینے سے گرنے تک کے منظر کو کارٹون میں دکھایا گیا تھا۔

شیلبی سمجھ گئی کہ معاملہ کیا تھا۔ فل اپنی گرل فرینڈ چھینے اور پیگی ٹھکرائے جانے کے باعث آرتھر سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ سوا دس بجے جب آرتھر پیگی کے کمرے سے باہر نکلا تو اس کے دس منٹ کے اندر اندر پیگی کو بھی گرفتار کرکے پولیس ہیڈکوارٹر منتقل کردیا گیا۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ آرتھر اور شیلبی پولیس ہیڈکوارٹر کے کانفرنس روم میں بیٹھے اس بات پر بحث کررہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ شیلبی نے اب تک کیس کو رجسٹرڈ نہیں کیا تھا۔ وہ کیس رجسٹرڈ کرکے اُن دونوں کو باقاعدہ گرفتار کرنا چاہتی تھی مگر آرتھر اس بات کی مخالفت کررہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ معاملے کو دبا دیا جائے اور ان دونوں کو تنبیہ دے کر چھوڑ دیا جائے۔ کچھ دنوں بعد اسے گورنر کے عہدے کا حلف اٹھانا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی سیاسی زندگی کے اس اہم موڑ کے آغاز پر ہی وہ تنازعات کا شکار ہوجائے۔ آخر شیلبی کو اس کی بات ماننا ہی پڑی۔

فل اور پیگی کی رہائی کے بعد آرتھر کو پھر دھمکی آمیز کارٹونز موصول نہیں ہوئے۔ وہ مطمئن تھا اور پھر حلف برداری کی تاریخ طے ہوگئی۔ دوسری طرف آرتھر کی ہدایت پر شیلبی نے خفیہ طور پر پیگی اور فل پر نظر رکھی ہوئی تھی، تاہم رہائی کے بعد دونوں کی کوئی مشکوک سرگرمی سامنے نہیں آئی۔

☆☆☆

اسٹیٹ کیپٹل سپریم کورٹ کی سیڑھیوں پر کھڑا آرتھر ارشل ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کے نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ وہ طور گورنر حلف اٹھانے کے لیے پہنچا تھا۔ سامنے سڑک پر اس کے استقبال کے لیے سیکڑوں لوگ موجود تھے۔ شیلبی اور اس کی ٹیم کے لوگ نئے گورنر کے قریب تھے۔ اچانک مجمع میں کھڑے ایک شخص کا ہاتھ اوپر اٹھا۔ اس میں آٹومیٹک پستول تھا۔ شیلبی کی نظر اس پر پڑ گئی مگر تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ گولی چلی اور لمحوں میں..... آرتھر کی گردن میں پیوست ہوگئی۔ وہ زمین پر گر پڑا لیکن اس کے نیچے گرنے سے پہلے ہی بلی نے حملہ آور پر گولی چلادی۔ وہ بھی نیچے گرا۔ گولی اس کے سینے پر لگی تھی۔ اسٹیٹ کیپٹل سپریم کورٹ کے باہر مجمع میں بھگدڑ مچ گئی تھی مگر پھر بھی پولیس والے زخمی حملہ آور کو ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال کی طرف دوڑ پڑے۔

"تم کون ہو؟"

"تھامس چارلی کیٹرز۔" اس نے لڑکھڑاتے لہجے جواب میں دیا۔ شیلبی اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"تو تم ہو کاپی کیٹرز۔"

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گورنر کو کیوں مارا ہے تم نے؟" شیلبی نے سوال کیا۔

یہ سن کر وہ خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے کچھ اوپر لگتی تھی۔ جسم سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ "بولو۔" شیلبی نے اسے جھنجوڑا۔

"اس نے میری بیٹی کو دکھ دیے تھے، اس کا دل توڑا، سے جیل بھیجا۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"اسے تو فل مارنا چاہتا تھا۔ پیگی اس کی مدد کررہی تھی مگر تم کیوں؟"

یہ سن کر وہ مسکرایا۔ "وہ سب ڈراما تھا۔ آرتھر انجام کو پہنچا۔ میرا بدلہ پورا ہوگیا۔ پیگی کا بھی مقصد پورا ہوگیا۔" یہ کہہ کر وہ کھانسا۔ اس کے منہ سے بھی خون نکلا۔ "اب فل اور لزا ہنسی خوشی رہیں گے۔" یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر کھانسا۔ ایک ر پھر منہ سے خون بہہ نکلا۔ کچھ دیر بعد اس نے شیلبی کی طرف دیکھا۔ "میں نے سب کے سامنے جرم کیا اور گولی کھائی۔ اب تم کسی کو نہیں پکڑ سکتیں۔" یہ کہہ کر اس نے ہنسنے کی وشش کی مگر اس کی سانس اکھڑنے لگی۔

"لیزا..." اس نے بدقت تمام کہا اور پھر ہچکی لی۔ اس ی گردن ڈھلک گئی۔

ایمبولینس اسپتال پہنچ چکی تھی اور عین گیٹ پر کیٹرز نے ری ہچکی لی تھی۔

"گورنر..." ایمبولینس سے باہر نکلتے ہی اس نے سامنے کھڑے ایک پولیس افسر سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

گورنر کی موت کے بعد نئے گورنر کے لیے انتخابات شروع ہوچکے تھے۔ شیلبی ان دنوں چھٹی پر تھی۔ آرتھر قتل کیس کی تفتیش ختم ہوچکی تھی۔ حملہ آور مارا گیا اور ایف بی آئی یہ نہیں جان سکی کہ قتل کا محرک کیا تھا۔ شیلبی سچ جانتی تھی مگر وہ اسے ثابت نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے زبان بند رکھی۔ قتل کی تفتیش کے دوران وہ خاصی تھک چکی تھی۔ معاملہ نمٹ جانے کے بعد اس نے دو ماہ کی چھٹی لی اور ان دنوں وہ گھر پر ہی تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد شیلبی نے واشنگٹن پوسٹ اٹھایا۔ دوسرے صفحے پر بڑی سی تصویر چھپی تھی۔ آرتھر کے ہاتھوں شکست کھانے والا ایڈورڈ اپنی انتخابی مہم سے خطاب کررہا تھا۔ تصویر میں اس کے برابر فل روسلو بھی کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ چونک گئی۔ اس نے فون اٹھایا اور ویسلے کا نمبر ملایا۔ "ہیلو... میں شیلبی بول رہی ہوں۔"

"کہیے، کیا بنوانا ہے؟" اس نے کاروباری لہجے میں کہا۔

"کچھ بنوانا نہیں، پوچھنا ہے۔"

"تم صرف پوچھنے کے لیے ہی کیوں رابطہ کرتی ہو؟ خیر پوچھو، کیا پوچھنا چاہتی ہو؟" اس کے لہجے سے بیزاری ظاہر ہورہی تھی۔

"فل روسلو اور ایڈورڈ کا رشتہ کیا ہے؟"

"باپ بیٹا۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "اب پوچھو گی کہ مسٹر کاپی کیٹرز کے ساتھ ان دونوں کا کیا رشتہ ہے، تو سنو۔ ایڈورڈ، کاپی کیٹرز کا سب سے چھوٹا بھائی اور فل اب مسٹر کیٹرز کا داماد ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود اس دنیا میں نہیں رہے۔ اور کچھ؟"

"ہاں... شام کو اکٹھے ڈنر کریں؟ بتاؤ، ہاں یا نہ۔"

"ہاں۔" ویسلے نے خوشی سے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، شام کو ملتے ہیں۔ میں فون کرلوں گی۔ بائے۔"

شیلبی نے لائن کاٹی اور فون رکھ دیا۔ "سیاست چکر ہے یا گھن چکر، واقعی سیاست کی سچائی کبھی سامنے نہیں آسکتی۔" اس نے خود کلامی کی اور اخبار اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اسے اخبار سے زیادہ سامنے رکھی کافی میں دلچسپی محسوس ہورہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ویسلے برا آدمی نہیں۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنا، اکیلے رہنے سے زیادہ بہتر ہوگا۔

معاوضہ

عکس فاطمہ

دو لکھاریوں کے مابین طے پا جانے والے معاہدے کی جزئیات

جب ذہن کے خفیہ گوشوں میں شک کے زہریلے سانپ کلبلانے لگیں تو انسان کو معمولی بات پر بھڑکنے میں دیر نہیں لگتی... قسمت سے اسے بھی کچھ پانے کا موقع مل گیا تھا... مگر انجانے شکوک وشبہات نے اسے متوقع کامیابی کی ڈگر سے دور کردیا... اور اس مقام پر پہنچادیا جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔

سلطان شیرازی ایک اچھا مصنف تھا مگر کچھ زیادہ کامیاب نہیں تھا۔ وہ کہانیاں بھی لکھتا تھا اور ڈرامے بھی... مگر ملک کے بیشتر رائٹرز کی طرح اس کی مالی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ وہ کہانیاں لکھ لکھ کر مختلف اخباروں اور رسالوں کو بھیجتا رہتا تھا۔ کہانی چھپ جاتی تو کچھ ...... معاوضہ اسے مل جاتا تھا جس سے چندروز کی دال روٹی چل جاتی۔ اس کے بعد پھر وہی تنگ دستی کا عالم ہوتا تھا۔ اگر کبھی تواتر سے کئی کہانیاں چھپ جاتیں تو کچھ دن اچھے گزر جاتے۔

عام حالات میں شاید وہ ڈاکٹر خالد جہانزیب کی پیشکش کبھی قبول نہ کرتا مگر جب کافی دنوں تک آمدنی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ مجبور ہوگیا۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی اس لیے اس نے ڈاکٹر خالد جہانزیب کے بے سروپا ڈرامے کی نہ صرف تعریف کی بلکہ اس پر مزید کام کرنے اور اس کی نوک پلک سنوارنے کے لیے بھی تیار ہوگیا۔

ڈاکٹر خالد جہانزیب نے جو ڈراما لکھا تھا... یا لکھنے کی کوشش کی تھی... اس پر نظر ڈالتے ہی سلطان شیرازی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس سے برا اور بے بنیاد اسکرپٹ اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اسکرپٹ نے گویا اس کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔ سارا قصور اتوار کے روزنامہ ''شجاعت'' کا تھا۔ اس روز اس اخبار میں ایک اشتہار چھپا تھا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

''مصنف کی ضرورت ہے۔''

ایسے مصنف کی ضرورت ہے جسے ادب اور زبان و بیان پر عبور حاصل ہو اور جو ایک بہت عمدہ ڈرامے کے اسکرپٹ کو ازسرنو لکھ سکے، اسے ایڈٹ کر سکے اور اس میں ترامیم و اضافے کر سکے۔ رائٹر کا سنجیدہ مزاج ہونا ضروری ہے... ماہانہ معاوضے کے علاوہ رائلٹی بھی ملے گی... رابطے کے لیے پوسٹ بکس...

عام حالات میں شاید سلطان شیرازی اس اشتہار کو کوئی اہمیت نہ دیتا مگر اس وقت چونکہ روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے تھے اس لیے اس نے اس اشتہار کے جواب میں ایک درخواست بھجوادی۔ تین ہفتے گزر گئے۔ سلطان اس اشتہار کو بھی بھول گیا اور اپنی درخواست کو بھی۔ ایک روز وہ اپنے تازہ ترین ناول کے چھٹے باب پر کام کر رہا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

جس وقت سلطان کے موبائل کی گھنٹی بجی اس وقت وہ ناول کے ایک اہم حصے میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر اپنے کان سے لگایا اور بٹن دباتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ ''ہیلو... کسے تکلیف ہوئی ہے اس وقت؟''

''آپ سلطان شیرازی ہیں؟'' دوسری طرف سے کسی نے گویا اس کے لہجے کی ناگواری کو نظرانداز کرتے ہوئے مہذب، نرم اور خوش گوار لہجے میں پوچھا۔

''جب تم نے سلطان شیرازی کا نمبر ملایا ہے تو وہی بولے گا نا... کیا تم یہ توقع کر رہے تھے کہ تمہاری کال کے جواب میں کوئی حسینہ تم سے بات کرے گی؟ بے وقوف انسان!'' سلطان شیرازی نے پہلے سے زیادہ بداخلاقی سے کہا۔

''میں ڈاکٹر خالد جہانزیب بات کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے بولنے والے نے اسی خوش گوار لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم مجھے...''

''میں کوئی نجومی ہوں جو خود بہ خود جان لوں گا کہ تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' سلطان شیرازی نے بات کاٹی۔

''اوہ... تم تو خاصے ناراض لگ رہے ہو۔'' ڈاکٹر خالد جہانزیب نے اپنے لہجے کو بہ دستور خوش گوار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''معذرت خواہ ہوں... مجھے جس قسم کے سنجیدہ رائٹر کی ضرورت تھی وہ تم نہیں ہو سکتے۔''

''سنجیدہ رائٹر...؟'' سلطان بڑبڑایا...... تو ڈاکٹر خالد جہانزیب نے کہا۔ ''میں نے اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ مجھے اپنے ڈرامے کے اسکرپٹ...''

''اوہ!'' سلطان شیرازی کو یاد آیا تو اس کا لہجہ یک دم معذرت خواہانہ ہوگیا۔ ''معاف کرنا مسٹر...''

''ڈاکٹر خالد جہانزیب نام ہے میرا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''دراصل میں وہ درخواست بھیج کر بھول گیا تھا۔'' سلطان شیرازی نے کہا۔ ''اب کہیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''میرا جیولری کا خاصا وسیع کاروبار ہے۔'' ڈاکٹر خالد جہانزیب نے کہا۔ ''ہے نا عجیب بات کہ میں جیولری کا کاروبار کرتا ہوں اور ایک رائٹر کی تلاش میں ہوں۔''

''جی جی۔'' سلطان شیرازی نے عاجزی سے کہا۔ اس کے لیے تو یہ حیرت کی بات تھی کہ وہ جیولری کا کاروبار کرتا تھا جبکہ اس کے نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' لگا ہوا تھا۔ سلطان نے سوچا، ممکن ہے وہ پی ایچ ڈی ہو۔

''بہرحال، مجھے مطلوبہ رائٹر ابھی تک نہیں مل سکا ہے حالانکہ میں نے متعدد لوگوں کے انٹرویو کیے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی میرے معیار پر پورا نہیں اترا۔ تم ایسا کرو کہ مجھے اپنی تعلیمی قابلیت اور اب تک کیے گئے کام کی تفصیل بتاؤ۔ اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کرسکوں گا۔''

''میں ایک ایسا بدقسمت رائٹر ہوں جو ابھی ناکامیوں کے اندھیرے میں بھٹک رہا ہے۔'' سلطان شیرازی نے ناگواری سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم میرا خیال چھوڑو اور کسی اچھے اور مشہور رائٹر کی خدمات حاصل کرلو۔''

''اس کا فیصلہ میں کروں گا کہ مجھے کس کی خدمات حاصل کرنی ہیں اور کس کی نہیں۔'' ڈاکٹر خالد جہانزیب نے کہا۔ ''کیا تم شادی شدہ ہو؟''

''نہیں۔'' سلطان نے جواب دیا۔

''کسی عورت سے دوستی یا محبت وغیرہ...؟''

''نہیں... میری زندگی میں کوئی نہیں ہے۔'' سلطان شیرازی نے تلخی سے کہا۔ ''میرے پاس ان باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھ جیسے تہی دست انسان سے آج کے دور میں کون عورت محبت یا دوستی کرسکتی ہے؟ صرف ایک ماں تھی وہ بھی گزشتہ سال وفات پاگئی۔''

''اوہ! اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ساری توجہ کام پر ہے۔'' ڈاکٹر خالد نے کہا۔ ''مجھے ایسے لوگ اچھے لگتے ہیں۔''

کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''سلطان شیرازی! تم ابھی اور اسی وقت میرے گھر چلے آؤ۔ میں بہادرآباد میں رہتا ہوں... اور ہاں، اپنے ساتھ اپنی کچھ ایسی کہانیاں لیتے آنا جو

ابھی چھپی نہ ہوں۔ اگر ڈراما بھی لے آؤ تو کیا کہنے!"

سلطان شیرازی نے ڈاکٹر خالد جہانزیب کا شکریہ ادا کیا اور اس کا ایڈریس نوٹ کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا۔ اسے کسی اور کے لکھے ہوئے اسکرپٹ پر کام کرنا پسند نہیں تھا مگر مجبوری تھی۔ پیٹ کی خاطر اسے یہ کٹھن فیصلہ کرنا ہی پڑا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد سلطان شیرازی اپنی بغل میں ایک فائل دبائے ڈاکٹر خالد جہانزیب کے گھر پہنچا۔ اس فائل میں کہانیوں کے مسودے تھے۔ ڈاکٹر خالد کا بنگلا بہت شان دار تھا۔ چوکیدار کو اس نے اپنا نام بتایا تو اس نے انٹرکام پر ڈاکٹر خالد کو سلطان کی آمد سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر خالد کی طرف سے اجازت ملنے پر اس نے گیٹ کھول دیا اور سلطان شیرازی اندر داخل ہو گیا۔ اندر راہداری میں بھی وال ٹو وال کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ اس پر بے آواز چلتے ہوئے سلطان اپنے سستے سے فلیٹ کو یاد کر رہا تھا جس کے آس پاس شور وغل اور ہنگامہ مچا رہتا تھا۔ اندرونی دروازے پر ایک ملازم نے اس کا استقبال کیا۔ ملازم کا لباس سلطان شیرازی سے کہیں اچھا تھا۔ وہ اسے اندر ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں ایک قدیم طرز کا لیمپ روشن تھا۔ پیتل کا یہ لیمپ تازہ پالش کی وجہ سے چمک رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں رکھا ہوا فرنیچر بھی قدیم طرز کا تھا اور یقیناً اس کا شمار بھی نوادرات میں ہوتا ہوگا۔ ملازم کی درخواست پر سلطان شیرازی ایک آرام دہ صوفے میں دھنس گیا۔

"آپ تشریف رکھیے... ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں۔"

ملازم نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ایک پستہ قد گنجا اور ہنس مکھ سا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر قیمتی سوٹ اور پیروں میں چمچماتے نئے جوتے تھے۔

"خوش آمدید... خوش آمدید مسٹر شیرازی!" ڈاکٹر خالد جہانزیب نے کہا تو سلطان نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ سرخ وسفید اور روئی کی طرح ملائم تھا۔

"تم ایسا کرو کہ میرے ڈرامے کا اسکرپٹ دیکھو..." ڈاکٹر خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تک میں تمہارا اسکرپٹ دیکھتا ہوں۔ اُمید ہے تم اسکرپٹ ساتھ لائے ہو گے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر خالد نے اشارہ کیا تو اس کے خوش پوش ملازم نے ایک فائل سلطان کی طرف بڑھا دی۔ سلطان نے اپنی فائل ڈاکٹر کو دے دی۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کا اسکرپٹ بھی زبردست ہو گا۔" سلطان شیرازی نے مکھن لگانے میں مصلحت سمجھی۔

ڈاکٹر خالد جہانزیب شرماتے ہوئے مسکرا دیا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک سلطان شیرازی ڈاکٹر خالد جہانزیب کا اسکرپٹ پڑھتا رہا۔ جب وہ فارغ ہوا تو اس کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے یا اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس لکھ پتی جیولر کی پٹائی کر دے۔ وہ اسکرپٹ تھا یا عذاب...! سلطان نے اپنی زندگی میں اس قدر گھٹیا، بے ربط، مہمل اور فضول اسکرپٹ نہیں پڑھا تھا۔ کوئی بھی رائٹر چاہے وہ پروفیشنل ہوتا یا ادب پرست... اس اسکرپٹ کو پڑھ کر خوب ہنستا۔

"بے وقوف کہیں کا!" سلطان شیرازی نے دل ہی دل میں ڈاکٹر خالد کو برا بھلا کہا۔ "سمجھ رہا ہے کہ اس کا اسکرپٹ بہت اچھا ہے۔ میں اسے پڑھ کر بے حد متاثر ہوا ہوں۔"

"بھئی واہ سلطان شیرازی!" اچانک ڈاکٹر خالد جہانزیب نے کہا۔ "تم تو بہت اچھے رائٹر ہو۔ مزہ آگیا پڑھ کر... تم نے جس طرح اچھے اور برے پہلوؤں کو کھول کر پیش کیا اور جس طرح اس بے حس اور ظالم معاشرے کے تاریک گوشے اجاگر کیے ہیں، اس سے واقعی تمہاری قلمی مہارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔"

"جی... ڈاکٹر صاحب! وہ تو ہے مگر..." سلطان نے کچھ کہنا چاہا تو ڈاکٹر خالد نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ میرے ڈرامے کا اسکرپٹ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ میرا تعلق نہ فلم کی دنیا سے ہے اور نہ علم وادب کی دنیا سے۔ میں تو ایک سیدھا سادہ سا جیولر ہوں۔ کاروبار کرتا ہوں۔ انسانی رویوں کا ماہر نہیں ہوں۔ اگر میں بذاتِ خود رائٹر ہوتا تو تمہاری کیا ضرورت تھی مجھے؟ بہرحال، میرا جو اسکرپٹ تمہارے ہاتھ میں ہے یہ اگرچہ ابھی ابتدائی اور ناپختہ شکل میں ہے مگر تمہیں ماننا پڑے گا کہ یہ بنیادی طور پر اپنے آئیڈیا کے اعتبار سے کسی شاہکار سے کم نہیں... اگر اس ڈرامے کی نوک پلک کوئی تم جیسا ماہر رائٹر سنوار دے تو تم دیکھ لینا کہ یہ دھوم مچا دے گا۔"

ڈاکٹر خالد جوش وخروش کے عالم میں بولے جا رہا تھا جبکہ سلطان ہکابکا سا اسے دیکھ... رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ! تو ڈاکٹر کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ اس کا اسکرپٹ نہایت فضول اور بکواس ہے یا پھر وہ اسے بے وقوف بنا کر درحقیقت اس کی قابلیت کو پرکھ رہا ہے...

"ڈاکٹر صاحب! آپ کا اسکرپٹ اچھا ہے... اس میں حالات کا جو اتار چڑھاؤ ہے وہ واقعی دلچسپ ہے۔" آ... پیٹ کی خاطر سلطان شیرازی نے ڈاکٹر خالد جہانزیب کے سامنے یہ جھوٹ بول ہی دیا۔

"بالکل... بالکل... تم نے صحیح کہا۔" ڈاکٹر خالد پُرجوش انداز میں کہا۔ "مگر وہ نادان اور احمق لوگ یہ ماننے تیار ہی نہیں تھے کہ یہ زندگی کے حقائق کا ترجمان ہے۔

نتا ہوں کہ ابھی یہ اسکرپٹ ناپختہ اور ادھورا ہے۔ اس پر خاصا کام ہونا ہے۔ اس کی نوک پلک سنوارنی ہے۔ اس میں ترمیم واضافہ کرنا ہے۔ فالتو یا غیر دلچسپ چیزیں کاٹنی ہیں۔ اس کے بعد ہی یہ فائنل ہو سکے گا۔ جب یہ تیار ہو گا تو تم خود دیکھ لینا کہ کیا چیز ہوگا۔ بہرحال... تمہیں یہ سب کام کرنا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خاصا مشکل کام ہے۔ اس میں بہت وقت لگے گا۔ ظاہر ہے تمہارے ساتھ پیٹ لگا ہوا ہے لہٰذا میں تمہیں اس کام کے مکمل ہونے تک دس ہزار روپے مہینا دوں گا۔ جب یہ ڈراما آن ایئر جائے گا اور کامیاب ہوگا تو اس کے معاوضے اور رائلٹی کے حق دار بھی تم ہی ہو گے۔"

"جی؟" سلطان شیرازی نے حیرت سے کہا۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر خالد دو ڈھائی ہزار روپے میں پورا اسکرپٹ درست کروائے گا لیکن اس نے دس ہزار روپے ماہوار کی بات کی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ اس کام کو دانستہ طور پر طول دیتے ہوئے اسکرپٹ پر ایک سال تک کام کرتا تو اسے ایک لاکھ بیس ہزار روپے مل جاتے۔ معاوضہ اور رائلٹی الگ تھی۔ یہ اس قدر زبردست پیشکش تھی کہ اسے مسترد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ڈاکٹر خالد جہانزیب کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا؟ مگر وہ بالکل سنجیدہ تھا اور اس کے جواب کا منتظر تھا۔

پھر ڈاکٹر خالد نے کہا۔ "مگر ایک بات مجھے پوری ایمان داری کے ساتھ بتا دو۔ کیا میرے اسکرپٹ میں جان ہے؟ کیا اسے واقعی بنا سنوار کر شاہکار بنایا جاسکتا ہے؟ بالکل سچائی کے ساتھ رائے دینا۔"

سلطان شیرازی نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر زندگی میں پہلی مرتبہ پیٹ کی خاطر مسلسل جھوٹ بولنے کی تیاری کرنے لگا۔

"زبردست آئیڈیا ہے... بالکل منفرد...! میں نے ایسا اچھوتا خیال پہلے کبھی نہیں پڑھا۔ یہ سمجھ لیں کہ یہ ایک ناتراشیدہ ہیرا ہے جسے تراش خراش کر تیار کرنا ہے۔" سلطان شیرازی نے سنبھل سنبھل کر کہا۔

اس کی بات سن کر ڈاکٹر خالد جہانزیب کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ شیرازی دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ یہ شخص کتنا بے وقوف ہے جو ہر ماہ دس ہزار روپے ضائع کرنے کو تیار ہے۔

"ٹھیک ہے... اس خوشی میں چائے ہو جائے۔" ڈاکٹر خالد نے کہا اور اپنے ملازم کو اشارہ کیا تو وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔

"یہ سمجھ لو کہ یہ میری اور تمہاری پارٹنرشپ ہے۔" خالد جہانزیب نے سلطان شیرازی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مگر اس پارٹنرشپ میں، میں ایک خاموش پارٹنر کا کردار ادا کروں گا جبکہ سارا کام تمہیں کرنا ہوگا۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب!" سلطان نے جواب دیا۔

☆☆☆

سلطان شیرازی اور ڈاکٹر خالد جہانزیب کے درمیان ہونے والا معاہدہ بالکل سادہ سا تھا۔ اس کا ڈراما درحقیقت ایک سیریل تھی۔ اس نے یہ فیصلہ سلطان پر چھوڑ دیا تھا کہ اس کی کتنی قسطیں بن سکتی تھیں تاہم اسے ایک ماہ میں کم از کم ایک قسط تیار کر کے دینی تھی۔ ہر ماہ کے پہلے جمعے کو وہ بہادرآباد میں ڈاکٹر خالد کے گھر جاتا۔ وہاں نئی قسط کی فائل دے دیتا اور آئندہ قسط کے لیے ہدایات لے لیتا۔ اگر پچھلی قسط میں مزید کوئی ترمیم یا اضافہ ڈاکٹر کے خیال میں ضروری ہوتا تو اس پر بات ہو جاتی۔ وہ دونوں دو چار منٹ گپ شپ کرتے۔ اس کے بعد ڈاکٹر خالد، سلطان کو دس ہزار روپے کا چیک دے دیتا اور وہ واپس چلا آتا۔

اس طرح یہ کام چلتا رہا اور سلطان کے پاس پیسے آتے رہے۔ چوتھے ماہ تک اس کے پاس چالیس ہزار روپے آچکے تھے۔ جب پیٹ میں روٹی پڑی اور ذرا موٹی رقم نے سلطان کی آنکھوں میں چربی کی تہ چڑھائی تو اسے نئی نئی باتیں سوجھنے لگیں۔ وہ اس چکر میں لگ گیا کہ یہ معلوم کرے، خالد اسے اتنی رقم کیوں اور کہاں سے دے رہا ہے؟ اس دوران وہ جو قسطیں خالد کو دے کر آیا تھا، جب وہ اس نے دوبارہ دیکھنے کے لیے لیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں خالد نے نہ کوئی لکیر کھینچی ہے نہ کوئی اضافہ کیا ہے اور نہ کچھ کاٹا ہے۔ ہر مسودہ، وہ جیسا دے کر آیا تھا ویسا ہی اسے واپس مل گیا۔ اس سے سلطان شیرازی کو یہ اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر خالد کو اس کے اسکرپٹ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ ایک آدھ بار تو اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ خالد نے اسکرپٹ کو دیکھا تک نہیں ہے۔

یہ پانچویں ماہ کی بات ہے... جب سلطان نے خالد سے دس ہزار روپے کا چیک لیا اور پچھلے اسکرپٹ کی فائل لے کر اپنے گھر آیا تو مسودے کو بے داغ اور صاف دیکھ کر اسے غصہ آگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ڈاکٹر اس کے ساتھ کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ اس نے غصے کے عالم میں ڈاکٹر کے گھر بہادرآباد فون کیا مگر گھر میں کوئی نہیں تھا۔ گھنٹی بجتی رہی اور کسی نے بھی فون اٹینڈ نہیں کیا۔ اس نے چیک نکالا۔ اس پر "خالد اینڈ عارف جیولرز" کی مہر لگی ہوئی تھی اور ڈاکٹر خالد کے دستخط تھے۔

ٹیلی فون ڈائریکٹری میں سے اس نے ”خالد اینڈ عارف جیولرز“ کا ٹیلی فون نمبر ڈھونڈ نکالا اور وہاں فون کیا تو لیڈی آپریٹر نے جواب دیا۔ ”ڈاکٹر خالد کراچی میں نہیں ہیں۔ وہ اسلام آباد اور لاہور کے دورے پر گئے ہوئے ہیں۔“

سلطان نے چاہا، وہ آپریٹر کو بتا دے کہ ڈاکٹر خالد کراچی میں موجود ہے اور وہ اس سے ایک گھنٹے پہلے مل کر آیا ہے مگر اس نے کچھ نہیں کہا البتہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ڈاکٹر اسے بے وقوف بنا رہا ہے۔ ڈرامے کے اسکرپٹ کی تدوین اور اس کی درستگی کے نام پر وہ اسے جو دس ہزار روپے مہینا دے رہا ہے اس کے پیچھے کوئی اور ہی مقصد کارفرما ہے۔ ڈرامے نہ تو اس طرح لکھے جاتے تھے اور نہ اس طرح درست کرائے جاتے تھے۔

”آپ ڈاکٹر خالد کو میرا یہ پیغام دے دیں کہ میں نے فون کیا تھا۔ میرا نام سلطان شیرازی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

کافی دیر تک سلطان تمام حالات اور واقعات پر غور کرتا رہا۔ ”ڈاکٹر خالد جہانزیب اتنا بے وقوف نہیں کہ وہ دس ہزار روپے ہر ماہ ضائع کرے۔ ضرور وہ کسی اور چکر میں ہے۔

سوچتے سوچتے سلطان شیرازی کو ایک انگریزی فلم یاد آ گئی جس میں ایک آدمی کو معمولی اور فضول سے کام کا بھاری معاوضہ دیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مذکورہ شخص کو ایک خاص مقام سے دور رکھا جائے۔ اس جگہ اس کی دکان واقع تھی۔ مجرم چند گھنٹوں کے لیے اس شخص کو اس کی دکان سے دور رکھتے اور اس کی عدم موجودگی میں ہر روز اس کی دکان کے اندر گھس کر ایک سرنگ کھودتے تھے جو ایک بینک تک گئی تھی اور ان لوگوں نے بینک لوٹ لیا تھا۔

سلطان نے اپنے گھٹیا فلیٹ پر نظر ڈالی۔ اس کی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا مگر اسے آس پاس کوئی بھی بینک نظر نہیں آیا۔ اس کے گھر میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں سے کوئی خفیہ راستہ باہر جاتا۔ اس کے پڑوسی بھی سب تقریباً اسی جیسے تھے۔ کسی کے پاس فالتو روپیا نہیں تھا۔ سلطان کے پاس کوئی جائداد بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود خالد اس جیسے کنگلے انسان کو ایک فضول کام کے دس ہزار روپے ماہوار دیے جا رہا تھا۔ کیوں... اور کس لیے؟

سلطان چھٹی قسط پر کام کر رہا تھا۔ ڈاکٹر خالد جہانزیب نے ابھی تک اس کے کام میں کوئی نقص نہیں نکالا تھا۔ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ کسی قسط میں کوئی رد و بدل کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ رقم کی ادائیگی میں بھی کوئی گڑبڑ نہیں کی تھی۔ پانچ ماہ سے تمام کام عمدگی سے چل رہا تھا۔ ڈاکٹر کو اس سے کیا فائدہ پہنچا، اس کا تو اندازہ نہیں تھا مگر سلطان آسان سے کام کے پچاس ہزار وصول کر چکا تھا۔ آخر خالد یہ رقم کیوں ضائع کر رہا تھا؟ ابھی کام کا سلسلہ جاری تھا لیکن خود خالد کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی سیریل کو کون پروڈیوس کرے گا اور کون سا چینل اسے خریدے گا۔

”مجھے حقیقت کا پتا چلانا ہوگا۔“ یہ سوچ کر سلطان شیرازی بڑی احتیاط سے منصوبہ تیار کرنے لگا۔ ڈاکٹر خالد جہانزیب اسے پابندی سے معاوضے کا چیک دے رہا تھا جس پر ”خالد اینڈ عارف جیولرز“ کی مہر ہوتی تھی اور ڈاکٹر خالد جہانزیب کے دستخط ہوتے تھے۔ یہ چیک آسانی سے کلیئر بھی ہو جاتے تھے۔ کبھی کسی طرح کی کوئی رکاوٹ یا پریشانی سامنے نہیں آتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چیک صحیح تھے اور خالد کوئی بے ایمانی نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور تھی اور سلطان کو اسی کا پتا چلانا تھا۔ آخر وہ دس ہزار روپے ہر ماہ کیوں ضائع کر رہا تھا؟

اس کے بعد سلطان شیرازی حرکت میں آ گیا اور اس نے ڈاکٹر خالد جہانزیب کے بارے میں معلومات حاصل کرنی شروع کر دیں۔ اس نے ایک انکم ٹیکس آفیسر کا روپ دھارا اور ڈاکٹر کی مالی پوزیشن کے بارے میں انکوائری شروع کر دی۔ وہ اس بینک میں بھی گیا جہاں ”خالد اینڈ عارف جیولرز“ کا اکاؤنٹ تھا۔ اکاؤنٹ صحیح تھا اور اسی کے ذریعے سلطان کو بھی ادائیگی ہوتی رہی تھی۔

”خالد اینڈ عارف جیولرز“ کے نام سے دکان طارق روڈ پر واقع تھی۔ اس کا پتا معلوم کر کے سلطان شیرازی وہاں جا پہنچا۔ وہ اپنی آنکھوں سے اس کاروباری ادارے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ یہاں بھی سلطان نے خود کو انکم ٹیکس آفیسر ہی ظاہر کیا جس پر اس کا استقبال سرد مہری سے کیا گیا۔ ٹیلی فون آپریٹر نہ اسے کچھ بتانے کو تیار تھی اور نہ اس کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے آمادہ تھی مگر جب سلطان نے اسے سمجھایا بجھایا اور تھوڑا سا دھمکایا تو وہ تعاون کے لیے تیار ہو گئی۔

سلطان نے اس شاپ کے شوکیسوں کا جائزہ لیا تو اسے تمام شوکیسوں کے اندر کھلی ڈبیوں میں چھوٹے چھوٹے ہیرے اور ہیروں سے سجے زیورات رکھے نظر آئے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ڈاکٹر خالد اس جگہ سے ہیرے چرا رہا ہو اور ان کی آگے منتقلی یا ترسیل سلطان کے ذریعے اس طرح کی جا رہی ہو کہ اسے اندازہ بھی نہ ہو رہا ہو؟

اپنے گھر واپس جاتے ہوئے سلطان شیرازی یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے ذریعے کس چیز کی ترسیل کی جا رہی ہے؟

لی پیغام، ہیرے یا دستاویز...؟ ممکن ہے چیک کے ذریعے ولی چیز منتقل کی جا رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مسودے کی نموں کے اندر کچھ ہو جس کا اندازہ نہ ہو پا رہا ہو... ہر حال... جو کچھ بھی تھا سلطان کو اس کا پتا چلانا تھا۔

☆☆☆

حسب پروگرام جب سلطان شیرازی اگلی قسط کا مسودہ لے کر بہادر آباد پہنچا تو ملازم نے اسے اندر پہنچا دیا۔ اس بار لطان سوچ کر آیا تھا کہ وہ کچھ ایسا تاثر دے گا جیسے وہ خالد کے راز سے واقف ہو گیا ہے اور اپنا منہ بند رکھنے کے لیے اسے زیادہ رقم درکار ہے۔ جاتے ہی سلطان شیرازی نے کٹر خالد جہانزیب پر چیخنا چلانا شروع کر دیا اور اس پر الٹے سیدھے الزامات لگانے لگا۔

”ڈاکٹر! تم بے ایمان ہو... لٹیرے ہو... مجھے ہر ماہ صرف دس ہزار روپے دیتے ہو اور آگے سے اس کے چار گنا پیسے وصول کرتے ہو۔ میں تمہاری اسکیم کو خوب اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔“

سلطان شیرازی کے الزامات کے جواب میں ڈاکٹر خالد حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی گویا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سلطان کیا کہہ رہا ہے۔

”تم کیا کہہ رہے ہو؟“ آخر ڈاکٹر نے کہا۔ ”تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ میرا ڈراما ترمیم، اضافے اور تصحیح کے بعد ایک شاہکار بن جائے گا... اور میں تمہیں اسی کام کا منہ مانگا معاوضہ دے رہا ہوں۔“

”بڑا حصہ تم خود رکھ رہے ہو اور مجھے معمولی رقم پر ٹرخا رہے ہو۔ میں پولیس کے پاس جاؤں گا اور تمہارے خلاف دھوکا دہی کا پرچہ درج کراؤں گا۔“ سلطان شیرازی نے چیختے ہوئے کہا۔

”اوہ... تو تم مجھے بلیک میل کرو گے!“ ڈاکٹر خالد جہانزیب نے کہا۔ اس کی آواز میں شوخی کے ساتھ طنز بھی تھا۔ ”کیا تم نے سوچا ہے کہ تم پولیس کو کیا بتاؤ گے؟ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟“

”تم مجھے استعمال کر رہے ہو اور میرے ذریعے کسی خاص قسم کی چیز کی ترسیل کرا رہے ہو۔ ڈرامے کا مسودہ محض آڑ ہے۔“ سلطان شیرازی نے کہا۔

یہ سنتے ہی خالد جہانزیب نے زوردار قہقہہ لگایا اور کافی دیر تک ہنستا رہا۔

”اب میں صرف دس ہزار روپے ماہوار پر نہیں مانوں گا۔ اس رقم کو کم از کم دگنا کرو۔“ سلطان نے اکڑتے ہوئے کہا۔

”تم ایک لالچی اور خود غرض انسان ہو۔“ خالد جہانزیب

نے کہا۔ ”تم نے میری محبت اور ہمدردی کا یہ صلہ دیا ہے؟“

”اوہ... تو تمہیں افسوس ہو رہا ہے... ہے نا؟“ سلطان شیرازی نے کہا۔ ”مگر اب یہ سب بے کار ہے۔ تمہارا پول کھل چکا ہے اور تم بے نقاب ہو چکے ہو۔“

یہ سنتے ہی ڈاکٹر خالد جہانزیب کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مجھے بے حد مایوس کیا ہے۔ تم واقعی بہت لالچی اور ناشکرے انسان ہو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ کمرے میں رکھی ہوئی میز کی طرف بڑھا مگر دوسری جانب سلطان بھی تیار تھا۔ اس نے جھپٹ کر عین اس وقت ڈاکٹر خالد جہانزیب کے ہاتھ پر ہاتھ ڈال دیا جب وہ میز کی دراز سے پستول نکال رہا تھا۔ پستول اس کشمکش میں فرش پر جا گرا جسے سلطان شیرازی نے اٹھا لیا مگر اس وقت وہ مایوس ہو گیا جب اسے پتا چلا کہ پستول خالی ہے۔

اس نے کھا جانے والی نظروں سے ڈاکٹر خالد کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ یکایک اسے اپنے پیچھے کوئی آواز سنائی دی تو اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے خالد جہانزیب کے خوش پوش ملازم کی جھلک نظر آئی۔ اسی لمحے کسی نے اس کے سر پر کوئی بھاری چیز ماری تو اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس کے سر پر خالد جہانزیب کے ملازم نے ضرب لگائی ہے۔

☆☆☆

جب سلطان شیرازی ہوش میں آیا تو وہ دبیز براؤن قالین پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے سر کو جھٹکے دیے تو اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے سے رقص کرنے لگے۔ اس کی کنپٹیاں بری طرح دکھ رہی تھیں اور سر چکرا رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تو سائے سائے سے نظر آئے۔

کمرے میں نمکین سی بو بسی ہوئی تھی۔ اسے کھانسی آنے لگی۔ یکایک اسے کچن کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو وہ اٹھ کر اس کی طرف بھاگا مگر کسی نے دروازہ بند کر کے لاک کر دیا تھا۔ وہ واپس ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پورے گھر میں نمکین بو کہاں سے آ گئی ہے؟ اسے یاد آیا کہ اس کمرے میں ڈاکٹر خالد جہانزیب اور اس کا خوش پوش ملازم بھی تھا مگر اب وہ دونوں غائب تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہی لوگ اسے اس چوہے دان میں بند کر گئے تھے۔

اچانک بیرونی دروازے پر کوئی زور زور سے ہاتھ مارنے لگا اور ساتھ ہی کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ چند ہی لمحوں بعد پولیس دروازہ توڑ کر اندر آ گئی۔ دو پولیس والوں نے اندر آتے ہی سلطان شیرازی کو جکڑ لیا۔ ایک پولیس افسر نے آگے بڑھ کر فرش پر پڑا ہوا پستول اٹھا لیا اور اس کی نال کو سونگھنے لگا۔

”اس سے ابھی ابھی فائر کیا گیا ہے۔“ پولیس آفیسر نے کہا۔ ”اس میں ایک گولی کم ہے۔“

ایک اے ایس آئی بیڈ روم کے دروازے پر کھڑا تھا، اس نے انسپکٹر سے کہا۔ ”سر! یہاں...“

دونوں پولیس والے سلطان شیرازی کو دھکیلتے ہوئے بیڈ روم میں گھس گئے۔ ان کے ساتھ دونوں افسر بھی تھے۔ بیڈ روم کے فرش پر ایک شخص کی لاش پڑی تھی۔

”کیا یہ ڈاکٹر خالد جہانزیب ہے؟“ پولیس انسپکٹر نے اے ایس آئی سے سوال کیا۔

”لگتا تو وہی ہے۔“ اے ایس آئی نے کہا۔ ”اس کے پارٹنر نے یہی حلیہ بتایا تھا۔“

سلطان شیرازی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہر طرف سے دھند میں گھرا ہوا ہے۔ وہ اپنے ذہن پر زور دینے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس نے فرش پر پڑی لاش کی طرف دیکھا۔ براؤن قالین پر ہر طرف خون تھا۔ لاش کے جسم پر وہی لباس تھا جو اس نے ڈاکٹر خالد جہانزیب کے جسم پر دیکھا تھا مگر یہ آدمی سلطان کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی اس شخص کو نہیں دیکھا تھا۔

”نہیں... یہ... وہ... نہیں ہے۔“ سلطان شیرازی نے چیخنے کی کوشش کی تو اس کی آواز پھٹ گئی۔

پولیس افسر نے لاش کی جیبوں سے ایک پرس اور ایک چھوٹا سا بیگ نکالا۔ بیگ میں ایک جیولری سیٹ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے تھے۔ اس سیٹ میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ پرس پر ایک ٹیگ چپکا ہوا تھا جس پر ڈاکٹر خالد جہانزیب کا نام لکھا تھا۔ سلطان نے کہنے کی کوشش کی کہ فرش پر پڑی ہوئی لاش ڈاکٹر کی نہیں ہے... مگر اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکلی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ کمرے میں کوئی اور بھی ہے جو اس کے پیچھے کھڑا تھا اور اے ایس آئی اس سے کہہ رہا تھا۔ ”عارف جان صاحب! کیا یہ لاش آپ کے پارٹنر کی ہے؟“

”ہاں، یہ میرا پارٹنر ہے۔“ عارف جان نامی شخص نے جواب دیا۔

تب سلطان شیرازی کو پتا چلا کہ اس کے پیچھے وہ شخص کھڑا تھا جو اب تک ڈاکٹر خالد بن کر اسے دھوکا دیتا رہا تھا۔ اصل ڈاکٹر خالد جہانزیب اس کے سامنے لاش کی صورت میں موجود تھا۔ جس شخص نے اس کے ساتھ ڈرامے کے اسکرپٹ والا کھیل کھیلا، وہ دراصل عارف جان تھا۔ ڈاکٹر خالد جہانزیب کا کاروباری پارٹنر اور ”خالد اینڈ عارف جیولرز“ کا حصے دار!

سلطان شیرازی کے سامنے سے گویا دھند چھٹ گئی اور ہر بات صاف ہو گئی۔ فرش پر پڑی ہوئی لاش ڈاکٹر خالد جہانزیب کی تھی جسے سلطان نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ کبھی اس سے ملا تھا۔

”ڈاکٹر خالد جہانزیب میرا پارٹنر تھا۔“ عارف جان نے کہنا شروع کیا۔ ”اور یہ شخص شاید اس کا ملازم تھا۔ غالباً یہ اس کے لیے کوئی کام کر رہا تھا۔ مجھے کئی مرتبہ شک ہوا کہ ڈاکٹر خالد ہمارے شوروم سے ہیرے چوری کر رہا ہے۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ ڈاکٹر خالد اس شخص کے ذریعے دکان سے ہیرے پار کرا رہا تھا اور اکثر اسلام آباد، لاہور جاتا رہتا تھا۔ اصل میں اسے کچھ ذاتی نقصان ہوا تھا جسے پورا کرنے کے چکر میں وہ ہیرے چوری کرنے لگا تھا... اور یہ شخص سلطان شیرازی اس منصوبے میں اس کا مددگار اور معاون تھا۔“

”نہیں... وہ... دراصل... ڈرامے... کا... مسودہ تھا... جو بہت خراب تھا... اور مجھے اسے درست کرنے... کی ذمے داری دی گئی تھی۔“ سلطان شیرازی نے کہا تو عارف جان نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”کیا بکواس ہے یہ...؟“ عارف جان نے انسپکٹر کی طرف گھوم کر کہا۔ ”ایک کاروباری آدمی کا... جیولری کا کام کرنے والے کا ڈرامے سے کیا تعلق؟ میرا پارٹنر ڈاکٹر خالد ایک لائن بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ ہاں، اس نے اردو ادب میں پی ایچ ڈی ضرور کیا تھا اسی لیے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لگاتا تھا۔ لیکن اس کا لکھنے سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اگر ہم اس شخص کی بات مان بھی لیں تو کیا یہ ہمیں ڈاکٹر مرحوم کا کوئی مسودہ دکھا سکتا ہے یا اس کے تحریر کردہ ڈرامے کا کوئی ثبوت پیش کر سکتا ہے جو اس کے بہ قول اس نے درست کیا ہے؟“

”مگر میں نے...“ سلطان شیرازی نے کچھ کہنا چاہا تو عارف جان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پولیس افسر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں اور میرا ملازم بہت عرصے سے اس شخص پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہ بڑے پُراسرار طریقے سے میرے پارٹنر ڈاکٹر خالد جہانزیب سے ملنے آتا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی دن رنگے ہاتھوں ان دونوں کو گرفتار کراؤں گا۔ اس لیے میں نے آج پولیس بلا لی مگر اس نے ڈاکٹر خالد کا خون کر دیا۔ اس سے پوچھا جائے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس لالچی انسان نے خالد کی جان کیوں لی؟ کیا ان دونوں کے درمیان ہیروں کی تقسیم پر لڑائی ہوئی تھی؟“

”میرا خیال ہے کہ یہ شخص ڈاکٹر خالد جہانزیب کو بلیک میل کر رہا تھا۔“ انسپکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

”آفیسر! ڈاکٹر خالد اس بلیک میلر کو ہر ماہ دس ہزار روپے کا چیک دیا کرتا تھا جو ”خالد اینڈ عارف جیولرز“ کے اکاؤنٹ کا ہوتا تھا۔ خالد بے چارے نے چوری ضرور کی مگر اس میں عقل استعمال نہیں کی۔ ایک تو اس لٹیرے کی خدمات حاصل کیں اور دکان کے اکاؤنٹ سے اس کی ادائیگی کی۔ یہ اس کی بے وقوفی نہیں تو اور کیا تھی؟“

عارف جان نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ”بہر حال، اس نے اس اُچکے کے لیے ہر خطرہ مول لیا اور اس نے اسی کو قتل کر دیا۔“

دوسری طرف سلطان شیرازی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ وہ ساری کہانی سمجھ چکا تھا۔ ہر مہینے کے پہلے جمعے کو عارف جان اس سے ڈاکٹر خالد بن کر ملتا تھا اور ہر ماہ کے پہلے جمعے کو خالد جہانزیب اسلام آباد اور لاہور کے دورے پر چلا جاتا تھا۔ عارف جان، ڈاکٹر خالد سے پہلے ہی چیک سائن کرا لیتا تھا تاکہ اس کی عدم موجودگی میں کام چلایا جا سکے۔

”عارف جان!“ پولیس افسر نے کہا۔ ”تم دونوں... یعنی ڈاکٹر خالد مرحوم اور تم... خالد اینڈ عارف جیولرز میں پارٹنر تھے۔ اس حوالے سے ہر چیک پر تم دونوں کے سائن ہونے ضروری تھے۔ مگر اس شخص سلطان شیرازی کو جو چیک دیے گئے ہیں، ان پر صرف ڈاکٹر خالد کے سائن ہیں... تمہارے نہیں... اس کی وجہ؟“

”دراصل ہم دونوں نے بینک کو یہ لکھ کر دیا تھا کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی ایک پارٹنر چیک سائن کر سکتا ہے۔“ عارف جان نے جواب دیا تو پولیس افسر خاموش ہو گیا اور اس نے پولیس والوں کو اشارہ کیا کہ وہ سلطان شیرازی کو باہر گاڑی میں لے جائیں۔ شیرازی سوچ رہا تھا کہ اس کی حالت بدلی بھی تو مختصر مدت کے لیے... اور یہ تبدیلی بھی اسے بہت مہنگی پڑی۔ ایک ایسا قتل اس کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا جو اس نے نہیں کیا تھا۔

سرورق کی پہلی کہانی

سلیم فاروقی

فریب کار

جوش وولولہ زندگی میں رنگ بکھیر دیتا ہے... اسے تروتازہ اور معطر بنا دیتا ہے... لیکن وقت کی لہریں کبھی ہموار نہیں رہتیں... آج کا جوش اور لہروں کی طرح بپھرا ہوا جذبہ... آنے والے کل کی نادانی... بیوقوفی اور سراسر خسارے کے سودا میں بدل جاتا ہے... وہ بھی جوش و جذبات کے طوفان سے لبریز تھا... وقت کی بساط پر جو لوگ اپنے آپ کو سب سے بڑا شاطر سمجھتے ہیں... وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بازی جب پلٹتی ہے تو ہر چال مات کی طرف لے جاتی ہے... ایک ایسے ہی نوجوان کی ولولہ انگیز بے قراریاں جو اسے دشواریوں کی جانب بڑھا رہی تھیں...

ایک نئے محاذ کے مرکز توجہ بننے کا سنسنی خیز احوال... اس ماہ کا خاص سرورق

کمرے میں دھوئیں اور شراب کی ملی جلی بُو چکرا رہی تھی۔ وہ پانچوں فرشی نشست پر بیٹھے تھے۔ وہاں صرف ایک دبیز کارپٹ، چند فلور کشن اور گاؤ تکیے تھے۔ ان پانچوں کے درمیان شیشے کی سطح والی ایک میز رکھی تھی جس پر وِسکی کی دو آدھوری اور ایک سربمہر بوتل رکھی تھی۔

دلاور خان گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا اور سگریٹ پھونک رہا تھا۔ وہی ہمارا لیڈر تھا۔ اس کے علاوہ جمشید عرف جمی تھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ اب تک سترہ قتل کر چکا ہے۔ تیسرا آدمی شوکت تھا جو شوکی کہلاتا تھا۔ وہ بھی خود کو جرائم کی دنیا کا بادشاہ سمجھتا تھا۔ چوتھا آدمی نصیر تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی کوئی عرفیت نہیں تھی۔ پانچواں فرد کوئی مرد نہیں بلکہ ایک حسین اور پُرکشش لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی کہ اسے دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس حسین اور معصوم لڑکی کا تعلق جرائم پیشہ افراد سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے پُرکشش اور متناسب جسم کا انگ انگ بولتا تھا۔

اس وقت وہ بھی انتہائی بے تکلفی سے نہ صرف شراب کے گھونٹ لے رہی تھی بلکہ سگریٹ بھی پی رہی تھی۔ اس کا نام ثمرہ تھا۔

میں ان سب سے الگ تھلگ دیوار سے ٹیک لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ میں ابھی کچھ دن پہلے ہی اس گینگ میں شامل ہوا تھا۔ ”تم کن سوچوں میں گم ہو جونی؟“ دلاور خان اچانک مجھ سے مخاطب ہوا۔

”میں آپ لوگوں کی باتیں سن رہا ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”تمہارے خیال میں ہمارا یہ منصوبہ قابلِ عمل ہے؟“

”اس میں کئی جگہ جھول ہیں۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے کیونکہ ابھی کچھ دن پہلے ہر فرد دلاور کے اس منصوبے کی تعریف کر چکا تھا۔

”مثلاً کیسے جھول؟“ جمی نے درشت لہجے میں پوچھا۔ اسے اپنی دراز قامت، ورزشی جسم اور پُرکشش شخصیت پر بہت ناز تھا۔ میری شمولیت سے اس کی یہ خصوصیات ماند پڑ گئیں۔ میرا قد اس سے بھی ایک انچ زیادہ یعنی چھ فٹ ایک انچ تھا۔ جسم بھی اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ کسرتی اور مضبوط تھا۔

”پہلے تو تم اپنا لہجہ درست کرو۔“ میں نے بھی درشت لہجے میں کہا۔ ”اس مشن کے لیڈر تم نہیں، دلاور خان ہیں۔“

”ارے یار جونی!“ دلاور خان نے کہا۔ ”تم جمی کی

برا مان گئے، اس کا لہجہ ہی ایسا ہے۔“

”لیکن میں اس لہجے کا عادی نہیں ہوں۔“ میں نے لہجے میں کہا۔

”تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟“ جمی بھڑک کر بولا۔ ”تم اگر کے دوست نہ ہوتے تو...“

”جمی پلیز!“ ثمرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کا ر آلود تھا۔ ”تم تو ہر وقت مرچیں چبائے رہتے ہو۔“

”مجھے خالد یہاں نہ لایا ہوتا تو تم کیا کر لیتے؟“ میں چڑ کر کہا۔

”جونی!“ دلاور خان نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم بتا تھے کہ ہمارے اس پلان میں جھول ہے؟“

”ایک نہیں کئی جھول ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”سب سے معمول یہ ہے کہ بینک کی گاڑی جس سڑک سے گزرے گی، پر گاڑیوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ یہ درست ہے وہاں ٹریفک بہت کم ہے لیکن اب اتنا کم بھی نہیں ہے۔“

”بولتے رہو۔“ دلاور خان نے کہا۔ ”میں تمہارے م اعتراضات کے جوابات ایک ساتھ دوں گا۔ اگر تم نے ت کر دیا کہ اس منصوبے میں واقعی کوئی خامی ہے تو پھر کچھ وچیں گے۔“

”اس میں دوسری خامی یہ ہے کہ ثمرہ کی الٹی ہوئی ی سڑک کے عین درمیان میں دیکھ کر کوئی عقل کا اندھا سمجھ جائے گا کہ یہ کوئی ڈراما ہے۔ گاڑیاں تیز رفتاری کی ہے یا کسی بھی وجہ سے سڑک کے عین بیچ میں نہیں گرتیں لڑھکتی اور گھسٹتی ہوئی سڑک کے دائیں، بائیں کہیں چلی ہیں۔ ہم سڑک کے بجائے گاڑی کو سڑک کے کنارے جگہ الٹ سکتے ہیں جس پر ان گاڑی والوں کی نظر فوراً ہی ئے۔ البتہ ثمرہ خون میں لتھڑی ہوئی سڑک کے درمیان پڑی رہ سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس پلان میں تیسری بنیادی خامی یہ ہے کہ سیکیورٹی کمپنی کی اس بلٹ پروف ی کے گارڈز انتہائی کائیاں ہوتے ہیں۔ ثمرہ کو خون میں ہت دیکھنے کے بعد بھی وہ دونوں گاڑی سے نہیں اتریں بلکہ اندر بیٹھے ہی بیٹھے یا تو پولیس کو ٹیلی فون کر دیں گے یا ثمرہ کو اسی حالت میں چھوڑ کر آگے نکلنے کی کوشش کریں گے۔“

دلاور خان چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ”تمہارا آخری اس واقعی درست ہے۔ یہ نکتہ میرے ذہن سے نکل گیا تھا گارڈز کسی بھی حالت میں اس بلٹ پروف گاڑی سے باہر نہیں آئیں گے۔ یہ سب بے وقوف بھی میری ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔ تمہارا آخری اعتراض واقعی وزن رکھتا ہے۔ اب ہمیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔“

”جمی سے پوچھیں، اس کے ذہن میں کوئی تجویز ہے؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”تم کیا خود کو بہت زیادہ ہوشیار سمجھتے ہو؟“ جمی نے ترش لہجے میں کہا۔

”جمی!“ دلاور نے سخت لہجے میں کہا۔ ”جونی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہارے ذہن میں کوئی بھی تجویز ہے تو بتاؤ۔“

جمی کچھ کھسیانا سا ہو کر بولا۔ ”اس پلان کے ماسٹر مائنڈ تو آپ ہیں باس!“

”میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔“ ثمرہ بولی۔

”تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھو۔“ دلاور نے اسے جھڑک دیا۔ ”تمہاری اس خوب صورت کھوپڑی میں عقل ہے ہی کب؟ اس وقت تو تم یوں بھی نشے میں ہو۔“ پھر دلاور، شوکت عرف شوکی سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں شوکی! تم کیا کہتے ہو؟“

”باس! پلاننگ کرنے سے پہلے ہم بھول گئے تھے کہ سیکیورٹی ایجنسی کا ڈرائیور اور گارڈز کسی بھی قیمت پر باہر نہیں نکلتے۔ انہیں ایجنسی کی طرف سے بہت سختی سے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ کسی بھی صورت میں گاڑی سے باہر نہیں آنا ہے۔ میرے ذہن میں تو ایسی کوئی بھی تجویز نہیں ہے جس کے ذریعے ان گارڈز کو باہر نکالا جائے۔“

”جونی! تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟“

سب سے رائے لینے کے بعد دلاور نے مجھ سے پوچھا۔
''باس! فی الحال تو میرے ذہن میں بھی کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ میں کل تک آپ کو بتا سکتا ہوں۔''
''اوکے، میں تم سب کو دو دن دیتا ہوں۔ ابھی ہمارے پاس پندرہ دن کا وقت ہے۔''
پھر ایک ایک کر کے سبھی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمروں میں چلے گئے۔
دلاور نے یہ فلیٹ کچھ عرصے کے لیے کرائے پر لیا تھا۔
میں اپنے کمرے میں آیا ہی تھا کہ ثمرہ جھومتی لچکتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ شراب کی حدت سے تمتما رہا تھا اور اس حالت میں بھی وہ مزید حسین اور دل کش لگ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر دل آویز انداز میں مسکرائی۔
میں نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
وہ مترنم لہجے میں بولی۔ ''ہائے ہینڈسم! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''
''میں بہت تھک گیا ہوں ثمرہ!'' میں نے کہا۔ ''اس لیے فی الحال تو میں سونے کی تیاری کر رہا ہوں۔ باتیں تو ہم صبح بھی کر سکتے ہیں۔''
''نہیں...'' وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔''
''ایسا کرو، تم دو تین پیگ اور لے لو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''بہت شان دار نیند آئے گی۔''
''تم کیسے بدذوق ہو جونی!'' وہ جھنجلا کر بولی۔ ''تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو؟''
''میں کچھ بھی نہیں سمجھتا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔
''یہی بات اکثر جمی کہتا ہے۔ میں...''
''اس گھٹیا آدمی کا تو نام بھی مت لو میرے سامنے۔'' ثمرہ نے بپھر کر کہا۔ ''خود کو ہیرو سمجھتا ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ دنیا کی ہر لڑکی پہلی ہی نظر میں اس پر عاشق ہو جائے گی۔''
''ہینڈسم تو خیر وہ ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اس میں ہر وہ خوبی موجود ہے جسے لڑکیاں پسند کرتی ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔
''چھچھورا آدمی ہے۔'' ثمرہ نے کہا۔ ''کسی دن میں سب کے سامنے اسے اپنی اس لمبی ہیل کی سینڈل سے ماروں گی۔''
''اچھا، ابھی تو تم جا کے آرام کرو اور مجھے بھی سونے دو۔ صبح ہم اس موضوع پر تفصیل سے بات کریں گے... اوکے۔''
ثمرہ نے مجھے گھور کر دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ ''میں نے آج تک تم جیسا بدذوق آدمی نہیں دیکھا۔'' یہ کہہ کر وہ لہراتی، بل کھاتی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جلدی سے کمرا اندر سے بند کر لیا اور لائٹ آف کر کے لیٹ گیا۔
میں نے ثمرہ سے جھوٹ بولا تھا کہ مجھے نیند آرہی ہے۔ میری آنکھوں میں تو نیند کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں کیا تھا اور کیا بن گیا تھا؟ میرا ماضی گویا فلم کی صورت میں میرے ذہن کی اسکرین پر چل رہا تھا۔ اس میں کچھ تصویریں بہت دھندلی تھیں اور کچھ آئینے کی طرح شفاف تھیں۔

☆☆☆

میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں صرف امی ہی کو دیکھا۔ ابو کا انتقال میرے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ مجھے تو ان کی شکل بھی یاد نہیں۔ ہاں، میں نے ان کی بہت سی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ بہت وجیہہ اور خوب رو شخصیت کے مالک تھے۔ امی بھی کچھ کم حسین نہیں تھیں۔
ابو کسی سرکاری ادارے میں سترہ گریڈ کے ملازم تھے اور وہ ہمارے لیے نارتھ ناظم آباد میں صرف چار سو گز کا ایک بنگلا چھوڑ گئے تھے۔
امی خاصی سمجھ دار اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ انہوں نے بنگلے کی بالائی منزل کو کرائے پر اٹھا دیا اور خود ایک اسکول میں ملازمت کر لی۔ مکان کا کرایہ، ابو کی پنشن اور امی کی تنخواہ ملا کر اتنا ہو جاتا تھا کہ ہمارے تمام اخراجات بہ خیر وخوبی پورے ہو رہے تھے۔
میں ان دنوں شاید ساتویں کلاس میں تھا کہ میرے تایا اپنے خاندان سمیت ہم سے ملنے آئے۔ ان کا بڑا بیٹا یوسف ان دنوں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں تھا اور جلد ہی پاس آؤٹ ہو کر سیکنڈ لیفٹیننٹ بننے والا تھا۔ اس کے تو مزاج ہی نہیں مل رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اکیڈمی سے فارغ ہو کر براہِ راست پاکستان آرمی کا کمانڈر چیف ہو جائے گا۔ اس سے چھوٹی ماریہ تھی۔ وہ بھی انتہائی نخریلی لڑکی تھی۔ نہ جانے ان لوگوں کو کس بات کا زعم تھا؟ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ تایا ہمارے مقابلے میں زیادہ خوش حال تھے۔ اس وقت ان کے پاس پرانی سی ایک گاڑی بھی تھی۔
ان بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی فریحہ تھی جو عمر

مجھ سے شاید دو تین سال چھوٹی تھی۔ وہ اس عمر میں بھی بہائی سیدھی سادی، سلجھی ہوئی اور ذہین لڑکی تھی۔ مجھے تایا کھر والوں... میں بس فریحہ ہی اچھی لگتی تھی۔
کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب ہم سب لاؤنج میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے تو امی نے ہنس کر کہا۔ ''بھائی صاحب! میں چاہتی ہوں کہ میرا عمران بھی پڑھ لکھ کر فوجی افسر بنے۔''
''فوجی افسر ایسے نہیں ہوتے ہیں چچی جان۔'' یوسف بھائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس کے لیے بہت مشقت اور محنت جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھلا کیا فوجی افسر بنے گا؟''
امی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔
تایا جان نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں ہاں سلمٰی بہن! اگر عمران محنت سے پڑھے گا تو فوجی افسر ضرور بنے گا۔''
''اس میں کون سی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے بھائی!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''آرمی میں جانے کے لیے انٹرمیڈیٹ ہونا ہی ضروری ہے۔ یوسف بھائی بھی تو انٹرمیڈیٹ ہیں۔ دو سال فیل ہونے کے بعد فوج میں گئے تھے۔ تایا جان تو انہیں انجینئر بنانا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے تو محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔''
میری بات سن کر وہاں لمحے بھر کو سناٹا چھا گیا۔
امی نے گھور کر مجھے دیکھا پھر وہ کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ ماریہ چمک کر بولی۔ ''تم تو انٹرمیڈیٹ بھی پاس نہیں کر سکے۔''
''یہ تو خیر وقت بتائے گا ماریہ باجی!'' میں نے کہا۔ ویسے معاف کیجیے گا، ابھی میٹرک کے امتحان میں تو آپ بھی فیل ہو چکی ہیں۔''
ہماری اس تلخ کلامی سے تایا جان کا موڈ آف ہو گیا۔ یوسف بھی مسلسل مجھے گھور رہا تھا اور ماریہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے کچا چبا جائے گی۔
پھر وہ لوگ زیادہ دیر نہیں رکے۔
ان کے جانے کے بعد امی نے ڈانٹا۔ ''عمران! کیا ضرورت تھی یوسف سے یہ باتیں کرنے کی؟''
''امی! ان کا رویہ آپ نے دیکھا تھا۔ وہ کیا خود کو پاکستان آرمی کا ٹھیکے دار سمجھتے ہیں؟ وہ یہ بات حتمی انداز میں ایسے کہہ رہے تھے کہ میں آرمی میں نہیں جا سکتا۔''
''وہ بڑے ہیں بیٹا... اگر انہوں نے ایسی کوئی بات کہہ بھی دی تھی تو اسے درگزر کر دیتے لیکن تم نے تو ماریہ سے بھی بدتمیزی کر لی۔ پھر تمہیں کون سا ان سے اپنی ذہانت اور قابلیت کی سند لینا ہے۔ تم نے کیسی بدتمیزی سے یوسف کو جتایا کہ وہ انٹر میں دو سال فیل ہونے اور انجینئرنگ کالج میں داخلہ نہ ملنے پر فوج میں گیا ہے۔''
''وہ بھی اس لیے کہ یوسف بھائی کے ماموں فوج میں اچھے عہدے پر فائز ہیں اور آج کل جی ایچ کیو میں ہیں ورنہ شاید انہیں یہ ملازمت بھی نہ ملتی۔''
''عمران بیٹا! دوسروں پر تنقید کرنے کے بجائے انسان کو اپنی فکر کرنا چاہیے۔ ان لوگوں کی باتوں سے اب میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ تم پاکستان آرمی جوائن کرو گے اور میرٹ پر کرو گے۔''
انکل مسعود ابو کے بہت پرانے دوست تھے اور ان دنوں کیڈٹ کالج پٹارو میں تعینات تھے۔ انکل مسعود کی کوشش اور میری محنت سے بالآخر میرا داخلہ کیڈٹ کالج سرائے عالمگیر میں ہو گیا۔
میں سال میں دو دفعہ چھٹی پر آتا تھا۔ ایک ہی سال میں میری شخصیت ہی بدل کر رہ گئی۔ ملٹری اکیڈمی کی طرح وہاں علی الصباح اٹھنا پڑتا تھا۔ پریڈ بھی ہوتی تھی اور کھیلوں میں حصہ لینا بھی ضروری تھا۔
میرے انٹر کے امتحانات میں ایک مہینا باقی تھا۔ کیڈٹس کو امتحانات کی تیاری کے لیے ایک مہینے کی چھٹی دے دی گئی تھی۔
میں گھر پہنچا تو امی بہت پریشان تھیں۔ میں نے ان سے کئی دفعہ پریشانی کا سبب پوچھا لیکن وہ ٹال گئیں۔
میرے بہت زیادہ اصرار پر انہوں نے بتایا کہ کرائے داروں نے گزشتہ ایک سال سے کرایہ دیا ہے، نہ بجلی اور گیس کا بل۔
''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا ان بے چاروں کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں؟ ان کے گھر میں تو تین تین کمانے والے ہیں پھر انہیں کیا مجبوری ہے؟''
''کوئی مجبوری نہیں ہے۔'' امی نے کہا۔ ''بس وہ ڈھٹائی پر آمادہ ہیں اور مکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔''
''آپ نے پولیس میں رپورٹ نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔
''کی تھی۔'' امی نے کہا۔ ''لیکن پولیس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ دیوانی کیس ہے۔ اس میں پولیس کچھ نہیں کر سکتی، آپ کورٹ میں جائیں۔''
''کورٹ میں جائیں؟'' میں نے کہا۔ ''کورٹ میں تو

ایسے مقدمات برسوں چلتے ہیں امی۔"

"بھائی شریف بھی یہی کہہ رہے تھے۔" شریف انکل شروع سے ہمارے پڑوسی تھے اور ہمارے ان سے گھریلو تعلقات تھے۔ "ہم زبردستی بھی ان سے مکان خالی نہیں کرا سکتے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کیا جائے؟"

میں خود بھی پریشان ہوگیا۔ وہ لوگ گزشتہ دس سال سے ہمارے کرائے دار تھے۔ انہوں نے کبھی کرایہ بھی نہیں بڑھایا تھا اور اب تو سرے سے کرایہ دینے ہی سے انکار کردیا تھا۔ ان برسوں میں ان کے بچے جوان ہوچکے تھے اور بقول انکل شریف کے ان کی صحبت اچھی نہیں تھی۔ وہ لوگ نہ صرف بات بات پر لڑائی جھگڑا کرتے تھے بلکہ آتے جاتے لڑکیوں کو بھی تنگ کرتے تھے۔

میں ساری رات اس موضوع پر سوچتا رہا۔ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں تھا۔

میں نے رات ہی میں ایک فیصلہ کرلیا۔ دوسرے دن شام کو میں گھر سے نکل گیا۔ ڈیفنس کے علاقے میں میرا ایک کلاس فیلو ناصر رہتا تھا۔ ہم دونوں چھٹیوں میں ایک ساتھ کراچی آتے تھے۔ وہ ہاسٹل کے کمرے میں بھی میرے ساتھ رہتا تھا اس لیے اس سے میری بہت اچھی دوستی تھی۔

اس کے والد آرمی میں بریگیڈیئر تھے۔ میں سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوگیا اور بولا۔ "عمران! اگر تو پانچ منٹ لیٹ ہوجاتا تو میں تجھے گھر پر نہیں ملتا۔"

"کیا کہیں جانے کا پروگرام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یار! میں تیری ہی طرف آرہا تھا۔"

اسی وقت ناصر کے پاپا انکل اکبر اور آنٹی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر خوش ہوگئے۔ آنٹی نے ہنس کر کہا۔ "ارے عمران! تم کب آئے؟"

"آنٹی! بس ابھی آکر بیٹھا ہوں۔"

انکل اور آنٹی امی کی خیریت پوچھتے رہے، پھر وہ لوگ کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ انہیں کسی پارٹی میں جانا تھا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے ناصر سے کہا۔ "یار ناصر! میں ایک عجیب پریشانی میں گرفتار ہوں۔"

"کیسی پریشانی؟" ناصر چونک کر بولا۔

میں نے اسے تفصیل سے کرائے داروں کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔

ناصر بھی سوچ میں پڑ گیا۔

میں نے کہا۔ "میرے پاس اس کا ایک حل ہے۔"

ناصر نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولا۔ "کیسا حل؟"

میرے ذہن میں جو تجویز تھی، میں نے اسے بتادی۔

"یار! کام تو خطرناک ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

"تیرے پاس گاڑی تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں گاڑی تو موجود ہے۔"

"پھر چل، ابھی ان میں سے کوئی گھر میں مل جائے گا۔ اسے گھر سے بلا کر تُو لائے گا کیونکہ مجھے تو وہ پہچانتے ہیں۔"

ناصر نے گاڑی نکالی اور ہم لوگ نارتھ ناظم آباد روانہ ہوگئے۔ گھر سے کچھ فاصلے پر ناصر نے مجھے اتار دیا اور خود ہمارے کرائے داروں کی طرف چلا گیا۔ میں نے اسے کرائے داروں کے نام بتادیے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ کرائے داروں کے منجھلے بیٹے کو گاڑی میں لے کر میرے پاس پہنچا۔ میں بھی عقبی نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

"آپ کچھ بتائیں تو سہی، آپ مجھے کہاں لے جارہے ہیں؟" کرائے داروں کے منجھلے بیٹے رشید نے پوچھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمیں آپ سے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔ آپ کے تعلقات تو بڑے بڑے لوگوں سے ہیں۔"

یہ سن کر وہ مزید گردن اکڑا کر بیٹھ گیا۔

یونیورسٹی روڈ پر ایک ویرانے میں ہم دونوں نے اسے گاڑی سے باہر نکالا اور اس کی اس بُری طرح مرمت کی کہ وہ ادھ موا ہوگیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں فریکچر ہوگیا اور کئی دانت بھی ٹوٹ گئے۔ پھر ہم نے اس سے کہا۔ "اگر دو دن کے اندر اندر تم لوگوں نے میرے تمام بقایاجات اور کرایہ نہ دیا تو میں آئندہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

پھر ہم اسے اس کے دروازے پر چھوڑ کر چلے گئے۔

ناصر کے دوست فیصل کے بھائی ایس ایس پی تھے۔

ہم سیدھے ان کے پاس پہنچے اور انہیں سارا واقعہ سنادیا۔

وہ پہلے تو بہت ناراض ہوئے، پھر اس شرط پر راضی ہو گئے کہ ہم آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ ہم نے فوراً وعدہ کرلیا۔

وہ مسکرا کر بولے۔ "تم لوگ شام چھ بجے سے رات کے نو بجے تک میرے ساتھ تھے۔ بس اب تم جاؤ اور آئندہ کوئی شکایت نہیں آنی چاہیے۔"

اسی دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سعید صاحب کی بیٹی کلثوم گھر کا سارا زیور اور نقدی لے کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی اور جاتے جاتے بس ایک خط چھوڑ گئی کہ میں اپنی مرضی سے جارہی ہوں، مجھے تلاش نہ کیا جائے۔

سعید صاحب نے تین دن کے اندر اندر نہ صرف مکان خالی کردیا بلکہ میرے تمام بقایاجات بھی ادا کردیے۔

میں اکیڈمی میں تقریباً ہر آؤٹ ڈور گیم کھیلتا تھا۔ نہ صرف کھیلتا تھا بلکہ اس کا چیمپئن بھی تھا۔ ان میں باسکٹ بال، ہاکی، فٹ بال، باکسنگ، کراٹے اور سوئمنگ شامل ہے۔ اسکواش میں یوں نہیں کھیلتا تھا کہ باسکٹ بال اور اسکواش میں سے کوئی ایک کھیل کھیل سکتا تھا کہ دونوں کے لیے اتنا ہی اسٹیمنا اور محنت درکار ہوتی ہے۔

پاکستان ملٹری اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد مجھے پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین میں بھیج دیا گیا۔ میں نے "انفنٹری" کا انتخاب کیا تھا۔ وہاں چند ہی ماہ میں میری صلاحیتیں دیکھتے ہوئے مجھے اسپیشل سروسز گروپ (ایس ایس جی) کے لیے منتخب کرلیا گیا اور ٹریننگ کے لیے کوئٹہ بھیج دیا گیا۔

ان دنوں ملک میں امن وامان کی صورتِ حال بہت ابتر تھی۔ سوویت یونین کی پسپائی کے بعد افغانستان کے جنگجو سردار اقتدار کے لیے آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانے میں مصروف تھے۔ ان کے پاس امریکا کا دیا ہوا اور سوویت یونین سے چھینا ہوا بے تحاشا اسلحہ تھا۔ وہی اسمگل ہو کر پاکستان بھی آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ منشیات کی لعنت بھی پاکستان میں عام ہوگئی تھی اور افغانستان کی منشیات مافیا روز بروز زور پکڑ رہی تھی۔

ہماری انٹیلی جنس ایجنسیز کی رپورٹ کے مطابق افغانستان اور کشمیر سے پناہ گزینوں کے روپ میں بھارتی خفیہ ایجنسی "را" اور اسرائیلی ایجنسی موساد کے بے شمار ایجنٹ پاکستان میں سرگرم عمل تھے۔ امریکن سی آئی اے کے لوگ تو کھلے عام ملک میں دندناتے پھرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے امریکا اور اسرائیل نے بہت سے بے ضمیر مقامی لوگوں کو خرید لیا تھا۔ وہ لوگ پاکستان کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے اور ہماری خفیہ ایجنسیاں ان کا سراغ لگانے میں مصروف تھیں۔ میں اس وقت تک اپنی ایس ایس جی کی ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد کیپٹن کے عہدے پر پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

وہ میری زندگی کی بدترین شام تھی جس نے میرا کیریئر تباہ کرکے مجھے سیاہ بختی کے اندھیروں میں دھکیل دیا تھا۔ اس دن ہمارے اعزاز میں خصوصی ڈنر تھا۔ ڈنر میں اکثریت ایس ایس جی کے لوگوں کی تھی۔ صرف چند اعلیٰ افسران ہی ہمارے علاوہ تھے۔ ناصر بھی کمیشن حاصل کرنے کے بعد بلوچستان کی بلوچ رجمنٹ میں تعینات تھا۔

اس ڈنر میں اہم بات یہ تھی کہ انکل اکبر بھی شریک تھے۔ وہ اب میجر جنرل ہوچکے تھے اور دو ماہ بعد ریٹائر ہونے والے تھے۔

اچانک ہال میں مجھے میجر بابر دکھائی دیا۔ وہ مجھ سے بہت خار کھاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے نہ صرف اس کی باسکٹ بال چیمپئن شپ چھین لی تھی بلکہ باکسنگ رنگ میں بھی اس کی بہت پٹائی لگائی تھی۔ وہ کراٹے کا بھی ماہر تھا لیکن میرا نام سن کر اس نے بیماری کا بہانہ بنا کر مقابلے سے دستبرداری کا اعلان کردیا تھا۔

وہ عام حالات میں مجھ سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔

میں نے اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ وہ میرے پاس آکر رکا تو احتراماً مجھے بھی اٹھنا پڑا اور اسے فوجی انداز میں سلام کرنا پڑا۔

میرے سلام کا جواب اس نے سر کی خفیف سی جنبش سے دیا پھر کرسی کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا۔

اسے وہاں بیٹھتا دیکھ کر میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے کرخت لہجے میں مجھے پکارا۔ "کیپٹن عمران!"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور دل پر جبر کرکے بولا۔

"یس سر!"

"تم مینرز اور ایٹی کیٹس سب کچھ بھول گئے ہو یا پھر سیکھے ہی نہیں ہیں... تم کس پنڈ سے آئے ہو؟"

"پنڈ سے تو سر آپ آئے ہیں۔ میں تو کراچی سے ہوں۔" مجھ سے اس کی بدزبانی ضبط نہ ہوسکی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میجر بابر بپھر کر کھڑا ہوگیا۔

"تم نے مجھے پینڈو کہا؟"

"سر! آپ کا تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس سلسلے میں بھلا کیا کرسکتا ہوں۔" میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ آج اسے ترکی بہ ترکی جواب دوں گا۔

"شٹ اَپ یو باسٹرڈ!" وہ بپھر کر بولا۔

"ایسا ہی کچھ میں آپ کے لیے سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کتے کے بچے! تُو مجھ سے بات کس لہجے میں کررہا

ہے؟"

"تُو بھی تو کسی الّو کے پٹھے سے کم نہیں ہے۔ تجھے کس نے آرمی جوائن کرنے کا مشورہ دیا تھا باسٹرڈ۔" میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر کہا۔

اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ اس وقت تک زیادہ لوگ وہاں پہنچے بھی نہیں تھے۔ میں ہی وقت سے کچھ پہلے آگیا تھا۔

میجر بابر نے گھوم کر میرے چہرے پر مکّا مارنے کی کوشش کی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور جواب میں اتنا زبردست گھونسا اس کے چہرے پر مارا کہ وہ الٹ کر پیچھے کی طرف ایک ٹیبل پر گر گیا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کا گریبان پکڑ کر اٹھایا اور اس کا چہرہ پوری قوت سے اپنے گھٹنے پر دے مارا۔

وہ اذیت ناک انداز میں کراہا اور رکوع کی حالت میں جھک گیا۔ میں نے اسی حالت میں اس کے چہرے پر ایک اور زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ میرا یہ وار بہت خطرناک تھا اور مجھے امید نہیں تھی کہ بابر زندہ بچ سکے گا۔

یہ سب کچھ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہوگیا۔

اچانک کئی آفیسرز نے مجھے پکڑ لیا اور کیپٹن نعیم بولا۔ "عمران! یہ تم کیا کر رہے ہو... تم ہوش میں تو ہو؟" اس نے مجھے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ "تمہارا کورٹ مارشل ہو جائے گا احمق!"

کچھ افسر میجر بابر کو دیکھ رہے تھے جو اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔ اسے فوری طور پر اسپتال بھجوا دیا گیا۔

جس ہال میں کچھ دیر پہلے ہلکے سروں میں موسیقی گونج رہی تھی، وہاں اب موت کا سا سناٹا تھا۔

اچانک بریگیڈیئر عارف صدیقی کی آواز ہال میں گونجی۔ "کیپٹن عمران! یو آر انڈر اریسٹ، ڈونٹ ٹرائی ٹو موو!"

اسی وقت ایم پی (ملٹری پولیس) کے دو چاق و چوبند نوجوان اندر داخل ہوئے اور میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ اب اگر میں نے فرار کی کوشش کی تو وہ پلک جھپکتے میں مجھے گولی مار کے زخمی کر دیں گے۔

"کیپٹن کو کوارٹر گارڈ میں لے جاؤ۔ اس کا فیصلہ صبح کیا جائے گا۔" بریگیڈیئر عارف صدیقی نے کہا۔ وہ بہت دبنگ آفیسر تھے اور ایس ایس جی کے سینئر افسران میں سے ایک تھے۔

مجھے خدشہ تھا کہ میں نے جس بے رحمی سے میجر بابر کو مارا ہے، وہ زندہ نہیں بچ سکے گا پھر پھانسی کا تختہ یا فائرنگ اسکواڈ میرا مقدر ہوگا۔

"سر پلیز!" ملٹری پولیس والوں میں سے ایک بولا۔ میں ابھی تک ملزم تھا اس لیے اس کے لیے قابلِ احترام تھا۔

اس نوجوان نے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ مجھے ہتھکڑی پہنائی گئی تھی، نہ مجھ سے کوئی بدسلوکی کی گئی تھی۔

کوارٹر گارڈ کا فاصلہ وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ جس ہال میں پارٹی ہو رہی تھی، اس کے باہر ایک طرف سوئمنگ پول، لان اور دوسری طرف کھیل کا وسیع و عریض میدان تھا۔ کوارٹر گارڈ اسی میدان کے سرے پر تھا۔ آرمی میں کوارٹر گارڈ عام طور پر ہتھیار رکھنے کے کام آتا ہے۔ وہاں ہمہ وقت کئی سنتری ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ آرمی ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بھی وہیں رکھا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہاں چھوٹے چھوٹے دو تین کمرے بنے ہوتے ہیں۔ وہ گویا ایک طرح سے آرمی کی حوالات ہوتی ہے۔

چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث قیدیوں کو چودہ دن یا اٹھائیس دن کی قید ہوتی ہے۔ ان جرائم کی نوعیت بہت معمولی ہوتی ہے۔ مثلاً کسی جونیئر نے کسی سینئر کا حکم ماننے سے انکار کر دیا یا دو جوان آپس میں لڑ پڑے یا پھر کسی جونیئر نے سینئر آفیسر کے ساتھ تند و تیز لہجے میں بات کی ہو۔

ان معمولی جرائم میں فوجیوں کو چودہ دن اور اٹھائیس دن کی قید برداشت کرنا پڑتی ہے۔ سزا کے طور پر ان کی تنخواہ بھی کاٹ لی جاتی ہے۔

میرا جرم تو بہت زیادہ سنگین تھا۔ میں نے نہ صرف اپنے سینئر آفیسر سے بدکلامی کی تھی بلکہ اس پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا اور اسے اس بے رحمی سے مارا تھا کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ میں جوش میں آکر یہ حرکت کر تو بیٹھا تھا لیکن دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ میجر بابر کی جان بچ جائے۔

کمرے سے باہر نکلتے ہی ایم پی کے ان دونوں نوجوانوں نے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیے وہ مجھ سے خاصے محتاط فاصلے پر چل رہے تھے۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں اگر فرار ہونے کی کوشش کرتا تو ایم پی والوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔ وہ میری ٹانگوں پر فائر کرتے اور میں معذور ہو کر اسپتال پہنچ جاتا۔

میں نے اچانک وہاں سے فرار ہونے کا رسک لینے کا

فیصلہ کر لیا۔ میں چلتے چلتے اچانک لڑکھڑایا اور زمین پر گر پڑا۔ گرنے کا انداز اتنا بے ساختہ اور فطری تھا کہ میرے بازو اور کہنیاں چھل گئیں۔ اگر میں گرنے میں احتیاط کرتا تو ایم پی والے کبھی دھوکا نہ کھاتے۔ ایس ایس جی کی طرح ان کی ٹریننگ بھی خاصی بہترین ہوتی ہے۔

ان میں سے ایک جوان جھپٹ کر آگے بڑھا اور مجھے سہارا دیتے ہوئے بولا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں سر؟"

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ بس چلتے چلتے چکر سا آگیا۔"

ایم پی کا دوسرا نوجوان اب بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی چوکنا نظر آرہا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر اٹھنے میں کچھ دیر لگائی، پھر پلک جھپکتے میں نوجوان کے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔

دوسرے ہی لمحے ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اسی نوجوان کو ڈھال بنایا اور ڈپٹ کر دوسرے سے بولا۔ "اپنی گن پھینک دو ورنہ میں تم دونوں کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔ میجر بابر اب تک مر گیا ہوگا۔ مجھے ایک قتل کی بھی اتنی ہی سزا ملے گی جتنی تین قتل کرنے پر۔ جلدی کرو ورنہ میں فائر کر دوں گا۔"

"سر! یہ آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔" مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے دوسرے نوجوان نے کہا۔

"ہری اپ! ڈراپ دا گن؟" میں نے غرا کر کہا۔

اس نے بہت بے دلی سے اپنا ریوالور پھینک دیا۔

"اب دوسری طرف گھوم جاؤ۔" میں نے اسے حکم دیا۔ وہ فوراً دوسری طرف گھوم گیا۔

میدان میں اس وقت دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ دور لان میں سوئمنگ پول کے پاس کچھ افسر بیٹھے تھے لیکن میدان میں اتنی تاریکی تھی کہ وہاں سے کچھ نظر نہیں آرہا ہوگا۔

اس کے گھومتے ہی میں نے پہلے اس نوجوان کے سر پر ریوالور کے دستے سے ضرب لگائی جو میرے قبضے میں تھا، پھر میں اسے ناک آؤٹ کرنے کے بعد دبے پاؤں آگے بڑھا اور دوسرے نوجوان کی کھوپڑی پر بھی پشت سے وار کر دیا۔ اس نے لڑکھڑا کر سنبھلنے کی کوشش کی پھر وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین بوس ہوگیا۔

انہیں وہیں چھوڑ کر میں تیزی سے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے لیے بھی مجھے میدان عبور کرنا پڑتا لیکن پارکنگ لاٹ کوارٹر گارڈ کی مخالف سمت میں تھا۔ ممکن ہے ان سنتریوں تک بھی یہ اطلاع پہنچ گئی ہو کہ میں نے میجر بابر کو

شدید زخمی کر دیا ہے۔

میں پارکنگ لاٹ میں پہنچا تو وہاں ڈیوٹی پر آر پی (رجمنٹل پولیس) کے دو جوان تھے۔

اسی وقت وہاں ایک گاڑی داخل ہوئی۔ اس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس گاڑی میں میرا ایک ساتھی کیپٹن راشد تھا۔ اس نے میرے نزدیک اپنی گاڑی روکی اور خوش دلی سے بولا۔ ''ہیلو کیپٹن! کیا پارٹی ختم ہو گئی؟''

''نہیں یار، ابھی تو پارٹی شروع ہی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

آر پی کے جوان نے مجھے زوردار انداز میں سیلوٹ کیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ ابھی تک اسے اس واقعے کی اطلاع نہیں ملی ہے۔

میں کیپٹن راشد کے انتظار میں وہیں کھڑا ہو گیا۔ وہ گاڑی سے اتر کر میرے پاس آیا اور بولا۔ ''یار عمران! مجھے لگ رہا ہے کہ آج کی پارٹی میں ہم سب کو کوئی نہ کوئی مشن سونپا جائے گا ورنہ ایسی خصوصی پارٹیاں تو اس وقت ہوتی ہیں جب گروپ کے اعلیٰ افسران بھی موجود ہوں۔''

''ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں جنرل رحمان صاحب کے بنگلے پر جا رہا ہوں۔ ان کی ڈائری وہاں رہ گئی ہے۔''

''یار! تم ہو بہت لکی۔'' راشد ہنس کر بولا۔ ''جنرل رحمان تو اپنے سائے پر بھی اعتبار نہیں کرتے اور وہ تم سے اپنی ڈائری منگوا رہے ہیں۔''

''او کے یار! تم چلو، میں ابھی دس منٹ میں آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ٹہلتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے بہت خوفناک انداز میں ریورس کیا۔ جب میں پارکنگ ایریا سے باہر نکلا تو آر پی والے نے ایک بار پھر مجھے بہت زوردار انداز میں سیلوٹ کیا۔ میں نے تیزی سے اپنی گاڑی باہر نکال لی۔

مین روڈ پر آتے ہی میں نے گاڑی کو تیزی سے دوڑانا شروع کر دیا۔ میں کم سے کم وقت میں وہاں سے دور جانا چاہتا تھا۔ اب تک میرے فرار کا علم ہو چکا ہوگا اور ایس ایس جی کے تربیت یافتہ افراد کے ساتھ ساتھ ملٹری پولیس بھی میری تلاش میں نکل پڑی ہوگی۔

سیالکوٹ یوں بھی زیادہ بڑا شہر نہیں تھا۔ میری گاڑی بھی جانی پہچانی تھی۔ میں نے مین روڈ سے گاڑی ایک گاؤں کی طرف موڑ لی اور کئی کلومیٹر اس پگڈنڈی پر چلنے کے بعد میں نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ اپنا ضروری سامان اس میں سے نکالا اور گاڑی وہیں چھوڑ کر پیدل ہی تیزی سے مین روڈ کی طرف چل دیا۔ میں نے گاڑی وہاں صرف ملٹری پولیس کو بھٹکانے کے لیے چھوڑی تھی۔ وہ یہی سمجھتے کہ میں فرار ہو کر اس گاؤں کی طرف گیا ہوں۔

میں مین روڈ کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ وہاں آگے پیچھے کئی جیپیں اور گاڑیاں آ گئیں۔ میں وہیں کھیتوں میں دبک گیا۔

دو تین گاڑیاں مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئیں۔ دو گاڑیاں وہیں رک گئیں۔

ان گاڑیوں میں سے میرے دو ساتھی کیپٹن خرم اور میجر شاہد باہر نکلے۔ وہ دونوں انتہائی ذہین اور زیرک افسران تھے۔

چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے ان کے چہرے آ رہے تھے۔

میجر شاہد نے دو تین گہرے گہرے سانس لیے اور بولا۔ ''کیپٹن! مجھے سگریٹ کے دھوئیں کی بو محسوس ہو رہی ہے۔ یہ برانڈ عمران ہی کا ہے۔ وہ اسی طرف سے گزرا ہے۔ شاید یہاں کچھ دیر کے لیے رکا بھی ہو۔''

میں نے خود کو لعنت ملامت کی کہ میں نے وہاں ٹھہر کر سگریٹ کیوں پی؟ میں عادی سگریٹ نوش نہیں تھا لیکن ٹینشن کے عالم میں اور کبھی کبھی شوقیہ پی لیا کرتا تھا۔

''میرے خیال میں عمران اس طرف گیا ہے۔'' میجر شاہد نے کہا اور بولا۔ ''آؤ، اس طرف چلتے ہیں۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔''

وہ دونوں اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے تو میجر شاہد نے کہا۔ ''کیپٹن! تم اپنی گاڑی یہیں کہیں پارک کر دو۔ عمران خطرناک کمانڈو ہے۔ ہم دونوں کا ساتھ رہنا ضروری ہے۔ وہ تو اس وقت اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ ہمارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا۔''

''آپ درست کہہ رہے ہیں سر!'' کیپٹن نے کہا اور اپنی جیپ اس انداز میں کھڑی کی کہ وہ سڑک سے پہلی نظر میں نظر نہیں آ سکتی تھی۔

وہ دونوں اسی کچے راستے پر روانہ ہو گئے۔

اچانک میجر نے اپنی جیپ روک دی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے جیپ عین اس جگہ روکی جہاں میں ہوا تھا۔

''کیپٹن!'' میجر شاہد نے کہا۔ ''عمران یقیناً اسی طرف ہے۔ یہ دیکھو، یہاں اس کی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات ہیں۔ اس کے پاس ٹویوٹا کرولا ہے نا؟''

''جی سر!'' کیپٹن نے کہا۔

''یہ ٹویوٹا کرولا ہی کے ٹائروں کے نشانات ہیں۔ اب بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' یہ کہہ کر میجر آگے بڑھ گیا۔

کیپٹن خرم کی جیپ وہیں کھڑی تھی۔ میں جھپٹ کر کھیتوں سے نکلا اور کیپٹن خرم کی جیپ کی طرف دوڑا۔ میں نے انتہائی مہارت سے اس کا اگنیشن ڈائریکٹ کیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے برق رفتاری سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے امید تھی کہ مجھے تلاش کرنے والے دوسرے افراد نے وہ جیپ دیکھ بھی لی تو زیادہ دھیان نہیں دیں گے۔ اس جیپ پر آرمی کا مخصوص نمبر تھا۔ وہ لوگ یہی سمجھتے کہ آرمی کا کوئی افسر عمران کو تلاش کر رہا ہے یا پھر کہیں جا رہا ہے۔

میں نے فیول گیج پر نظر ڈالی تو میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس میں پیٹرول برائے نام تھا پھر اچانک مجھے گاڑی کے پیچھے لگے ہوئے پیٹرول کینز کا خیال آیا۔

میں نے گاڑی روکی اور کین کھول کر اس میں سے پیٹرول گاڑی میں ڈال لیا۔ اس کے بعد میں پھر انتہائی برق رفتاری سے روانہ ہو گیا۔

چند کلومیٹر چلنے کے بعد مجھے ایک مرتبہ پھر مایوسی نے گھیر لیا۔

فوجیوں نے سڑک پر بیریئر لگا کر راستہ بلاک کر رکھا تھا۔

میں نے سوچا کہ اگر ان لوگوں میں سے کوئی مجھے پہچانتا ہوگا تو یقیناً مجھے روکنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے ریوالور نکال کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر مجھے ان لوگوں نے روکنے کی کوشش کی تو میں انہیں گولی مار کے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ اس وقت مجھ پر عجیب سا ایک جنون سوار تھا۔

چیک پوسٹ کے پاس کھڑے ہوئے دونوں سنتریوں نے میری جیپ دیکھی، پھر مجھے سیلوٹ کیا اور بیریئر ہٹا دیا۔

میں نے جیپ روک لی تھی۔ میں نے انہیں اشارے سے اپنے نزدیک بلایا اور پوچھا۔ ''تم لوگوں نے کسی وائٹ کرولا کو تو یہاں سے گزرتے نہیں دیکھا؟''

''نو سر!'' ان میں سے ایک مستعد انداز میں بولا۔

''اس کرولا کا نمبر پرائیویٹ ہے۔ وہ کیپٹن عمران صاحب کی ذاتی گاڑی ہے۔'' اس نے مجھے میری گاڑی کا نمبر بھی بتا دیا۔ میں انہیں محتاط رہنے کی تاکید کر کے آگے بڑھ گیا۔

میں نے جیپ ایک مرتبہ پھر خوفناک انداز میں دوڑانا شروع کر دی۔

سیالکوٹ سے بیس بائیس کلومیٹر دور آنے کے بعد بھی خطرہ نہیں ٹلا تھا۔ ایس ایس جی والے اتنی آسانی سے کسی کی جان نہیں چھوڑتے۔

ان لوگوں کو اب یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں کیپٹن خرم کی جیپ میں فرار ہوا ہوں۔ مجھے اب جلد ہی اس جیپ سے بھی پیچھا چھڑانا تھا۔ یوں بھی اس میں پیٹرول اب ختم ہونے والا تھا۔ پھر وہ جیپ مزید چند کلومیٹر چلی اور دو تین جھٹکے لے کر بند ہو گئی۔

میں نے دھکیل کر جیپ کو کچے میں اتار دیا اور خود پیدل ہی روانہ ہو گیا۔

چلتے چلتے اچانک سڑک کے ایک کچے راستے سے مجھے کچھ روشنیاں دکھائی دیں۔

میں چونک اٹھا اور اپنا ریوالور نکال کر فوری طور پر جھاڑیوں میں گھس گیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس نہ تو اتنے نیچے ہوتے ہیں، نہ اتنے مدھم۔ غور سے دیکھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ کچھ بیل گاڑیاں ہیں جن کے نیچے روشنی کے لیے لالٹینیں لٹک رہی ہیں۔

وہ بیل گاڑیاں کچھ نزدیک آئیں تو میں سڑک پر آ گیا۔

مجھے دیکھ کر ایک کتا غراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ گویا ان لوگوں کے ساتھ کتے بھی تھے۔

بیل گاڑی سے فوراً ہی ایک شخص کود کر نیچے آیا اور اس نے کتے کو ڈانٹا پھر پنجابی میں بولا۔ ''صاحب جی! معاف کرنا۔ میرے کتے کی وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''لیکن آپ اس وقت جا کہاں رہے ہیں؟''

''میری گاڑی خراب ہو گئی ہے اور مجھے فوراً یہاں سے نکلنا بھی ہے۔ میرے کچھ دشمن پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائیں گے۔''

''اس کی آپ فکر ہی نہ کرو صاحب۔'' دوسرا آدمی بولا۔ ''ہم بھی سات آٹھ بندے ہیں۔ اور ہمارے پاس کلہاڑیاں اور گنڈاسے بھی ہیں۔''

''وہ کلہاڑیوں اور گنڈاسوں سے لڑنے والے لوگ

نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان کے پاس پستول اور رائفلیں ہیں۔ وہ لوگ خود کو فوجی ظاہر کر رہے ہیں اور لوگوں سے یہی کہہ رہے ہیں کہ ان کا ایک آدمی قتل کر کے بھاگا ہے۔"

"آپ ایسا کرو، میری گاڑی میں آجاؤ۔" وہی شخص بولا جس نے مجھے کتّے سے بچایا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"نام تو جناب دین محمد ہے لیکن سب لوگ مجھے دینو کہتے ہیں۔"

"تم لوگ جا کہاں رہے ہو؟"

"ہم لوگ اپنے گاؤں جا رہے ہیں۔ وہ چھوٹا سا گاؤں ہے اور یہاں سے بیس ایک میل تو ہوگا۔ آپ ادھر پیال میں چھپ جاؤ۔ میں آپ کے اوپر یہ پیاز اور ٹماٹر ڈھیر کر دوں گا۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ آپ ہمارے ساتھ ہو۔"

"تمہارے گاؤں سے لاہور کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"لاہور تو صاحب جی بہت دور ہے۔ ہاں، ہمارے گاؤں سے کچھ فاصلے پر وزیر آباد ہے۔"

وہ لوگ مجھے چھپا کر چلے ہی تھے کہ دو گاڑیاں تیزی سے آکر وہاں رک گئیں۔

"کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟" کسی نے گرج دار آواز میں پوچھا۔ میں وہ آواز پہچان گیا۔ وہ ہمارے ایس ایس جی کے ایک آفیسر میجر خورشید کی آواز تھی۔

"ہم لوگ اپنے گاؤں جا رہے ہیں سرکار۔" دینو نے جواب دیا۔ "آج کل دن میں بہت گرمی ہوتی ہے اس لیے ہم رات میں سفر کرتے ہیں۔ ہم ان سبزیوں کے لیے ایک دوسرے گاؤں گئے تھے۔"

"تم نے کسی فوجی جیپ کو تو یہاں سے گزرتے نہیں دیکھا؟" میجر نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"کئی گاڑیاں گزری ہیں۔ ان میں سے ایک کار اور دو تین جیپیں تھیں۔"

"سر! ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ان میں سے کس میں ہمارے آدمی سوار تھے اور کس میں عمران تھا۔" میرے کانوں میں صوبیدار حسین بخش کی آواز آئی۔

پھر وہ گاڑیاں آگے بڑھ گئیں۔

بیل گاڑیاں خستہ سڑک سے ایک پگڈنڈی پر اتریں تو دینو نے مجھے پیاز اور آلوؤں کے ڈھیر سے نکال لیا۔

مزید آدھ گھنٹا چلنے کے بعد اس نے کہا۔ "صاحب جی! وزیر آباد یہاں سے دو تین میل کے فاصلے پر ہے لیکن آپ آج ہمارے گاؤں میں آرام کریں۔ کل میں آپ کو وزیر آباد چھوڑ دوں گا۔"

میں نے پہلے تو انکار کرنا چاہا لیکن پھر راضی ہو گیا۔ کل تک وہ لوگ مجھے تلاش کرنے کے بعد مایوس ہو جاتے۔

دوسرے دن میں نے دینو ہی سے اس کے کپڑے لیے اور اپنے کپڑے ایک پوٹلی میں باندھ لیے۔ میرے پاس نقد رقم بھی بہت کم تھی لیکن میں جلد از جلد وہاں سے نکل کر لاہور جانا چاہتا تھا۔ فوری طور پر میں نے کراچی جانے کا ارادہ مسترد کر دیا تھا۔ ملٹری پولیس والے سب سے پہلے میرے گھر ہی پہنچتے۔

ناصر ان دنوں لاہور میں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس موقع پر میری مدد ضرور کرے گا۔

میں لاہور کیسے پہنچا، یہ بھی ایک الگ داستان ہے۔

میں نے ناصر کی رجمنٹ کا ٹیلی فون نمبر تلاش کرنے کے بعد اسے ٹیلی فون کیا۔

وہ میری آواز سن کر بولا۔ "عمران! تو کہاں ہے؟"

"یار! یہ مت پوچھ۔" میں نے کہا۔ "تیرا کیا بھروسا تُو میرے بارے میں انکل کو بتا دے۔"

"تُو مجھے ایسا سمجھتا ہے؟" اس نے خفگی سے کہا پھر ہنس کر بولا۔ "ہاں یار! تیرے لیے ایک خوش خبری بھی ہے۔ میجر بابر بچ گیا ہے لیکن ابھی وہ کافی دنوں ..... تک بیڈ پر رہے گا۔"

"واقعی وہ بچ گیا ہے؟" میں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں یار!" ناصر نے کہا۔ "وہ کچھ زیادہ ہی سخت جان ہے ورنہ تُو نے تو اسے ہلاک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تیرے نمبر سے مجھے یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ تُو لاہور ہی میں ہے۔" ناصر بولا۔ ان دنوں سی ایل آئی نیا نیا پاکستان میں متعارف ہوا تھا اور ٹیلی فون کے ساتھ الگ سے ایک ڈیوائس لگانا پڑتی تھی۔

"میں اس وقت ریلوے اسٹیشن پر ہوں۔ تُو اپنا ایڈریس بتا، میں وہیں آجاتا ہوں۔"

"یار عمران! لگتا ہے اس واقعے نے تیری عقل بھی تجھ سے چھین لی ہے۔ میں لاہور چھاؤنی میں رہتا ہوں۔ یہاں پر صرف فوجی افسر ہیں۔ دو کیپٹن ہمارے بیچ کے بھی ہیں۔ تجھ پر سے صرف ابھی قتل کا کیس ختم ہوا ہے۔ باقی کیس اپنی جگہ پر ہیں۔ تُو وہیں ٹھہر، میں وہاں پہنچتا ہوں۔"

"میں پلیٹ فارم نمبر پانچ پر ہوں۔" میں نے کہا اور پی سی او سے باہر آگیا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر ناصر وہاں پہنچ گیا۔

میں نے اسے پہچان کر اسے آواز دی تو وہ حیرت سے بولا۔ "یار! تُو نے واقعی اپنا حلیہ اتنا بدل لیا ہے کہ پہلی نظر میں تو میں بھی تجھے نہ پہچان سکا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "یہاں میرا ایک دوست علی ہے۔ وہ گلبرگ میں رہتا ہے۔ تُو فی الحال اس کے ساتھ ٹھہر جا، بعد میں کچھ سوچیں گے۔"

"کون علی؟" میں نے پوچھا۔ "آدمی تو بھروسے کے قابل ہے نا؟"

"ہاں، وہ بہت قابلِ اعتبار آدمی ہے۔ تُو اس پر اتنا ہی بھروسا کر سکتا ہے جتنا مجھ پر... لیکن پہلے تجھے اپنا حلیہ درست کرنا پڑے گا۔" ناصر نے کہا۔ "میں تیرے لیے ریڈی میڈ کپڑے خرید لیتا ہوں۔"

"یار! میرا ایک سوٹ تو اس گٹھڑی میں ہے۔" میں نے اسے وہ گٹھڑی دکھائی جس میں میرا سوٹ، جوتے اور ٹائی وغیرہ تھی۔

"اسے ڈرائی کلیننگ کے لیے دے دے۔ میں تجھے ایک دو جوڑے اور ایک بیگ دلوا دیتا ہوں۔"

اس نے مارکیٹ سے میرے لیے دو تین شرٹس، پینٹس، تولیا، ٹوتھ برش، شیونگ کٹ اور ضرورت کا دوسرا سامان خریدا، پھر میں نے وہیں ایک ویٹنگ روم میں غسل کیا، البتہ میں نے شیو نہیں کیا، بس اپنے طور پر خط بنا لیا۔ میں چاہتا تھا کہ داڑھی رکھ لوں تاکہ مجھے پہلی نظر میں کوئی پہچان نہ سکے۔

علی بہت زندہ دل آدمی تھا۔ اس نے بہت پُرتپاک انداز میں میرا خیر مقدم کیا۔ ناصر بھی رات گئے تک میرے ساتھ رہا۔ اس نے علی پر اتنا اعتماد کر لیا کہ اسے میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

علی کسی کام سے باہر گیا تو میں نے ناصر سے کہا۔ "تم نے اس پر اتنا اعتماد کر لیا کہ اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ ملٹری پولیس اور ایس ایس جی والے پورے ملک میں میری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔"

"یار! اسی لیے تو میں نے اسے سب کچھ بتایا تاکہ وہ ہر قسم کے حالات کے لیے پہلے سے تیار رہے۔"

دوسرے دن ناشتے کی میز پر علی نے مجھ سے کہا۔ "عمران صاحب! اب آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"یار! پہلے تو آپ یہ صاحب اور آپ کے تکلفات چھوڑیں۔ ناصر نے کہا تھا کہ آپ اس کے بہترین دوست ہیں پھر یہ تکلف کیسا؟"

"یہ تو تم بھی کر رہے ہو۔" وہ ہنس کر بولا۔

"یار! میں کیا سوچوں گا؟" میں نے کہا۔ "مجھے سب سے زیادہ فکر تو اپنی امی کی ہے۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا ہوگا کہ میں نے نہ صرف سنگین جرم کیا ہے بلکہ وہاں سے فرار بھی ہو گیا ہوں۔ ایسے فوجی کو ہماری اصطلاح میں بھگوڑا کہا جاتا ہے۔"

"اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ اب تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح ملک سے باہر نکل جاؤں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ یہاں تو ہر وقت میرے سر پر تلوار لٹکی رہے گی۔"

"تم تو یہاں سے کہیں جا بھی نہیں سکتے۔ ناصر نے شاید تمہیں نہیں بتایا کہ ای سی ایل میں تمہارا نام دیا جا چکا ہے۔ تم ملک سے فرار ہونے کی کوشش کرو گے تو ائرپورٹ پر ہی دھر لیے جاؤ گے۔"

"تو پھر کیا میں کسی کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاؤں؟" میں نے کہا۔

"یار! میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔" اس نے کہا۔ "اگر تم بُرا نہ مانو تو میں اپنی تجویز تمہیں بتاؤں؟"

"جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔ میں اس وقت بُرا ماننے کی پوزیشن ہی میں کب ہوں۔"

"دیکھو، باہر کی دنیا میں اب تم شرافت سے کسی بھی طرح زندگی نہیں گزار سکتے۔ تم غیر قانونی طور پر ملک سے فرار ہونا چاہتے ہو تو یہاں رہ کر کام کیوں نہیں کرتے؟"

"کیا مطلب؟" میں چونک کر بولا۔

"میرے تعلقات انڈر ورلڈ کے کچھ لوگوں سے ہیں۔"

"تو کیا میں انڈر ورلڈ کے لیے کام کروں؟" میں بُرا مان کر بولا۔

"یار! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم بُرا مان جاؤ گے۔" علی نے کہا۔ "پہلے تم میری پوری بات تو سن لو۔ تم انڈر ورلڈ کے لیے چند ماہ کام کرو۔ اس میں تم اتنا پیسا کما لو گے کہ بہت آسانی سے کسی بھی ملک کی طرف نکل جاؤ گے۔ انسان کی جیب میں رقم ہو تو دنیا کا ہر کام اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ میں بھی ملازمت پیشہ آدمی ہوں اور ناصر بھی۔ ہم نے

بہت کوشش کی تو تمہارے لیے بمشکل تمام دس لاکھ کا بندوبست کر پائیں گے۔ اس سے دگنی رقم تو باہر بھیجنے والے ایجنٹ مانگتے ہیں۔ انڈر ورلڈ میں رہ کر تم صرف ایک مہینے میں اتنا پیسا کما لو گے۔ تم چاہو تو ناصر سے بھی مشورہ کر لو۔ ویسے یہ تجویز اسی کی ہے۔"

"یہ تجویز ناصر کی ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"دیکھو عمران! زیادہ جذباتی بن کر مت سوچو۔ حقائق پر غور کرو۔ تمہیں پولیس، ملٹری پولیس اور ایس ایس جی کے کمانڈوز سے صرف اب انڈر ورلڈ ہی میں پناہ مل سکتی ہے۔ تم اگر ملٹری پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو تمہاری بے عزتی الگ ہو گی اور ممکن ہے آرمی والے یہ کیس سول پولیس کے حوالے کر دیں یا ممکن ہے، وہ پہلے تمہارا کورٹ مارشل کریں پھر تمہیں پولیس کے حوالے کریں۔ اب میں چلتا ہوں۔" علی نے کہا۔ "اب شام کو ملاقات ہو گی۔ میں ناصر کو بھی بلا لوں گا۔ تم اس دوران میں اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور میرے ذہن میں ایک شور برپا ہو گیا۔ مجھے سب سے زیادہ امی کی فکر تھی۔ انہوں نے کتنے جتن کر کے مجھے پڑھایا تھا، میرا مستقبل بنایا تھا۔ میں نے ایک ہی جھٹکے میں ان کے سارے خواب، ساری آرزوئیں چکنا چور کر دی تھیں۔ لوگ تو انہیں اب "بھگوڑے" کی ماں کہتے ہوں گے۔ وہ لوگوں سے نظریں کیسے ملاتی ہوں گی؟

میں دیر تک اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ میرا ضمیر کہتا تھا کہ تُو نے اپنے ملک سے وفاداری کا حلف اٹھایا تھا۔ دل کہتا تھا کہ وہی ملک تیری جان کے درپے ہے۔ یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو علی اور ناصر دونوں موجود تھے۔ علی ہنس کر بولا۔ "یار! تم تو ایسی بے ہوشی کی نیند سوتے ہو کہ اگر میرے پاس دروازے کی چابی نہ ہوتی تو ہم لوگوں کو دو گھنٹے تک باہر ہی بیٹھنا پڑتا۔"

"تو کیا تم لوگ دو گھنٹے سے آئے ہوئے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "مجھے ایسی نیند تو کبھی نہیں آئی۔ میں نے تو دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"چلو، اب جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ میں کھانا لگاتا ہوں۔" علی نے کہا۔

کھانے کے بعد علی نے پھر وہی موضوع چھیڑ دیا۔

"یار عمران! علی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ فی الحال تو اس کی بات مان لے۔ پھر ایک بات اور بھی ہے۔" ناصر نے کہا۔ "تیرے جیسے ٹرینڈ بندے کو وہ لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔"

"میں ابھی مزید سوچنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا اور بات ختم کر دی۔

اس دن بھی ناصر رات گئے تک بیٹھا رہا۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی اٹھ کر اس کمرے میں آ گیا جو علی نے میرے لیے سیٹ کر دیا تھا۔ میری ایک عادت بچپن ہی سے ہے کہ مجھے کچھ پڑھے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ ناصر میری یہ عادت جانتا تھا اس لیے میرے مطالعے کے لیے کئی ناول اور میگزین لے آیا تھا۔

میں نے لائٹ آف کر کے ٹیبل لیمپ روشن کیا اور ایک ناول اٹھا لیا۔ میں دن بھر سویا تھا اس لیے اس وقت نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس وقت وال کلاک سوا تین بجا رہی تھی جب ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی سن کر میں اچھل پڑا۔ ٹیلی فون تو علی کے... بیڈ روم میں تھا اس نے اس کا ایکسٹینشن مجھے بھی دے رکھا تھا۔

دو تین گھنٹیاں بجنے کے بعد خاموشی چھا گئی۔ یا تو علی نے ٹیلی فون اٹھا لیا تھا یا پھر ٹیلی فون کرنے والے ہی نے مایوس ہو کر لائن کاٹ دی تھی۔

اچانک میرے دروازے پر دستک ہوئی اور علی اندر آ گیا اور بولا۔ "عمران! تم سو تو نہیں رہے تھے؟"

"میں آج دن بھر سویا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب اتنی آسانی سے نیند کیسے آئے گی؟"

"تمہارا ٹیلی فون ہے۔"

"میرا ٹیلی فون؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "ناصر تو اس وقت گھوڑے بیچ کر سو رہا ہو گا پھر...؟"

"میں نہیں جانتا کہ کون ہے؟" علی نے کہا۔ "تم ریسیور اٹھاؤ۔ وہ ہولڈ پر ہے۔"

میں نے الجھے ہوئے انداز میں ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔ "ہیلو!"

دوسری طرف کی آواز سن کر حیرت سے زیادہ مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے کہا۔ "سر! یہ نمبر..."

"یہ نمبر مجھے ناصر کے ذریعے ملا ہے۔" انہوں نے کہا۔

وہ ایس ایس جی کے بریگیڈیئر عارف تھے۔ میں پریشان تھا کہ ان سے رابطہ کیسے ہو لیکن انہوں نے خود ہی میری مشکل آسان کر دی۔

بات دراصل یہ تھی کہ ملک میں را، سی آئی اے اور موساد کی بڑھتی ہوئی مداخلت سے ہماری قیادت پریشان

تھی۔ ان میں خاص طور پر سی آئی اے والے تو مختلف منصوبوں اور ترقیاتی کاموں کی آڑ میں اپنے لوگوں کو پاکستان بھیج رہے تھے۔ وہ لوگ کسی منصوبے پر کام کر رہے تھے نہ ترقیاتی کام پر۔ ہاں، یہ سب کاغذات میں ضرور ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پاکستان کے بہت سے بے ضمیر لوگوں کو بھی خرید رکھا تھا۔ ان کے لیے سب سے آسان بکاؤ مال ہمارے ملک کی انڈر ورلڈ تھی۔

اس سلسلے میں بریگیڈیئر جہانگیر نے ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے قرعہ فال میرے نام نکلا تھا۔ مجھے پہلے سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اس میں میری جان بھی جا سکتی ہے۔ دشمنوں سے نمٹنے کی نوبت تو بہت بعد میں آتی، پہلے تو مجھے اپنے ہی لوگوں کی طرف سے خطرہ ہوتا۔ وہ پلان چونکہ بہت "ٹاپ سیکریٹ" تھا اس لیے بریگیڈیئر عارف، بریگیڈیئر جہانگیر اور میرے علاوہ کسی کے بھی علم میں نہیں تھا۔ مجھے نہ صرف وہاں سے فرار ہونا تھا بلکہ خود کو ایس ایس جی اور ایم پی والوں کی پہنچ سے بچانا بھی تھا۔

یہ انتہائی مشکل کام تھا۔ اگر میں تھوڑا سا بھی چوک جاتا تو ایم پی والے منصوبے کے شروع ہونے سے پہلے ہی میرا کام تمام کر دیتے۔

"تم خاموش کیوں ہو گئے کیپٹن؟" بریگیڈیئر صاحب کی آواز آئی۔ "کیا ابھی سے خوف زدہ ہو گئے؟"

"نہیں سر! میں سوچ رہا تھا کہ اس منصوبے کا علم صرف ہم تین افراد کو ہے۔ اب اس میں ناصر بھی شامل ہو گیا ہے۔"

"ناصر شروع ہی سے اس منصوبے میں شامل تھا۔" انہوں نے کہا۔ "جنرل صاحب (ناصر کے پاپا) جانتے تھے کہ تم اگر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو سب سے پہلے اسی سے رابطہ کرو گے۔ ہم نے اسے بھی اعتماد میں لے لیا ہے اور وہ بھی تمہاری طرح ایک محبِ وطن فوجی ہے۔" وہ ہنس کر بولے۔ "اس کے علاوہ ایک اور شخص ہے جسے اس منصوبے کا علم ہے۔"

"سر! مجھے ابھی بتا دیں کہ مزید کتنے آدمی ہیں جو اس منصوبے سے واقف ہیں؟" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ ناگوار ہو گیا۔

دوسری طرف سے بریگیڈیئر صاحب کے ہنسنے کی آواز آئی، وہ بولے۔ "ناراض مت ہو۔ ناصر کے علاوہ اس پلان سے صرف علی واقف ہے کیونکہ وہ ایم آئی کا بہترین ایجنٹ ہے۔"

"علی... کا تعلق... ایم آئی سے ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "مجھے تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا۔"

"اگر تمہیں احساس ہو جاتا تو پھر ایم آئی کو اس کی صلاحیتوں پر اعتبار نہ رہتا۔ بس اب باقی تفصیل تمہیں ناصر اور علی بتا دیں گے۔ او کے، وش یو بیسٹ آف لک۔" انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

مجھے نیند تو پہلے بھی نہیں آ رہی تھی لیکن اب میں نئے سرے سے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ سب سے بڑی رکاوٹ امریکن سی آئی اے تھی۔ اس نے نہ جانے کس کس طریقے سے اپنے لوگوں کو پاکستان میں گھسا دیا تھا۔ ان کی بہت سی این جی اوز کام کر رہی تھیں۔ بظاہر وہ سب پاکستان اور اس کے عوام کے خیر خواہ تھے لیکن ان کے مقاصد کچھ اور تھے۔ پھر بھارت کی "را" تھی۔ اس کے لیے تو یہ آسانی تھی کہ اپنے حلیوں اور رنگ و روپ کی وجہ سے وہ لوگ آسانی سے پہچانے نہیں جاتے تھے، پھر انہوں نے بھی یہاں کے کئی بااثر افراد کو خرید رکھا تھا۔

یہی سب سوچتے سوچتے میں سو گیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی سوا دس بجا رہی تھی۔ خلافِ توقع اس وقت علی بھی گھر میں موجود تھا اور ناصر بھی۔

میں نے ناصر سے کہا۔ "مجھے تم سے یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ تم..."

"ارے یار! ناراض بعد میں ہونا، پہلے ناشتا کر لو۔" علی نے کہا۔ "تمہاری وجہ سے ہم بھی بھوکے بیٹھے ہیں۔"

"مجھے بھی علم تھا اور علی کو بھی۔ تم تو خود ایس ایس جی کے آدمی ہو، ہماری مجبوریاں جانتے ہو اس لیے ناراض کیوں ہو رہے ہو؟"

"اچھا، اب کام کی بات سنو۔" علی نے کہا۔ "تمہیں ایک گھنٹے بعد فلینز ہوٹل جانا ہے۔ وہاں کمرا نمبر چار سو بارہ میں ایک شخص احسن مقیم ہے۔ وہ تمہیں انڈر ورلڈ مافیا کے ایک اہم ترین آدمی سے ملوا دے گا۔"

"میں احسن سے کہوں گا کیا؟"

"اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اسے صرف اپنا نام اور عہدہ بتانا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "ہاں، اگر گاڑی کی ضرورت ہو تو..."

"نہیں، میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں علی کے فلیٹ سے باہر نکلا اور ٹیکسی کے ذریعے فلینز ہوٹل پہنچ گیا۔ میں نے وہاں استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے احسن کے بارے میں پوچھا۔

وہ کاروباری انداز میں مسکرا کر بولی۔ ’’یس سر! احسن صاحب کمرا نمبر فور ون ٹو میں ہیں۔ آپ کا نام؟‘‘

’’کیپٹن عمران!‘‘ میں نے کہا۔

اس نے انٹرکام پر بات کی اور فوراً ہی مجھ سے بولی۔ ’’احسن صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔‘‘

میں لفٹ کے ذریعے چوتھی منزل پر پہنچا اور کمرا نمبر چار سو بارہ پر دستک دی۔

’’یس، کم ان۔‘‘ اندر سے کسی نے مہذب انداز میں کہا۔

کمرے میں جو نوجوان تھا، وہ خاصا خوش لباس اور خوش گفتار تھا۔ اس نے بہت تپاک سے میرا استقبال کیا اور بولا۔ ’’آپ وقت کے بہت پابند ہیں۔ میں آپ کو چائے یا کافی کی پیشکش کرتا لیکن آپ کی طرح خالد صاحب بھی وقت کے اتنے ہی پابند ہیں۔‘‘

’’ان تکلفات کو چھوڑیے۔ چائے پھر کسی وقت پی لوں گا۔‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔

’’تو پھر آیئے میرے ساتھ۔‘‘ وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

پارکنگ میں اس کی گاڑی موجود تھی۔ اس نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر وہ تیز رفتاری سے ایک طرف روانہ ہوگیا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کا رخ ماڈل ٹاؤن کی طرف ہے۔ وہ راستے بھر خاموش رہا، میں نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ماڈل ٹاؤن کی ایک وسیع و عریض اور قدیم طرز کی کوٹھی کے سامنے اس نے گاڑی روک کر ہارن بجایا۔ گیٹ میں لگی ذیلی کھڑکی سے کسی نے جھانکا پھر فوراً ہی مین گیٹ کھل گیا۔

گاڑی پورچ میں روکنے کے بعد وہ برآمدے میں داخل ہوا تو دو تین مسلح آدمی نظر آئے۔ انہوں نے احسن کو بہت ادب سے سلام کیا۔ وہ مجھے لے کر سیدھا اس کوٹھی کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔ وہ کوٹھی تو باہر سے قدیم نظر آ رہی تھی لیکن اندر سے خوب آراستہ تھی۔

ڈرائنگ روم میں صرف ایک آدمی بیٹھا تھا۔ احسن نے اسے سلام کیا اور بولا۔ ’’باس، کیپٹن عمران فرام ایس ایس جی۔‘‘

’’ایکس کیپٹن کہو احسن!‘‘ اس نے بھاری آواز میں کہا۔ خالد کی شخصیت مجھے پہلی ہی نظر میں پسند نہیں آئی تھی۔ اس کا قد درمیانہ لیکن جسم خاصا گٹھا ہوا تھا۔ پیشانی تنگ تھی اور آنکھیں کسی سانپ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ اس نے بہترین تراش کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سوٹ اسے جبراً پہننے پر مجبور کیا گیا ہو۔

اس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا اور بولا۔ ’’بیٹھ جاؤ کیپٹن!‘‘

’’ایکس کیپٹن سر!‘‘ میں نے کہا۔

’’گڈ!‘‘ وہ ہنس کر بولا۔ ’’تم نے میری ہی بات مجھ ہی پر ماردی۔‘‘ میں اس کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

’’تمہارا نام عمران علی ہے۔ تعلق کراچی سے ہے اور آرمی کے ایس ایس جی گروپ میں تھے؟‘‘

میں نے آہستہ سے کہا۔ ’’یس سر!‘‘

’’کراچی میں صرف تمہاری ماں ہے۔ ابھی تک غیر شادی شدہ ہو اور اپنے ہی گروپ کے ایک میجر کے قتل میں ملوث ہو؟‘‘

’’یس سر!‘‘ میں نے کہا۔

’’مجھے یہ تو معلوم ہے کہ تم وہاں سے فرار کیسے ہوئے لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ تم یہاں تک کیسے پہنچے؟‘‘

’’یہاں تک میں احسن صاحب کے ساتھ آیا ہوں۔‘‘

’’میرا مطلب ہے کہ تم لاہور تک کیسے پہنچے؟‘‘

میں نے اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

’’کون سا گاؤں بتایا تم نے جہاں تم نے عارضی طور پر پناہ لی تھی؟‘‘

’’میں نے ابھی تک اس گاؤں کا نام نہیں بتایا ہے۔‘‘ میں نے اسے گاؤں کا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ مجھے وہاں دینو نے پناہ دی تھی۔

’’ابھی تھوڑی دیر میں اس کی بھی تصدیق ہو جائے گی۔‘‘

اس نے اپنے سامنے رکھا ہوا سیل فون اٹھایا اور کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ سیل فون ان دنوں پاکستان میں نیا متعارف ہوا تھا اس لیے خال خال لوگوں ہی کے پاس تھا۔

خالد کسی سے گفتگو کرتا رہا پھر مجھ سے بولا۔ ’’تمہارے پاس موبائل فون نہیں ہے؟‘‘

’’نہیں سر!‘‘ میں نے کہا۔ ’’موبائل فون میرے کئی ساتھیوں کے پاس ہے لیکن مجھے ابھی تک اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔‘‘

’’احسن!‘‘ اس نے احسن کو مخاطب کیا۔ ’’عمران کے لیے فوری طور پر ایک سیل فون کا بندوبست کرو اور انہیں ان کا کمرا دکھا دو۔ فی الحال یہ یہیں میرے ساتھ قیام کریں گے۔‘‘ پھر وہ چونک کر بولا۔ ’’عمران! تمہیں لاہور آئے ہوئے تو تین دن ہو گئے ہیں۔ تم تین دن کہاں رہے؟‘‘

’’ایک دن تو میں نے اسٹیشن پر گزارا پھر میں اسٹیشن کے قریب ہی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں منتقل ہوگیا۔‘‘ میں نے اسے ہوٹل کا نام بتایا۔

’’میں جانتا ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ خالد نہ صرف اس گاؤں کا سراغ لگا کر دینو سے معلومات کرے گا بلکہ ہوٹل کے مالک سے بھی پوچھ گچھ کرے گا۔ علی نے شاید ان لوگوں کو میرے بارے میں پہلے ہی بتا دیا ہوگا۔ ویسے میں مطمئن تھا۔

خالد نے سر کے اشارے سے احسن کو جانے کو اشارہ کیا۔

احسن نے مجھ سے کہا۔ ’’آیئے عمران صاحب! میں آپ کو کمرا دکھا دوں۔ کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔‘‘

احسن مجھے بیڈ روم میں لے آیا..... وہ بہت بہترین بیڈ روم تھا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ الماریوں میں بہت سے تھری پیس سوٹ، سلیپنگ سوٹ اور شلوار قمیص کے سوٹ موجود تھے۔

’’اب آپ یہاں آرام کریں۔ باس، شام کو آپ کی ملاقات بگ باس سے کرائیں گے۔‘‘

’’اگر آپ کو کوئی ضروری کام نہیں ہے تو آپ بھی یہیں ٹھہر جائیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میں آپ کے ساتھ ضرور وقت گزارتا لیکن مجھے ابھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ شام کو آپ سے ملاقات ہو گی۔‘‘ یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور جاتے جاتے بولا۔ ’’کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو یہ ریڈ بٹن دبا دیجیے گا۔‘‘ اس نے میرے بیڈ کے سرہانے کے نزدیک لگے ہوئے بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ ’’ہاں، یہاں سے نکلنے کی کوشش مت کرنا۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’یہاں کے گارڈز بہت خوں خوار ہیں۔‘‘

’’مسٹر احسن!‘‘ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’کیا میں یہاں قیدی ہوں؟‘‘

’’او نو۔‘‘ وہ جلدی سے بولا۔ ’’یہ صرف احتیاط ہے۔‘‘ اس نے کہا۔

’’جہاں تک یہاں کے گارڈز کا تعلق ہے، وہ ملٹری پولیس اور ایس ایس جی سے زیادہ خطرناک تو نہیں ہو سکتے؟‘‘ میرا لہجہ ناخوش گوار تھا۔

’’میں جانتا ہوں۔‘‘ وہ مسکرا کر بولا۔ ’’مجھے آپ کی نہیں، اپنے گارڈز کی فکر ہے۔ پھر فضول میں کوئی پیچیدگی ابتدا ہی میں پیدا ہو سکتی ہے اس لیے میں نے محض احتیاطاً یہ بات کہی تھی۔‘‘

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی دستک دے کر اندر آیا اور بڑا سا ایک ڈبا ٹیبل پر رکھ دیا۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

’’باس نے آپ کے لیے موبائل فون بھجوایا ہے سر!‘‘ اس نے کہا۔

موبائل فون کے ساتھ ایک چارجر بھی تھا اور ایک کتابچہ بھی جس میں اس کے استعمال کا طریقہ لکھا ہوا تھا۔

میں ابھی اس کے تمام فنکشنز سمجھ کر فارغ ہی ہوا تھا کہ مجھے ہلکی سی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی موبائل فون کی اسکرین روشن ہوگئی اور اس پر ایک نمبر نظر آنے لگا۔ میں نے اس کے سرے پر لگا ہوا انٹینا کھینچا اور آن کا بٹن دبا کر موبائل کو کان سے لگا لیا اور بولا۔ ’’ہیلو!‘‘

’’گڈ!‘‘ دوسری طرف سے خالد کی آواز آئی۔ ’’تم نے موبائل کے استعمال کا طریقہ بھی سیکھ لیا۔‘‘

’’طریقہ تو بہت آسان ہے باس!‘‘ میں نے کہا۔

’’ٹھیک ہے، اب تم سے میں کسی بھی وقت رابطہ کر سکوں گا۔‘‘

میں نے سوچا کہ میں یہاں سے بریگیڈیئر عارف کا نمبر ملاؤں لیکن پھر فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ یہ موبائل فون پوسٹ پیڈ ہے۔ بل کے ساتھ ان نمبرز کی تفصیل بھی آجائے گی جہاں جہاں میں نے ٹیلی فون کیا ہوگا۔ نہ صرف ڈائل شدہ نمبروں کی فہرست ہو گی بلکہ موصول ہونے والے نمبر بھی اس فہرست میں درج ہوں گے۔ میں نے یہ سوچ کر کسی سے بھی رابطہ کرنے کا ارادہ مسترد کر دیا۔ وہاں کئی کتابیں تھیں، میگزین تھے اور اخبارات تھے۔ ان پر میری نظر پڑی ہی نہیں تھی۔

وہ سب اسی تاریخ کے اخبارات تھے۔

میں نے ان کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ ان میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ بس افغانستان کی خبریں نمایاں تھیں۔ وہاں جنگجو سردار اقتدار کی رسّاکشی میں ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔

میں نے کچھ سوچ کر ریڈ بٹن پش کر دیا۔

فوراً ہی ایک ملازم نما شخص اندر آگیا۔ ’’یس سر!‘‘ اس نے کہا۔

’’مجھے ایک کپ کافی پلا دو اور ہو سکے تو گزشتہ تین چار

دن کے اخبارات بھی لے آؤ۔“ میں نے کہا۔
”او کے سر!“ وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔
اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں نے سیل فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ ”ہیلو!“ میں نے کہا۔
”عمران! تم نے جس خبر کی تلاش میں اخبارات منگوائے ہیں، وہ خبر کسی اخبار میں نہیں ہے۔ حکومت نے مکمل طور پر اس خبر کو چھپالیا ہے لیکن ہم سے نہیں چھپا سکی۔ تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ تم نے جس آفیسر کو زخمی کیا تھا، وہ کل سی ایم ایچ میں چل بسا ہے۔“
”یہ... یہ... آپ... کیا... کہہ رہے... ہیں؟“
”ہاں، اب ان لوگوں کو پہلے سے زیادہ شدت سے تمہاری تلاش ہے۔“

☆☆☆

شام کو ملازم نے آکر بتایا کہ آپ تیار ہو جائیں، باس آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔
میں تو آدھا گھنٹا پہلے ہی تیار ہو گیا تھا۔
میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو باس وہاں موجود تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی موجود تھے لیکن وہ دونوں غیر ملکی تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ان میں سے ایک کا تعلق امریکا سے اور دوسرے کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ بعد میں جب باس نے ان سے میرا تعارف کرایا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ہارلے کا تعلق امریکا سے تھا۔ وہ اپنے حلیے سے کسی کالج کا پروفیسر یا کسی بینک کا صدر لگتا تھا۔ ڈیمن برطانوی تھا۔ وہ ہارلے کے برعکس غیر مہذب اور غیر شائستہ لگتا تھا۔ اس کے جسم پر لباس تو صاف ستھرا تھا لیکن اس نے شاید کئی ہفتوں سے دانت صاف نہیں کیے تھے۔ ان پر زردی کی تہ چڑھی ہوئی تھی۔
خالد نے میرا تعارف کرایا۔ ”مسٹر ہارلے! ہمارا نیا ساتھی عمران!“
”گڈ!“ ہارلے نے توصیفی انداز میں میرا جائزہ لیا اور ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی جس سے اس کی طاقت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ڈیمن نے مجھ سے ہاتھ ملانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔
”تم تیار ہو عمران؟“ باس نے پوچھا۔
”میں بالکل تیار ہوں سر!“ میں نے کہا۔
”تو پھر چلو۔“ اس نے کہا اور ہم گاڑی میں آبیٹھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر خالد تھا۔ اس کے ساتھ ہارلے بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ عقبی سیٹ پر ڈیمن تھا۔ اس کے جسم سے انتہائی ناگوار بو آرہی تھی۔
اچانک اس نے اپنی جیب سے چمڑے کی کوئی چشمہ نما چیز نکالی اور میری آنکھوں پر باندھنے لگا۔
”یہ کیا ہے باس!“ میں نے جھنجلا کر کہا۔
”یہ بلائنڈ فولڈ ہے۔“ خالد نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تم کچھ دیر کے لیے اپنے اردگرد دیکھنے سے محروم ہو جاؤ گے۔“
میں سمجھ گیا کہ وہ لوگ نہیں چاہتے کہ میں ان کا ٹھکانا دیکھوں یا بعد میں اس کی نشان دہی کر سکوں۔
ڈیمن نے وہ بلائنڈ فولڈ سختی سے میری آنکھوں پر باندھ دیا۔
تقریباً چالیس، پینتالیس منٹ بعد گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ اب وہ لاہور سے باہر نکل آئے تھے یا پھر مجھے دھوکا دینے کے لیے یونہی سڑکوں پر چکر لگاتے رہے تھے، مجھے اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔
گاڑی رکی تو میری طرف کا دروازہ کھلا۔ میں ذہنی طور پر تیار ہو گیا کہ شاید مجھے کھینچ کر نیچے اتارا جائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ خالد نے انتہائی آہستگی سے مجھے نیچے اتار لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میں بھی اندھوں کی طرح اس کے ساتھ چل دیا۔
میری آنکھوں سے وہ بلائنڈ فولڈ ہٹایا گیا تو کچھ دیر کے لیے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ ایک ہال کمرا تھا۔ اس میں بڑی سی ایک میز کے گرد تقریباً چھ آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں سے دو غیر ملکی اور بقیہ چار مقامی تھے۔
وہاں کئی کرسیاں خالی تھیں۔ ایک مقامی آدمی نے ہمیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے بہ غور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیپٹن عمران علی... عمر تیئس سال انٹرمیڈیٹ کے فوراً بعد آرمی میں سلیکشن، پاس آؤٹ ہونے کے ایک سال بعد ایس ایس جی میں شمولیت، ہر لحاظ سے بہترین کمانڈو۔ اپنے ایک افسر کے قتل کے جرم میں آرمی سے فرار۔“ اس نے میری پوری کیس ہسٹری بیان کر دی۔ مجھے غصہ آرہا تھا کہ ان لوگوں کو یہ معلومات کون فراہم کر رہا ہے؟
”تمہاری صرف ایک ماں ہے۔ ان کے علاوہ ایک تایا اور ان کا خاندان بھی ہے لیکن تمہارا ان لوگوں سے واجبی سا تعلق ہے۔ ہاں، تمہارا ایک بہترین دوست ناصر بھی تھا جو اب تمہارا دشمن بن چکا ہے کیونکہ تم اس کے باپ کی کمانڈ میں تھے۔“
”جی ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“
”تم ہمارے لیے کام کرو گے تو اپنی آرمی، ایم آئی اور آئی ایس آئی سے محفوظ رہو گے۔“
”میں جانتا ہوں، اسی لیے یہاں آیا ہوں۔“
”اگر تم سے کہا جائے کہ لاہور کے کور کمانڈر کو ٹھکانے لگا دو؟“ اس نے اچانک کہا۔
”یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔
”گڈ!“ اس نے کہا۔ ”مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔ اب فوری طور پر تمہارا حلیہ بدلا جائے گا اور تمہیں نیا پاسپورٹ جاری کر دیا جائے گا۔ تم پاکستانی نژاد امریکن ہو۔ تمہارا تعلق ٹیکساس سے ہے۔ وہاں تمہارے والدین موجود ہیں اور تم ترقیاتی کاموں کے لیے ایک این جی او کی طرف سے پاکستان آئے ہو۔ ہاں، ہمیں ڈبل کراس کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری ماں کی جان بھی جائے گی۔“
”دیکھیے سر!“ میں نے بے خوفی سے کہا۔ ”میں نے اپنی مرضی سے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے بہترین سال آرمی کو دیے۔ میرا مستقبل تابناک تھا۔ مجھ سے اگر ایک بھول ہو گئی ہے تو یہ لوگ میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ رہا سوال ڈبل کراس کرنے کا تو میں ڈبل کراس کر کے کہاں جاؤں گا؟ اور پلیز آئندہ مجھے کسی بھی قسم کی دھمکی نہ دیجیے گا۔“
”او کے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”ہمیں ایسے ہی پُراعتماد آدمی کی ضرورت ہے۔ فی الحال تو تم اس وقت تک آرام کرو جب تک تمہارے حلیے میں کچھ تبدیلی نہ کی جائے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر بولا۔ ”وش یو بیسٹ آف لک مسٹر ایمران!“
”ناٹ ایمران۔“ میں نے کہا۔ ”میں عمران ہوں... عمران علی۔“
”تم جو کچھ بھی ہو لیکن نئے پاسپورٹ کے لحاظ سے تمہارا نام بھی نیا ہوگا۔ گڈ لک۔“ اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

مجھے خالد کے ساتھ رہتے ہوئے ایک مہینا گزر گیا تھا لیکن ابھی مجھے کھلے عام باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میرے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ کلر لینس کے ذریعے میری آنکھوں کا رنگ تبدیل ہو چکا تھا۔ بالوں کے اسٹائل میں بھی تبدیلی لائی گئی تھی۔ ایک جرمن مجھے

جرمن زبان سکھا رہا تھا کیونکہ بقول خالد کے میری ماں جرمن اور باپ امریکی مسلمان ہے۔ اس نے مجھے میرے والدین کی کئی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔
جس دن میرا پاسپورٹ بن کر آیا، اسی دن ملک میں انقلاب آگیا۔ ملک میں مارشل لا نافذ ہو گیا۔
ہارلے اور خالد اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھے لیکن میں خوش تھا کہ اب فوجی حکومت ان لوگوں کی اچھی طرح خبر لے گی۔
مجھے ایک پریشانی تھی کہ میں اپنے ساتھیوں علی اور ناصر سے رابطے میں نہیں تھا۔ خالد نے مجھے جو.... موبائل فون دیا تھا لیکن اس سے بات کرنے میں خطرہ تھا۔ ممکن ہے میرا وہ سیل فون ٹریک ہو رہا ہو۔
پاسپورٹ بنتے ہی مجھے باہر نکلنے کی اجازت مل گئی۔ یہ پاسپورٹ ”جہانگیر خان“ کے نام کا تھا۔ گویا میں عمران سے جہانگیر بن گیا تھا اور خالد مجھے جونی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔
اس نے فوری طور پر مجھے دلاور کے گروپ میں شامل کر دیا۔
دلاور دوسرے درجے کا ایک بدمعاش تھا۔ اس کے ذمے چھوٹے موٹے ہنگامے، سیاسی لیڈروں سے رابطے اور انہیں دھمکیاں دینا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ڈکیتیاں بھی کرتا تھا اور اغوا برائے تاوان کی وارداتیں بھی۔ یہ سب وہ خالد کے اشارے پر کرتا تھا۔
مجھے ان وارداتوں سے شدید کوفت ہوتی تھی۔ میں تو کسی بڑی مچھلی کی تلاش میں تھا۔
علی یا ناصر کا کوئی آدمی کبھی فقیر کے روپ میں، کبھی خوانچہ فروش کے روپ میں مجھ سے کہیں بھی مل لیتا تھا۔ میرا رابطہ انہی لوگوں کے ذریعے بریگیڈیئر عارف سے قائم تھا۔
ایک دن دلاور نے ہم سب کو جمع کیا اور بولا۔ ”چیف کی طرف سے ہمیں ایک ٹاسک دیا گیا ہے۔ ہمیں غزنوی صاحب کی بیٹی کو اغوا کرنا ہے۔“
میرے دل میں غصے کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ غزنوی صاحب انتہائی نیک نام سرکاری افسر تھے۔ وہ وزارتِ خارجہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اس وقت امریکا اور بھارت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہی تھے۔ ان کی بیٹی مدیحہ اس وقت کالج میں پڑھتی تھی۔ میں نے اسے دیکھا نہیں تھا، بس انہی لوگوں سے اس کا نام سنا تھا۔
”اس اغوا کا مقصد؟“ میں نے پوچھا۔
دلاور نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا پھر بولا۔ ”کیا

تمہارے لیے مقصد جاننا ضروری ہے؟ مقصد تو چیف ہی جانتا ہوگا۔ میں نے ملتان روڈ کے ایک پس ماندہ علاقے میں مکان کا بندوبست کرلیا ہے۔ لڑکی کو اغوا کرنے کے بعد ہم وہیں پہنچائیں گے۔ اسے اغوا کرنے میں ہمیں زیادہ دقت پیش نہیں آئے گی۔ لڑکی کے ساتھ صرف ڈرائیور ہوتا ہے جو شاید مسلح بھی ہوتا ہے۔"

"پھر اس کام کے لیے ہم سب کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ کام تو اکیلا جمی ہی کرلے گا۔"

"کسی بھی کام کو آسان نہیں سمجھنا چاہیے۔" جمی نے کہا۔ "مجھے کم سے کم دو آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔"

"باس! اس کام میں زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہے، میں یہ کام اکیلا کرسکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تمہیں اگر مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر یہ کام تم ہی کرلو۔" جمی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اس کا فیصلہ میں کروں گا۔" دلاور نے کہا۔ "یہ کام جونی کرے گا، ہم دور سے اس کی نگرانی کریں گے۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی پلاننگ بھی جونی ہی کرے گا۔"

"اوکے باس! یہ کام کب کرنا ہے؟"

"پرسوں یہ کام ہوجانا چاہیے۔" دلاور نے کہا۔

"ہوجائے گا۔" میں نے کہا۔ "میں کل مدیحہ کے آنے جانے کا وقت اور روٹ معلوم کرلوں گا۔"

مدیحہ صبح ساڑھے سات بجے کالج کے لیے نکلتی تھی۔ وہ ڈیفنس میں رہتی تھی اور اس کا کالج وہاں سے بیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ وہاں سے وہ ڈیڑھ بجے تک واپس آتی تھی۔ غزنوی صاحب کے گھر پر بھی صرف ایک گن مین تھا۔ میں چاہتا تو اسے گھر سے نکلتے ہی اٹھا سکتا تھا لیکن میں خون خرابا نہیں چاہتا تھا۔

رات کو میں نے دلاور سے کہا۔ "مجھے صبح ایک ڈبل کیبن پک اپ چاہیے ہوگی۔"

"اس کا بندوبست ہوجائے گا۔" دلاور نے کہا۔

تیسرے دن میں صبح سات بجے ڈبل کیبن پک اپ میں اس جگہ موجود تھا جہاں سے مدیحہ کی گاڑی گزرتی تھی۔ میں نے دور سے دیکھا کہ مدیحہ کی گاڑی آرہی ہے۔ میری گاڑی کا انجن اسٹارٹ تھا۔ میں ایکشن کے لیے تیار ہوگیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر جمی اور شوکی ایک گاڑی کا بونٹ کھولے کھڑے تھے جیسے انجن میں کوئی خرابی ہوگئی ہو۔

میں سائڈ روڈ پر کھڑا تھا۔ مدیحہ کی گاڑی جونہی آگے بڑھی، میں نے بھی تیز رفتاری سے اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔ دونوں گاڑیاں دھماکے سے ٹکرائیں۔ میں نے کوشش کی تھی کہ ٹکراؤ زیادہ شدید نہ ہو۔

"اندھے ہوگیا؟" مدیحہ کے ڈرائیور نے چیخ کر کہا۔

"اندھا میں نہیں بلکہ تم ہو۔ تمہیں اتنی بڑی گاڑی نظر نہیں آئی۔"

ڈرائیور بکتا جھکتا گاڑی سے اترا اور اپنی گاڑی کے نقصان کا جائزہ لینے لگا۔

اسی وقت وہاں کچھ گاڑیاں مزید رک گئیں۔

میں نے نرم لہجے میں ڈرائیور سے کہا۔

"سوری! غلطی میری ہی تھی۔ میں آپ کا نقصان پورا کرنے کو تیار ہوں۔ آپ پہلے ان خاتون کو کالج چھوڑ دیں، پھر میرے ساتھ کسی ورکشاپ چلیں، ڈینٹ پینٹ کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گا۔"

میری بات سن کر وہاں موجود لوگ کسی متوقع تماشے سے مایوس ہوکر آگے بڑھ گئے۔

میں نے کہا۔ "آپ کی گاڑی کا تو اسٹیئرنگ بھی ٹیڑھا ہے۔ کیا اس میں بھی میری غلطی ہے؟"

ڈرائیو اندر جھک کر اسٹیئرنگ دیکھنے لگا۔ میں نے اسی وقت ریوالور کے دستے سے اس کی کھوپڑی سہلا دی اور اس مہارت سے وار کیا کہ مدیحہ کو بھی احساس نہ ہوسکا۔ ڈرائیور اوندھے منہ گاڑی میں گر گیا۔

"اسے کیا ہوا؟" مدیحہ نے حیرت سے کہا۔

"شاید صدمے سے بے ہوش ہوگیا ہے۔" میں نے کہا اور اچانک عقبی نشست کا دروازہ کھول کر بولا۔ "نیچے اترو۔"

وہ گنگ سی ہوکر مجھے دیکھنے لگی۔ میرے رویے سے زیادہ اسے اس ریوالور سے حیرت ہوئی تھی جو میرے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔

"جلدی کرو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یہیں ڈھیر کردوں گا۔"

وہ لرزتی کانپتی نیچے اتر گئی۔ میں نے اسے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور اچانک اس کی دونوں کنپٹیاں پکڑ کر دبا دیں۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹک گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہی ہو۔ پھر میں نے تیز رفتاری سے گاڑی وہاں سے نکالی اور مین روڈ پر آگیا۔ میں نے عقبی شیشے میں دیکھا، جمی اور شوکی میرے پیچھے آرہے تھے۔ میں چالیس منٹ کے اندر اندر ملتان روڈ پر واقع اس بستی میں پہنچ گیا جہاں دلاور نے مکان

کا بندوبست کیا تھا۔ وہ مکان الگ تھلگ تھا اور اس کے پیچھے کھیت تھے۔ مکان کیا وہ مجھے اچھا خاصا فارم ہاؤس لگ رہا تھا۔ اس میں لکڑی کا ایک بڑا سا پھاٹک لگا تھا۔ میں نے سیل فون پر دلاور کو اطلاع دی کہ میں لڑکی کو لا رہا ہوں۔

دلاور گیٹ پر ہی موجود تھا۔ گاڑی دیکھتے ہی اس نے گیٹ کھول دیا۔ میں گاڑی لے کر اندر داخل ہوگیا۔ میرے پیچھے پیچھے جمی اور شوکی بھی داخل ہوگئے۔ دلاور نے گیٹ بند کردیا۔

میں نے اس معصوم سی لڑکی کو اٹھا کر اس کمرے میں لٹا دیا جس کا بندوبست دلاور نے کیا تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ لڑکی بہت زیادہ خوب صورت تو نہیں تھی لیکن اس کی گھنی پلکوں اور دراز زلفوں نے اسے دل کش ضرور بنا دیا تھا۔ اس کا جسم بھی خاصا متناسب تھا۔ میں نے احتیاطاً اس کے جسم پر چادر ڈال دی کیونکہ جمی اور شوکی اسے پُرہوس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''لڑکی کو ہوش آرہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں کمرے سے باہر جارہا ہوں لیکن اس کے ساتھ کسی بھی قسم کی بدسلوکی نہیں ہونی چاہیے۔'' یہ کہہ کر میں باہر نکل گیا۔

اچانک لڑکی کی آواز آئی۔ ''تت... تم... لوگ کون ہو اور... میں کہاں ہوں؟''

''ہم نے تمہیں اغوا کرلیا ہے بے بی۔'' دلاور نے کہا۔ ''اب ہم تمہارے باپ سے سودے بازی کریں گے۔ اگر وہ مان گیا تو اچھی بات ہے اور اگر نہ مانا تو پھر تم زندہ نہیں رہوگی۔''

''وہ... وہ صاحب... کہاں گئے... جو...''

''تمہیں یہاں لائے ہیں؟'' جمی نے اس کا جملہ پورا کردیا۔

''انہیں اب بھول جاؤ۔'' جمی نے کہا۔ ''مجھے دیکھو، مجھ میں کیا بُرائی ہے جان؟''

''یہ تم کیا بکواس کررہے ہو؟'' لڑکی بپھر کر بولی۔ ''میرا ہاتھ چھوڑو ذلیل آدمی!''

میں اچانک کمرے میں داخل ہوگیا۔ مجھے دیکھ کر جمی نے اس لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''میں نے کیا کہا تھا؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم نے سنا نہیں تھا؟''

''تم مجھے حکم دینے والے کون ہوتے ہو؟'' جمی بپھر کر بولا۔

''باہر نکلو یہاں سے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''جونی!'' دلاور نے کہا۔ ''تمہیں ہو کیا گیا ہے؟''

''ان دونوں کو کمرے سے باہر نکالو۔'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔

''اب تم مجھ سے بھی اس لہجے میں بات کروگے؟'' دلاور دہاڑا۔ پھر وہ جمی سے بولا۔ ''جمی! اسے اپنی قوت اور طاقت پر بہت ناز ہے۔ اس نے امریکا میں دو چار وارداتیں کیا کرلیں، یہ خود کو طرم خان سمجھنے لگا ہے۔ میں بھی اسے خالد بھائی کا آدمی سمجھ کر طرح دیتا رہا۔ اس کی ناک رگڑ دے زمین پر۔''

جمی نے مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھا اور یوں آگے بڑھا جیسے مجھے روڈ رولر کی طرح روند کر رکھ دے گا۔

''یہ تم لوگ کیا کررہے ہو؟'' شوکی نے کہا۔

''تم خاموش رہو۔'' دلاور نے اسے بُری طرح جھڑک دیا۔

مدیحہ بُری طرح رو رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس جھگڑے کے بعد چیف کا ردِعمل کیا ہوگا۔ بہرحال، شوکی اس بات کا گواہ تھا کہ جمی، دلاور کے حکم پر یہ سب کچھ کررہا تھا۔

جمی نے اچانک میرے منہ پر گھونسا مارنے کی کوشش کی۔ میں نے تھوڑا سا ترچھا ہو کر اس کا وہی ہاتھ کہنی کے پاس سے پکڑ لیا اور بائیں ہاتھ سے اس کے منہ پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ اس کی زوردار گونج سنائی دی۔

وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ ان میں سے کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ میرا تعلق ایس ایس جی سے ہے۔ وہ سب مجھے امریکا سے آیا ہوا کوئی اسٹریٹ فائٹر سمجھتے تھے۔

''اٹھو اور میری ناک رگڑو ورنہ میں تمہاری کھوپڑی تربوز کی طرح توڑ دوں گا۔'' میں نے حقارت سے کہا۔

جمی فوراً ہی کھڑا ہوگیا۔ اس کا دایاں رخسار سوج گیا تھا اور اس پر میری انگلیوں کے نشان ثبت ہوگئے تھے۔

اس نے اس مرتبہ میرے منہ پر لات مارنے کی کوشش کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جمی اچھا فائٹر تھا اور کراٹے کے اچھے خاصے داؤ پیچ بھی جانتا تھا۔ میں نے تھوڑا سا نیچے جھک کر اپنا چہرہ بچایا اور اس کی چلائی ہوئی لات اپنے شانے پر روک کر دائیں ہاتھ سے پکڑ لی۔ اس سے پہلے کہ وہ اچھل کر دوسری لات چلاتا، میں نے اس کی ٹانگوں کے درمیان لات رسید کردی۔

وہ کراہتا ہوا دوبارہ زمین پر گر گیا۔ میں جانتا تھا کہ

اب وہ فوری طور پر اٹھنے کے قابل نہیں ہے۔

دلاور چیخ کر بولا۔ ''شوکی! اس حرام زادے کی ہڈیاں توڑ دے۔''

اچانک دروازے کے پاس سے خالد کی آواز آئی۔ ''یہ کیا ہورہا ہے؟''

''باس! اس کا دماغ بہت خراب ہوگیا ہے۔'' دلاور نے کہا۔ ''یہ مجھ پر بھی حکم چلانے لگا ہے۔''

''تو تم اس کے ساتھ یہ سب کچھ کروگے؟'' خالد نے سرد لہجے میں کہا۔

''قصور میرا نہیں ہے سر!'' میں نے کہا۔ ''اس بات کا گواہ شوکی بھی ہے اور یہ لڑکی بھی۔'' میں نے مدیحہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''جمی کو بھڑکانے میں دلاور ہی کا ہاتھ تھا۔''

''کچھ بھی ہو، دلاور تمہارا باس ہے۔'' خالد نے کہا۔ ''تم دلاور سے اپنے رویّے کی معافی مانگو جونی!'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک آنکھ دبا کر مجھے اشارہ کیا۔

میں نے فوراً کہا۔ ''سوری باس! مجھے آپ سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ معافی چاہتا ہوں۔''

دلاور کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ اس نے کہا۔ ''جونی! بات کرنے سے پہلے دیکھ لیا کرو کہ تم کس سے بات کررہے ہو۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں اس دفعہ تو تمہاری غلطی معاف کررہا ہوں لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''اسے کچھ کھانے پینے کو بھی دیا ہے یا...''

''میں ابھی اس کے لیے کھانے کو منگواتا ہوں۔'' دلاور نے کہا اور شوکی سے کہا۔ ''جمی کو یہاں سے اٹھاؤ، بہت بڑا سورما بنتا تھا اور کچھ کھانے پینے کو لاؤ۔''

شوکی، دلاور کے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔ اس نے سہارا دے کر جمی کو بھی اٹھا لیا تھا لیکن وہ اس وقت بھی شدید تکلیف میں تھا۔

''سر! اگر اس لڑکی کو دو چار دن یہاں رکھنا ہے تو پھر اس کی دیکھ بھال کے لیے ثمرہ کو یہاں بھیج دیں۔'' میں نے جرمن زبان میں کہا۔ میں جانتا تھا کہ خالد کو نہ صرف جرمن بلکہ فرنچ بھی آتی ہے۔

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں ثمرہ کو یہاں بھیجتا ہوں اور اس لڑکی کو کسی دوسرے بیڈروم میں شفٹ کرو۔ یہ فارم ہاؤس ہے۔ یہاں اس سے کہیں زیادہ اچھے بیڈ رومز ہیں اور وہاں اے سی بھی موجود ہیں۔''

''سر! یہ بات آپ براہِ راست دلاور سے کہیں اور یہاں دلاور یا جمی کو مت چھوڑیے گا۔''

''مطلب یہ کہ تم یہاں رہنا چاہتے ہو؟'' خالد نے مسکرا کر کہا۔

''سر! سودے بازی ہمیں غزنوی سے کرنا ہے۔ یہ لڑکی تو بہت معصوم ہے۔ کہیں...''

''میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔'' خالد نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں دلاور اور جمی کو یہاں سے لے جاتا ہوں اور ثمرہ کو بھیج دیتا ہوں۔ فی الحال ثمرہ کو لینے کے لیے شوکی بھی میرے ساتھ جائے گا۔ تم تنہا یہاں کی صورتِ حال کو سنبھال لوگے؟''

''آف کورس سر! یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، پھر میں چلتا ہوں۔''

اسی وقت دلاور اور شوکی بھی کمرے میں آگئے۔

''تم لوگ میرے ساتھ چلو۔'' خالد نے کہا۔ ''چیف کی طرف سے ایک ٹاسک اور ملنے والا ہے۔ فی الحال یہاں صرف جونی رہے گا۔ شوکی، ثمرہ کو لے کر واپس آجائے گا۔ یہاں ہمیں کسی لڑکی کی ضرورت بھی پڑے گی۔''

''او کے باس۔'' دلاور نے کہا لیکن اس کا موڈ مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب چلے گئے۔ خالد اپنی گاڑی میں آیا تھا اور دلاور کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ ڈبل کیبن پک اپ اب بھی وہیں موجود تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے گیٹ بند کیا اور گھوم پھر کے آس پاس کا جائزہ لیا۔

میں نے مدیحہ کو ایک بہترین بیڈروم میں شفٹ کردیا۔ پھر میں نے سیل فون پر شوکی کا نمبر ملایا اور اس سے کہا کہ کھانے پینے اور ضرورت کا تمام سامان لے آئے۔

اچانک مجھے سیل فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ میں چونک اٹھا۔ یہ میرے سیل فون کی گھنٹی تو نہیں تھی۔ یہ آواز مدیحہ کے ہینڈ بیگ میں سے آرہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے ہینڈ بیگ لے لیا اور اس میں سے سیل فون نکال لیا۔ اسکرین پر ''پاپا'' کا نام تھا۔ یقینی طور پر یہ کال غزنوی کی تھی۔ میں نے لائن کاٹی اور سیل فون آف کردیا۔

''تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' مدیحہ نے پوچھا۔ وہ اب کسی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ''تم تو مجھے کسی بھی طرح سے کرمنل نہیں لگتے۔''

''ہم لوگوں نے تمہیں تاوان کے لیے اغوا کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''پاپا سے تمہیں دو چار لاکھ سے زیادہ نہیں مل سکیں گے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''سودے بازی تو ہمارا چیف کرے گا۔ ہاں، تمہاری حفاظت کی ذمے داری مجھ پر ہے۔'' پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ میں مدیحہ کے سیل سے علی اور ناصر سے بات کر سکتا ہوں۔ بریگیڈیئر عارف سے بھی بات ہو سکتی تھی۔

میں نے جیب سے مدیحہ کا سیل فون نکالا اور اس سے پوچھا۔ ''تمہارا سیل فون پری پیڈ ہے یا پوسٹ پیڈ؟''

''پری پیڈ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں سیل فون لے کر کمرے سے باہر نکل گیا اور سب سے پہلے بریگیڈیئر صاحب کو کال کی۔

دوسری طرف کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد ان کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

''السلام علیکم سر! میں عمران بول رہا ہوں۔''

''عمران تم!'' وہ حیران رہ گئے۔ ''یہ کس کا سیل فون ہے؟''

میں نے انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

''اچھا ایسا کرو، تم مجھے بتاؤ کہ ملتان کے کس علاقے میں ہو؟''

''سر! یہاں بہت سارے فارم ہاؤسز ہیں۔ انہی میں سے کسی فارم ہاؤس میں ان لوگوں نے مدیحہ کو رکھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس فارم ہاؤس کا کوئی نام تو نہیں ہے۔ خاصا اجاڑ اور ویران فارم ہاؤس ہے لیکن اس سے تقریباً ایک کلومیٹر پہلے میں نے گل فارم ہاؤس کا نام دیکھا تھا۔ مجھے پھر شاید بات کرنے کا موقع نہ ملے کیونکہ ان لوگوں کا ایک ساتھی واپس آ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے عمران! اب میں ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟''

مجھے کسی گاڑی کی آواز تو بہت پہلے سنائی دی تھی لیکن اچانک گیٹ پر ہارن بجا تو میں نے سلسلہ منقطع کیا اور موبائل فون آف کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ شوکی اور ثمرہ آ گئے تھے۔ شوکی ضرورت کا سب سامان لے آیا تھا۔

''یہاں کچن بھی ہے اور فریج بھی۔'' میں نے کہا۔ ''کھانے پینے کی چیزیں فریج میں رکھ دو۔ اور ثمرہ! تم ایسا کرو کہ پہلے کھانا لے آؤ۔''

''اے!'' ثمرہ نے منہ بنا کر کہا۔ ''میں کوئی ملازمہ نہیں ہوں۔''

''یہ باس کا حکم ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

ثمرہ بُرا سا منہ بنا کر خاموش ہو گئی پھر مسکرا کر بولی۔ ''ویسے جونی! آج تم نے دل خوش کر دیا۔ جمی کی ساری اکڑفوں نکال دی۔''

''وہ اونٹ کا سا کینہ رکھتا ہے۔'' شوکی نے کہا۔ ''وہ جونی سے بدلہ ضرور لے گا۔''

''اب اگر وہ مجھ سے الجھا تو میں ذرہ برابر رعایت نہیں کروں گا۔ اس سے پہلے بھی پچاس قتل کر چکا ہوں، ایک اور سہی۔''

''تم اور قتل؟'' شوکی نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے تو تم کسی یونیورسٹی کے طالب علم لگتے ہو۔''

''لگتا نہیں ہوں بلکہ تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی حال ہی میں یونیورسٹی سے فارغ ہوا ہوں۔ ایک لڑکی کے چکر میں وہاں کی ایک خطرناک مافیا میرے پیچھے پڑ گئی تو بابا نے مجھے یہاں بھیج دیا۔''

''لڑکی کے چکر میں؟'' ثمرہ نے ہنس کر کہا۔ ''کون تھی وہ خوش نصیب؟''

''وہ خوش نصیب نہیں تھی۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ خود ہی میرے چکر میں پڑی تھی اور خود ہی ماری گئی۔ وہ مافیا چیف کی محبوبہ تھی۔ وہ تو مجھے بھی مارنا چاہتا تھا لیکن میں بچ نکلا۔''

''اب ذرا ہمیں بھی تو وہ پری چہرہ دکھاؤ جسے تم اٹھا کر لائے ہو؟'' ثمرہ نے عامیانہ انداز میں کہا۔

میں اسے بیڈروم کی طرف لے گیا۔

مدیحہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ہماری آہٹیں سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ثمرہ کو حیرت سے دیکھا۔ ثمرہ اس سے کہیں زیادہ حسین اور اشتعال انگیز جسم کی مالک تھی۔ مدیحہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ ''تم لوگ جرائم پیشہ نہیں ہو سکتے۔ سوائے اس آدمی کے جسے تم نے ابھی بہت بے رحمی سے مارا تھا۔ تم بھی شاید یونیورسٹی میں پڑھتی ہو؟'' اس نے ثمرہ سے کہا۔

ثمرہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے اے سی آن کر دیا کیونکہ مدیحہ گرمی کی وجہ سے بے چین تھی۔

ثمرہ اس کے لیے کھانا لے کر آئی تو وہ بولی۔ ''میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''کھانے سے کیا ناراضی ہے؟''

''پلیز، مجھے گھر چھوڑ دو۔'' وہ نہ جانے کب سے ضبط

کیے بیٹھی تھی۔ اچانک ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''ابھی تک امی، پاپا اور گڈو کسی نے بھی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ پلیز، مجھے چھوڑ دو۔ تم مجھے اچھے آدمی لگتے ہو۔''

''میں تمہیں چھوڑ دوں گا، پہلے تم کھانا تو کھاؤ۔''

''دیکھو، تمہاری وجہ سے ہم بھی بھوکے ہیں۔'' ثمرہ نے کہا۔

اس نے بمشکل تمام دو چار لقمے لیے، پھر ہاتھ کھینچ لیا۔

''اچھا، یہ جوس پی لو۔'' ثمرہ نے بہت اپنایت سے کہا اور زبردستی اسے جوس پلا دیا۔

ثمرہ اور شوکی کھانے بیٹھے تو میں بھی بیٹھ گیا لیکن مجھ سے بھی کھانا نہیں کھایا گیا۔ یہ سب کچھ میری فطرت کے خلاف تھا۔

جوس میں ثمرہ نے شاید کوئی خواب آور دوا ملائی تھی۔ مدیحہ تھوڑی ہی دیر بعد گہری نیند سو گئی۔

شام کو ہارلے اور خالد وہاں پہنچے۔ مدیحہ اس وقت تک جاگ چکی تھی۔

خالد نے اپنا سیل فون نکال کر کہا۔ ''تمہارے ڈیڈی کا سیل نمبر کیا ہے؟''

ثمرہ کو سیل نمبر زبانی یاد تھا۔ اس نے خالد کو سیل نمبر بتا دیا۔ خالد نے نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ ''ہیلو، مجھے غزنوی صاحب سے بات کرنا ہے... آپ کی بیٹی ہمارے قبضے میں ہے... کیوں؟... نہیں رقم نہیں چاہیے اور رقم آپ دے بھی نہیں سکتے ہیں... اچھا... میری ڈیمانڈ... باقی باتیں میں بعد میں کروں گا... ہاں ہاں، ابھی تک آپ کی بیٹی خیریت سے ہے... اچھا... لیں بات کریں۔'' اس نے سیل فون کا اسپیکر آن کر کے مدیحہ کی طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو پاپا!'' مدیحہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟'' دوسری طرف سے غزنوی کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔

''جی ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے بہت آرام سے رکھا ہے۔''

''تم نے کھانا کھایا ہے؟''

''جی پاپا!'' اس نے کہا۔ ''مجھے ان لوگوں نے کھانا بھی کھلایا ہے اور ہر طرح سے میرا خیال رکھ رہے ہیں۔''

خالد نے سیل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ''اب تمہیں یقین آیا کہ تمہاری بیٹی خیریت سے ہے؟''

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''یہ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔'' یہ کہہ کر خالد نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''تم لوگوں کو اللہ کا واسطہ۔'' مدیحہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے گھر جانے دو... تم جتنے پیسے کہو گے، بابا تمہیں دے دیں گے۔'' وہ بُری طرح سسکنے لگی۔

''تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' ہارلے نے انگلش میں کہا۔ ''جتنی جلدی تمہارا باپ راضی ہو جائے گا، اتنی ہی جلدی ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔''

اچانک خالد نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا سیل فون کہاں ہے؟''

میں نے آنکھوں کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ مجھے شاید کچھ زیادہ ہی خوش فہمی ہو گئی تھی کہ وہ میری بات مان لے گی۔

''شاید میرا سیل فون گھر پر رہ گیا۔'' مدیحہ نے کہا۔ ''وہ سائلنٹ پر ہے اس لیے پاپا کو بھی معلوم نہیں ہوا ہوگا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔

رات کو ثمرہ نے پھر مدیحہ کو خواب آور دوا کھلا دی اور وہ پُرسکون نیند سو گئی۔

تھوڑی دیر بعد ثمرہ میرے کمرے میں آ گئی اور بولی۔ ''میں نے اس معصوم لڑکی کو خواب آور دوا دے دی ہے۔ اب وہ صبح تک سکون سے سوتی رہے گی۔''

''اس خواب آور دوا کی ایک خوراک تم بھی لے لیتیں۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ میں بھی صبح تک سکون کی نیند سوتا۔''

''تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو؟'' وہ بہت ادا سے لہرا کر بولی۔

''میں عمر... جونی ہوں اور کیا ہوں؟'' میں بے خیالی میں اپنا اصلی نام لیتے لیتے رک گیا۔ ''اور جونی ہی سمجھتا ہوں۔ تم نے شاید کچھ زیادہ ہی چڑھا لی ہے۔''

''آج تو میں نے ایک قطرہ بھی نہیں پیا۔ جونی! اگر تم کہو گے تو میں شراب پینا بالکل چھوڑ دوں گی۔ میں جانتی ہوں تمہیں شراب سے نفرت ہے۔'' وہ آہستہ سے میرے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ''جونی پلیز! میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔ بس تم میری ایک بات مان لو۔''

''یہی کہ جمی کو ختم کر دوں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''بھاڑ میں گیا جمی!'' وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔ ''جونی... میں... تمہیں پسند کرنے لگی... ہوں... آئی... لو... یو جونی!'' وہ انتہائی جذباتی ہو گئی۔ ''میں جانتی ہوں کہ میں اچھی لڑکی نہیں ہوں لیکن تم کہو گے تو میں سب کچھ

چھوڑ دوں گی، صرف تمہاری ہو کر رہوں گی۔"
"تم چاہو بھی تو یہ سب کچھ نہیں چھوڑ سکتیں ثمرہ!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ لوگ تمہیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔"
"تم ایک دفعہ ہاں کر دو، پھر میں دنیا سے ٹکرا جاؤں گی۔" اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔
"اچھا، اس وقت تو ہم ڈیوٹی پر ہیں۔ پھر کسی وقت بات کریں گے۔" میں نے کہا۔ "میں بھی صبح سے مسلسل بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہوں، اب ذرا مجھے بھی آرام کرنے دو پلیز۔"
"اچھا، تم سو جاؤ۔" وہ ہنس کر بولی۔ "اب میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔" وہ لہراتی بل کھاتی کمرے سے نکل گئی۔
میں نے سکون کا سانس لیا اور بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔
صبح میری آنکھ کھلی تو ثمرہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔
"اب اٹھ جاؤ۔ نو بجنے والے ہیں۔" ثمرہ نے کہا۔ "باس اور دوسرے لوگ دس بجے آنے والے ہیں۔ میں نے کسی نہ کسی طرح مدیحہ کو بھی ناشتا کرا دیا ہے۔"
وہ اس وقت بہت شرافت کے موڈ میں تھی۔ مجھے جگا کر فوراً ہی واپس چلی گئی۔
ناشتے سے فارغ ہو کر میں مدیحہ کے کمرے میں پہنچا۔ چند گھنٹوں میں اس کا چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ مسلسل رونے کی وجہ سے آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر پھر رونے لگی اور بولی۔ "جونی بھائی پلیز! مجھے یہاں سے نکالو۔"
دس بجے تک خالد اور ہارلے وغیرہ بھی پہنچ گئے۔ خالد کے پاس اس مرتبہ غزنوی صاحب کا نمبر موجود تھا۔ اس نے سیل فون نکالا تو ہارلے نے کہا۔ "تم لوگ ٹیکنالوجی میں تو ابھی آگے نہیں ہو اندا اس نمبر کے ذریعے وہ لوگ یہ جگہ تو تلاش کر ہی سکتے ہیں۔"
"نہیں مسٹر ہارلے!" خالد نے کہا۔ "یہ ایسا خصوصی نمبر ہے کہ وہ لوگ اسے بھی ٹریس نہیں کر سکیں گے۔" اس نے غزنوی کا نمبر ڈائل کر دیا اور سلسلہ ملتے ہی اسپیکر فون بھی آن کر لیا۔
"ہیلو!" دوسری طرف سے غزنوی صاحب کی مضطرب آواز سنائی دی۔
"رات کیسی گزری غزنوی؟" خالد نے طنزیہ انداز میں کہا۔
"اچھا، تو تم ہو؟" غزنوی صاحب نے کہا۔ "میری بیٹی..."
"وہ ابھی خیریت سے ہے۔"
"کیا چاہتے ہو تم؟" غزنوی صاحب نے اپنے اضطراب پر قابو پالیا تھا۔
"تمہارے پاس ایس سی زیرو زیرو ٹو سیون نمبر کی ایک ٹاپ سیکرٹ فائل آئی ہے۔" خالد نے کہا۔
"تمہیں کیسے پتا؟" غزنوی صاحب نے حیرت سے کہا۔
"اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ، وہ فائل کہاں ہے؟"
"ابھی تو میرے پاس ہے لیکن..."
"ہمیں وہ فائل چاہیے۔" خالد نے کہا۔
"وہ "ٹاپ سیکرٹ" فائل ہے۔" غزنوی نے کہا۔ "اس فائل میں قومی راز ہیں۔ وہ میں تمہیں کیسے دے سکتا ہوں؟"
"تو پھر اپنی بیٹی کو بھول جاؤ۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا؟" غزنوی صاحب بپھر کر بولے۔
"میرا مطلب یہ ہے کہ وہ فائل ہمارے حوالے کر دو اور اپنی بیٹی کو لے جاؤ۔"
"ناممکن۔" غزنوی صاحب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
"میں تمہیں سوچنے کے لیے بارہ گھنٹے دے سکتا ہوں۔" خالد نے کہا۔ "اس کے بعد تمہیں تمہاری بیٹی کی لاش ملے گی۔"
"اس معصوم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" غزنوی صاحب نے کہا۔ "مارنا ہے تو مجھے مارو۔"
"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے... صرف بارہ گھنٹے۔" خالد نے کہا۔ "فیصلہ کرو کہ فائل دو گے یا اپنی بیٹی کی زندگی؟ اور اس کی موت بھی بہت دردناک ہوگی۔ ہم اسے آسانی سے نہیں ماریں گے بلکہ..."
"میری بیٹی کو خراش بھی آئی تو..."
"خراش!" خالد نے ان کی بات کاٹ دی۔ "وہ تو یوں بھی خاصی خوب صورت ہے۔ میرا مطلب تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو گے۔ میں رات کو تمہیں ٹھیک فون کروں گا، اچھی طرح سوچ لینا۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
مدیحہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے

روتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ کس قسم کے انسان ہو؟ بلکہ تمہیں تو انسان کہنا ہی غلط ہے۔ تم تو جانور ہو جانور۔ میں پاپا کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ مجھے مرنے دیں گے لیکن اس فائل کو کبھی تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔"
"اولاد کی محبت بہت بُری چیز ہوتی ہے لڑکی۔" ہارلے نے کہا۔ "تمہارا باپ وہی کرے گا جو ہم کہیں گے۔"
"خالد! اس لڑکی کی حفاظت کے لیے یہاں کتنے آدمی ہیں؟" کمرے سے باہر نکل کر ہارلے نے پوچھا۔
"یہاں تین آدمی ہیں مسٹر ہارلے۔" خالد نے کہا۔ "جونی کے بارے میں آپ اچھی طرح جانتے ہیں، اس کے علاوہ شوکی ہے۔ اسے بھی کئی دفعہ ہم آزما چکے ہیں۔ یہ دونوں بیس آدمیوں پر بھاری ہیں۔ ثمرہ ہے۔ وہ بھی کسی طور شوکی سے کم نہیں ہے۔ پھر اس ویرانے میں وہ بھاگ کر کہاں جا سکتی ہے؟"
میں اپنے کمرے کے باتھ روم میں چلا گیا اور مدیحہ کا سیل فون نکال کر اسے آن کیا اور بریگیڈیئر عارف صاحب کا نمبر ملا کر بولا۔ "سر! ان لوگوں نے..."
"میں جانتا ہوں..." انہوں نے کہا۔ "انہوں نے غزنوی سے اس ٹاپ سیکرٹ فائل کا مطالبہ کیا ہے۔ تم مجھے لوکیشن ایک مرتبہ پھر سمجھاؤ۔"
"سر! یہاں دور دور تک ویرانہ ہے۔ کسی بھی گاڑی کی آمد فوراً نظروں میں آجائے گی۔ آپ غزنوی صاحب سے کہیں کہ وہ ان لوگوں سے کل صبح تک کا وقت لے لیں۔ وہ کوئی بھی بہانہ بنا سکتے ہیں۔ میں مدیحہ کو خود ہی بہ حفاظت یہاں سے نکال لوں گا۔"
میں نے مڑ کر دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں باتھ روم کا دروازہ اندر سے بولٹ کرنا بھول گیا تھا۔ باتھ روم کے دروازے پر ہارلے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس کا رخ میرے سینے کی جانب تھا۔
"یو چیٹ!" اس نے بپھر کر کہا۔ "تم ہمیں ڈبل کراس کر رہے تھے۔ یہ سیل فون تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"
"مجھے یہاں سے باہر تو آنے دیں مسٹر ہارلے۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔" میں نے اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے انتہائی فرسودہ حربہ آزمایا اور بولا۔ "خالد صاحب! آپ ہی انہیں سمجھائیے۔ میں..."
ہارلے کی نظریں ایک لمحے کو چوکی تھیں۔ میں نے اس کے سینے پر پوری قوت سے لات رسید کر دی۔ وہ تکلیف کی شدت سے دوہرا ہوا تو میں نے بڑھ کر اس کا ریوالور چھین لیا اور اس کے بال پکڑ کر اس کا سر پوری قوت کے ساتھ کموڈ سے ٹکرا دیا۔ وہ بہت سخت جان آدمی تھا۔ میں اسے کسی بھی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا خصوصی اور انتہائی خطرناک داؤ آزمایا۔ بائیں ہاتھ سے اس کا سر پکڑا اور دائیں ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اچانک زوردار جھٹکا دیا۔ گردن کی ہڈی کے چٹخنے کی آواز آئی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ کموڈ سے ٹکرانے کی وجہ سے اس کے سر میں خاصی چوٹ آئی تھی۔ اس کا چہرہ خون آلود ہو رہا تھا۔ وہ خون میرے ہاتھوں پر بھی لگ گیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ اچھی طرح دھوئے۔ فرش پر کچھ پانی گرایا تاکہ دیکھنے والوں کا تاثر یہی ہو کہ ہارلے پھسل کر گرا اور کموڈ سے ٹکرا گیا۔ اس سے نہ صرف اس کے سر میں شدید چوٹ آئی بلکہ گردن کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔
وہ یوں بھی کموڈ کے نزدیک ہی گرا ہوا تھا اور کموڈ کے کنارے پر اس کا خون بھی لگا ہوا تھا۔
میں مطمئن ہو کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ میری نظر اس کے ریوالور پر پڑی۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور اسے اچھی طرح صاف کر کے اس کے بغلی ہولسٹر میں ڈال دیا پھر میں باتھ روم سے باہر آ گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ میں نے کمرے میں آ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میرے صرف بال بکھر گئے تھے۔ میں نے دوبارہ بال سنوارے، تولیا سے اپنے چہرے کو صاف کیا اور باہر نکل آیا۔
خالد اور ثمرہ ایک مرتبہ پھر مدیحہ کے کمرے میں تھے۔ میں وہاں پہنچا تو خالد، مدیحہ کو خوف زدہ کر رہا تھا کہ اگر تمہارے باپ نے ہماری بات نہیں مانی تو تمہاری عزت تو جائے گی ہی، تمہاری جان بھی چلی جائے گی۔
"اسے خوف زدہ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا سر!" میں نے کہا۔ "اس کے باپ کو خوف زدہ کریں۔"
"اس کے باپ کے سامنے تو میں مدیحہ کی پامالی اور موت کا ایسا نقشہ کھینچوں گا کہ وہ تڑپ اٹھے گا۔" پھر اس نے اردگرد دیکھا اور چونک کر بولا۔ "یہ مسٹر ہارلے کہاں گئے؟"
"ابھی تو یہیں تھے۔" میں نے کہا۔
جب دس منٹ تک ہارلے کا کچھ پتا نہیں چلا تو اس کی تلاش شروع ہوئی۔
تھوڑی دیر بعد میرے باتھ روم سے اس کی لاش برآمد ہوئی۔
ان سب کے ساتھ میں بھی چونک اٹھا۔ "ارے، یہ کیا

ہوا؟'' میں نے کہا۔

میں آگے بڑھنے لگا تو خالد نے مجھے روک دیا اور بہت باریکی بینی سے باتھ روم کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ''لگتا ہے، مسٹر ہارلے باتھ روم میں آئے اور پھسل کر گر گئے۔''

میں نے سکون کا سانس لیا کہ ان لوگوں کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا۔

''اب اس لاش کا کیا کریں؟'' خالد نے کہا۔ ''یہ امریکی شہری ہے اور سفارت کار کے طور پر یہاں آیا تھا۔ ہمیں پولیس کو بھی انفارم کرنا پڑے گا اور امریکی سفارت خانے کو بھی۔''

''سر! پولیس سب سے پہلے یہ سوال کرے گی کہ ہارلے اس ویرانے میں کیا کر رہا تھا... پھر ابھی غزنوی سے ہماری ڈیل بھی فائنل نہیں ہوئی ہے۔ اس کی بیٹی یہیں موجود ہے۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' خالد الجھ کر بولا۔

''ہارلے کی لاش کو یہاں سے کہیں دور ویرانے میں ڈال دیں۔ ہم کہہ دیں گے کہ مسٹر ہارلے ہم سے ملے ضرور تھے لیکن پھر کسی کا ٹیلی فون آ گیا اور وہ روانہ ہو گئے۔ اس کی گاڑی ابھی آپ کے بنگلے پر کھڑی ہو گی۔ یا تو آپ گاڑی کو وہیں رہنے دیں اور کہہ دیں کہ ہارلے کا وہ نامعلوم ملاقاتی ..... اپنی گاڑی میں لے گیا تھا یا پھر اس کی گاڑی بھی وہاں سے کہیں دور بھجوا دیں۔''

خالد چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ''اس کی گاڑی کو فی الحال وہیں رہنے دو۔ جب تک پولیس کو ہارلے کی لاش کا علم ہو گا، ہم غزنوی سے فائل حاصل کر چکے ہوں گے۔'' پھر وہ دلاور سے بولا۔ ''اس کی لاش کو ایسی جگہ پھینک کر آؤ کہ کبھی اس کا سراغ نہ ملے۔''

دلاور، ہارلے کی لاش کو اٹھا کر لے گیا۔ میں نے اور ثمرہ نے مل کر اچھی طرح باتھ روم صاف کر دیا۔

شام کو چائے پینے کے بعد خالد نے ایک مرتبہ پھر غزنوی صاحب سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''ہاں غزنوی! کیا فیصلہ کیا؟''

''میں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔'' غزنوی نے کہا۔ ''مجھے کچھ وقت اور چاہیے۔ اپنے ضمیر کا سودا کرنے کے لیے کچھ وقت تو درکار ہوتا ہے۔'' انہوں نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''چلو، میں تمہیں کل صبح دس بجے تک کا وقت دے رہا ہوں۔'' خالد نے کہا۔ ''اس کے بعد اگر تم نے مزید وقت مانگا تو تمہیں ایک منٹ بھی نہیں دوں گا۔ پھر تم فائل دو گے یا اپنی بیٹی کی لاش وصول کرو گے۔ ممکن ہے تمہیں لاش بھی نہ ملے۔ ہم اپنا مطلب پورا ہونے کے بعد اسے آگے فروخت کر دیں۔''

''بکواس بند کرو۔'' غزنوی نے کہا۔

''یہ بکواس ہے یا حقیقت اس کا اندازہ تو تمہیں کل ہو گا۔'' یہ کہہ کر خالد نے سلسلہ منقطع کر دیا اور بولا۔ ''اچھا ہوا اس نے وقت مانگ لیا۔ ہارلے کی موت کے بعد میں بھی بہت اپ سیٹ ہوں۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں آج رات میں کسی وقت مدیحہ کو وہاں سے نکال سکتا تھا۔ معاملہ نہ صرف ایک معصوم کی زندگی اور عزت کا تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قومی سلامتی کا تھا۔

اس رات خالد کے ساتھ ساتھ شوکی اور نصیر بھی وہیں تھے، ثمرہ تو پہلے سے موجود تھی۔ بس جمی کی کمی تھی۔ دلاور بھی لاش کو ٹھکانے لگا کر آنے والا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ خالد کا پروگرام کیا ہے؟ وہ یہیں قیام کرے گا یا جائے گا... لیکن محسوس یہ ہو رہا تھا کہ وہ یہیں قیام کرے گا کیونکہ اس نے بغیر کسی جھجک کے میرے بیڈ روم پر قبضہ کر لیا تھا۔

وہاں صرف تین بیڈ رومز تھے یا پھر ایک وہ بوسیدہ سا کمرا تھا جہاں دلاور نے مدیحہ کو پہلی دفعہ رکھا تھا۔ تیسرا..... بیڈ روم ثمرہ کے پاس تھا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر مدیحہ کو یہاں سے لے جانے کے لیے مجھے ان سب کو ہلاک کرنا پڑا تو میں ان سب کو مار دوں گا۔

میں نے سوچا کہ ثمرہ کو مدیحہ کے کمرے میں بھیج دوں اور خود وہاں چلا جاؤں۔ یوں بھی مجھے آج رات سونا تو تھا نہیں۔

خالد کمرے میں شراب کی بوتلیں، بھنی ہوئی مونگ پھلیاں اور کاجو وغیرہ لے کر بیٹھا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔ ''جونی! تم ثمرہ کے کمرے میں چلے جاؤ۔ یوں بھی آج وہ اس کمرے میں رہے گی۔''

میں نے ثمرہ کو کبھی اچھا نہیں سمجھا لیکن اس وقت نہ جانے کیوں مجھے خالد کا یہ جملہ بہت ناگوار گزرا۔

میں ثمرہ کے کمرے میں پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھی۔ ''اوہو، آج تو میری قسمت ہی جاگ گئی۔ تم... خود... میرے پاس آ گئے۔''

''میں خود نہیں آیا ہوں بلکہ مجھے باس نے بھیجا ہے۔'' میں نے کہا۔

اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ ''وہ آج رات یہیں رہے گا اور تم...''

''میں اب صرف تمہاری ہوں۔ کسی اور کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کروں گی۔'' ثمرہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''وہ زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا؟ مجھے گولی مار دے گا... تو مار دے۔''

''تم کیوں جان دینے پر تلی ہوئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں سب کچھ چھوڑ دوں گی۔''

''تم سراب کا پیچھا کر رہی ہو ثمرہ!'' میں نے کہا۔ ''میں ابھی...''

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم میری محبت کا جواب محبت سے دیتے ہو یا نہیں۔ میں تو تم سے محبت کرتی ہوں۔ میرے لیے بس یہی کافی ہے۔''

''تو پھر فوری طور پر تم مدیحہ کے پاس چلی جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''مجھے مشورے مت دو۔'' وہ بھنا کر بولی۔ ''تم تو بس یہی چاہتے ہو نا کہ میں یہاں سے چلی جاؤں؟'' یہ کہہ کر وہ پیر پٹختے ہوئے وہاں سے نکل گئی۔

میرے پاس ایک جرمن لیوگر تھا۔ اس پسٹل میں صرف نو گولیاں تھیں۔ مجھے فی الحال تو انہی پر بھروسا کرنا تھا۔ شوکی کے مقابلے میں نصیر اور ثمرہ بہت شارپ شوٹر تھے۔ وہ کم بخت پوری طرح چوکنا بھی رہتا تھا۔ شارپ شوٹر دلاور بھی تھا لیکن اس میں وہ پھرتی نہیں تھی۔ رہا خالد تو میں نے آج تک اسے ایکشن میں نہیں دیکھا تھا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ میں بیڈ پر نیم دراز پہلو بدل رہا تھا۔

آخر دو بجے کے قریب وہاں تقریباً سناٹا چھا گیا۔

میں نے ابھی تک کپڑے بھی نہیں بدلے تھے، جینز اور جیکٹ ہی میں ملبوس تھا۔ میں نے جوگرز پہنے، اپنے ہتھیار کا جائزہ لیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں پورے فارم ہاؤس کا ایک راؤنڈ لگا کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر دلاور یا شوکی میں سے کوئی مجھے دیکھ بھی لیتا تو مجھ پر شبہ نہ کرتا۔ وہ یہی سمجھتے کہ میں احتیاط کے طور پر وہاں کا چکر لگا رہا ہوں۔

میں پہلے خالد کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا اور مسلسل پینے میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے پر شدید تشویش کے آثار تھے۔ شاید اسے ہارلے کی موت کی فکر تھی۔

''آؤ جونی!'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ ''تم ابھی تک سوئے نہیں؟''

''میں احتیاطاً پورے فارم ہاؤس کا راؤنڈ لگا رہا ہوں۔ آپ آرام کریں۔'' یہ کہہ کر میں وہاں سے نکل آیا۔

میں نے مدیحہ کے کمرے میں جھانکا، ثمرہ بھی تھک کر سو گئی تھی لیکن مدیحہ جاگ رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا لیکن میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اچانک ثمرہ کی دونوں کنپٹیاں پکڑ کر دبانے لگا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی آنکھوں پر تھا تاکہ اگر وہ آنکھیں کھول بھی لے تو میری شکل نہ دیکھے۔

چند لمحوں میں ثمرہ نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔

میں وہاں سے باہر نکلا اور دلاور کو تلاش کیا۔ وہ اسی بوسیدہ کمرے میں خراٹے لے رہا تھا جہاں پہلے دن اس نے مدیحہ کو رکھا تھا۔ میں نے اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

اب مجھے نصیر اور شوکی کی تلاش تھی۔

مجھے گیٹ کے نزدیک ایک گاڑی کی آڑ میں ایک سایہ سا نظر آیا۔ میں مزید آگے بڑھا تو وہ شوکی تھا۔ میں پشت سے دبے قدموں اس کی طرف بڑھا اور اس کے سر پر ریوالور کا دستہ رسید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کا ریوالور بھی چھین لیا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اس کے ریوالور پر سائیلنسر بھی فٹ تھا۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میرے دائیں شانے میں آگ سی بھر گئی ہو۔ مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ مجھے گولی لگ گئی ہے۔ اس سے پہلے بھی دو دفعہ مجھے گولی لگ چکی تھی۔ میں نے نصیر کو بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ شاید اس نے پشت سے مجھ پر فائر کیا تھا۔ میری زندگی ہی باقی تھی کہ عین اس وقت میں شوکی کے ریوالور کا جائزہ لینے کے لیے اپنی جگہ سے بائیں طرف جھک گیا تھا۔ ورنہ شانے پر لگنے والی گولی میری پشت میں لگتی۔ میں نے حملہ آور کو سنانے کے لیے ہلکی سی چیخ ماری اور اچھل کر گر پڑا۔ یہ سب کچھ سیکنڈوں میں ہو گیا تھا۔ فوراً ہی مجھے ٹارچ کی تیز روشنی دکھائی دی۔ ٹارچ لے کر کوئی میری ہی طرف آ رہا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا، میرا دوست ہرگز نہیں تھا۔ میں نے شوکی کے ریوالور سے نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ آنے والے کو چیخنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ اس کی ٹارچ نیچے گر گئی اور وہ خود بھی زمین پر گر پڑا۔

وہ نصیر نہیں تھا بلکہ کوئی اجنبی تھا۔ ممکن ہے خالد اسے خصوصی طور پر اپنے ساتھ لایا ہو۔

میں نے فوراً ہی ٹارچ آف کر دی۔ مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں گھوم کر دوسری گاڑی کی آڑ میں چلا گیا۔ پھر مجھے نصیر کا ہیولا نظر آیا۔ وہ عین اس جگہ آ ٹھہرا جہاں اس اجنبی کی لاش پڑی تھی۔ پھر وہ ڈپٹ کر بولا۔ ”کون ہے، کیا ہو رہا ہے یہاں...؟“

میں نے اچانک پیچھے سے اس کے سر پر بھی ریوالور کا دستہ رسید کر دیا۔ وہ فوراً ہی اوندھے منہ گر پڑا۔

میں تیزی سے اندر بھاگا اور مدیحہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئی اور آہستہ سے بولی۔ ”آ... آپ... تو... بہت زخمی ہیں۔“

”تم ڈرائیونگ کر سکتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، مجھے ڈرائیونگ آتی ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو پھر آؤ میرے ساتھ۔“ میں اسے لے کر باہر آیا۔ ایک گاڑی کی چابی شوکی کی جیب میں بھی تھی۔

میں نے چابی مدیحہ کو دے کر کہا۔ ”تم یہاں سے نکل کر دائیں طرف جانا، پھر بائیں جانب پہلا ٹرن آتے ہی مڑ جانا اور سیدھی چلی جانا۔ وہ ملتان روڈ ہے۔“

”اور آپ؟“ اس نے کہا۔

”میں ابھی یہیں رہوں گا۔“ پھر میں نے جیب سے مدیحہ کا سیل فون نکال کر بریگیڈیئر عارف صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ انہوں نے پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔ ”ہاں عمران!“

”سر! میں نے مدیحہ کو وہاں سے نکال دیا۔ وہ ملتان روڈ کی طرف آ رہی ہے۔ میں اب یہ سیل فون بھی اسی کو دے رہا ہوں تاکہ وہ آپ سے رابطے میں رہے۔ وہ آف وائٹ ٹویوٹا کرولا میں ہوگی۔ آپ فوراً کسی کو ملتان روڈ کی طرف بھیجیں۔ ان لوگوں کو ابھی کچھ دیر میں اس کے فرار کا علم ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اس سے پہلے ہی مدیحہ کو اپنی تحویل میں لے لیں۔“ میں نے سیل فون مدیحہ کے حوالے کیا اور گیٹ کو چوپٹ کھول کر اسے باہر نکلنے کو کہا۔ ”جلدی کرو اور ذرا تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا۔ جاؤ، وش یو گڈ لک!“

مدیحہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور فوراً ہی وہاں سے نکل گئی۔ میں نے دلاور کے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور باہر آ کر پہلے تو اپنے پسٹل ...... سے مختلف سمتوں میں تین فائر کیے اور خود بھی اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے شوکی کا ریوالور رومال سے صاف کیا اور اسے شوکی کے نزدیک پھینک دیا۔

میرا خون بہت تیزی سے ضائع ہو رہا تھا اور مجھے شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ میں نے آخری آوازیں خالد اور دلاور کی سنیں۔ وہ دونوں چیخ رہے تھے۔ پھر میں نے کچھ فائروں کی آواز سنی اور میرا ذہن پوری طرح تاریکی میں ڈوب گیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں کسی اجنبی جگہ پر تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ شاید کسی اسپتال کا کمرا تھا۔ میرے بیڈ کے نزدیک ہی ثمرہ کرسی پر بیٹھی سو رہی تھی۔ میرا سر ابھی تک چکرا رہا تھا اور ہر چیز دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ میں نے بمشکل تمام کہا۔ ”پا... نی...“

ثمرہ نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر وہ بہت تیزی سے میرے اوپر جھک گئی۔ ”جونی... جونی!“ اس نے آوازیں دیں لیکن مجھ سے کچھ بولا نہ گیا اور مجھ پر پھر غشی سی طاری ہونے لگی۔

ثمرہ چیختی ہوئی بھاگی۔ ”ڈاکٹر... ڈاکٹر!“

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ آوازیں کہیں بہت دور سے آ رہی ہوں۔ میرا ذہن پھر تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو وہی کمرا تھا لیکن اس وقت کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ثمرہ حسبِ معمول میرے بیڈ کے پاس بیٹھی تھی لیکن یہ وہ ثمرہ تو نہیں تھی جسے میں جانتا تھا۔ اس کا چہرہ گویا بجھ کر رہ گیا تھا، لباس بھی شکن آلود تھا اور بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔

مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ خوشی سے چیخی۔ ”ڈاکٹر! پیشنٹ کو ہوش آ گیا۔“

میرے دائیں بائیں اسٹینڈ پر گلوکوز اور خون کے بیگ لٹک رہے تھے جو قطرہ قطرہ میرے جسم میں داخل ہو رہے تھے۔

اسی وقت ایک ڈاکٹر اور نرس وہاں آ گئے۔

ڈاکٹر نے اچھی طرح میرا جائزہ لیا پھر بولا۔ ”شکر ہے مسٹر جونی! آپ کو ہوش تو آیا؟“

”مجھے... کیا ہوا... تھا... اور...“

”آپ پلیز خاموش رہیں اور اپنے ذہن پر زور مت ڈالیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

دو گھنٹے بعد میری حالت مزید سنبھل گئی۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گولی میرے شانے کے

رونی حصے کو پھاڑتی ہوئی میرے سینے میں دائیں جانب پیوست ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے میرا خون بہت زیادہ ضائع ہو گیا تھا اور مجھے تین دن بعد پہلی دفعہ ہوش آیا تھا۔ پھر مزید یک دن بعد میں نے آنکھیں کھولی تھیں۔

شام تک میں اس قابل ہو سکا کہ کچھ بول سکوں۔ اس کے باوجود ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ مریض کو زیادہ نہ بولنے دیا جائے۔

ثمرہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔ ”اب تم کیوں رو رہی ہو؟“

”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں جونی!“ ثمرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس وقت مجھے امی یاد آئیں۔ ان بے چاری کو تو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ ان کا بیٹا موت کے دروازے پر دستک دے کر واپس آیا ہے۔

”اچھا، پہلے تم جا کر اپنا حلیہ درست کرو، بالکل چڑیل لگ رہی ہو۔ اور بہتر ہے کہ کچھ دیر آرام کر لو۔“

”میں ابھی آتی ہوں۔“ ثمرہ نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

اسی وقت خالد اور دلاور آ گئے۔ خالد نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ”اب کیسے ہو جونی؟“

”اب میں کافی بہتر ہوں لیکن مجھے ہوا کیا تھا؟ میں تو فارم ہاؤس کا ایک راؤنڈ لگا کر واپس آ رہا تھا کہ اچانک مجھ پر کسی نے فائر کر دیا... پھر... پھر... کیا ہوا...؟“

”ہم وہ بازی ہار گئے جونی! ان لوگوں نے نہ جانے کیسے اس فارم ہاؤس کا سراغ لگا لیا۔ انہوں نے پہلے نصیر اور شوکی پر حملہ کیا پھر میرے ایک آدمی رشید کو مار دیا۔“

”رشید کون؟“ میں نے پوچھا۔

”رشید میرا خاص آدمی تھا۔ وہ آسانی سے قابو میں نہیں آیا ہوگا۔ ان لوگوں نے اسے ختم کر دیا۔ تم نے بھی ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی ہوگی۔ انہوں نے اپنے خیال میں تمہیں بھی ٹھکانے لگا دیا۔ وہ لوگ غالباً پہلے ہی سے فارم ہاؤس میں چھپے بیٹھے تھے۔ تمہاری یا رشید کی گولی سے ممکن ہے کوئی مر بھی گیا ہو۔ ایک آدمی زخمی بھی ہوا تھا۔ وہی مدیحہ کو وہاں سے لے گیا ہوگا۔ اس کے خون کے قطرے کمرے میں موجود تھے۔“

”مجھے بہت افسوس ہے باس!“ میں نے کہا۔ ”ہم نے اس کیس کو زیادہ سیریس لیا ہی نہیں۔“

”اس میں قصور تمہارا ابھی نہیں ہے۔“ خالد نے کہا۔ ”ہم بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ان لوگوں کو ہمارے ٹھکانے کا علم نہیں ہو سکتا۔ ہم نے کہیں کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ حیرت تو مجھے دلاور پر ہے۔ یہ ان حالات میں بھی گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔“

”باس! میں اب بھی یہی کہوں گا کہ انہیں ہمارے ہی کسی آدمی نے اطلاع دی ہے۔“

اسی وقت ڈاکٹر آ گیا اور بولا۔ ”پلیز سر! پیشنٹ کو زیادہ ڈسٹرب مت کریں۔“

”سوری ڈاکٹر!“ خالد نے کہا۔ ”ہم لوگ بس جا ہی رہے تھے۔“ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ”جلدی سے صحت یاب ہو جاؤ۔“

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ثمرہ آ گئی۔ میرے سامنے وہ پرانی ثمرہ تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے چہرے پر وہ شادابی نہیں تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ ڈاکٹرز نے مجھے ہلکی پھلکی غذا کی اجازت دے دی تھی۔ ثمرہ نے مجھے اپنے ہاتھ سے دلیا کھلایا اور ایک بوائل انڈا بھی کھلایا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ میں کس اسپتال میں ہوں لیکن کمرے کی سجاوٹ اور اے سی دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کسی بہت مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں ہوں۔ میرے کمرے کے ساتھ ہی ثمرہ کا کمرا تھا جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی۔

رات کو مجھے بہت پُرسکون نیند آئی۔

صبح ثمرہ بھی خاصی نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے ناشتا کرایا پھر بولی۔ ”وہ حرام زادے دلاور اور جمی تم پر شبہ کر رہے ہیں کہ تم نے ہی اپنے سیل فون سے پولیس کو اطلاع دی ہوگی... باس نے سیل فون کمپنی سے ہم سب کی کالز کا ریکارڈ منگوایا تھا۔ تمہارے سیل فون سے کسی اجنبی نمبر پر کال نہیں کی گئی۔ ہم میں سے کسی کے نمبر سے بھی کوئی مشتبہ کال نہیں کی گئی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جب یہ دلاور اس گورے کی لاش کو ٹھکانے لگانے گیا تھا تو اپنے پیچھے خفیہ پولیس کے لوگوں کو بھی لگا لایا تھا۔“

”جمی کے کیا حال ہیں؟“

”اس منحوس کا تو نام بھی مت لو میرے سامنے۔ وہ تو تمہارے زخمی ہونے پر بہت خوش تھا اور دل ہی دل میں تمہارے مرنے کی دعائیں مانگ رہا ہوگا۔“

☆☆☆

خالد کے گھر پر پارٹی تھی۔ اس پارٹی میں نہ صرف ملک کے بہت سے بیوروکریٹس شریک تھے بلکہ صنعت کار اور سیاست داں بھی تھے۔ وہاں بہت ہی خوب صورت لڑکیاں

بھی تھیں لیکن ثمرہ کے سامنے ان سب کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ ثمرہ کی تو اس دن دھج ہی نرالی تھی۔ میری صحت یابی کی خوشی میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گئی تھی۔ رات گئے یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ میں اس دوران میں ہر اس سیاست داں، بیوروکریٹس، صنعت کار کا نام اور چہرہ اپنے ذہن میں نقش کر چکا تھا جو اس پارٹی میں شریک تھے۔

پارٹی ختم ہونے کے بعد خالد نے کہا۔ ''کل شام کو یہاں ایک اہم میٹنگ ہوگی۔ چیف ہمیں کوئی نیا ٹاسک دے گا لیکن اس مرتبہ کسی کی غفلت برداشت نہیں کی جائے گی۔''

پارٹی میں جمی بھی موجود تھا جو ثمرہ کو ہوس ناک نظروں سے گھورتا رہا تھا۔ ہوس تو ان تمام لوگوں کی آنکھوں میں تھی جو پارٹی میں شریک تھے لیکن جمی کی ہوس گویا سب پر بھاری تھی۔

ثمرہ اٹھلاتی ہوئی میرے پاس آئی اور بولی۔ ''جونی! میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

''میرے خیال میں اب تک بے شمار لوگوں نے تمہاری تعریف کی ہوگی۔ جن لوگوں نے زبان سے نہیں کی ہو گی ان کی نظریں تمہارے سراپا کی تعریف کر رہی ہوں گی۔ اب بھی تمہارا دل نہیں بھرا اپنی تعریف سے؟''

''جس کے لیے میں نے آج خصوصی اہتمام کیا ہے، سجی سنوری ہوں، اس کے منہ سے اپنی تعریف نہ سنوں تو اس سنورنے کا فائدہ؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''ویسے ثمرہ، سچی بات تو یہ ہے کہ آج تم ہمیشہ سے زیادہ خوب صورت لگ رہی ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''واقعی؟'' ثمرہ کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔

''کہو تو قسم کھا لوں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا میری ایک بات مانو گے؟'' ثمرہ نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں بولو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ اس نے اسپتال میں میری اتنی خدمت کی تھی کہ میں اس کا احسان مند ہو گیا تھا اور سچی بات تو یہ تھی کہ وہ اب مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔

''میں تمہارے ساتھ چلوں؟'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''آج ہم بہت سی باتیں کریں گے۔''

''چلو۔'' میں نے کہا۔

میں نے خالد کے حکم کے مطابق گلبرگ میں چھوٹا سا ایک بنگلا کرائے پر لے لیا تھا۔ وہاں صرف ایک چوکیدار اور ملازم تھا۔

ثمرہ کو میری گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر جمی سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ تیر کی طرح وہاں پہنچ گیا۔ ''ثمرہ! تم کہاں جا رہی ہو؟'' اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''میں تمہیں جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔'' ثمرہ نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا پھر وہ مجھ سے بولی۔ ''چلو جونی!''

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے ریورس کر کے نکال لیا۔

گھر آ کر میں نے ملازم سے کافی بنانے کو کہا اور ثمرہ کو لے کر لاؤنج میں بیٹھ گیا۔

''میں بہت تھک گئی ہوں جونی!'' ثمرہ نے کہا۔ ''ہم لوگ بیڈروم میں چل کر بھی تو بات کر سکتے ہیں۔ تمہیں تو خود پر بہت اعتماد ہے۔''

''مجھے تم پر بھی اعتماد ہے۔'' میں نے کہا اور ہم لوگ بیڈروم میں آ گئے۔

ملازم بیڈروم ہی میں کافی دے گیا۔

کافی پیتے ہوئے ثمرہ نے پوچھا۔ ''جونی! ایک بات پوچھوں... بُرا تو نہیں مانو گے؟''

''پوچھو۔'' میں نے کہا۔ ''میں اب تمہاری کسی بات کا بُرا نہیں مانتا۔''

''اس دن مدیحہ کو وہاں سے تم ہی نے فرار کرایا تھا نا؟''

میں بُری طرح چونک اٹھا پھر سنبھل کر بولا۔ ''تم بھی وہی بات کر رہی ہو جو دلاور کر رہا تھا؟''

''میں یہ بات کر سکتی ہوں۔'' ثمرہ نے کہا۔ ''اس دن جب تم کمرے میں آئے تھے اور میری کنپٹیاں دبا کر مجھے بے ہوش کرنے کی کوشش کی تھی تو میں جاگ رہی تھی۔ پھر میں نے آنکھوں کی جھری سے تمہیں دیکھا بھی تھا اور تمہارے مخصوص پرفیوم کی مہک بھی محسوس کی تھی۔''

''تم... اس وقت... جاگ رہی تھیں؟''

''ہاں، میں اس وقت جاگ رہی تھی اور سب دیکھ بھی رہی تھی۔''

''پھر تم نے یہ بات خالد یا دلاور کو کیوں نہیں بتائی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ثمرہ اس وقت میرے لیے سب سے بڑا خطرہ تھی۔

''اب تم سوچ رہے ہو کہ یہ لڑکی تو میرے لیے پھانسی کا پھندا بن جائے گی اس لیے اسے ٹھکانے لگا دو۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔ واقعی وہ بہت ذہین تھی۔ ''اگر یہ سوچ رہے ہو تو مجھے مار دو۔ تمہارے ہاتھوں سے مرنا بھی مجھے قبول ہے۔''

''تم نے خالد کو یہ بات کیوں نہیں بتائی؟'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ میں اس زندگی سے عاجز آ گئی ہوں۔ صرف میں ہی اب تک جانتی ہوں کہ تم اب بھی ایس ایس جی کے لیے یا شاید آئی ایس آئی کے لیے کام کرتے ہو۔''

''تم تو واقعی میرے لیے بہت بڑا خطرہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''جونی! نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے اب میں زندہ نہیں رہوں گی اس لیے آج مجھے بولنے دو۔''

''بولو، میں نے تمہیں بولنے سے کب روکا ہے؟''

''ثمرہ میرا اصل نام نہیں ہے۔'' اس نے ایک اور انکشاف کیا۔ ''میرا نام سادھنا ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ اب تم پینا چھوڑ چکی ہو۔''

''میں نشے میں نہیں ہوں۔ بالکل ہوش میں ہوں۔ ہاں میرا نام سادھنا ہے اور میرا تعلق بھارت کی خفیہ ایجنسی 'را' سے ہے۔''

''تمہارا تعلق را سے ہے؟''

''را سے تھا۔'' وہ مسکرائی۔ ''اب تو تم سے ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے ان درندوں سے بچا لو گے۔''

''تم پاکستان میں کب سے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''گزشتہ پانچ سال سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہیں ایک بات اور بتاؤں؟'' وہ ہنس کر بولی۔

''اب تم کہو گی کہ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میرا نام ثریا ہے اور...''

''نہیں۔'' اس نے میری بات کاٹ دی اور سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''خالد بھی مسلمان نہیں ہے۔ ہندو ہے۔ اس کا نام جے سہنا ہے اور وہ را میں اے ایس کے نام سے مشہور ہے۔''

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ہماری ایجنسی کو کب سے ''اے ایس'' کی تلاش تھی۔ وہ یہاں خالد کے روپ میں بیٹھا ہمارے سینوں پر مونگ دَل رہا تھا۔ ہمیں دھوکا دینے کے لیے وہ نہ صرف نمازیں پڑھتا تھا بلکہ روزے رکھنے کا ڈھونگ بھی رچاتا تھا۔ اب میں خالد عرف اے جے سہنا کو کسی بھی قیمت پر چھوڑنے والا نہیں تھا۔

''سادھنا! کیا تمہیں...''

''تمہارے منہ سے میرا نام کتنا اچھا لگتا ہے۔'' وہ ایک دم جذباتی ہو گئی۔ ''ایک مرتبہ پھر کہو۔''

''سادھنا! مجھے یہ بتاؤ، کیا تمہیں یقین ہے کہ خالد ہندو ہے؟''

''یہ بات مجھ سے زیادہ بہتر کون جان سکتا ہے؟'' اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

''اور یہ چیف کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''چیف اصل میں ایک امریکن دہشت گرد ایجنسی کا آدمی ہے۔ یہ بات تو تم بھی جانتے ہو کہ امریکن سی آئی اے اپنے ایجنٹوں کے علاوہ دوسرے لوگوں سے بھی کام لیتی ہے۔ وہ اس سے پہلے سعودی عرب، کویت اور عراق میں سرگرم تھا، اب پاکستان آ گیا ہے اور یہاں کے اہم لوگوں کو یا تو خرید رہا ہے یا پھر ان کا امیج خراب کر رہا ہے۔ انہیں ٹھکانے لگا رہا ہے۔''

''اور یہ چیف رہتا کہاں ہے؟''

''اس کا علم صرف خالد کو ہے۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ کلفٹن میں کہیں رہتا ہے اور کسی ترقیاتی منصوبے کا سربراہ بن کر پاکستان آیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس بہت سے پاکستانیوں کی فہرست ہے جو امریکن سی آئی اے، موساد یا پھر را کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔''

سادھنا کی باتیں سن کر میری آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''سادھنا! تم ہندو اور میں مسلمان...''

''میں اب ہندو بھی کہاں رہی ہوں۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''میں نے اسلامی بنیادی تعلیمات کا مطالعہ تو پاکستان آنے کے لیے کیا تھا لیکن یہاں آ کر مجھے واقعی اسلام سے محبت ہو گئی۔ اگر تم مجھے نہ بھی ملتے تو میں مسلمان ہو کر ہی مرتی کیونکہ را والے مجھے زندہ تو چھوڑتے نہیں۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری وجہ سے مسلمان ہو رہی ہوں۔''

''تم مسلمان ہو رہی ہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، کہو تو ابھی اور اسی وقت تمہارے ساتھ چل کر کسی مسجد کے پیش امام کے ہاتھوں مسلمان ہو جاؤں۔ مجھے اپنا نام ثمرہ ہی پسند ہے۔ میں اپنا یہی نام رکھوں گی۔''

اس سے باتیں کرتے کرتے نہ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔

دوسرے دن میں نے ثمرہ کو اس کے فلیٹ پر چھوڑا اور خود خالد کی طرف چلا گیا۔ میں اس معاملے کو اب مزید طول نہیں دینا چاہتا تھا لیکن خالد کہیں گیا ہوا تھا۔

شام کو ہم سب میٹنگ کے لیے اکٹھے ہوئے۔ یہ وہی میٹنگ تھی جس کا احوال میں ابتدا میں سنا چکا ہوں۔ ہمیں بینک کی گاڑی کو لوٹنا تھا۔

صرف میں جانتا تھا کہ اس گاڑی میں رقم تو برائے نام ہے لیکن حکومتِ پاکستان کے بہت سے قیمتی راز ہیں۔ خالد اتنا باخبر تھا کہ اسے بھی یہ معلوم تھا ورنہ خفیہ نوعیت کے

کاغذات اور دستاویزات اِدھر اُدھر منتقل ہوتی ہی رہتی ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

میٹنگ کے بعد میں نے خالد سے کہا۔ ”سر! میں نے آئی ایس آئی کا ایک ایجنٹ پکڑا ہے۔ وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ بہت کچھ جانتا ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“

”میرے فلیٹ پر ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو چلو پھر اسے وہاں سے کسی ایسی جگہ منتقل کر دیں جہاں اس سے پوچھ گچھ کی جا سکے۔“ خالد نے کہا اور چلنے کو تیار ہو گیا۔ ”تم اپنی گاڑی میں چلو، میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔“

میں اسے بہانے سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ حکومت کے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ اس سے تو اسی طرح نمٹا جا سکتا تھا۔

کچھ دور جا کر میری گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔

خالد اپنی گاڑی سے اتر کر میرے پاس آیا اور بولا۔

”کیا ہوا؟“

”سر! شاید کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ ممکن ہے دھکّے سے اسٹارٹ ہو جائے۔ آپ اسٹیئرنگ پر بیٹھیں، میں دھکّا لگاتا ہوں۔“

وہ اسٹیئرنگ پر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے اپنے ریوالور کے دستے سے اس کی کھوپڑی سہلا دی۔ وہ سیٹ پر لڑھک گیا۔

میں نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا جو میں نے کچھ ہی دن پہلے خریدا تھا اور علی کا نمبر ڈائل کیا۔ سلسلہ ملنے پر میں بولا۔ ”علی! میں نے شکار کو قابو میں کر لیا ہے۔ بتاؤ، اسے کہاں پہنچانا ہے؟“

”تم کینٹ کے داخلی راستے پر رک کر میرا انتظار کرو۔“ علی نے کہا۔

میں نے احتیاطاً خالد کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور اس کے منہ میں گاڑی صاف کرنے کا میلا سا کپڑا ٹھونس دیا۔

پھر میں اسے لے کر لاہور چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گیا۔

علی اور ناصر پہلے سے وہاں میرے منتظر تھے۔

ہم اسے ایک ایسی متروک بیرک میں لے گئے جو برسوں سے خالی پڑی تھی۔ دو جوانوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دو کمروں کی صفائی کر دی۔

ہم نے خالد کو وہاں منتقل کر دیا۔

وہ خاصا سخت جان آدمی تھا۔ اسے کچھ ہی دیر بعد ہوش آ گیا۔ سب سے پہلے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ بولا۔ ”جونی! یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟ کہاں ہے وہ ایجنٹ؟“

اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے اٹھ نہ سکا۔

”ہیلو مسٹر اجے سہنا عرف اے ایس!“ علی نے کہا۔ ”کیسے ہو تم؟“

”جونی! تم... تم آستین کے سانپ ہو... میں...“

”میرا نام جونی نہیں عمران ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب تم شرافت سے میرے سوالوں کے جواب دو گے یا تمہارا حلیہ بگاڑا جائے؟“

”پوچھو، کیا پوچھنا ہے۔ اب چھپانے کو رہ ہی کیا گیا ہے؟“

”تم پاکستان میں کب سے ہو؟“

”میں تو گزشتہ پندرہ سال سے یہاں ہوں اور اب میں اجے سہنا نہیں بلکہ خالد احمد ہوں۔“

”پھر تو تمہاری موت پر را کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”چیف کون ہے؟ مجھے اس کا ایڈریس چاہیے؟“

”چیف!“ خالد ہذیانی انداز میں ہنسا۔ ”اگر تم نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تمہیں چیف کا پتا ضرور بتاؤں گا۔ اس نے درجنوں گارڈز رکھے ہوئے ہیں اور وہ ہندو نہیں ہے بلکہ امریکا کا ایک معزز شہری ہے اور تمہارے ملک کی درخواست پر یہاں آیا ہے۔ اس کا پتا نوٹ کرو۔“ خالد نے کہا پھر چیف کا گلبرگ کا ایڈریس لکھوا دیا۔ علی اس کی بات چیت ریکارڈ بھی کر رہا تھا۔

”اگر یہ ایڈریس غلط ہوا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”تم تو مجھے یوں بھی زندہ نہیں چھوڑو گے۔“ خالد نے کہا۔ ”مجھے ایک گلاس پانی پلا دو اور میرے ہاتھ کھول دو۔ تم جانتے ہو میں ہارٹ پیشنٹ ہوں اور مجھے پابندی سے دوا لینا پڑتی ہے۔“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں ٹیبلٹس کا ایک پیکٹ ہے۔ اس میں سے ایک ٹیبلٹ مجھے دے دو۔ میری حالت خراب ہو رہی ہے۔“

علی نے اس کی تلاشی تو پہلے ہی لے لی تھی۔ اس کے ہاتھ کھول کر اسے پانی کا گلاس دے دیا۔ اس نے جیب سے ٹیبلٹس کا ایک پیکٹ نکالا۔ اس میں ان کے علاوہ ایک چھوٹی سی گولی اور بھی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا، اس نے وہ گولی منہ میں ڈال کر چبالی۔ لمحوں میں اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگا۔

وہ ہنس کر بولا۔ ”تم مجھے کیا مارو گے، میں نے تو خود ہی اپنی جان لے لی۔“ یہ کہہ کر وہ زمین پر گر گیا۔ وہ تھوڑی دیر تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔

دوسرے دن میں چیف کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہاں میری یوں تلاشی لی گئی کہ اگر میں ایک سوئی بھی اندر لے جانے میں کامیاب ہو گیا تو چیف کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

وہ خاصا لمبا تڑنگا امریکن تھا اور اپنے حلیے سے کسی یونیورسٹی کا پروفیسر لگتا تھا۔ اس کا سر انڈے کے چھلکے کی طرح صاف تھا۔ اس نے اپنی عینک کے دبیز شیشوں سے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر بولا۔ ”تم یہاں کیسے آئے اور تمہیں میرا ایڈریس کس نے بتایا؟“

”خالد صاحب نے کل ایک مشن کمپلیٹ کرنے کا پروگرام بنایا ہے لیکن وہ خود رات سے کہیں گئے ہوئے تھا۔“

”خالد کہاں جا سکتا ہے؟“ چیف نے کہا اور ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکا کر کئی جگہ ٹیلی فون کیا پھر مجھ سے بولا۔ ”اگر صبح تک خالد نہ ملا تو تم لوگوں کو کوئی دوسرا آدمی مل جائے گا۔“

”صبح کا انتظار کون کرے گا چیف!“ یہ کہہ کر میں نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچی اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر جما دیا۔ وہ خاصا جان دار آدمی تھا اس لیے مجھے اپنا گھٹنا بھی استعمال کرنا پڑا۔ پھر میرے ہاتھ کی سخت گرفت سے اس کی آنکھیں حلقوں سے گویا ابل پڑیں اور اس نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔

”خس کم جہاں پاک۔“ میں نے کہا اور اس کی لاش کو گھسیٹ کر باتھ روم میں پھینک دیا۔ وہیں میں نے اپنا حلیہ درست کیا اور باتھ روم سے نکل آیا۔ کسی نے بھی میرا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی اور میں اطمینان سے باہر نکل آیا۔

خالد کا وہ منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا جس کے لیے اس نے میٹنگ طلب کی تھی۔

ہم سب لوگ پروگرام کے مطابق خالد کے بنگلے پر اکٹھے ہوئے لیکن خالد خود موجود نہیں تھا۔

اسی دوران میں جمی کو پھر دورہ پڑا اور وہ ثمرہ کے پیچھے لگ گیا۔ میں اب کھیل ختم کرنا چاہتا تھا اس لیے اسے اتنی بیدردی سے مارا کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔

دلاور نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ وہ فائر کرنے ہی والا تھا کہ چیخ مار کے ڈھیر ہو گیا۔ ثمرہ نے اسے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ شوکی میرے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا لیکن نصیر نے مجھ پر ریوالور تان لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر فائر کرتا، میں نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن اتنی قوت سے دبائی کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

ہماری انٹیلی جنس ایجنسیوں کی رپورٹ کے مطابق بارلے، خالد اور چیف کے مرنے کے بعد ان کا نیٹ ورک منتشر ہو گیا۔ خاص طور پر چیف کے مرنے کے بعد امریکی حکومت نے بہت واویلا کیا لیکن انہیں کسی کے بھی خلاف کوئی ثبوت نہ ملا۔

اب میری لسٹ پر وہ سیاست داں اور بیوروکریٹس تھے جو را اور امریکن سی آئی اے کے ہاتھوں بکے ہوئے تھے۔

میں نے ایک ایک کر کے ان کا شکار شروع کر دیا۔

یہ شکار آج بھی جاری ہے۔ میری بیوی اکثر کہتی ہے کہ آپ کی قوم میں اتنے غدار کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ آپ ایک آدمی کم کرتے ہیں تو امریکن سی آئی اے اور را تین نئے ضمیر فروش خرید لیتی ہے۔ آپ کب تک ان کا شکار کرتے رہیں گے؟

جی ہاں، ثمرہ اب میری بیوی ہے۔ ہمارے دو پیارے پیارے بچے ہیں اور میرا واحد شوق شکار ہے... پاکستان دشمنوں اور ضمیر فروشوں کا شکار! مجھے لگتا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں، ضمیر فروشوں کی یہ فصل ختم نہیں ہو گی اور میں اسے کاٹتا رہوں گا۔

بقول ثمرہ کے اگر میں ان کی تنظیم کو ڈبل کراس نہ کرتا تو نہ بارلے ختم ہوتا، نہ خالد اور نہ چیف۔ ”تم بھی ڈبل ایجنٹ نکلے عمران!“

یہی تو ہماری خفیہ ایجنسیوں کی خوبی ہے جس کا اعتراف دنیا بھر میں کیا جاتا ہے کہ ہمارا کوئی بھی ایجنٹ ڈبل ایجنٹ نہیں ہے۔ اس لیے ہماری خفیہ ایجنسی دنیا کی نمبر ایک ایجنسی ہے اور امریکن سی آئی اے، کے جی بی، را، موساد سب کے ایجنٹ اکثر دوسری تنظیموں کے لیے کام کرتے ہیں۔ ہمارے ایجنٹ صرف اور صرف اپنے کاز کے لیے کام کرتے ہیں۔ پھر میں ڈبل ایجنٹ کیسے ہو سکتا ہوں؟

وہ مجھے چڑانے کو اکثر مجھے ڈبل ایجنٹ کہتی ہے۔ میں مسکراتا ہوں اور کسی نئے شکار کی چھان بین میں لگ جاتا ہوں۔ یہ میرا یقین ہے کہ جب تک میں اور مجھ جیسے دوسرے سرفروش زندہ ہیں، ہم پاکستان پر آنچ نہیں آنے دیں گے، انشاءاللہ۔

چال شناس

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ہر شخص اپنی زندگی کے پیمانے کو بلندی پر دیکھنا چاہتا ہے... کچھ لوگ بلندی کا سفر اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر طے کرتے ہیں... اور کچھ کے طرزِ عمل میں جرم کی آمیزش شامل ہوجاتی ہے... اس راہِ پرخار پر قدم رکھتے ہی ان کی خواہشات کا سمندر پھیلتا چلا جاتا ہے... لالچ وطمع، حرص وہوس کا طوفانِ بلاخیز انہیں اس طرح جکڑلیتا ہے کہ سچائی، احساس و مروت اور رواداری کے جذبات ان کی زندگی سے نکل کے کہیں دور بہتے چلے جاتے ہیں۔

ان دوستوں کا فسانہ جن کی دوستی کے بیچ زروجواہر کے انبار استادہ تھے

اس کے چہرے پر موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑلیا گیا ہو، آنکھوں سے انجانا خوف مترشح تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں پشت پر ہاتھ باندھے اپنی پُرتعیش خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس پچاس کے درمیان تھی، نام ظہیر خان تھا۔ وہ کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ کا کاروبار کرتا تھا۔

''اوہو...! اس میں اتنا ٹینس ہونے کی کیا ضرورت ہے ظہیر؟ مجھے تو یہ کسی پاگل انسان کی بڑلگتی ہے۔''

ایک بڑے جہازی سائز کے نرم وگداز بیڈ پر بیٹھی ایک خوش شکل مگر قدرے فربہ اندام عورت نے بڑے رسان سے ازراہِ تشفی کہا۔ وہ اس کی بیوی زرینہ تھی۔ وہ بیش قیمت سلکی ساڑی میں ملبوس تھی۔ وہ خاصی دیر سے اپنے شوہر کی بے چینی پر دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔

اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ ظہیر خان آج معمول سے دو گھنٹے پہلے ہی لوٹ آیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑرہی تھیں، اس نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔ یہی نہیں اپنے دونوں بچوں سے بھی ہیلو ہائے کیے بغیر ہی اس نے سیدھا اپنی خواب گاہ کا رخ کیا تھا۔

اس کے دونوں بچے تیرہ سالہ پنکی اور پندرہ سالہ گوگی ٹی وی لاؤنج میں موجود تھے جبکہ اس کی بیوی زرینہ ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون پر اپنی کسی سہیلی سے باتوں میں مصروف تھی۔ اسے اپنے شوہر کے جلد گھر لوٹ آنے پر کچھ حیرت بھی ہوئی تھی۔ یوں وہ اپنی گفتگو ختم کرکے جب شوہر کے پیچھے خواب گاہ میں داخل ہوئی تو وہ یہ نہ دیکھ پائی کہ آہٹ پاتے ہی ظہیر نے فوراً ایک خط اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں چھپالیا تھا۔ وہ اس خط کی ایک جھلک بھی اپنی بیوی کو دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ یوں تو یہ محض چند سطری خط تھا مگر اس نے ظہیر کو شدید خوف میں مبتلا کرڈالا تھا۔ اس خط کو اس نے جتنی بار بھی پڑھا تھا، اس قدر ہی اس کے خوف میں اضافہ ہوا تھا۔

جب اس کی بیوی زرینہ خواب گاہ میں داخل ہوئی اور اس نے اپنے شوہر کو اس کیفیت میں دیکھا تو اسے تشویش سی ہوئی۔ ظہیر خان اپنی بیوی کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن اس پر خوف اس قدر طاری تھا کہ وہ اپنی کیفیات چھپا سکا اور نہ اس خوف کی وجہ... البتہ اس نے خط کا ذکر گول کرکے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ کسی گمنام شخص نے آج فون پر اسے قتل کرنے کی دھمکی دی ہے تو ذرا دیر کو زرینہ بھی متوحش ہوگئی مگر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنے شوہر سے تسلی آمیز کلمات کہنا ضروری سمجھا۔

''بیگم! یہ کسی پاگل کی بڑ نہیں ہے، تم اس معاملے کی سنگینی کو نہیں سمجھ سکتیں۔ تم مجھے تھوڑی دیر اکیلا چھوڑ دو۔'' ظہیر نے اپنے لہجے کو پُرسکون بنانے کی کوشش کی۔

''لیکن ظہیر...!''

زرینہ نے کچھ کہنا چاہا تو ظہیر جھلا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''پلیز زرینہ! فارگاڈ سیک... لیوی الون... پلیز!''

زرینہ خواب گاہ سے باہر نکل گئی۔

بیوی کے کمرے سے نکلنے کے بعد ظہیر خان نے دوبارہ اپنی جیب سے وہ خط نکالا جس نے اسے ایک عذاب میں مبتلا کردیا تھا۔

اس نے کھڑے کھڑے کئی مرتبہ وہ چند سطری خط پڑھا پھر جیسے خوف اور پریشانی نے جھلاہٹ آمیز غصے کا روپ دھارلیا۔ وہ خط کو پھاڑنا چاہتا تھا لیکن پھر اچانک کچھ سوچ کر اس نے وہ خط دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی خواب گاہ کا دروازہ کھلا۔ وہاں زرینہ کھڑی تھی، اس کے چہرے سے ہنوز خفت سی مترشح تھی۔ اس نے گویا اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کا فون ہے۔''

ظہیر جو پہلے سے خوف زدہ تھا، اس کی حالت مزید ابتر ہوگئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بیوی کی طرف دیکھ کر ہکلا کے بولا۔

''فف... فون...'' جب وہ فون اٹینڈ کرنے کے لیے خواب گاہ سے نکلنے لگا تو اس کی ٹانگوں میں واضح طور پر لڑکھڑاہٹ محسوس کی جاسکتی تھی۔

''ہیلو... ہیلو۔'' کپکپاتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھا کر اس نے اپنے کان سے لگاتے ہوئے لرزیدہ سی آواز میں کہا تو دوسری جانب سے ایک اسرار بھری اجنبی آواز ابھری۔

''زیادہ نہیں... صرف دو سال پرانی تو بات ہے مسٹر ظہیر خان!'' اس آواز پر ظہیر کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔

''کک... کک... کون...؟ کون ہو تم؟'' ظہیر نے ہکلا کر استفسار کیا۔

''پچ... پچ...! تم نے مجھے نہیں پہچانا ابھی تک؟'' دوسری جانب سے استہزائیہ انداز میں کہا گیا۔

''سنو ظہیر خان!'' آواز میں اب ایک ایکی تنبیہ عود کر آئی تھی۔ ''پہچان لو مجھے اچھی طرح سے... میں اسلم خان کی روح ہوں، ایک بے چین روح...! میرے پچیس کروڑ کے ہیرے واپس لوٹادو۔ صرف اڑتالیس گھنٹوں کی مہلت دوں گا میں تمہیں... ورنہ اپنی موت کا انتظار کرو... تم چاروں... ہاں، یعنی تم... طفیل احمد، جابر خان اور خضر حیات... تم چاروں نے مجھے بڑی بیدردی کے ساتھ قتل کیا تھا نا؟'' یہ کہہ کر دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

ظہیر ''ہیلو... ہیلو'' کرتا رہ گیا۔ اس کے قریب حیران پریشان کھڑی زرینہ نے پوچھا۔

''خیریت... کس کا فون تھا؟''

''اسی کا تھا...'' ظہیر دہشت زدہ لہجے میں بولا۔ ''مگر... وہ زندہ کیسے ہوگیا؟''

''کون زندہ ہوگیا؟ کس کی بات کررہے ہو... تم ہوش میں تو ہونا؟'' زرینہ نے پوچھا۔ ظہیر کو اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس کے دل ودماغ میں ہنوز انہی الفاظ کی گردان ہورہی تھی۔ ''اپنی موت کا انتظار کرو۔'' پھر اس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک نمبر ملایا۔

''ہہ... ہیلو۔'' اس کے لہجے سے ابھی تک خوف مترشح تھا۔ ''طف... طفیل؟'' وہ دوسری جانب رابطہ ہوتے ہی کسی سے استفساریہ بولا۔

''ہاں... ہاں... بول رہا ہوں مگر تمہاری آواز... خیریت تو ہے؟'' دوسری طرف سے اس کے دوست طفیل احمد کی آواز ابھری۔

''طط... طفیل... تت... تم فوراً میرے پاس پہنچو اور... اور سنو... خضر حیات کو بھی لیتے آنا اپنے ساتھ... سمجھے؟'' ظہیر نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''اوہو، بھئی آجائیں گے ہم سب مگر ہوا کیا ہے... خیریت تو ہے؟''

''بس تم لوگ فوراً آجاؤ، خیریت نہیں ہے... میں جابر خان کو بھی فون کرکے بلالیتا ہوں۔''

ظہیر نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کیا اور پھر وہ جابر خان کا

نمبر ڈائل کرنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ اپنی بیوی زرینہ پر پڑی، پھر اس نے کچھ سوچ کر جابر کا نمبر ملائے بغیر ریسیور رکھ دیا اور اپنے کمرے میں آکر سیل فون پر جابر سے رابطہ کر کے اسے فوراً اپنے ہاں پہنچنے کا کہا۔

وہ شدید پریشانی کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ ایک مرا ہوا انسان دوبارہ زندہ کیسے ہوسکتا ہے؟

پھر وہ تیزی سے باہر نکلا، اپنی بیوی زرینہ کو ہدایت دی کہ طفیل وغیرہ آئیں تو ان لوگوں کو اوپر کے کمرے میں بھیج دیا جائے۔ یہ کہہ کر وہ زینے کی طرف بڑھ گیا۔

اوپر اس کا الگ تھلگ اسٹڈی روم تھا۔ یہاں اکثر وبیشتر وہ اپنے آفس کا کچھ ضروری کام نمٹایا کرتا تھا۔ یہاں ٹیبل اور چند کرسیوں کے علاوہ ایک صوفہ بھی تھا۔ وہ ایک کرسی پر براجمان ہوگیا۔ اس نے ایک بار پھر وہ خط جیب سے نکالا اور پڑھنے لگا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک نجی ٹی وی چینل سے وابستہ تھے۔ عدنان ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور ایک خاص نظریے اور جذبے کے تحت اس فیلڈ سے وابستہ ہوا تھا اور وہ جذبہ تھا عوام کو جگانے کا... سچی آواز اور سچی بات ان تک پہنچانے کا... وہ ٹی وی چینل کے ایک ہفتہ وار پروگرام کی میزبانی کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اس میں محکمۂ پولیس کے تعاون سے گرفتار شدہ مجرموں کے بارے میں خصوصی رپورٹ نشر ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ اس لحاظ سے عدنان کو کرائم رپورٹر بھی کہنا کچھ غلط نہ تھا۔ مائرہ اس کی معاون تھی۔ یہ فیلڈ محض اس نے اپنے شوق اور ایڈونچر کی خاطر اختیار کی تھی۔ وہ ایک بڑے باپ کی اکلوتی اولاد تھی، اس کی عمر بیس بائیس کے قریب تھی۔ وہ عدنان سے عمر میں چار پانچ سال چھوٹی ہی تھی۔

وہ دونوں ان دنوں اسلم خان مرڈر کیس پر کام کر رہے تھے۔ یہ ایک پرانا اور غیر حل شدہ کیس تھا جو سرد خانے میں پڑا رہ گیا تھا۔ مگر عدنان اور مائرہ نے اسے اپنے طور پر حل کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔

اسلم خان مرڈر کیس کی تفصیل کچھ یوں تھی کہ اسلم... ساؤتھ افریقا میں ہیروں کی تجارت کرتا تھا اور وہیں مستقل رہائش پذیر تھا۔ اس کے قتل کے سلسلے میں... جو دو سال پہلے ہوا تھا، خیال یہی کیا جاتا تھا کہ اسے دولت کے لالچ میں قتل کیا گیا تھا یا پھر اس کی موت اسے ساؤتھ افریقا سے پاکستان کھینچ لائی تھی۔

دراصل یہاں ''بھائی بھائی گولڈاسمتھ'' والوں سے کی پرانی کاروباری ڈیلنگ تھی اور ابتدائی تفتیش سے بات واضح ہو چکی تھی کہ ہیروں کا بیوپاری اسلم خان ''بھائی بھائی گولڈاسمتھ'' والوں کو لگ بھگ پچیس کروڑ کی مالیت کے ہیرے فروخت کرنے ساؤتھ افریقا سے پاکستان آیا تھا۔ شہر کے ایک بڑے فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ ہیرے کے پاس ہی موجود تھے، اپنی آمد کو انتہائی خفیہ رکھنے باوجود جانے کس طرح نامعلوم قاتلوں کو اس کی بھنک پڑ اور وہ ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت اس کا قتل کر کے پچیس کروڑ مالیت کے ہیرے بڑی کامیابی کے ساتھ لے اڑے تھے۔ پولیس بعد میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہ گئی البتہ خم پولیس کا ایک جواں سال انسپکٹر شکیل شیرازی اس کیس اپنے طور پر حل کرنے کے لیے کوشاں تھا۔

بہرطور... عدنان اور مائرہ اس وقت ایک گر رنگ کی گاڑی میں انسپکٹر وجاہت علی سے ملنے متعلقہ تھانے جا رہے تھے۔ یوں تو معلومات وغیرہ کے سلسلے میں یہ دونو اس سے پہلے بھی کوئی بیسیوں مرتبہ تھانے کے چکر لگا چکے تھے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا اور انسپکٹر وجاہت علی نے بالآخر تنگ آکر ان سے کہا تھا کہ جیسے ہی کیس میں تھوڑی بہت پیش رفت ہوئی تو وہ انہیں خود ہی مطلع کر دے گا۔

اگرچہ عدنان اور مائرہ اندازہ لگا چکے تھے کہ انسپکٹر وجاہت علی نے انہیں ٹالنے کے لیے ایسا کہا ہے مگر دونوں اپنی دھن کے پکے تھے اور اپنے طور پر بھی تگ و دو میں مصروف رہتے تھے، تھانے کا چکر البتہ اب مہینے میں ایک آدھ بار ہی لگتا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مایوس ہونے کے بجائے ان کی دلچسپی اور جوش بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آج پورے دو ماہ بعد وہ دونوں متعلقہ تھانے کے انسپکٹر وجاہت علی سے ملنے جا رہے تھے۔ انہوں نے اسے فون کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

کار، مائرہ خود ڈرائیو کر رہی تھی اور عدنان اس کے برابر والی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔

مائرہ نے ذرا گردن موڑ کر اپنے برابر میں خاموش بیٹھے عدنان کی طرف دیکھا تو وہ اسے کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آیا۔ مائرہ نے اسے مخاطب کیا۔

''عدنان! کیا تم اس کیس سے اب مایوس ہونے لگے ہو؟''

''کیا تمہیں اب تک ایسا محسوس ہوا ہے؟'' عدنان سپاٹ لہجے میں بولا۔ مائرہ مسکرا کے بولی۔

''نہیں، مجھے معلوم ہے تمہارے لیے یہ کیس ایک چیلنج کا درجہ رکھتا ہے لیکن دو برس بیت چکے ہیں، اب تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔'' مائرہ نے ونڈ اسکرین پر اپنی نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہ تو ہے۔ دو سال کا عرصہ کوئی معمولی بات تو نہیں اور کیس سے متعلق اب تک کوئی سراغ نہیں ملا، نہ ہمیں۔ پولیس کو۔'' عدنان نے کہا۔

''اس لیے تو میں پوچھ رہی تھی کہ کیا تم...؟''

مائرہ نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو عدنان نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو میں اس وقت تمہارے ساتھ اس بددماغ انسپکٹر کے پاس کیوں جا رہا ہوتا؟''

''لیکن عدنان! دو سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ تھوڑی ہی سہی، کوئی تو پیش رفت ہوتی۔ مگر یہاں تو چاروں طرف ہراراور اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

''تو گویا اس کا مطلب ہے کہ تم اب مایوس ہونے لگی ہو اور پوچھ مجھ سے رہی ہو۔'' عدنان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''نہیں، اب ایسی بات بھی نہیں... بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ دیکھا جائے تو اصل ایڈونچر کا مزہ اسی قسم کے پیچیدہ اور غیر حل شدہ کیسز میں آتا ہے۔'' مائرہ کے دلکش ہونٹوں پر پُرعزم مسکراہٹ تھی۔

''گڈ۔'' عدنان خوش ہو کے بولا۔

''لیکن عدنان! میں سوچتی ہوں کہ کاش ہمارے ہاتھ کوئی ایسا سراغ لگ جاتا کہ جس کے ذریعے ہم اس کیس کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔''

''ہاں، میں بھی اسی جستجو میں ہوں۔'' عدنان نے مختصراً کہا۔

''عدنان! جن لوگوں نے اس بدنصیب تاجر اسلم خان کو بیش قیمت ہیروں کے لالچ میں قتل کیا، کیا اب وہ مزے سے بیٹھے پرائے مال پر عیش کر رہے ہوں گے؟'' مائرہ کے لہجے میں تاسف تھا۔

''نہیں۔'' عدنان نے کہا۔ ''ایسی دولت جو کسی بے گناہ کے خون سے رنگی ہوئی ہو... وہ راس نہیں آتی۔ جلد یا دیر ایسے انسان کو مکافاتِ عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔'' مائرہ کے لہجے میں تائید تھی۔

''پتا نہیں، شکیل شیرازی کو کہاں تک کامیابی ہوئی ہوگی یا وہ بھی ابھی تک ہماری طرح ٹامک ٹوئیاں ہی مار رہا ہے؟'' دفعتاً مائرہ نے کہا۔

''اب یہ تو وہ جانے۔'' عدنان نے شانے اچکا کر کہا۔ ''ویسے کل اس نے موبائل پر مجھ سے رابطہ بھی کیا تھا۔''

''اچھا... کیا کہہ رہا تھا وہ؟''

''پوچھ رہا تھا یہی... کہ کیا ہمارے ہاتھ کوئی سراغ لگا یا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں؟''

''تم نے کیا جواب دیا؟'' مائرہ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''یہی... کہ کوشش جاری ہے۔'' عدنان نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ موصوف بھی ہماری طرح خالی ہاتھ ہی ہیں۔''

''نہیں۔'' عدنان نے اچانک نفی میں سر ہلا کے کہا۔ اس کی پُرسوچ نظریں کسی غیر مرئی نکتے پر مرکوز تھیں۔

''کیا مطلب؟'' مائرہ قدرے چونکی۔

''وہ بڑا تیز اور گھنا شخص ہے۔ دوسروں کو کریدتا ہے، خود کچھ نہیں بتاتا۔ کرمنالوجی میں ماسٹر کیا ہے اس نے۔ وہ ہماری ٹوہ لے رہا تھا، مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ اس کے ہاتھ کوئی سراغ ضرور لگا ہے۔''

''تم نے کیسے اندازہ لگالیا؟'' مائرہ نے ایک چوراہے پر سگنل کی سرخ بتی جلتے دیکھ کر کار روکتے ہوئے پوچھا۔

''اس کے لہجے سے...'' عدنان نے جواب دیا۔ ''مجھے اس کے استفسار طلب لہجے میں افسوس کے بجائے ایک گرم جوشی محسوس ہوئی تھی۔''

تھوڑی دیر بعد بتی سبز ہوتے ہی مائرہ نے کار بائیں جانب ون وے پر موڑ لی۔ پھر متعلقہ تھانے تک سفر خاموشی سے گزرا۔ اگلے چند منٹوں بعد وہ انسپکٹر وجاہت علی کے سامنے کرسیوں پر براجمان تھے۔

انسپکٹر وجاہت علی کے چہرے پر ان دونوں کو دیکھتے ہی بیزاری کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے انہیں چائے وغیرہ کا بھی نہیں پوچھا اور مصافحہ کرتے ہی گویا جان چھڑانے کے انداز میں بولا۔

''ہم دراصل یہ کیس مکمل طور پر خفیہ پولیس کو ٹرانسفر کر چکے ہیں۔ نیز یہ کہ اب میں تفتیشی افسر بھی نہیں رہا۔''

پتا نہیں وہ سچ بھی کہہ رہا تھا یا نہیں، تاہم بعد میں اس نے یہ مشورہ بھی دے ڈالا کہ اب وہ دونوں یعنی عدنان اور مائرہ انسپکٹر شکیل شیرازی سے ہی رابطہ کریں۔

گویا اس نے بات ہی ختم کر دی۔ ناچار عدنان اور مائرہ تھانے کی عمارت کے احاطے میں کھڑی اپنی کار میں آبیٹھے۔ ڈرائیونگ سیٹ مائرہ نے ہی سنبھالی۔

"کہاں کے ارادے ہیں اب؟" مائرہ نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"گلشن ہائٹس۔" عدنان نے کہا۔

"گلشن ہائٹس!" مائرہ خود کلامیہ بڑبڑائی۔ "وہاں کس سے ملنا ہے؟"

"ہیروں کے تاجر اسلم خان کے قاتل... پرویز پروانہ سے...!"

عدنان نے کہا تو مائرہ کے چہرے پر جانے کیوں چونکنے کے بجائے ایک اسرار بھری مسکراہٹ ابھری۔

☆☆☆

اس کی ڈیوٹی ہی ایسی تھی کہ وہ رات دو بجے گھر لوٹتا تھا۔ اس کے پاس ایک پرانی موٹر سائیکل تھی۔ وہ ایک بڑے ہوٹل کا ہیڈ ویٹر تھا۔ ہوٹل "ریڈ کارپٹ" سے اس کا گھر پانچ چھ کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ بیوی ایک گھریلو عورت تھی۔ البتہ گھر میں وہ شام کے وقت پرائمری کے چند بچوں کو ٹیوشنز پڑھایا کرتی تھی۔

حسبِ معمول وہ جب اپنے کام سے فارغ ہوا تو ایک ویٹر جلال نے اس سے آکر کہا۔

"پرویز صاحب! آپ کا فون ہے۔"

پرویز کو اپنے وجود میں سنسنی کا احساس ہوا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس وقت فون کس کا ہو سکتا ہے۔ وہ منیجر کے پاس سے فارغ ہو کے ریسیپشن پر پہنچا۔ ریسیور سنگِ مرمر کے کاؤنٹر پر رکھا تھا جبکہ ریسیپشن پر موجود مشتاق احمد ٹیلی فون سیٹ سے ذرا دور اپنی کرسی پر بیٹھا میز پر دھرے مانیٹر میں مصروف تھا۔ پرویز نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور "ہیلو" کہا۔

دوسری طرف سے کوئی اس کی آواز پہچان کر بولا۔

"ہیلو مسٹر پرویز پروانہ! کیا سوچا پھر تم نے؟"

پرویز کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ تاہم وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

"آ... آپ مجھ سے ایک ملاقات کر لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ فون پر تو یہ بات نہیں ہو سکتی۔" پرویز نے اپنے لہجے کے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اوہ... لگتا ہے کوئی چالاکی دکھانا چاہتے ہو۔" دوسری طرف سے استہزائیہ انداز میں کہا گیا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" پرویز نے ذرا ہمت کر کے کہا۔ "میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔ اچھا... پھر ایسا کرو کہ تم اپنی مرضی سے کوئی جگہ بتاؤ، میں وہاں خود آجاؤں گا۔" پرویز نے کچھ سوچ کے کہا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہاں البتہ اگر تم ان ہیروں کے ساتھ مجھ سے ملنے کا وعدہ کرو تو سوچا جا سکتا ہے۔"

پرویز پروانہ... ہیروں کے ذکر پر لرز اٹھا۔ وہ جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ہیروں کے بارے میں کچھ کہنے کی اس کے اندر ہمت نہ ہو سکی۔ وہ چند لمحے کے لیے خاموش رہا مگر وہ اپنے چہرے سے پریشانی یا خوف کے تاثرات ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ سامنے بیٹھے مشتاق کی نگاہ اس پر پڑتی تو وہ ضرور چونک جاتا۔

"لگتا ہے تم وہ ہیرے اکیلے ہی ہڑپ کرنے کے چکر میں ہو۔" اس کی طول پکڑتی خاموشی پر معاً ہی ریسیور میں وہی بھرّائی ہوئی آواز ابھری۔ بولنے والے کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ آواز بدل کر بات کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ آگے بولا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو پرویز! تم نے ہی ہیروں کے لالچ میں اسلم خان کو قتل کیا ہے اور اس کے سارے ثبوت میرے پاس موجود ہیں۔ میں جب چاہوں تم سے سارے ہیرے لینے کا مطالبہ کر سکتا ہوں لیکن میں تم سے ففٹی ففٹی کی بنیاد پر ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔ سوچ لو، آخری موقع دے رہا ہوں میں تمہیں... ورنہ میں پولیس کو سارے ثبوت دے دوں گا پھر نہ صرف تم آدھے حصے سے بھی جاؤ گے بلکہ پھانسی کا پھندا بھی تمہارا مقدر ہوگا۔"

اس کے فوراً بعد ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا اور پرویز بوکھلاہٹ آمیز انداز میں "ہیلو... ہیلو" کرتا رہ گیا۔ سامنے بیٹھے مشتاق احمد نے اس کی طرف قدرے چونک کر دیکھا اور مستفسر ہوا۔

"کیا بات ہے پروانہ! کس کا فون تھا؟"

"وہ... وہ ایک دوست کا تھا۔ ناراض ہو رہا تھا۔ میں اس کی شادی پر جو نہ جا سکا۔" پرویز نے بے ربط سے الفاظ میں ایک بہانہ گھڑا پھر جلدی سے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ باہر نکل کر اپنی بائیک پر بیٹھا اور گھر کی راہ لی۔

سڑک دور تک ویران تھی۔ اس کی کھٹارا سی بائیک پچاس کی اسپیڈ سے زیادہ نہیں دوڑ سکتی تھی۔ پرویز کی کنپٹیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ وہ دھمکی سے شدید...

... پریشان اور خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ اس گمنام شخص کا خوف اس کے اعصاب پر بُری طرح سوار تھا۔ وہ اب تک تین چار بار اسے فون پر ایسی ہی دھمکیاں دے چکا تھا۔ پرویز نے اسے پہلے صاف صاف لفظوں میں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس کے پاس اوّل تو پچیس کروڑ مالیت کے ہیرے ہیں اور نہ ہی وہ کسی جیتے جاگتے انسان کو قتل کر سکتا ہے۔ تاہم اسے اس بات پر حیرانی ہوئی تھی کہ آخر اس گمنام شخص کو اس پر کیونکر شبہ ہوا تھا کہ اس نے ہی ہیروں کے سوداگر اسلم خان کا اس لیے قتل کیا ہے کہ اس کے بیش قیمت مالیت کے ہیروں پر قبضہ کر سکے۔ نیز آخر اس کے پاس اس کے خلاف ایسے کون سے ثبوت تھے جن کی بنا پر وہ اسے قاتل سمجھ رہا تھا؟ کیا واقعی اس شخص کے پاس اس کے خلاف اسلم خان کو قتل کرنے کا کوئی ثبوت تھا؟ یا وہ اسے خوامخواہ ہی پولیس کے چکروں میں ڈال کر الجھانا چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس پر اندھیرے میں تیر چلا کر کوئی نفسیاتی حربہ ستعال کرنے کی کوشش کر رہا ہو تا کہ وہ اس سے خوف زدہ ہو کر اس کی بات ماننے پر رضامند ہو جائے۔ یعنی ففٹی ففٹی حصہ... اس نے سوچا۔

اس بلیک میلر کو تو یہ تک معلوم تھا کہ جب بھی اسلم خان ساؤتھ افریقا سے لوٹتا تھا تو "ریڈ کارپٹ" نامی ہوٹل میں ہی قیام کرتا تھا اور پرویز ہی خصوصی طور پر اسے سروس فراہم کرتا تھا۔ اس کی پرویز سے اچھی خاصی دوستی بھی ہو چکی تھی۔ دو سال قبل جب اسلم خان کا قتل ہوا تو پولیس نے پرویز کو بھی طویل عرصے تک شاملِ تفتیش رکھا اور اسے بعد میں شک کی بنا پر سزا ہوتے ہوتے رہ گئی جس پر اس نے سکون کا سانس لیا۔ مگر دو سال بعد اس گمنام شخص نے اس کا سکون پھر برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

ایک بار تو تنگ آکر پرویز نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ پولیس کو اس گمنام بلیک میلر کے بارے میں سب کچھ بتا دے مگر وہ اس کی جرأت نہ کر سکا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ایک بار پھر پولیس اس کی طرف سے دوبارہ شکوک میں نہ پڑ جائے۔

انہی پریشان کن خیالات میں وہ گھر پہنچا۔

یہ چھوٹا سا دو کمروں اور مختصر سے صحن والا کرائے کا گھر تھا۔ یہاں وہ اپنی بیوی ناہید اور دو چھوٹے بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ چونکہ وہ رات گئے گھر آتا تھا اس لیے وہ بیوی بچوں کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے دروازے میں لگے لاک کی ایک ڈپلی کیٹ چابی بنوا رکھی تھی۔

وہ تالا کھول کر اندر داخل ہوا، بائیک ایک طرف کھڑی کی اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

اسے بہت دیر سے نیند آئی تھی مگر صبح خلافِ معمول جلد ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی بیوی ناہید تب تک دونوں بچوں کو تیار کر کے اسکول بھیج چکی تھی۔ اسے بھی اپنے شوہر کے آج جلدی جاگ جانے پر قدرے حیرت ہوئی، ورنہ عام طور پر پرویز بارہ ایک بجے ہی جاگتا تھا۔

پرویز نے اپنی پریشانی کی وجہ بیوی کو بتا دی۔ ناہید نے اسے یہی مشورہ دیا کہ اسے پولیس کو اس بلیک میلر کے بارے میں ضرور مطلع کر دینا چاہیے مگر پرویز کا دل نہیں مان رہا تھا۔ وہ الجھن کا شکار تھا۔

☆☆☆

مائرہ، عدنان کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔

درحقیقت جب پولیس نے ہوٹل ریڈ کارپٹ کے ہیڈ ویٹر پرویز پروانہ پر اسلم خان کے قتل کا شبہ کیا تھا تو مائرہ نے اپنے طور پر فوراً یہ اندازہ قائم کر لیا کہ...... اسلم خان کا قتل پرویز نے ہی کیا ہوگا کیونکہ اسلم خان کو ہمیشہ وہی سروس فراہم کرتا تھا۔ اس طرح اس کی اس سے اچھی خاصی دوستی بھی ہو گئی تھی۔ پرویز نے کسی طرح اسلم خان کے روم میں ان بیش قیمت ہیروں کی چمک دیکھ لی اور یوں اس کی نیت میں فتور آ گیا... اس کے بعد اس نے اسلم خان کا انتہائی رازداری کے ساتھ قتل کر ڈالا اور ان ہیروں کو چرا لیا۔ حالانکہ عدنان کو تھوڑا سا بھی پرویز پر شبہ نہ تھا مگر مائرہ اپنی بات پر ڈٹی رہی۔

"آخر آج تمہیں اچانک پرویز پروانہ کا خیال کیسے آ گیا؟ لگتا ہے اب تمہیں میری بات کا یقین آ گیا ہے؟" مائرہ کے لہجے میں فخر تھا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔" عدنان نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا سمجھ لوں؟" وہ چڑ کر بولی۔ "بنو مت، مجھے سچ سچ بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں اچانک ایسی کون سی بات آئی ہے جو تم مجھ سے چھپانا چاہتے ہو کہ کہیں سارا کریڈٹ میں نہ لے لوں۔"

"اوہو مائرہ! تم بسا اوقات بہت "کچی" ہو جاتی ہو۔ بھئی ایسی کوئی بات نہیں ہے تم چلو تو سہی، وہاں جا کر خود ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کبھی کبھی گڑے مردے دوبارہ اکھاڑنا پڑتے ہیں۔"

"تم اب کون سے گڑے مردے اکھاڑنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" مائرہ بھی چھوڑنے والی نہ تھی۔

''تم خود بھی ذرا اپنے دماغ پر زور دو، میں نہیں بتاؤں گا۔'' عدنان بھی گویا اسے زچ کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔

وہ بولی..... ''سب جانتی ہوں، تم نے ہمیشہ انسپکٹر شکیل شیرازی کے حوالے سے مجھ پر شبہ کیا ہے کہ میں تمہاری خفیہ معلومات اس تک پہنچاتی ہوں۔'' اس نے منہ پھلا لیا۔

''میں جانتا ہوں، تم ایسا کبھی نہیں کرسکتیں لیکن شیرازی بہت چالاک ہے، وہ باتوں باتوں میں تم سے اگلوا لیتا ہے۔''

''مائی فٹ... تم میری کار لے جاؤ، میں ٹیکسی سے گھر چلی جاؤں گی۔'' مائرہ نے غصے سے کہا اور کار روک دی۔

''کم آن یار... میں تو مذاق کررہا تھا۔ اب تم اتنی بھی بے وقوف نہیں ہو۔ شیرازی کو تو تم بھی اچھی طرح جانتی ہو، وہ ایک نمبر کا گھنا شخص ہے، غصہ تھوک دو۔ اینڈ کیپ ڈرائیو، پلیز۔''

مائرہ نے کار آگے بڑھا دی۔ اس کا غصہ ایسا ہی ہوتا تھا، جھاگ کی طرح فوراً بیٹھ جاتا تھا۔

''گلشن ہائٹس'' کے برابر ہی میں وہ علاقہ تھا جہاں پرویز پروانہ کا گھر تھا، مائرہ نے ذرا دیر بعد کار اس کے گھر کے سامنے لے جاکر روک دی۔ تھوڑی دیر بعد عدنان، پرویز پروانہ کے مکان پر دستک دے رہا تھا۔

☆☆☆

وہ چاروں دم بہ خود چہروں کے ساتھ خاموش بیٹھے تھے، اسٹڈی روم کے وال کلاک میں بارہ بج رہے تھے اور ان چاروں کے چہروں پر بھی خوف کے باعث گویا بارہ بج رہے تھے۔

اسٹڈی روم میں دو ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ کرسی پر پریشان حال بیٹھے ظہیر خان اپنے سامنے تین کرسیوں پر متفکر چہرے لیے بیٹھے جابر خان، طفیل احمد اور خضر حیات کو باری باری دیکھ رہا تھا شاید وہ ان کے بولنے کا بے چینی سے منتظر تھا۔

ظہیر ان تینوں کو وہ گمنام خط دکھا چکا تھا۔

''یہ کون ہوسکتا ہے آخر؟'' چند لمحوں کی اعصاب شکن خاموشی کے بعد بالآخر خضر حیات نے ہی سکوت توڑا۔

''کیا تم نے خط کے اختتام میں نہیں پڑھا خضر؟ فقط... اسلم خان کی بے چین روح...'' ظہیر نے جھلا کر کہا۔ اس کی حالت بہ دستور دگرگوں تھی۔ خضر حیات بغلیں جھانکنے لگا۔ وہ اور طفیل احمد امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کرتے تھے اور آپس میں کاروباری شراکت دار تھے۔

طفیل احمد نے اپنے بزنس پارٹنر خضر حیات کی بات کو واضح کرتے ہوئے ظہیر سے ازراہِ تحمل کہا۔

''یار ظہیر! خضر کا مطلب تھا کہ اسلم خان کی بے چین روح کا یہ ڈراما رچانے والا آخر یہ کون شخص ہوسکتا ہے؟''

''ظاہر ہے، وہ تو میں بھی سمجھ رہا ہوں۔'' ظہیر نے زچ ہوکے کہا۔ ''اب سوچنا یہ ہے کہ مجھے، میرا مطلب ہے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے واقعی اسلم خان کی بے چین روح دو دن بعد میرا گلا گھونٹ کر مجھے مار ڈالے گی۔'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''ٹیک اٹ ایزی یار! تم اتنے خوف زدہ کیوں ہورہے ہو؟ تمہاری صورت سے تو لگ رہا ہے جیسے ابھی تمہاری جان نکلنے والی ہے، سنبھالو خود کو...'' جابر بولا۔

''میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم لوگ... یاد رکھو، اگر میں زندہ نہ رہا تو کل تم تینوں پر بھی یہ وقت آئے گا۔''

اس کی بات سن کر وہ تینوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے پھر خضر حیات نے ظہیر سے کہا۔

''یار! تم ذرا اپنی حالت پر قابو پاؤ تو ہم اس کا کوئی حل سوچیں۔ تم ذرا دیر کے لیے پُرسکون ہوجاؤ اور ہمیں کچھ سوچنے دو۔''

وہ خط لفافے سمیت جابر خان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جانے کیا سوچ کر چوتھی بار لفافے کو غور سے دیکھنے لگا جس پر ظہیر کا نام اور اس کے دفتر کا پتا ٹائپ تھا جبکہ پشت پر ٹائپ شدہ الفاظ میں بھیجنے والے کا فرضی نام اور پتا لکھا تھا۔ جابر کچھ سوچ کر دوبارہ خط اندر سے نکال کر پڑھنے لگا۔

''مسٹر ظہیر خان!

آنے والے اڑتالیس گھنٹوں میں اگر تم نے میرے پچیس کروڑ کے ہیرے واپس نہیں لوٹائے تو یاد رکھنا، میری بے چین روح تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گی۔

فقط... اسلم خان کی بے چین روح۔''

جابر کو خط کے آخر میں خط بھیجنے والے کا نام خاصا مضحکہ خیز لگا۔

''میرا خیال ہے ہمیں پولیس سے مدد لینی چاہیے۔'' جابر نے بالآخر رائے دی۔

''پولیس... تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو جابر؟'' ظہیر اس کی بات سن کر بدک کر بولا۔ ''تم شاید ہوش میں نہیں ہو۔''

اس کے قریب بیٹھے طفیل احمد نے بھی اسے ٹوکا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ پولیس سے اس کا ذکر کرنا آبیل مجھے مار کے مترادف ہوگا۔''

اس پر جابر نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''ہم پولیس کو ساری بات نہیں بتائیں گے اور نہ ہی اس خط کا ذکر کریں گے، محض اتنا بتانا کافی ہوگا کہ کسی تاوان طلب کرنے والے گروہ نے ظہیر کو ایک گمنام ٹیلی فون کال کے ذریعے قتل کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے مقررہ رقم مذکورہ...''

''شٹ اپ۔'' اچانک خضر حیات نے جابر کی بات کاٹی۔ ''یہ سراسر بے وقوفی ہوگی، تم لوگ نہیں جانتے کہ اب یہ کیس خفیہ پولیس کے انسپکٹر شکیل شیرازی کو ٹرانسفر ہو چکا ہے۔ اپنے تحفظ کے لیے ہمیں گارڈز کی خدمات لینا ہوں گی... بس یہی حل ہے۔''

''تم لوگ کام کی بات کے بجائے فضول باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔'' ظہیر نے کہا۔

خضر حیات نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''تو پھر تم ہی کام کی بات بتادو۔''

''تم لوگ آخر اس بات پر غور کیوں نہیں کرتے کہ جو ''راز'' ہم چاروں تک محدود تھا، وہ پانچویں فرد تک کس طرح پہنچا؟ جبکہ ہم چاروں کو پورا یقین ہے کہ اسلم خان زندہ نہیں ہے تو پھر یہ ہمارا پانچواں ہم راز کہاں سے پیدا ہو گیا؟''

قصہ مختصر... اس میٹنگ کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا سوائے ظہیر کو یہ مشورہ دینے کے کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے کسی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کی خدمات حاصل کر لے۔

☆☆☆

دو سال کے طویل عرصے کی برف اب ''اسلم خان مرڈر کیس'' سے پگھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، کم از کم شکیل شیرازی کا تو یہی خیال تھا۔

وہ ایک دبلا پتلا اور طویل قامت شخص تھا، رنگت گندمی تھی۔ آنکھوں میں بلا کی مقناطیسی کشش تھی۔ وہ غیر شادی شدہ تھا۔ خفیہ پولیس کا محکمہ اس نے اپنے شوق ہی کی خاطر چنا تھا۔ اس کا تعلق اندرونِ سندھ کے ایک چھوٹے سے مگر تاریخی شہر سے تھا۔ ابتدائی تعلیم اس نے وہیں سے حاصل کی تھی۔ اس کا باپ انور شیرازی پولیس کا ایک اعلیٰ افسر تھا۔ وہ ایک بہادر، ایماندار اور فرض شناس پولیس افسر تھا۔ خطرناک ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ مارا گیا تھا۔ شکیل شیرازی اس کی اکلوتی اولاد تھا۔ دنیا میں دونوں باپ، بیٹے کا کوئی اور قریبی رشتے دار نہ تھا۔ باپ کے کوٹے میں شکیل نے پولیس کا محکمہ خوشی سے جوائن کیا اور پھر وہاں سے خفیہ پولیس میں ٹرانسفر کروا کے کراچی آگیا۔

اسلم خان مرڈر کیس میں اس نے بہت سر کھپایا تھا، بلکہ اب تک کھپا رہا تھا۔ یہ کیس اس کے لیے چیلنج بن گیا تھا۔ اس نے اپنے طور پر اس کیس کو حل کرنے کی پوری کوشش کی تھی مگر وہ ابھی اندھیرے میں رہنے کے باوجود مایوس نہیں ہوا تھا۔

شکیل شیرازی کے مطابق پرویز پروانہ پر اب نگاہ رکھنا فضول اور وقت کا زیاں تھا۔ تب اچانک اسے ان چاروں دوستوں یعنی ظہیر خان وغیرہ کا خیال آیا۔ اگر ان چاروں کی نگرانی کی جاتی تو اس کیس سے متعلق کچھ نہ کچھ سراغ ضرور مل سکتا تھا اور آج یعنی دو سال بعد اچانک ہی بالآخر شکیل شیرازی کو ایک اہم سراغ ہاتھ لگ گیا تھا۔

اپنے تین کمروں کے اس کشادہ لگژری اپارٹمنٹ کے کمرائے خاص میں اس نے جاسوسی کے تمام آلات نصب کر رکھے تھے۔ جن میں کمپیوٹر، ایف ایم مائکروفون اور بوسٹر سے متعلق آلات بھی شامل تھے، جن کا رابطہ ڈش انٹینا اور کارڈلیس انٹینا کی صورت میں اس کے اپارٹمنٹ کی چھت سے منسلک تھا۔

یہ اپارٹمنٹ شکیل نے حال ہی میں کرائے پر لیا تھا جو اتفاق سے ظہیر کی عالی شان کوٹھی سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس لیے شکیل شیرازی فارغ اوقات میں آڈیو ڈیوائس کے سامنے کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے گھنٹوں ہونے والی ''کراس ٹاکنگ'' سنتا رہتا اور ان میں جیسے ہی اسے کوئی مشکوک گفتگو سنائی دیتی تو وہ فوراً انتہائی حساس ریڈیو ٹرانسمیشن کے ایک ایڈجسٹنگ سوئچ کے ذریعے بہ آسانی اپنے مطلب کی آواز یا گفتگو کو واضح اور صاف کر دیتا تھا۔ اگر وہ کبھی اپنے اپارٹمنٹ میں نہ بھی ہوتا تو وہ ایک ٹیپ ریکارڈر آن کر جاتا اور بعد میں آکر آڈیو سن لیتا تھا۔

آج اس نے ظہیر خان نامی ایک شخص کو ملنے والی اس کی رہائش گاہ پر ٹیلی فونک دھمکی آمیز گفتگو سن لی تھی اور جسے سن کر شکیل کو یہ اندازہ قائم کرنے میں چنداں دشواری نہ ہوئی کہ اسلم مرڈر کیس میں ان چاروں دوستوں کا عمل دخل کس حد تک ہو سکتا ہے۔ اسے اب اس بات کا بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ دھمکی دینے والا وہ گمنام شخص جو خود کو اسلم خان کی بے چین روح کہتا تھا، ضرور ان چاروں کے کسی گھناؤنے جنونی راز سے واقف تھا۔

شکیل شیرازی تو سوچ رہا تھا کہ ان چاروں کے بجائے اگر وہ اس دھمکی دینے والے گمنام شخص کو ٹریپ کرنے کی کوشش کرے تو یہ کیس چٹکی بجاتے ہی حل ہو سکتا تھا۔

بہرطور... ظہیر کو ملنے والی اس دھمکی کے بعد شکیل ...... اب اس کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے کسی رازداں سے رابطہ کرے اس لیے وہ اپنے اسپیشل روم جسے وہ ''اسپائی روم'' کہتا تھا، وہاں سے بالکل نہیں ہلا اور تب پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ظہیر کی بگڑی ہوئی آواز میں وہ پیغام بھی کیچ کر لیا جس میں اس نے اپنے فون کے ذریعے اپنے تینوں دوستوں کو فی الفور اپنی رہائش گاہ پہنچنے کا کہا تھا۔ شکیل...... اس پیغام کو سننے کے بعد یکدم کھڑا ہو گیا پھر ہیڈ فون کانوں سے اتار کر وہ ظہیر کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

قریب پہنچ کر اس نے وہیں کسی تاریک اور قدرے ویران گوشے میں چھپ کر ان تینوں کو ظہیر خان کی کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا جو اپنی کاروں پر وہاں پہنچے تھے۔ وہ جان گیا تھا کہ اب یہ چاروں کسی اہم نوعیت کی نشست میں مصروف ہونے والے ہیں۔

آج کی اتنی کامیابی پر وہ بہت مسرور اور پُرجوش تھا۔ وہ ایک نئے عزم اور ولولے کے ساتھ نئے سرے سے اس کیس کو حل کرنے کے لیے کوشاں ہو گیا۔

اپنی اس جزوی کامیابی پر نہ جانے کیوں اس کے تصور میں مائرہ کا دلکش چہرہ رقصاں ہو گیا۔ وہ اس سے ایک جذباتی سا لگاؤ محسوس کرنے لگا تھا جسے محبت کہا جا سکتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ مائرہ سے اپنی اس کامیابی کا ذکر کرے۔ وہ اسے متاثر کرنے کی کوشش میں تو رہتا ہی تھا مگر عدنان ہمیشہ کباب میں ہڈی بنتا تھا۔ اسے عدنان سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ وہ اس کے لیے اپنے اندر رقیبانہ جذبات رکھتا تھا۔

شکیل کا خیال تھا کہ عدنان، مائرہ کا خوامخواہ دُم چھلا بنا ہوا ہے جبکہ مائرہ کو عدنان سے کوئی دلی لگاؤ نہ تھا۔

عدنان کا خیال آتے ہی اسے اپنے حلق میں کڑواہٹ گھلتی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ عدنان ہی تھا جس کی وجہ سے شکیل، مائرہ کو متاثر کرنے کا خیال اپنے دل میں لا کر فوراً رد کر دیا کرتا کیونکہ مائرہ کے توسط سے عدنان کے کانوں میں یہ بھنک پڑ سکتی تھی۔ یوں عدنان بڑی چالاکی سے کامیابی حاصل کر کے سارا کریڈٹ خود لے جاتا کیونکہ ماضی میں کچھ کیسز میں شکیل سے یہ بے وقوفی ہو چکی تھی۔ اب وہ اس اہم نوعیت کے کیس کے سلسلے میں محتاط رہنا چاہتا تھا۔ یوں بھی مائرہ کا تعلق بہرحال اس کے محکمے سے نہ تھا مگر دل سے تو تھا۔ لاکھ خود کو سمجھانے پر بھی بسا اوقات شکیل مائرہ کے سامنے شیخی بگھارنے بیٹھ جاتا تھا جس کا فائدہ لامحالہ عدنان اٹھا ہی لیا کرتا تھا۔

وہ اپنے اپارٹمنٹ میں واپس پہنچا پھر آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

دستک دینے پر دروازہ پرویز...... نے ہی کھولا تھا، اس وقت دن کے گیارہ بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ پرویز ہوٹل جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

وہ دروازے پر عدنان اور مائرہ کو دیکھ کر چونکا۔ پھر پریشان سا ہو گیا۔

''جی... آپ پھر مجھے تنگ کرنے آگئے؟''

''ایسی بات نہیں ہے پرویز۔'' عدنان نے شائستگی سے مسکرا کے کہا۔

''ہم بہرحال پولیس والے نہیں ہیں جو تمہیں تنگ کریں۔'' اس بار مائرہ نے مسکرا کر اس سے کہا۔

مگر پرویز اس کی دلکش مسکراہٹ سے متاثر ہوئے بغیر جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر پولیس والوں کا دردِ سر آپ دونوں نے کیوں اپنے سر پر لے رکھا ہے؟''

''تو کیا تم ہم سے تعاون نہیں کرو گے؟''

''آپ کو کیسا تعاون چاہیے؟''

''چند باتیں پوچھنا ہیں جو ہیں تو پرانی اور دہرائی ہوئی مگر اب ذرا نئے زاویے سے ہیں۔ شاید اس میں تمہاری بھی بہتری کا کوئی پہلو نکل آئے۔'' عدنان نے کہا۔

پرویز ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا پھر انہیں بادلِ ناخواستہ اندر کمرے میں لے آیا۔ اس کی بیوی ناہید کچن میں مصروف تھی۔

''جی... کیا کہنا ہے آپ نے؟'' پرویز نے ان دونوں کو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد خود سامنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

عدنان پرویز کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''پرویز! ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم اسلم خان مرڈر کیس کے سلسلے میں کوئی بات چھپا رہے ہو، میرا مطلب ہے کوئی ایسی بات جسے یا تو تم غیر ضروری سمجھتے ہوئے ہو اب تک چھپا رہے ہو یا پھر تمہیں یہ ڈر ہو کہ بات تمہارے منہ سے نکلنے کی دیر ہو اور پولیس ایک بار پھر تمہیں شبے میں گرفتار کر لے۔''

''آپ نے بھلا یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ میں نے ایسی

کوئی بات اب تک پولیس کو نہیں بتائی ہوگی؟"

پرویز کے لہجے میں حیرت تھی مگر عدنان کی زیرک نظروں نے اس کے چہرے پر مترشح پریشانی کے تاثرات فوراً ہی بھانپ لیے تھے۔ درحقیقت اسے پہلے سے ہی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پرویز کچھ بتانے سے کترا رہا ہے۔ عدنان نے جواباً ایک دھماکا کیا۔

"اس لیے کہ ہمیں کسی نامعلوم شخص نے گمنام فون کر کے بتایا ہے کہ تم اسلم خان مرڈر کیس میں نہ صرف شریک رہے ہو بلکہ پچیس کروڑ مالیت کے ہیرے بھی تمہارے قبضے میں ہیں۔"

عدنان کی بات سن کر پرویز کی جو حالت ہوئی سو ہوئی، خود مائرہ بھی چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ عدنان نے آخر اس سے یہ بات کیوں چھپائی تھی؟ یا پھر وہ دانستہ اندھیرے میں تیر چھوڑ رہا تھا۔

"یہ... یہ... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" پرویز، عدنان کی بات سن کر ہکلاتے ہوئے بولا۔

عدنان کی بھانپتی ہوئی نظریں اس کے پریشان حال چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیا میں اپنی بات دوبارہ دہراؤں پرویز صاحب؟" عدنان نے اس کی طرف دیکھ کر ڈرامائی لہجے میں کہا۔

"آں... نہیں... پتا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" پرویز سے کوئی بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ بُری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اگرچہ یہ بات بھی درست تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اسے کیسے معلوم ہوئی؟ اس کا خیال لامحالہ فوراً اس گمنام کال کرنے والے بلیک میلر کی طرف چلا گیا کہ کہیں یہ اس کی حرکت تو نہیں؟

"دیکھو پرویز! شکر کرو کہ اس گمنام فون کرنے والے نے تمہارے خلاف سارے ثبوت ہم تک پہنچا دیے، اگر وہ پولیس کو یہ سارے ثبوت فراہم کر دیتا تو تمہارا کیا حشر ہوتا، خود سوچ لو۔" عدنان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا... پرویز کی حالت دیدنی تھی۔

"عدنان صاحب! میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں... میں بے قصور ہوں، میں ایک غریب اور سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس نے بھی آپ کو فون کیا ہے یا میرے خلاف جو ثبوت دیے ہیں، وہ جھوٹے ہیں اور یہ اس نے مجھے پھنسانے کے لیے کیا ہے جبکہ اسلم خان کا اصل قاتل بھی وہی ہوگا۔ میں اپنے بچوں کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں نے یہ قتل نہیں کیا ہے۔"

اس کی بات پر عدنان نے فوراً پینترا بدلا۔ "ہاں... پہلے مجھے وہ ثبوت دیکھ کر ایسا ہی محسوس ہوا تھا مگر پولیس اتنی باریک بینی سے کام نہیں لے گی، نہ ہی اسے تمہاری قسموں پر اعتبار آئے گا۔ اس لیے ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا سراغ ہمارے ہاتھ لگ جائے جو اصل قاتل کو بے نقاب کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ ہماری معلومات کے مطابق تم مقتول اسلم خان کے بہت قریبی اور قابلِ اعتبار خدمت گار رہے ہو۔ آخر تمہیں کچھ تو علم ہوگا کہ اسلم خان کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ کون اس سے ملنے آتا تھا؟ اس رات ضرور کوئی اس سے ملنے تو آیا ہوگا، تم کچھ چھپا رہے ہو کہ کہیں تم خود پولیس کی لمبی چوڑی تفتیش کا دوبارہ سے نشانہ نہ بن جاؤ... لیکن ہمارا تم سے یہ وعدہ ہے کہ تم جو کچھ بتاؤ گے، ہم اس کی پولیس والوں کو ہوا تک نہیں لگنے دیں گے اور تمہاری بتائی ہوئی بات کو سراغ بنا کے اصل قاتل تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ بہ صورتِ دیگر یہ بات کسی بھی وقت خود تمہارے لیے مصیبت بن سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر عدنان نے جانچتی... ہوئی نظریں پرویز کے ستے ہوئے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اس نے صاف محسوس کیا کہ پرویز کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

"لل... لیکن..." پرویز کچھ کہتے کہتے رکا، پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کو بتا ہی دینا چاہیے تاکہ اصل مجرم بے نقاب ہو جائے اور میری بھی جان چھوٹ جائے۔"

"گڈ...! یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔"

پرویز نے بتانا شروع کیا۔

"... جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ اسلم خان جب بھی ہمارے ہوٹل ریڈ کارپٹ میں ٹھہرتا تھا تو میں ہی خاص طور پر اسے سرو کیا کرتا تھا۔ یعنی اس کی چھوٹی موٹی ضروریات حتیٰ کہ ٹیلی فون کالز وغیرہ کے بارے میں بھی مجھے علم ہوتا تھا جو اس کی غیر موجودگی میں آتی تھیں۔ غرضیکہ میں اس کا کُل وقتی ملازم بن جاتا تھا۔"

اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ عدنان اور مائرہ بہ غور اس کی گفتگو سن رہے تھے۔ ان دونوں کے چہروں سے ظاہر تھا کہ وہ پرویز کی طرف سے کسی نئے انکشاف کے لیے بے چینی سے منتظر تھے۔

اس نے کہنا شروع کیا۔

"قتل کی رات انٹرکام پر اسلم خان نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا۔ میں نے اسلم خان کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔"

"آ جاؤ۔" ایک گمبھیر آواز اندر سے ابھری۔

"میں دروازہ آہستگی سے دھکیل کر اندر داخل ہوا، سامنے کرسی پر اسلم خان براجمان تھا اور اس کی انگلیوں میں بیش قیمت سگار دبا ہوا تھا۔"

"جی سر! حکم کیجیے؟" میں نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

"بیٹھو۔" انہوں نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔

میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔

"مسٹر پرویز! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم ایک اچھے انسان ہو۔ تم نے کبھی اپنی خدمت کے صلے میں مجھ سے کوئی لالچ نہیں رکھا۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

میں نے کہا۔ "سر! آپ کی خدمت کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ اس میں کسی لالچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں، البتہ آپ اپنی خوشی سے مجھے ٹپ کے طور پر جو دیتے ہیں، وہ میرے لیے کم نہیں۔"

"یہ میں تمہاری اضافی خدمت کے صلے میں دیتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "کیونکہ میں جب بھی یہاں آتا ہوں، تم نہ صرف میرا خاص طور پر خیال رکھنے کی کوشش کرتے ہو بلکہ میری ہدایات کے مطابق میری آمد کو بھی خفیہ رکھتے ہو۔ دراصل میرا بزنس ہی ایسی نوعیت کا ہے کہ مجھے اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا پڑتا ہے لیکن بسا اوقات مجھے کچھ کاروباری میٹنگز یہاں اس کمرے میں بھی نمٹانی پڑتی ہیں اور چند بڑے کاروباری افراد کے یہاں آنے سے کچھ نہ کچھ خبر آؤٹ ہو ہی جاتی ہے۔ بہرحال..." وہ اتنا کہہ کر رکا پھر کرسی سے اٹھا۔ میں عجیب شش و پنج میں مبتلا تھا کہ آخر یہ مجھ سے کہنا کیا چاہتا ہے؟ تاہم میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل کے قریب جا کر اس کی دراز سے ایک لفافہ نکالا اور مجھے تھمانے کے بعد دوبارہ اپنی جگہ پر براجمان ہوگیا۔ لفافہ کھلا تھا، یعنی سر بمہر نہ تھا۔ اس کے اندر چند بڑے نوٹوں کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔

"اس میں تمہاری خدمتِ خاص کی چھوٹی سی رقم موجود ہے، اسے رکھ لو۔"

"مم... مگر سر! اس کی کیا ضرورت تھی؟ آپ مجھے پہلے ہی کافی ٹپ دے چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں، مگر یہ رقم تمہاری ٹپ کے علاوہ، اس کام کی ہے جو تم میرے لیے کرنے والے ہو۔"

میں نے فوراً کہا۔ "جی سر! آپ حکم کریں کیا کام ہے؟"

"آج رات... ایک بجے کے لگ بھگ مجھے یہاں اس کمرے میں چند لوگوں کے ساتھ ایک خاص قسم کی کاروباری ڈیلنگ نمٹانی ہے۔ جن لوگوں سے میں آج رات ایک بجے یہاں ملاقات کرنے والا ہوں، ان کی تعداد چار ہوگی۔ ان کے نام ظہیر خان، طفیل احمد، خضر حیات اور جابر خان ہیں اور میں ان کے ساتھ یہ اہم ترین ڈیل بالکل خفیہ رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے۔" وہ اتنا کہہ کر پھر رکا اور چند سیکنڈز کے بعد دوبارہ کہنا شروع ہوا۔

"یوں تو مجھے ان چاروں پر بھروسا ہے مگر دولت کو دیکھ کر انسان کی نیت بدلنے میں ذرا دیر نہیں لگتی... میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب وہ چاروں آئیں تو تمہیں ان کی آمد کو بھی خفیہ رکھنا ہوگا۔ دوسری اہم بات یہ کہ جب تک وہ چاروں میرے کمرے میں موجود رہیں گے، میں اپنے روم کے انٹرکام کا ریسیور اٹھائے رکھوں گا اور تم ریسیپشن پر موجود میرے کمرے سے منسلک انٹرکام کا ریسیور اپنے کان سے لگائے رکھو گے۔ جیسے ہی مجھے اندازہ ہوگا کہ ان چاروں کی نیت میں فتور آ رہا ہے' میں تمہارے نام کا دوسرا حصہ پکاروں گا یعنی "پروانہ۔" یہ ایک اشارہ ہوگا، تم سمجھ جانا کہ میری جان خطرے میں ہے یا میں خطرے سے کسی وقت بھی دوچار ہونے والا ہوں' اس کے بعد تم فوراً میرے کمرے میں آ جانا اور دانستہ یہ جھوٹ بولتے ہوئے مجھے مطلع کرنا کہ ایک اعلیٰ پولیس افسر میرا منتظر ہے۔ یہ ایک احتیاطی تدبیر ہوگی۔ وہ چاروں ڈر جائیں گے اور اس طرح ان کے اندر جو بھی جارحانہ عزائم پرورش پا رہے ہوں گے وہ ازخود ختم ہو جائیں گے۔ میں فوراً تمہارے ساتھ باہر آ جاؤں گا اور ان سے معذرت کر لوں گا۔ یوں یہ چاروں بھی تمہاری نظروں میں آ جائیں گے۔" وہ چند لمحے کے لیے رکا پھر دوبارہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"تم ضرور حیران ہو رہے ہو گے مگر کیا کروں میرا کام ہی ایسا ہے کہ مجھے اپنے تحفظ کے لیے ایسی عجیب و غریب احتیاطی تدابیر کا سہارا لینا پڑتا ہے۔" پھر وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

تب میں نے پوچھا۔

"سر جی! آپ کو ان چاروں سے اگر اپنی جان اور مال کا خطرہ ہے تو پھر آپ ایسے لوگوں سے کاروباری ڈیلنگ

ہی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟''

میری بات پر وہ بے نیازسی مسکراہٹ سے بولا۔

''مجھے تو اپنے پاس آنے والے ہر شخص پر شبہ ہوتا ہے۔ اب تم اسے میرا وہم کہہ لو یا پھر حفاظتی تدبیر... کیونکہ میرے کاروبار کی نوعیت ہی ایسی ہے تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟''

''جج... جی ہاں سر! مگر... پتا نہیں مجھے کیوں ڈر لگ رہا ہے کہ میں آپ کا یہ کام ٹھیک طرح سے انجام دے پاؤں گا بھی یا نہیں؟'' میں نے بہ مشکل کہا۔

وہ میری طرف دیکھ کر ہنس دیا اور بولا۔ ''تم واقعی بہت سیدھے آدمی ہو مگر میں ہیرے اور کوئلے کا فرق جانتا ہوں۔ تم شاید گھبرا رہے ہو یہ کام کرتے ہوئے۔ چلو میں تمہارا یہ کام ذرا سا مختصر کیے دیتا ہوں کیونکہ تمہارے لیے شاید ریسیپشن پر مسلسل انٹرکام کا ریسیور تھامے رکھنے میں دقت ہو، پھر تم صرف اتنا کر دینا کہ ان چاروں کے آتے ہی ذرا دیر بعد میرے کمرے میں آ کر یہ سب کہہ دینا جو میں نے تم سے کہا ہے۔ اس طرح کم از کم یہ تو ضرور ہو گا کہ ان چاروں پر پہلے ہی سے نفسیاتی دباؤ پڑ جائے گا کہ باہر کوئی پولیس کا اعلیٰ افسر میرا منتظر کھڑا ہے۔ اس دوران میں ان چاروں سے ڈیلنگ نمٹانے کی کوشش کروں گا۔ اگر ان کی نیتوں میں فتور ہوا تو وہ ٹال مٹول سے کام لیں گے اور میں انہیں کسی اور وقت آنے کا کہہ کر رخصت کر دوں گا مگر پھر ان سے دوبارہ کوئی ڈیل نہیں کروں گا۔ پھر خاموشی سے واپس ساؤتھ افریقا لوٹ جاؤں گا، کیونکہ یہ میرا اصول ہے کہ میں ایک ہی نشست میں ڈیل کو حتمی نتیجے پر پہنچا کر ختم کر دیتا... ہوں۔ یہ میرے کاروبار اور اپنے تحفظ کی مجبوری ہے۔''

''جی میں سمجھ گیا۔'' میں نے فوراً قدرے جوش سے کہا۔ ''یہ کام میرے لیے نسبتاً آسان ہے کیونکہ میں ہیڈ ویٹر ہوں۔ آپ نے یہ درست اندازہ لگایا کہ میں مسلسل ایک ہی جگہ پر انٹرکام کا ریسیور اپنے کان سے لگائے کھڑا نہیں رہ سکتا۔ مجھے منیجر کے حکم کے مطابق حرکت میں رہنا پڑتا ہے اور دیگر ویٹرز کی کارکردگی اور دیگر کسٹمرز کی بھی خبر لینا پڑتی ہے۔''

''بظاہر مجھے یہ کام عام نوعیت کا ہی محسوس ہوا تھا۔ البتہ اسلم خان کو میں اب ان روایتی دولت مندوں کے روپ میں ضرور دیکھنے لگا تھا کہ جن کے پاس دولت تو بے انتہا ہوتی ہے مگر سکون نام کی چیز غارت ہو جاتی ہے پھر جس قدر انسان دولت مند ہوتا ہے اسی قدر وہ وہمی بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگتا ہے تاہم مجھے جانے کیوں اب اسلم خان پر بھی اس بات کا شبہ سا ہونے لگا تھا کہ یہ شخص ہیروں کا سوداگر نہیں بلکہ کوئی بہت بڑا اسمگلر ہے جو اس قدر رازداری کے ساتھ آتا ہے اور اپنا کام نمٹا کے اسی رازداری کے ساتھ واپس لوٹ جاتا ہے۔ میں نے لعنت بھیجی، مجھے کیا... وہ سوداگر ہو یا اسمگلر، مجھے تو اپنے کام کا معاوضہ مل رہا تھا۔ مجھے وہی کرنا تھا جو اس نے کہا تھا۔

''پھر ٹھیک ایک بجے ایک بڑی سی سیاہ رنگ کی کار ہوٹل کی وسیع کار پارکنگ میں رکی۔ اس کے اندر سے چار سوٹ پوش آدمی برآمد ہوئے۔ وہ وقت کے پابند معلوم ہوتے تھے۔ میں اس وقت کسی بہانے سے ریسیپشن پر ہی موجود تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سب سے پہلے ریسیپشن پر موجود مشتاق احمد سے اسلم خان کے بارے میں کچھ دریافت کریں گے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور سیدھے لفٹ کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ میں نے ان کے تعاقب میں جا کر یہ تصدیق کر لی تھی کہ یہی اسلم خان کے وہ چاروں مطلوبہ افراد تھے جن کے بارے میں اس نے آگاہ کیا تھا۔ میں ایک دوسری لفٹ سے اوپر پہنچا تھا اور پھر میں نے ان چاروں کو کمرا نمبر ننانوے میں داخل ہوتے دیکھا۔ چونکہ میں اس وقت ویٹر والی مخصوص وردی میں تھا اس لیے انہیں مجھ پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا۔

''میں واپس نیچے لوٹ آیا۔ اب ذرا دیر بعد مجھے اسلم خان کی ہدایت کے مطابق ان کے کمرے میں جا کر وہی کچھ کہنا تھا جو اس نے مجھے سمجھایا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد جب میں اسلم خان کے کمرے کی طرف جانے کے ارادے سے بڑھا تو اچانک ریسیپشن پر موجود مشتاق احمد نے مجھے اطلاع دی کہ منیجر ایاز صاحب نے مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں بلایا ہے۔ میں نے سوچا ان چاروں کو آئے ابھی دیر ہی کتنی ہوئی ہے، میں تھوڑی دیر بعد چلا جاؤں گا، کوئی حرج نہیں۔ میری نظر میں ویسے بھی اسلم خان ایک وہمی اور جھکی انسان تھا۔ اسے تو مجھ سے بھی ڈر لگتا ہو گا۔ لہٰذا ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ سرے سے ہو گا ہی نہیں۔ چنانچہ میں آفس روم کی طرف بڑھ گیا۔ منیجر ایاز سے ملنے کے بعد پتا چلا کہ حساب کتاب میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

یوں منیجر ایاز نے مجھ سے لگ بھگ پون گھنٹے تک سر کھپایا تب جا کر میری گلوخلاصی ہوئی۔ میں نے وہاں سے فارغ ہو کر سیدھے اسلم کے کمرے کا رخ کیا اور دروازے کے قریب پہنچ کر دستک دی۔ جانے کیوں میرا دل ایک انجانے احساس سے بے تحاشا دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ کوئی ضروری نہیں کہ ایسا ہو جائے جس کا اسلم خان کو ہر وقت ہی دھڑکا لگا رہتا تھا۔

جب دوسری اور تیسری بار بھی دستک دینے پر اندر سے کوئی آواز نہ آئی تو میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ سامنے نگاہ پڑتے ہی مجھے اپنے سینے میں سانس رکتی محسوس ہوئی۔ سامنے بیڈ پر اسلم خان لاش کی صورت میں پڑا تھا۔ اسے شاید سائلنسر لگے پستول سے ہلاک کیا گیا تھا کیونکہ اس کی پیشانی میں سوراخ نظر آ رہا تھا جہاں سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ میں بُری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ میں ایک غریب اور سیدھا سادہ انسان ہوں۔ اس لیے یکدم خوف زدہ ہو کر اُلٹے پیروں واپس پلٹا اور پھر کسی کو کچھ بتائے بغیر اپنے گھر لوٹ گیا۔ یوں بھی اس وقت میری ڈیوٹی آف ہونے والی تھی۔''

پرویز... اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔

مائرہ کے چہرے پر حیرت تھی اور عدنان خاصا پُرجوش نظر آ رہا تھا۔

عدنان نے ایک گہری سانس لے کر پرویز سے پوچھا۔ ''تم ان چاروں افراد کو پہچان لو گے جو اس رات ڈیڑھ بجے مقتول اسلم خان سے ملنے آئے تھے؟''

''بالکل جی! میں نے تو ان کے نام بھی آپ کو بتا دیے ہیں۔'' وہ فوراً بولا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ یہ قتل ان چاروں کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔''

''ٹھیک ہے تمہارا شکریہ۔ اب یہ بات کسی اور کو مت بتانا۔ ہم اب اپنے طور پر کچھ کرتے ہیں۔'' عدنان یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

پرویز ملتجی لہجے میں بولا۔ ''عدنان صاحب! میں ایک غریب انسان ہوں۔ آپ اپنا وعدہ یاد رکھیے گا۔ اگر یہ بات پولیس تک پہنچ گئی تو اصل مجرموں کے بجائے کہیں پولیس مجھے ہی اسلم خان کے قتل کے الزام میں نہ دھر لے۔''

عدنان نے اس کے شانے کو ہولے سے تھپتھپا کر دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔ ''بے فکر رہو، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔''

وہ دونوں واپس چلے گئے۔

☆☆☆

ایک اہم سراغ کے ہاتھ لگتے ہی شکیل بہت خوش دکھائی دے رہا تھا کیونکہ اسے امید نہ تھی کہ ایک پیچیدہ کیس کی گتھیاں یوں اچانک سلجھ جائیں گی۔ وہ صرف ایک سراغ کی تلاش میں تھا مگر یہاں تو اس مرڈر کیس کا پورا پنڈورا باکس ہی کھل چکا تھا۔

ظہیر خان کو ملنے والی کسی گمنام شخص کی طرف سے دھمکی سے یہ بات تو ثابت ہو چکی تھی کہ اسلم خان کو ان چاروں دوستوں ظہیر خان، طفیل احمد، جابر خان اور خضر حیات نے مشترکہ منصوبہ بندی کے تحت قتل کیا تھا اور اس خوفناک واردات کا مقصد اسلم خان کے پچیس کروڑ روپے مالیت کے ہیرے ہتھیانا ہی ہو سکتا تھا لیکن یہ بات ابھی تک تاریکی میں تھی کہ آخر ظہیر خان کو دھمکی دینے والا وہ گمنام شخص کون تھا؟ یقیناً اسے اس لرزہ خیز واردات کے بارے میں نہ صرف علم تھا بلکہ اس کا دعویٰ بھی تھا کہ اس کے پاس اس خونی واردات کے ٹھوس ثبوت بھی تھے۔ شکیل سوچنے لگا کہ کسی طرح اگر اس گمنام شخص کو جو خود کو اسلم خان کی ''بے چین روح'' کہتا تھا، اگر وہ ٹریس کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پورا کیس ہی حل ہو جائے گا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ ظہیر اپنے بچاؤ کے سلسلے میں کیا کرتا ہے۔ اسلم خان کی ''بے چین روح'' کو پکڑنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ سب سے پہلے ظہیر کی خفیہ نگرانی کرے کیونکہ وہ گمنام شخص ظہیر کو اس کا مطالبہ نہ ماننے کی صورت میں قتل کی دھمکی بھی دے چکا تھا۔ اڑتالیس گھنٹوں کی مہلت ختم ہونے کے بعد کیا ہونے والا تھا...؟

☆☆☆

رات اپنے نصف پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔

ظہیر خلافِ معمول اپنی خواب گاہ کے بجائے آج رات اوپر اپنے اسٹڈی روم میں کرسی پر مضطرب سا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سلیپنگ گاؤن میں ایک پستول چھپا رکھا تھا۔ ایک ڈبل بیرل بندوق بھی اس نے تیار کر رکھی تھی جو قریب ہی بیڈ پر رکھی تھی۔ اس کی بیوی زرینہ نے بہت کوشش کی تھی کہ اپنے شوہر کو خواب گاہ تک ہی محدود رکھے یا پھر کم از کم وہ بھی اس کے ساتھ اوپر اس کے اسٹڈی روم میں ساتھ رہے مگر ظہیر نے سختی سے اسے منع کر دیا تھا۔

ظہیر کوئی آٹھویں مرتبہ اٹھ کر اپنے اسٹڈی روم کے دریچے کے قریب آیا اور ذرا سا پردہ سرکا کر باہر جھانکا۔ یہاں سے بیرونی گیٹ اور باہر تک کا پورا حصہ نظر آتا تھا۔ اس نے گیٹ پر چوکس کھڑے دونوں گارڈز کو دیکھا پھر قدرے مطمئن ہو کر دوبارہ کرسی کی طرف آ گیا۔ اپنے گاؤن کی جیب سے پستول نکال کر اسے ہاتھ میں لے کر تولا پھر بیڈ پر رکھی ڈبل بیرل بندوق اٹھائی۔ اس کا یونہی نشانہ

باندھا، پھر اسے دوبارہ بیڈ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور قریب میز پر رکھے سگار کیس کو اٹھا لیا۔ لائٹر بھی ساتھ ہی موجود تھا۔ اس نے سگار سلگا کر ایک گہرا کش لیا پھر ہونٹ سکیڑ کر زیر لب بڑبڑایا۔

''اونہہ... اسلم خان کی بے چین روح... اڑتالیس گھنٹے تو گزر چکے ہیں۔ طفیل ٹھیک ہی کہتا تھا، یہ کسی سرپھرے ہی کا کام ہو سکتا ہے... مگر... پھر اسے یہ خونی راز آخر کس طرح معلوم ہوا؟''

یہی وہ روح فرسا خیال تھا جو اس کی پریشان کن بے چینی کا اصل سبب بن رہا تھا۔ مگر پھر اس سلسلے میں فوراً ہی اسے خضر حیات کی اس بارے میں دی ہوئی تسلی بھی یاد آگئی کہ ممکن ہے کسی نے اپنے طور پر یہ اندازہ قائم کر لیا ہو، یا اسلم خان کے ساتھ ان کی ایک جھلک دیکھ چکا ہو اور یوں بعد میں ان پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کی غرض سے پچیس کروڑ کے ہیروں میں حصے دار بنا چاہتا ہو۔

''مگر وہ تو سارے ہیرے ہی ہڑپ کرنے کے چکروں میں ہے...'' اس نے استہزائیہ انداز میں سوچا۔ ایسا مطالبہ تو واقعی صرف اسلم خان کی بے چین روح ہی کر سکتی ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اسلم خان کی بے چین روح یا اس روپ میں جو کوئی بھی گمنام شخص تھا، وہ دو سال بعد ہی کیوں بیدار ہوا تھا؟ اس نے سوچا۔ ممکن ہے دو سال تک وہ کسی منصوبہ بندی میں مصروف رہا ہو!

اس نے سر جھٹک کے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا، رات کے ٹھیک ایک بجے کا وقت تھا۔ جانے کیوں اچانک ظہیر کو یاد آیا کہ یہی وہ وقت تھا جب ان چاروں نے مل کر ہوٹل ریڈ کارپٹ کے کمرا نمبر ننانوے میں داخل ہو کے پہلے اسلم خان کو زدوکوب کیا تھا پھر اس کے قبضے سے ہیرے برآمد کیے تھے۔ اس کے بعد طفیل احمد اور خضر حیات نے اسلم خان کو دبوچا اور اس نے (ظہیر خان نے) اپنے سائلنسر لگے پستول سے اسلم خان کی پیشانی میں سرخ روشن دان بنا دیا تھا۔

اس کا تصور کر کے جانے کیوں ظہیر خان کو اپنے رگ و پے میں سرد لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے اسلم خان کی بے چین روح کے انتقام لینے کا اصل وقت یہی تھا۔

اس کی نظریں ہنوز اپنی رسٹ واچ پر تھیں۔ جب اچانک اسے اپنے قریب... بالکل قریب... کسی کے وجود کا احساس ہوا... پھر اسے چونکنے کا بھی موقع نہ ملا۔ ایک سیاہ پوش وجود نے تیز چمک دار چھرے سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی اور ساتھ ہی اس پراسرار سیاہ پوش نے اس کے منہ پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔ ظہیر کی گردن سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔

موت کی اتھاہ اور تاریک وادیوں میں ڈوبنے کے باوجود اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنے قاتل کا چہرہ دیکھ لے۔ مگر اس کی یہ آخری خواہش پوری نہ ہو سکی اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

☆☆☆

شکیل شیرازی... کافی دیر سے تالیاں اور اپنے گال پیٹ پیٹ کر نہ جانے اب تک کتنے مچھروں کو واصلِ جہنم کر چکا تھا۔ یہی نہیں دو تین گھنٹوں سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ظہیر خان کی کوٹھی کا طواف کرتے ہوئے اس کی ٹانگوں میں بھی درد ہونے لگا تھا مگر ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ ظاہر ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔

اس نے ایک تاریک گوشے میں کھڑے کھڑے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ اسے ابھی تک ظہیر کی کوٹھی کے گرد کسی مشکوک شخص کی نقل و حرکت محسوس نہیں ہوئی تھی مگر وہ مایوس بھی نہ تھا۔ اس نے کم از کم پانچ بجے کی سحر خیزی تک کا لطف لینے کا قصد کر رکھا تھا، چنانچہ وہ ایک بار پھر سرگشت کرنے کے انداز میں آگے بڑھا اور کوٹھی کی عقبی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا جیسے ہی وہ گیٹ والی دیوار کی طرف گھوما تو اسے کوٹھی کے اندر کسی گڑبڑ کا احساس ہوا، وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

اسے اچانک احساس ہوا کہ گیٹ پر تعینات وہ دونوں باوردی مسلح گارڈز غائب ہیں جنھیں وہ کچھ دیر پہلے کوٹھی کے آس پاس محتاط انداز میں گشت کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ تب پھر دفعتاً ہی اسے اندر کسی عورت کے رونے چلانے کی ہسٹریائی آوازیں سنائی دیں۔ وہ بُری طرح چونک گیا۔ پھر کسی متوقع خیال سے اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہوئے۔ تب اس نے کوٹھی کے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا اور آگے بڑھ کر فوراً کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک بوکھلایا ہوا گارڈ نمودار ہوا۔ شکیل نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اپنی جیب سے سروس کارڈ نکال کر اسے دکھا دیا۔ گارڈ نے فوراً اسے اندر بلا لیا۔

''کیا ہوا ہے؟ میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ اچانک رونے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں؟'' شکیل نے اندر داخل ہو کے پختہ فرش پر چلتے ہوئے گارڈ سے پوچھا۔ گارڈ نے... بمشکل اپنی بدحواسی پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔

''س... سر! اندر قتل ہو گیا ہے۔''

اس انکشاف پر شکیل کا ماتھا ٹھنکا پھر وہ دونوں دوڑتے ہوئے کوٹھی کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئے اور وہاں سے گارڈ اسے اوپر ظہیر کے آفس نما اسٹڈی روم میں لے آیا۔ ایک عورت کو اس نے ظہیر کی خون آلود لاش سے لپٹے روتے ہوئے پایا، دو بچے بھی اسے قریب ہی روتے سسکتے ہوئے کھڑے نظر آئے۔ ایک دو گھریلو ملازم سوگوار چہرے لیے کھڑے تھے۔ شکیل نے سب سے پہلے دونوں نوعمر بچوں کو ایک ملازم کے ساتھ نیچے بھیج دیا اور پھر خود بہ غور لاش کا جائزہ لینے لگا۔ ظہیر کی لاش کرسی پر ڈھلکنے کے انداز میں پڑی تھی۔ عقل مند گارڈز نے کسی کو لاش کو چھونے نہیں دیا تھا۔ لاش کی کٹی ہوئی گردن سے بہنے والے خون نے فرش پر بچھے قالین کو داغ دار کر دیا تھا۔ زرینہ صدمے سے نڈھال ہو کر عالم غشی میں وہیں بیڈ پر ڈھے گئی تھی۔

شکیل نے بے ہوش زرینہ کے قریب آکر نبض دیکھی۔ وہ سست چل رہی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے چھوٹی ٹیبل پر پانی سے بھرا جگ اور گلاس پڑا دکھائی دیا۔ اس نے گلاس میں تھوڑا سا پانی انڈیل کر اس کے چھینٹے زرینہ کے چہرے پر مارے اور پھر ہولے سے اس کا گال تھپتھپانے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک گارڈ نے شکیل کو بتا دیا تھا کہ یہ مقتول بدنصیب ظہیر کی بیوی زرینہ ہے۔

''پلیز! خود کو سنبھالیے اور نیچے جا کر اپنے بچوں کو دیکھیں۔'' اس کے ہوش میں آتے ہی شکیل نے نرمی سے کہا اور ساتھ ہی اپنا سروس کارڈ دکھاتے ہوئے اپنا تعارف بھی کرا دیا۔

اس کے بعد وہ زرینہ کو سہارا دے کر نیچے پہنچانے کے بعد دوبارہ اوپر آگیا۔

شکیل کے چہرے پر الجھن تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ قتل کس طرح ہو گیا؟ کیونکہ وہ مسلسل کوٹھی کی نگرانی کر رہا تھا۔

بہر طور... لاش کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اس نے وہاں موجود گارڈ سے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا۔

''میں اور امجد نیچے گیٹ پر موجود تھے کہ اچانک بیگم صاحبہ کے اوپر سے چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر ہم دونوں اوپر دوڑے۔ اندر کمرے میں پہنچے تو وہ صاحب کی لاش سے لپٹی رو رہی تھیں۔ ہم پولیس کو اطلاع کرنے ہی والے تھے کہ آپ آگئے۔''

''کتنی دیر ہوئی ہے اس واقعے کو پیش آئے؟'' شکیل نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

''بس جی! ابھی آپ کے آنے سے ذرا دیر پہلے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم نے لاش کو چھوا تو نہیں؟''

''بالکل نہیں جی۔''

''کسی اور نے؟''

''صرف بیگم صاحبہ نے چھوا تھا بلکہ انہوں نے ہم سے کہا بھی تھا کہ ہم لاش کو اٹھا کر بیڈ پر ڈال دیں مگر ہم نے ایسا نہیں کیا اور بیگم صاحبہ کو قانونی پیچیدگی سے بھی آگاہ کیا۔''

''ٹھیک ہے۔''

شکیل کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ اسے چند اہم

سوالات مقتول ظہیر خان کی بیوہ زرینہ سے بھی پوچھنا تھے۔ وہ انتہائی باریک بینی سے کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگیا۔ بیڈ پر اسے ڈبل بیرل بندوق نظر آئی۔ اس کے علاوہ اور کوئی قابلِ ذکر شے اسے دکھائی نہیں دی تھی۔ اس نے کسی متوقع خیال کے تحت لاش کے سلیپنگ گاؤن کی تلاشی لی تو اسے ایک ریوالور ملا۔ وہ اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ یہ دونوں ہتھیار مقتول ظہیر کے ہی تھے اور یقیناً لائسنس یافتہ بھی ہوں گے مگر اسے انہیں چلانے کا موقع ہی نہ ملا اور وہ قاتل کے بھیانک چنگل میں پھنس کر چشمِ زدن میں موت کی وادی کی طرف کوچ کر گیا۔ بندوق اور ریوالور کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہی اس نے یہ اندازہ لگایا تھا لیکن شکیل سوچ رہا تھا کہ ظہیر خان نے تو یقیناً اپنے اسٹڈی روم کا دروازہ بند کر رکھا ہوگا۔ بہرحال اب اسے مقتول ظہیر کی بیوہ زرینہ سے چند اہم سوالات پوچھنا تھے۔

یہ سوچ کر... اس نے اسٹڈی روم کا دروازہ بند کروا دیا اور نیچے آگیا۔ زرینہ اپنے دونوں بچوں کو سنبھالے بُری طرح سسک رہی تھی۔

شکیل شیرازی نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔

''خاتون! جو کچھ ہوا اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں آپ سے ضروری نوعیت کے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں جو یقیناً آپ کے شوہر کے قاتل کو گرفتار کروانے میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔''

اس کی بات سن کر زرینہ نے ٹشو پیپر سے اپنے آنسو پونچھے پھر ہولے سے سر ہلا دیا۔

''آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ کو کیسے پتا چلا کہ آپ کے شوہر کے ساتھ یہ سانحہ پیش آچکا ہے؟'' شکیل نے پوچھا۔

زرینہ گلوگیر لہجے میں بتانے لگی۔

''انہیں کئی روز پہلے قتل کی دھمکی ملی تھی، وہ پریشان اور متفکر تھے۔ گمنام قاتل کی دھمکی پر عمل پیرا ہونے کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ میرے اصرار کرنے کے باوجود وہ ٹھیک گیارہ بجے اوپر اپنی اسٹڈی میں چلے گئے۔''

''گویا وہاں وہ خود کو زیادہ محفوظ سمجھ رہے تھے؟'' شکیل نے استفساریہ کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر آگے بتانے لگی۔

''حالانکہ میں نے ان سے کہا بھی تھا کہ پولیس کو انفارم کر دیں مگر وہ مانتے ہی کب تھے۔ وہ گیارہ بجے اوپر اسٹڈی میں چلے گئے۔ مجھے بھی ان کی فکر ستانے لگی تاہم میں بچوں کو سلا کر کوئی ساڑھے بارہ بجے کے قریب اوپر گئی۔ ان کی اسٹڈی کا دروازہ اندر سے بند تھا، میں نے دھیرے سے دستک دی۔ وہ جاگ رہے تھے مگر مجھے دیکھ کر انہوں نے جھڑک کر واپس نیچے لوٹا دیا۔ پھر میری بھی نیچے آکر آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو شاید دو بج رہے تھے۔ میں ان کی خیریت لینے کے لیے پھر اوپر پہنچی۔ گارڈز اپنے کیبن میں چوکنا بیٹھے تھے۔ مجھے تسلی تھی، میں دراصل دوبارہ ان کے پاس اس لیے جانا چاہتی تھی کہ اگر وہ پریشانی کے باعث نہیں سوئے تھے یا سونے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے تو میں ان کے لیے چائے بنا دوں، بہرطور میں چائے کا پوچھنے کے بہانے دوبارہ اسٹڈی میں پہنچی۔ دروازے پر دستک دی مگر جواب نہیں ملا... میں سمجھی شاید وہ سو چکے ہیں، میں نے کچھ سوچ کر دروازے کو ذرا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ میں اندر داخل ہوگئی اور پھر...''

اتنا بتا کر اس کی آواز رندھ گئی۔ شکیل نے زرینہ سے ان دھمکیوں سے متعلق بہت کریدنے کی کوشش۔ اس نے چند اور ضروری سوال کیے اس کے بعد دوبارہ اسٹڈی میں آگیا۔

اس نے سوچا کہ قاتل اسٹڈی روم کا دروازہ کھول کر اندر کیسے داخل ہوا ہوگا۔ بے شک اس نے دروازہ کھولنے کے لیے کوئی خفیہ تکنیک آزمائی ہوگی مگر ظہیر کی بیوی کے مطابق اس کے شوہر نے تو وہ ساری رات جاگ کر گزارنے کا تہیہ کر رکھا تھا اور اس مقصد کے تحت اس نے اپنے ساتھ ایک نہیں، دو دو ہتھیار پاس رکھے ہوئے تھے۔ پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ قاتل نہ صرف باہر موجود دونوں گارڈز کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ خود اسے بھی کوئی مشکوک شخص کوٹھی کے آس پاس دکھائی نہ دیا تھا۔ حالانکہ وہ خود کافی دیر سے کوٹھی کے باہر لان میں نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اسے بھی نظر نہیں آیا تھا۔ شکیل اس نتیجے پر پہنچا کہ چونکہ قاتل نے اس رات اپنے وقت پر اپنی دھمکی کے مطابق ظہیر کو قتل کرنا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ کسی بھی وقت موقع پا کر گھر میں گھسا اور اسٹڈی روم کو ویران پا کر وہاں چھپ گیا۔ یہ ظہیر کی بدقسمتی تھی کہ وہ اعصابی تناؤ کے عالم میں ہر طرف سے گھبرا کر دو ہتھیاروں سمیت اسٹڈی میں محصور ہوگیا۔ قاتل کے لیے وہ بہترین صورتِ حال تھی۔ مقررہ وقت پر اس نے اپنی کمین گاہ سے اچانک نمودار ہو کر ظہیر کو دبوچا اور موت کے گھاٹ اتار کر خاموشی سے اسٹڈی سے نکل کر فرار ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد شکیل اپنے موبائل پر اپنے ڈپارٹمنٹ کو فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دینے لگا۔

☆☆☆

''مجھے تو لگتا ہے، پرویز کو فون پر گمنام بلیک میلر بن کر ہراساں کرنے کا گل تمہارا ہی کھلایا ہوا تھا۔'' مائرہ نے پرویز کے گھر سے روانہ ہوتے وقت کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے عدنان سے کہا۔

عدنان اسرار بھری مسکراہٹ سے بولا۔ ''تم نے بھلا کیسے یہ اندازہ لگا لیا کہ پرویز کو میں نے گمنام بلیک میلر کی حیثیت سے فون کیا تھا؟''

''تمہاری اس پُروثوق بات سے جو تم نے پرویز سے کہی تھی کہ ہمیں کسی نامعلوم شخص نے گمنام فون کر کے بتایا ہے کہ ''اسلم مرڈر کیس'' میں نہ صرف تم شریک رہے ہو بلکہ پچیس کروڑ مالیت کے وہ ہیرے بھی تمہارے قبضے میں ہیں۔ گویا تمہیں یقین تھا کہ کوئی پرویز کو اس قسم کی گمنام فون کالز کر رہا ہے۔ ضرور تم نے اس کی شخصیت کے کسی ایسے پہلو کو شبے کی نگاہ سے دیکھ کر ہی اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے یہ ڈراما کیا تھا۔''

''میرے ساتھ رہ کر تم خاصی عقل مند ہوگئی ہو۔'' عدنان نے شرارت بھرے لہجے میں کہا پھر فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے اس کی تفصیل بھی بتانے لگا۔

''درحقیقت ابتدائی تفتیش کے دوران میں نے ہوٹل ریڈ کارپٹ کے دیگر ویٹرز سے پرویز کے سلسلے میں بھی مفصل معلومات حاصل کر لی تھیں کہ اسلم خان جب بھی کاروباری دورے پر آتا تو ہمیشہ پرویز ہی اس کا خاص خدمت گار ہوتا تھا۔ ظاہر ہے خاص خدمت گار رازداں بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح جب میں نے شروع میں دو ایک بار پرویز کو اس سلسلے میں کریدنے کی کوشش کی تو وہ کترانے لگا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ خود کو مقتول اسلم خان کا خدمت گار ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ یوں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی ایسی بات ضرور جانتا ہے جو وہ محض اس لیے چھپا رہا تھا کہ کہیں وہ پولیس کی تفتیش میں نہ الجھ کر رہ جائے چنانچہ میں نے سوچا کہ اندھیرے میں تیر چلایا جائے لیکن اندھیرے کا تیر بھی تب ہی نشانے پر بیٹھتا ہے کہ اسے اندازوں کے مطابق پھینکا جائے۔ سو میں نے جب پہلی بار پرویز کو گمنام بلیک میلر کی حیثیت سے فون کیا تو اس کے بوکھلائے ہوئے لہجے سے میں نے بھانپ لیا کہ وہ ضرور کوئی ایسی بات جانتا ہے جو اب تک اس نے کسی کو نہیں بتائی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ان چاروں دوستوں کے گرد جال کس طرح بُنا جائے۔'' عدنان نے آخر میں پُرسوچ انداز میں مائرہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

☆☆☆

ان تینوں کے چہروں سے خوف مترشح تھا۔ اپنے دوست ظہیر کے لرزہ خیز قتل پر وہ تینوں طرح خوف زدہ اور پریشان نظر آرہے تھے۔ اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ تینوں ایک کمرے میں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ یہ طفیل احمد کی رہائش گاہ کا ایک کمرا تھا۔

''مجھے تو اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ معاملہ واقعی اس قدر بھیانک رخ بھی اختیار کرسکتا ہے۔''

تھوڑی دیر کی اسرار بھری خاموشی کے بعد طفیل نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

''اب تو صاف لگتا ہے کہ ہم تینوں میں سے کسی ایک کی باری آنے والی ہے۔'' جابر نے کہا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ ہے کون جو اسلم خان کی بے چین روح کا کردار اتنے منظم طریقے سے ادا کر رہا ہے؟'' خضر حیات نے بھی لب کشائی کی۔

جابر پورے یقین سے بولا۔ ''بات صاف ہے، وہ جو کوئی بھی ہے اس نے ہمیں ضرور اسلم خان کا قتل کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے اور اب اسلم خان کی روح بن کر اپنا خوف ہمارے دلوں میں بٹھا کر ہم سے پچیس کروڑ کے وہ ہیرے ہتھیانا چاہتا ہے جو ہم نے اسلم خان کو قتل کر کے حاصل کیے تھے۔''

''ہاں، مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' طفیل احمد نے تائید کی۔ پھر اس نے جابر سے پوچھا۔

''جابر...! تم نے ویسے ظہیر سے وہ دھمکی والا خط تو لے لیا تھا نا جس میں اس گمنام شخص نے ہیروں اور اسلم خان کے قتل کا ذکر کیا تھا؟''

''ہاں، وہ میں نے پہلے اس احتیاط کے پیشِ نظر اس سے لے کر تلف کر ڈالا تھا کہ کہیں پولیس کے ہاتھ نہ لگ جائے۔''

طفیل دونوں سے مخاطب ہو کے تفکر آمیز لہجے میں بولا۔ ''اب یہ سوچو کہ اس گمنام قاتل کا کھوج کیسے لگایا جائے؟ کیونکہ اب اس کا اگلا شکار ہم تینوں میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے۔''

''اس معاملے میں بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں بجز اس انتظار کے کہ وہ اب ہم تینوں میں سے کسے پہلے دھمکی آمیز پیغام

بھیجتا ہے۔ ہم تینوں میں سے اب اس کا اگلا شکار کون ہوسکتا ہے، کیا خبر...؟"

"وہ اب اگلا شکار جسے بھی بنائے گا، اس کے سامنے پہلے ہیروں کی واپسی کا ہی مطالبہ کرے گا اور بعد میں موت کی دھمکی۔" خضر حیات نے کہا۔

"حیرت ہے، ہم نے اس رات اسلم خان کے ساتھ ملاقات سے لے کر اس کا کام تمام کرنے اور پچیس کروڑ مالیت کے ہیرے قبضے میں کرنے تک پوری رازداری اور ہوشیاری برتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری بے داغ اور جامع منصوبہ بندی کے باوجود آخر کہاں ہم سے چوک ہوگئی۔ آخر کس نے ہمیں یہ واردات کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور کیا اس کے پاس واقعی ہمارے خلاف ایسے ٹھوس ثبوت بھی تھے جس کے بل بوتے پر وہ ہمیں بلیک میل کر رہا ہے؟"

"بہرحال، کم از کم مجھے تو پورا یقین ہے کہ اس گمنام قاتل یا بلیک میلر کے پاس ہمارے خلاف کوئی بھی ثبوت نہیں ہوسکتے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، ہم سے ہیرے ہتھیانے کے چکر میں محض اندازوں سے کام چلا رہا ہے۔" جابر بولا۔

"اب وہ اندازوں سے کام چلائے یا ہمارے خلاف ثبوت کے اندھیرے میں تیر چلائے، کم از کم ظہیر کے قتل سے یہ بات تو واضح ہوگئی ہے کہ گمنام قاتل کوئی معمولی مجرم نہیں ہے۔ وہ ہمارے لیے بھی خطرہ ہے اور ہمیں اسے تلاش کرنا چاہیے، اس کا کھوج لگانا چاہیے یا پھر اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے چاہئیں۔" خضر حیات نے کہا۔

"مگر کیسے تلاش کریں اسے؟" طفیل نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں کافی دیر تک مغز ماری کرتے رہے مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

☆☆☆

پرویز کو اخبارات سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی مگر وہ اخبار اتفاقاً ہی اس کے ہاتھ لگا تھا جس میں ظہیر کے پُراسرار قتل کی خبر چھپی تھی اور تصویر بھی۔ پرویز فوراً اس تصویر کو پہچان گیا کہ یہ وہی ظہیر تھا جو اس رات اپنے تینوں دوستوں طفیل احمد، خضر حیات اور جابر خان کے ہمراہ اسلم خان سے ملنے آیا تھا اور پھر ان کی ملاقات کے بعد اسلم خان مقتول بن چکا تھا۔ پرویز نے فوراً عدنان کے دیے گئے سیل نمبر پر اس سے رابطہ کیا اور مذکورہ اخبار اور خبر کے بارے میں بتا دیا۔

عدنان نے فوراً وہ اخبار خرید لیا۔ اس نے مقتول ظہیر کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ اس کی زندگی کی تصویر بھی چھپی تھی۔

دراصل عدنان اس کے باقی تینوں ساتھیوں کی تصاویر یا انہیں دیکھنا چاہتا تھا اور وہ تینوں بھی یقیناً اپنے دوست کے قتل پر تعزیت کے لیے وہاں پہنچنے والے تھے۔ نام تو عدنان کو ان کے پرویز نے بتا ہی دیے تھے۔

بہرطور، وہ مائرہ کے ساتھ مقتول ظہیر کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہ دونوں کوٹھی پہنچے تو عدنان کی نظر باہر کھڑے پرانے ماڈل کی ایک ڈبل کیبن ٹویوٹا پر پڑی جسے دیکھ کر بیک وقت اس کے اور مائرہ کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری۔

"ہوں... تو گویا یہ حضرت بھی پہلے سے اندر تشریف فرما ہیں۔" مائرہ نے زیرلب کہا۔ البتہ اب عدنان کا شکیل کے ذکر پر منہ سا بن گیا۔ تاہم وہ کچھ سوچ رہا تھا کہ آیا اس وقت ظہیر کی بیوہ سے ملاقات کی جائے یا پھر کسی اور وقت آیا جائے، جب شکیل یہاں موجود نہ ہو۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر کوٹھی کے بغلی گیٹ پر پڑی۔ اندر سے شکیل برآمد ہو رہا تھا۔ یہ دونوں بھی تب تک اپنی گاڑی سے نیچے اتر چکے تھے اور گیٹ کے قریب ہی کھڑے تھے۔ تب پھر اسی وقت شکیل شیرازی کی بھی ان دونوں پر نظر پڑ گئی۔

مائرہ کو دیکھ کر شکیل کو اپنے دل کی دھڑکنیں یکبارگی تیز ہوتی محسوس ہوئیں۔ مگر حسبِ معمول عدنان کا دُم چھلا بھی اسے دکھائی دیا تو اس کی طبیعت مکدر سی ہونے لگی۔ دونوں کی کم ہی بنتی تھی، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ سرے سے ہی نہیں بنتی تھی۔ اب نہ جانے اس کی وجہ مائرہ تھی یا پھر کیس میں ان کی مشترکہ دلچسپی کا کوئی "پروفیشنل جیلسی" کا جذبہ کارفرما تھا۔

تاہم شکیل شیرازی نے قدرے قریب آ کے عدنان کو دانستہ یکسر نظرانداز کرتے ہوئے مائرہ سے مسکرا کے کہا۔

"ہیلو، مائرہ! کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک۔ تم سناؤ کیسے ہو؟" مائرہ نے بھی جواباً اس کی طرف ایک دلنشین مسکراہٹ پھینک کے کہا تو شکیل نے ایک استہزائیہ نظر عدنان پر ڈالتے ہوئے مائرہ سے کہا۔

"ایک دم فرسٹ کلاس۔"

ادھر عدنان نے بھی شکیل کا ادھار چکاتے ہوئے اسے نظرانداز کیا اور مائرہ سے کہا۔

"مائرہ! میں اندر جا رہا ہوں اگر تم یہاں اپنا تھوڑا وقت ضائع کرنا چاہتی ہو تو بصد شوق..."

"ارے یار... کیوں اس بے چاری دکھی عورت سے سر کھپانے جا رہے ہو، وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔" اس بار شکیل نے عدنان کی طرف دیکھ کر طنز کر ہی ڈالا۔ جواباً

عدنان نے خشک لہجے میں کہا۔

"وہ پولیس والوں سے تو ضرور تنگ ہوسکتی ہے مگر ہم سے نہیں۔"

"کرلو پھر پورا اپنا شوق۔" شکیل نے کہا اور مائرہ کے سامنے بڑک مارنا بھی ضروری سمجھا۔ "ویسے تمہاری اطلاع کے لیے میں عرض کر دوں کہ "اسلم خان مرڈر کیس" سمیت ظہیر کے قتل کا کیس میں چٹکیوں میں حل کرنے والا ہوں۔" شکیل نے بے نیازی سے کہا۔ عدنان نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ مائرہ کو دیکھ کر اب شکیل کی شیخی بگھارنے والی رگ پھڑک چکی ہے لہٰذا مائرہ کا اب تھوڑی دیر اس کے ساتھ کھڑا ہونا بے حد ضروری ہوگیا تھا۔ تاہم وہ اس کی بات سے اندر سے کھٹک ضرور گیا تھا۔ اگرچہ عدنان کی عادت شکیل کی طرح مائرہ کے سامنے شیخی مارنے کی نہ تھی مگر اسے نیچا دکھانے کے لیے پیچھے وہ بھی نہیں ہٹتا تھا۔ لہٰذا وہ چند قدم چل کر شکیل کے قریب آیا اور اسرار بھری مسکراہٹ سے بولا۔

"اطلاعاً عرض کر دوں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے میں بھی نہیں بیٹھا ہوں۔ عنقریب میرے ٹی وی چینل سے آن ایئر جانے والی سنسنی خیز رپورٹ تمہارے پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی راہنمائی کر رہی ہوگی۔"

یہ کہہ کر عدنان گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پُریقین لہجے نے شکیل کو بھی اندر سے پریشان کر دیا۔ عدنان کا مائرہ کو شکیل کے پاس چھوڑ کے اس طرح آگے بڑھ جانے کا ایک مقصد تھا۔ مائرہ کو بھی وہ جانتا تھا جو اب اسے بڑی خوب صورتی سے کریدنے والی تھی۔ تاہم رقابت کا جذبہ اپنی جگہ مگر عدنان، شکیل کی ذہانت کا معترف بھی تھا۔ اس نے شکیل کے پُرجوش چہرے اور لہجے سے فوراً اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ "اسلم خان مرڈر کیس" کے سلسلے میں اس کے ہاتھ ضرور کوئی مضبوط سراغ آچکا ہے۔

"شکیل! اب تم پلیز عدنان کی باتوں کو دل پر نہیں لیا کرو، میں تم سے اس کی طرف سے ایکسکیوز کرتی ہوں۔" عدنان کے وہاں سے جاتے ہی مائرہ نے دل موہ لینے والی مسکراہٹ اس پر نچھاور کرتے ہوئے کہا تو شکیل کے جیسے سارے بند کھل گئے۔ وہ گویا چاروں شانے چت ہو کے بولا۔

"ارے نہیں، تم میری فکر نہ کرو۔ ایسی کوئی بات نہیں، میں عدنان جیسے لوگوں کو گھاس تک نہیں ڈالتا، نہ ہی ان کی باتوں کی پروا کرتا ہوں۔ ایسے لوگ محض اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں اور کچھ نہیں کر پاتے۔"

اس کی بات پر مائرہ نے بڑی چالاکی سے کہا۔ "مگر، اب ایسی بات بھی نہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ عدنان بھی اس کیس کو حل کرنے کے سلسلے میں بہت آگے تک جا چکا ہے اور کیا عدنان کی ذہانت جانچنے کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اس بات کا کھوج لگا چکا ہے کہ ظہیر کے قتل کا تعلق درحقیقت "اسلم خان مرڈر کیس" کی ہی ایک کڑی ہے۔"

مائرہ نے دانستہ اسے اکسانے کے لیے ایسا کہا تھا جس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ شکیل اس کی بات سن کر فوراً اپنا سینہ پھلا کر بولا۔

"لو... یہ بھی کوئی بات ہے جس سے تم متاثر ہونے لگی ہو۔"

"تو تم نے کون سا تیر مار لیا ہے؟ ویسے تم بھی تو کم ذہین نہیں ہو لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم بھی محض قیافوں کے سہارے ہی اتنا اترا رہے ہو۔" مائرہ نے منہ بنا کر کہا۔

شکیل کو بھی جوش آگیا۔ اس کا سینہ پھٹنے لگا وہ بولا۔

"اس میں شبہ نہیں کہ ظہیر کا قتل بھی اسلم مرڈر کیس کی ہی ایک کڑی ہے لیکن بہت جلد مقتول ظہیر کے تینوں دوستوں، جابر خان، طفیل احمد اور خضر حیات کو بھی قتل کی دھمکیاں ملنے والی ہیں اور یہ وہی وقت ہوگا جب میں اس پُراسرار قاتل کو ہتھکڑیاں پہنا دوں گا۔"

مائرہ کو یہ سن کر سخت مایوسی ہوئی کیونکہ یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔

مائرہ کی خود اب تک ذاتی رائے یہ تھی کہ عدنان اور شکیل دونوں ہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں یا اندھے تیر چلا رہے ہیں جبکہ خود اس کی اپنی ذاتی رائے بھی کہ اسلم اور ظہیر خان کو قتل کرنے والا ایک ہی شخص ہوسکتا تھا لیکن وہ کون تھا؟ اس کی کوئی اب تک گرد بھی نہ پا سکا تھا۔

بہرطور... مائرہ نے بے دلی کے ساتھ شکیل کو خدا حافظ کہا اور گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

اپنے مرحوم دوست ظہیر خان کی بیوہ زرینہ کی دلجوئی کے لیے یہ تینوں دوست اپنی اپنی فیملی کے ساتھ تقریباً روزانہ ہی وہاں آتے جاتے رہتے تھے تاکہ وہ خود کو تنہا محسوس نہ کرے۔

طفیل احمد، جابر خان اور خضر حیات کو اب گزرتے وقت کے ساتھ اپنا خوف بھی دامن گیر رہنے لگا تھا کہ وہ پُراسرار قاتل ان تینوں میں سے عنقریب کسی ایک کا انتخاب کرنے والا تھا اور بالآخر ایسا ہی ہوا۔

شام کے چھ بجے کا وقت تھا۔ جابر اپنے آفس سے گھر لوٹنے کی تیاری میں مصروف تھا کہ اس کے پرسنل فون کی گھنٹی بجی۔

باوردی ڈرائیور اس کا بریف کیس سنبھال چکا تھا۔

''تم چلو میں آتا ہوں۔'' جابر نے اپنے سرخ رنگ کے پرسنل ٹیلی فون سیٹ کی طرف دیکھ کر شوفر سے کہا اور پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کے ''ہیلو'' کہا۔

''جابر خان!''

دوسری طرف سے ایک گمبھیر آواز ابھری اور نہ جانے کیوں جابر خان کو اپنے وجود میں سرسراہٹ کا احساس ہوا۔

''میں تمہیں خط بھیجنے کی ضرورت اس لیے نہیں سمجھتا کہ تمہارے دوست ظہیر کو بھیجا گیا خط یقیناً تم تینوں نے بھی پڑھ لیا ہوگا... اب تم مجھے بتاؤ کہ میرے پچیس کروڑ کے ہیرے لوٹانے کا کام تم انجام دو گے یا پھر ظہیر کی طرح تمہیں بھی...'' دوسری طرف دانستہ تہدیدی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا گیا۔ جابر خان کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔

''مجھے جلدی جواب چاہیے... میرے دوبارہ فون کرنے پر مجھے تم صرف یہ بتاؤ گے کہ تم کب اور کہاں مجھے میرے وہ ہیرے لوٹاؤ گے۔''

''تت... تم کک.... کون ہو؟'' جابر نے حلق تر کرتے ہوئے پوچھا۔

''اب بھی اس فضول سوال کی ضرورت ہے؟'' دوسری طرف سے غراہٹ ابھری۔

''مم... مجھے... تمہاری بات منظور ہے۔''

بالآخر جابر نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔

''گڈ۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''دراصل... وہ... ہیرے ہم چاروں نے آپس میں بانٹ لیے تھے اور انہیں فروخت بھی کیا جا چکا ہے... ہاں، ایسا ہو سکتا ہے کہ اب ہم تینوں دوست مل کر تمہیں... تمہارے پچیس کروڑ کا چوتھا حصہ...''

''شٹ اَپ۔'' دوسری طرف سے بولنے والے نے اس کی بات غصیلے لہجے میں کاٹی۔

''مجھے ہر صورت میں پورے پچیس کروڑ کے ہیرے چاہئیں، بس۔'' اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

جابر کافی دیر تک خالی الذہنی کی حالت میں کھڑا رہا۔ اس کا پورا وجود مرتعش تھا۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنی عرق آلود پیشانی کو پونچھا۔ میز پر رکھے پانی سے بھرے گلاس کو اٹھا کر غٹاغٹ پورا گلاس خالی کر ڈالا۔ اس کے بعد وہ اپنی دگرگوں حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ گمنام فون کرنے والے کی زہرناک دھمکیوں کے الفاظ ہنوز اس کی سماعت میں گونج رہے تھے۔ ظہیر کا انجام اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگا۔ اس نے فوراً طفیل اور خضر سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

''میرا یہ حتمی فیصلہ ہے، ہمیں وہ ہیرے اس کے حوالے کرنا ہی ہوں گے... کیونکہ زندگی سے بڑھ کر کوئی شے قیمتی نہیں ہوتی۔'' جابر نے سراسیمہ لہجے میں ان دونوں کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔ طفیل اور خضر اس وقت اس کی رہائش گاہ کے ایک کمرے میں موجود اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان تھے۔

جابر نے ان دونوں کو اپنے ہاں پہنچتے ہی ساری بات بتا دی تھی۔ نیز یہ بھی کہ وہ جو کوئی بھی تھا، کسی بات پر بھی راضی نہیں ہو رہا تھا، سوائے اپنے مطالبے کے۔

طفیل اور خضر نے بہ غور جابر کی بات سنی اور ان دونوں ہی کے چہروں پر گہری تشویش کے آثار نمودار ہونے لگے۔

''ہمیں سنجیدگی سے اب کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔''

چند لمحے کی اعصاب شکن خاموشی کے بعد بالآخر طفیل نے کہا۔

''سوچنا کیا ہے؟ ہمیں اس کا مطالبہ اب ہر صورت ماننا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اپنی جانیں بچانے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔'' جابر نے کہا۔

''ریلیکس یار! ہمیں کچھ سوچنے تو دو۔'' اس بار خضر بولا۔

''ریلیکس؟'' جابر اسے گھور کے بولا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں آرام سے بیٹھ کر اپنی موت کا انتظار کروں؟ قاتل اب ظہیر کی جان لینے کے بعد میری جان کے درپے ہو رہا ہے اور تم مجھے ریلیکس ہونے کا مشورہ دے رہے ہو؟ بس... یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، ہمیں ہیرے اس کے حوالے کرنا ہی پڑیں گے۔''

''جابر!'' طفیل نے اس کی طرف گھور کے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر تم اتنے ہی بزدل تھے تو پھر اسلم خان کے قتل کے منصوبے میں کیوں ہمارے ساتھ شریک ہوئے

تھے؟''

پھراس سے پہلے کہ جواب میں جابر بھی طفیل کے ساتھ گرما گرم بحث میں الجھتا، خضر نے جابر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو جابر! ذرا سوچو، پچیس کروڑ کی رقم کوئی معمولی نہیں ہوتی۔ ہم نے ان ہیروں کو حاصل کرنے کے لیے اسلم کا مرڈر کر کے کتنا رسک لیا تھا۔ اب کیا ہم تھوڑا سا مزید رسک نہیں لے سکتے۔ سوچو ذرا... اب تو ظہیر بھی ہم میں نہیں رہا، اب صرف ہم تین باقی بچے ہیں اور... تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم تینوں ہی ایک عرصے سے مالی بحران کا بھی شکار ہیں۔ ہمیں اپنے اپنے کاروبار کو سنبھالا دینے کے لیے ایک خطیر سرمائے کی ضرورت ہے، ظہیر کا معاملہ دوسرا تھا۔ سچی بات کہوں تو اس وقت ہم نے اس مسئلے کو سنجیدہ نہیں لیا تھا مگر اب تو ہمیں عملی طور پر کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑے گا۔''

خضر کے سمجھانے پر پہلی بار جابر نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ایک عرصے سے انہیں مالی بحران نے پریشان کر رکھا تھا۔ طفیل کے ایما پر وہ اسلم خان سے ہیروں کی ایک بڑی ڈیل کرنے والے تھے کہ اس دوران ان کی نیتوں میں فتور آ گیا اور انہوں نے سونے کا انڈا دینے والی مرغی یعنی اسلم خان کا قتل کر کے یکمشت پچیس کروڑ کے ہیرے قبضے میں لے لیے تھے۔ اس کی ایک وجہ اسلم خان سے ہونے والی ڈیلنگ کی ناکامی بھی تھی اور انہیں سونے کی یہ چڑیا ہاتھوں سے اڑتی نظر آ رہی تھی۔

''خیر...'' جابر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''پھر بتاؤ آخر اس کا کیا حل ہے تمہارے پاس؟''

''ہم پولیس کو رپورٹ کر دیتے ہیں۔'' معاً طفیل نے رائے دی۔

خضر نے بھویں اچکا کر اس کی طرف دیکھا اور چڑ کر بولا۔ ''کیا پولیس کو ہم یہ بتائیں گے کہ وہ گمنام شخص ہم سے ہیرے واپس لینے کی خاطر ہمیں قتل کرنا چاہتا ہے؟''

''نہیں یار! میں نے یہ کب کہا؟'' طفیل زچ ہو کے بولا۔ ''میرا مطلب یہ تھا کہ ہم پولیس کو صرف اتنا ہی بتائیں گے کہ کوئی گمنام شخص ہمیں بلاوجہ موت کی دھمکی دے کر ہم سے منہ مانگی بھتا لینے کا مطالبہ کر رہا ہے اور مطالبہ نہ ماننے کی صورت میں ہمیں قتل کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔''

''مگر پولیس اس بات کا یقین نہیں کرے گی اور نہ ہی اس کیس میں زیادہ دلچسپی لے گی... زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ چند سپاہی ہمارے ہی خرچے پر تعینات کر دے گی مگر کب تک؟'' جابر نے کہا۔

''ویسے میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو طفیل!'' خضر نے البتہ پُرخیال لہجے میں اس کی تائید کی۔ ''کیونکہ آج کل ایسے واقعات بڑے بڑے صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ ہو رہے ہیں۔''

''مگر کچھ بھی ہو، پولیس اس گمنام قاتل کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی کیونکہ پُراسرار قاتل نے ہمارے خلاف جامع اور مربوط منصوبہ بنا رکھا ہے اور جو کچھ ہم اس وقت اپنے تحفظات کے بارے میں سوچ رہے ہیں، وہ بھی پہلے سے اس کے ذہن میں ہوں گے۔ اسی لیے ہمیں کوئی دوسرا حل سوچنا پڑے گا۔'' جابر نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''اور اس کا ایک ہی ٹھوس حل ہے کہ ہم ہیرے اس کے حوالے کر دیں۔ کیا تم بھول رہے ہو کہ اس کے پاس ہمارے خلاف ٹھوس ثبوت بھی ہیں؟''

''وہ یہ سفید جھوٹ بول رہا ہے تاکہ ہم پولیس سے مدد نہ لے سکیں۔'' خضر نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں، میں خود تمہیں اگر گمنام بلیک میلر کی حیثیت سے فون کر کے کہوں کہ پانچ کروڑ کی رقم لے کر فلاں جگہ پر آ جاؤ ورنہ تمہیں قتل کر ڈالوں گا تو کیا واقعی تم محض ایک گمنام ٹیلی فون کال پر اتنی بڑی خطیر رقم مجھے دینے کے لیے رضامند ہو جاؤ گے؟ اس طرح تو تم کنگال بن جاؤ گے۔''

''میں فوراً اس کی اطلاع پولیس کو دے دوں گا۔'' جابر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے... میں بھی تو یہی مشورہ دے رہا ہوں کہ ہمیں پولیس...''

''مم... مگر یار خضر! یہ اور معاملہ ہے۔ اس گمنام قاتل نے ہمارے ایک ساتھی کو قتل کر ڈالا ہے۔ پھر وہ ہمارے جرم سے بھی آگاہ ہے۔ ذرا سوچو، بہت فرق ہے دونوں باتوں میں۔''

''میرے ذہن میں ایک حل آ رہا ہے۔'' خضر نے کہا۔ دونوں بیک وقت اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے تکنے لگے۔

''ہمیں اس مسئلے کو بھی اس طرح نمٹانا ہوگا، بالکل اسی طرح جیسے ہم نے اسلم خان کو نمٹایا تھا۔''

''یعنی اس گمنام دشمن کو قتل کرنا ہوگا؟'' جابر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں۔''

''مگر کیسے؟''

''میں بتاتا ہوں۔'' خضر نے کہا۔ ''دیکھو، ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ جس طرح اسلم خان کے سلسلے میں ہم چاروں ایک فیصلہ کرنے پر مجبور اور متفق تھے، اسی طرح اس گمنام دشمن کے سلسلے میں بھی ہم ایک فیصلہ کرنے پر مجبور ہیں اور وہ ہے اس کا قتل۔ یعنی ہمیں اپنے تحفظ کے لیے خود ہی کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا پڑے گا۔'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر کہنے لگا۔

''تم ایک کام کرنا جابر! وہ یہ کہ اس گمنام قاتل کا یقیناً دوبارہ فون آئے گا، وہ تمہارا عندیہ لینے کی کوشش کرے گا۔ تم اس سے کہہ دینا کہ تم نے وہ ہیرے اس کے حوالے کرنے کا بالآخر حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ تمہیں جگہ بتائے گا جہاں وہ، یعنی ہمارا گمنام دشمن تم سے ہیرے وصول کرنے کے لیے آئے گا۔ میں اور طفیل اس کی تاک میں ہوں گے اور پھر اسے بڑی آسانی کے ساتھ دھوکا دے کر پکڑ لیں گے یا ادھر ہی ہلاک کر ڈالیں گے۔ اسلم خان کے بعد ایک قتل اور سہی۔'' خضر کی اس تجویز پر دونوں نے صاد کیا۔ کمرے میں اب گہری خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شکیل بے چینی سے منتظر تھا کہ دیکھیں اب اس گمنام قاتل کا فون ان تینوں دوستوں میں سے کس کو آتا ہے۔ اس لیے اس نے جاسوسی کے سارے آلات چوبیس گھنٹے آن رکھے ہوئے تھے مگر اب تک اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ شکیل نے صرف اس پر ہی تکیہ نہیں کیا تھا... کہ دھمکی دینے والا کیا ضروری تھا کہ ان تینوں دوستوں کی رہائش گاہ کے ٹیلی فون پر رابطہ کرتا، وہ فون ان کے دفتر میں بھی آ سکتا تھا اس لیے شکیل کو اتنی تو امید ضرور تھی کہ اگر ان تینوں میں سے کسی ایک کو بھی دھمکی آمیز فون کسی اور جگہ پر بھی موصول ہوگا تو وہ پہلے کی طرح دوسرے سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے ہنگامی طور پر میٹنگ ضرور کریں گے۔ اس طرح کچھ نہ کچھ اشارہ مل سکتا تھا۔ اس کے علاوہ شکیل نے اب جابر، طفیل اور خضر پر بھی کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ کیونکہ اتنا تو اس پر واضح ہو چکا تھا کہ اسلم خان مرڈر کیس میں مقتول ظہیر خان سمیت یہ تینوں مذکورہ افراد بھی کسی نہ کسی حوالے سے شریک جرم تھے اور اس انکشاف کے بعد شکیل نے یہ بھی سوچا تھا کہ ان کو فوراً اسلم خان کے قتل کے جرم میں حراست میں لے لے مگر یہ سوچ کر کہ ایک تو اس حوالے سے اس کے پاس ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا، دوسرے یہ کہ اس دوران ہی اس گمنام قاتل کا پُراسرار کردار بھی ابھر آیا تھا جو ان چاروں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا اور ان کے سارے رازوں سے واقف بھی تھا۔ وہ اب اُن کو گمنام قاتل سمیت گرفتار کرنا چاہتا تھا کیونکہ گمنام قاتل کو بھی بے نقاب کرنا ضروری تھا۔

کافی سوچ بچار کے بعد اچانک شکیل کے ذہن... میں ان چاروں کو بیک وقت بے نقاب کرنے کی ایک زبردست چال سوجھی۔ اس نے فوراً اس پر عمل کرنے کا ارادہ بھی کر لیا۔

☆☆☆

جابر کو اب اس گمنام قاتل کے دوسرے فون کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اس فون کے ذریعے اس نے اسے یہ بتانا تھا کہ ہیرے کب اور کہاں پہنچانے تھے۔ مگر درپردہ ان کا منصوبہ کچھ اور تھا۔

اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے اور وہ اپنے دفتر میں موجود تھا اور بار بار مضطربانہ انداز میں کبھی اپنی نشِ

صفائی

بھینگے باؤلر نے امپائر کی طرف دیکھا اور چیخ کر اپیل کی۔ ''ہاؤزیٹ۔''

''ناٹ آؤٹ۔'' لیگ امپائر نے جواب دیا۔

باؤلر لیگ امپائر کی طرف مڑا۔ ''میں آپ سے بات نہیں کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''بھائی... میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ہے۔'' تھرڈ مین نے صفائی پیش کی۔

ووٹ

الیکشن میں ایک امیدوار کو صرف تین ووٹ ملے اس کی بیوی نے نتیجہ سنا تو رونے لگی اور کہنے لگی۔

''میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ تم کسی اور سے بھی عشق کرتے ہو اب تو ثبوت بھی مل گیا ہے۔ میرے اور تمہارے دو ووٹوں کے علاوہ تیسرا ووٹ اسی کلموہی کا ہو سکتا ہے۔''

حافظ آباد سے ماہا ایمان کا واویلا

قیمت رسٹ واچ کو دیکھتا تو کبھی میز پر رکھے ٹیلی فون سیٹ پر نظر ڈالتا۔ درحقیقت وہ چاہتا تھا کہ بارہ بجے سے پہلے... اس گمنام قاتل کا فون آجائے تاکہ وہ بارہ بجے ہونے والی اپنی ایک اہم بزنس میٹنگ بھی نمٹا لے۔

اتنے میں چائے آگئی، وہ چائے پینے لگا۔ چائے ختم کرنے کے ایک دو منٹ بعد ہی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو۔''

وہ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''چائے ختم کرلی تم نے مسٹر جابر؟''

دوسری جانب سے اسی گمنام شخص کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری اور جابر یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔

''ہا... ہاں... ہاں...!'' جابر کے منہ سے بے اختیار کپکپاتے الفاظ برآمد ہوئے۔ ''مم... مگر... تت... تم...''

''دیکھ لو... میں تمہارے کس قدر قریب ہوں... آخر کو روح ہوں... بے چین روح... اور روح تو کہیں بھی ہوسکتی ہے، ہیں نا...'' دوسری جانب سے سرسراتی آواز ابھری جس میں طنز کی گہری کاٹ بھی شامل تھی۔ جابر کو ایکا ایکی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں موت کی سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔ مارے دہشت کے اس سے مزید بولا بھی نہیں جارہا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اچانک دوسری جانب سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔ جابر سناٹے میں آگیا۔ اسے تشویش ہورہی تھی کہ آخر اس گمنام قاتل کو کیسے معلوم ہوا کہ اس نے ابھی ابھی چائے ختم کی تھی اور پھر اس نے ہیروں کی واپسی سے متعلق کچھ کہے سنے بغیر خود ہی رابطہ منقطع کردیا۔ کیوں...؟

اچانک اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ اپنی گردن پر رکھ لیے، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ سانسوں کی ڈور ٹوٹنے لگی، تب اچانک اس نے ایک ہچکی لی اور اس کا سر ٹیبل پر ڈھلک گیا۔ اس کی بے جان آنکھیں کھلی رہ گئیں اور سامنے چائے کا خالی کپ رکھا تھا۔ پتا نہیں آخری ہچکی لینے سے پہلے وہ یہ بات سمجھ بھی پایا تھا کہ نہیں کہ اس کی چائے میں انتہائی مہلک زہر شامل کردیا گیا تھا۔

☆☆☆

مائرہ کو محسوس ہونے لگا تھا کہ عدنان کے مقابلے میں شکیل، اسلم خان مرڈر کیس سمیت ظہیر خان کے قتل کی تہ تک پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ اس نے کچھ دن شکیل کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ وہ اس سے ملنے کے لیے جانے لگی۔ شکیل کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ تھی ہی اس کی منظورِ نظر... اور اس طرح وہ اس کی نظر کے سامنے بھی ہوتی پھر جب ایک روز اس نے شکیل سے دانستہ اپنے ان خیالات کا اظہار کیا کہ عدنان اس مشکل کیس کے سلسلے میں اب تک کچھ نہیں کر پایا ہے جبکہ وہ اس پر خوامخواہ ہی اپنی قابلیت کا رعب جھاڑتا رہتا ہے تو یہ سن کر شکیل کا سینہ فخر سے اور بھی پھول گیا۔ وہ اسے ایک روز اپنے اپارٹمنٹ لے گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہی وقت ہے مائرہ کو متاثر کرنے اور اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کا۔ چنانچہ اس نے مائرہ کو اپنا خفیہ روم دکھا دیا جس میں جاسوسی کے آلات نصب تھے اور مائرہ کو اس نے ریکارڈ شدہ وہ کیسٹ بھی سنادی جس میں اس گمنام قاتل کی ظہیر خان کے ساتھ دھمکی آمیز گفتگو بھی شامل تھی۔ مائرہ کو یہ نئی بات معلوم ہوئی تھی کہ ان تینوں دوستوں کو کوئی گمنام شخص ہیرے حاصل کرنے کے لیے بلیک میل کررہا تھا اور ظہیر خان کو بھی اس نے ہی قتل کیا تھا۔ مائرہ نے اس گمنام شخص کی ریکارڈ شدہ گفتگو کئی بار سنی، اسے صاف لگا کہ بولنے والا اپنی آواز بدل کر بولنے کی کوشش کررہا تھا۔

''تم دیکھنا مائرہ کہ میں بہت جلد نہ صرف اس پُراسرار قاتل کو پکڑ لوں گا بلکہ اسلم خان مرڈر کیس بھی چٹکی بجاتے ہی حل کر ڈالوں گا۔'' مائرہ کو متاثر ہوتے دیکھ کر شکیل نے فخر کے ساتھ کہا۔

مائرہ نے اس کی ستائش کرنے کے بعد چالاکی سے پوچھا۔ ''کیا تمہارے ذہن میں کوئی ایسا مربوط لائحہ عمل ہے؟''

''ہاں، ہے تو سہی۔'' شکیل نے کہا۔ ''مگر ابھی میں مزید چند باتوں کا کھوج لگانا چاہتا ہوں۔'' اس کی بات سن کر مائرہ نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کی لیکن اسے شبہ ہونے لگا تھا کہ عدنان ہی نہیں شکیل بھی اصل قاتل کو بے نقاب کرنے کے سلسلے میں ابھی کوسوں دور ہی ہے۔

☆☆☆

جابر خان کی اچانک موت بھی معما بن گئی......
پولیس نے ضابطے کی کارروائی نمٹائی اور پھر تفتیش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کردیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے موت کی وجہ ثابت ہوچکی تھی جس کے مطابق جابر کی ہلاکت زہر خورانی سے ہوئی تھی اور اس کی میز پر چائے کا جو خالی

کپ پایا گیا تھا، اس میں زہر کی ملاوٹ کی بھی تصدیق لیبارٹری نے کردی تھی۔

انسپکٹر شکیل بُری طرح الجھ کر رہ گیا۔ وہ کبھی ایک لائحہ عمل تیار کرتا تو اس کے فوراً بعد ہی اسے رد کرکے دوسرا تیار کرنے لگتا مگر مطمئن پھر بھی نہیں ہورہا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے ہر بار کوئی نہ کوئی اہم بات واضح ہوتے ہوتے رہ جاتی تھی۔

ایک روز وہ بڑی بے دلی کے ساتھ اپنے خفیہ کمرے میں کانوں پر ہیڈفون چڑھائے بیٹھا تھا کہ اچانک مواصلاتی شور کے درمیان اسے وہی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ اس نے فوراً وائس ایڈجسٹمنٹ کے ذریعے شور کو کم کرکے آواز کو واضح کیا اور بہ غور سننے لگا۔

''خضر! میرا اگلا شکار تم ہو... نہیں... بولنا کچھ نہیں ہے، صرف اتنا بتادو کہ کیا تم ظہیر خان اور جابر خان کی طرح میرا مطالبہ ٹھکراؤ گے یا پھر...''

''مم... مجھے... تمہارا ہر مطالبہ منظور ہے۔''

''گڈ! گویا تمہیں عبرت حاصل ہوگئی؟'' گمنام قاتل پھنکارا۔

''ہاں... ہاں... بہت اچھی طرح... مم... میں مرنا نہیں چاہتا۔'' خضر پر ابھی تک خوف سوار تھا۔

''غور سے سنو... پرانے قبرستان میں جہاں کیکر کے درختوں کے جھنڈ میں ایک پرانی باؤلی نظر آتی ہے، تم ہیرے لے کر ادھر آجانا... میری آنکھیں تمہیں دیکھ رہی ہوں گی۔'' وہ اسے سمجھانے لگا پھر آخر میں متنبہ کرکے بولا۔ ''مجھے اگر ذرا بھی شبہ ہوا کہ تم بھی ظہیر خان اور جابر خان کی طرح کسی قسم کی چالاکی کرنے کی کوشش کررہے ہو تو یاد رکھنا، وہیں پرانے قبرستان میں ایک قبر کا اور اضافہ ہوجائے گا۔''

''مم... میں آجاؤں گا... مگر مجھے کب آنا ہوگا؟'' خضر نے کپکپاتے لہجے میں پوچھا۔

''آج رات ٹھیک ایک بجے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور رابطہ منقطع کردیا گیا۔

شکیل کے چہرے پر یکایک جوش کی تند لہر اُمڈ آئی، اب اسے کچھ بلکہ بہت کچھ کرنے کا موقع ہاتھ آیا جس کا وہ کب سے منتظر تھا۔ آج رات ٹھیک ایک بجے وہ بھی پرانے قبرستان جانے کا پختہ ارادہ کرچکا تھا اسے پوری امید تھی کہ آج رات اس پُراسرار ڈرامے کا ڈراپ سین ہوجائے گا۔

☆☆☆

خضر نے اس گمنام قاتل اور بلیک میلر کو پکڑنے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا، وہ جابر کے قبل از وقت قتل ہوجانے کے باعث بُری طرح ناکامی سے دوچار ہوگیا تھا۔ وہ اب بھی اپنے اس منصوبے پر قائم تھا تاہم وہ خوف زدہ بھی تھا۔ دشمن بہت زیادہ ہوشیار، چالاک اور اس سے زیادہ سفاک بھی تھا۔ وہ ذرا سا بھی شبہ کرتا تو پھر شکار کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر اسے ہلاک کر ڈالتا تھا۔ مگر بہ قول طفیل کے، اس میں خود ان کی اپنی ہی بے وقوفی کا دخل ہوتا تھا وہ اس طرح کہ ظہیر اور جابر نے گمنام دشمن کے مطالبے پر لیت ولعل سے کام لیا تھا اور پھر ایک دم اس کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ جس سے وہ بھانپ گیا تھا کہ اب ان چاروں نے ضرور اس کے خلاف کوئی مشترکہ چال بچھانے کی تیاری مکمل کرلی ہے۔

''مگر اس بار ایسا نہیں ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے عقل مندی سے کام لے کر اس کی آنے والی پہلی ہی ٹیلی فون کال پر خوف زدہ ہوکر اس کا مطالبہ تسلیم کرلیا جس سے اسے یہ تو اندازہ ہو ہی گیا ہے کہ ہم اب اپنے دو ساتھیوں کے قتل کے بعد یقیناً اس سے ازحد خوف زدہ ہوچکے ہیں اور اب ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہیں آرہا کہ اپنی جان کو پچیس کروڑ کے ہیروں سے زیادہ فوقیت دے کر اس کا مطالبہ مان لیں۔'' طفیل نے تبصرہ کرتے ہوئے خضر سے کہا۔ پھر اسے اپنا منصوبہ سمجھاتے ہوئے آگے بولا۔

''یہ بہت اچھا موقع ہے۔ میں تمہیں ایک مخمل کی تھیلی دوں گا اور پھر تمہارے پیچھے آجاؤں گا۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول ہوگا۔ تم بھی اپنے پاس بھرا ہوا پستول رکھو گے۔ آج رات اس مردود ''بے چین روح'' کا خاتمہ کرکے اس کی ہمیشہ کے لیے ساری بے چینیاں ختم کردیں گے۔''

خضر نے بھی کچھ حوصلہ پکڑا، قدرے جوش سے بولا۔ ''اس سے پہلے بھی ہیرے ہم نے اپنی جان پر کھیل کر حاصل کیے تھے، اب اس کی خاطر دوبارہ اپنی جان پر کھیلیں گے۔ دیکھو نا یار طفیل! اگر ہم پچیس کروڑ کے ہیروں سے ہاتھ دھو بیٹھے تو اپنے گرتے ہوئے کاروبار کو کس طرح سہارا دیں گے؟ ہم تو فٹ پاتھ پر آجائیں گے۔''

''شاباش! اس لیے ہمت باندھو۔'' طفیل نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ''اور پھر ایک اور بات بھی تو سوچو خضر!'' طفیل نے آخر میں معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اب ہم صرف دو حصے دار ہیں۔ ان پچیس کروڑ ہیروں کے۔''

''ہاں، اس بات نے بھی میرے اندر مقابلہ کرنے کی جوت جگائی ہے۔'' خضر بھی جواباً مسکرا کے بولا۔

"جوڈر گیا؟" طفیل نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کے پوچھنے کے انداز میں کہا۔

"وہ مر گیا۔" اس کا اشارہ سمجھ کے جواباً خضر نے بھی پُرجوش مسکراہٹ کے ساتھ اس کا جملہ مکمل کیا۔

☆☆☆

پرویز کے ذریعے اسلم خان مرڈر کیس سے متعلق جو سرا عدنان کے ہاتھ لگا تھا، اسے تھام کر عدنان پہلے تو ہواؤں میں اڑنے لگا تھا اور یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اب یہ کیس حل ہوا ہی چاہتا ہے مگر ظہیر کے بعد جابر کے قتل سے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ نیا معاملہ کیا ہے؟

ادھر جب مائرہ نے شکیل سے حاصل ہونے والی معلومات کے متعلق عدنان کو بتایا تو وہ لامحالہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اسلم خان مرڈر کیس اور ان چاروں دوستوں (جو اب دو رہ گئے تھے) کو کسی گمنام شخص کی طرف سے دھمکیاں ملنے والا سلسلہ اصل میں ایک ہی کڑی ہے۔ وہ مزید الجھ کر رہ گیا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے عدنان کہ ان چاروں شکاریوں کے علاوہ کوئی پانچواں شخص بھی ہے جو اس خونی واردات سے نہ صرف اچھی طرح واقف تھا بلکہ ان کا شریک جرم بھی تھا۔" مائرہ نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے کسی تنازعے کے باعث ان چاروں نے اپنے اس پانچویں دوست کو ہیروں کی حصے داری سے محروم کردیا ہو اور اب وہ انتقامی کارروائی پر اتر آیا ہو۔"

"ایسا ہوسکتا ہے۔" عدنان نے عام سے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"مثلاً؟" مائرہ نے اس کی طرف دیکھا۔

عدنان پُرسوچ لہجے میں بتانے لگا۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ... وہ پچیس کروڑ کے ہیرے اب ہیں کہاں؟ ان چاروں دوستوں میں سے کسی ایک کے پاس امانتاً رکھے ہوئے ہیں یا پھر...؟"

اچانک مائرہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "یا پھر فروخت کردیے گئے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" عدنان نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہیرے فروخت کردیے گئے ہوتے تو وہ گمنام قاتل بار بار ان سے ہیروں کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتا۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ جانتا ہے کہ ہیرے انہی چاروں کے پاس ہیں؟" مائرہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اور وہ کوئی پانچواں ساتھی نہیں ہے بلکہ انہی چاروں میں سے ایک ہے۔"

"کیا؟" مائرہ چونکے بنا نہ رہ سکی۔

"ہاں، میرا یہی خیال ہے۔"

"مگر اب یہ کیسے پتا چلایا جائے کہ طفیل اور خضر میں سے کون مجرم ہے؟" مائرہ نے پوچھا۔

"جس کے پاس پچیس کروڑ کے ہیرے ہیں، وہی مجرم ہے۔" عدنان نے کہا۔

"کیا خبر دونوں کے پاس ہوں یا پھر چاروں نے آپس میں مساوی تقسیم کرلیے ہوں۔" مائرہ نے کہا۔

"یہ جاننے کے لیے ہمیں ایک خفیہ مہم سر کرنا پڑے گی۔" عدنان نے اسرار بھرے لہجے میں کہا۔

"خفیہ مہم؟" مائرہ نے پوچھا۔

"ہاں، خفیہ مہم!" عدنان نے گہرے اور پُرسوچ لہجے میں کہا پھر اسے بتانے لگا۔

☆☆☆

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

رات کی پُرہول تاریکی میں ایک نئے ماڈل کی چمکتی ہوئی کار پختہ سڑک پر دوڑتی ہوئی بالآخر پرانے قبرستان کے کچے اور قدرے نشیبی راستے میں اتر گئی اور پھر کچھ فاصلہ طے کرتی ہوئی قبرستان کے ٹوٹے ہوئے گیٹ پر رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر خضر براجمان تھا جبکہ برابر والی سیٹ پر طفیل موجود تھا۔

"سوئچ آف کردو اور ہیڈ لائٹس بھی بند کردو۔"

طفیل نے سرسراتی سرگوشی میں خضر سے کہا، پھر اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ایک بجنے میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔

"اب تم اترو اور آگے بڑھ جاؤ۔ میں تمہارے عقب میں آرہا ہوں۔" طفیل نے اسے مشورہ دیا۔

اس کی بات سن کر خضر نے اپنی جیب ٹٹول کر ریوالور کی موجودگی کا اطمینان کیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر قبرستان کے شکستہ گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹارچ تھی۔ گاڑی کے اندر بیٹھا ہوا طفیل، خضر کو قبرستان کے آسیبی اور پُرہیبت ماحول میں داخل ہوتے دیکھتا رہا پھر جیسے ہی خضر نظروں سے اوجھل ہوا تو وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ آسمان پر آخری راتوں کا چاند نکلا ہوا تھا۔ تارے چمک رہے تھے۔ پھر وہ خود بھی مدھم روشنی کے سہارے قبرستان کی طرف بڑھنے لگا مگر وہ شکستہ گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بجائے ٹوٹی ہوئی دیوار کے متوازی آگے بڑھ رہا تھا۔

ادھر خضر نے طفیل کی ہدایت کے مطابق اپنی جیب سے مخملی تھیلی نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ اب وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ٹوٹی ہوئی قبروں کے بیچ بنے ٹیڑھے میڑھے، کچے راستے پر آگے بڑھا چلا جارہا تھا۔

خضر کو ڈر تھا کہ اگر اس گمنام قاتل نے اسے قتل کر ڈالا تو کیا ہوگا؟ مگر اسے طفیل نے تسلی دی تھی کہ وہ ایسا نہیں کرے گا کیونکہ تم نے اس کا مطالبہ فوراً تسلیم کرلیا ہے۔ اسے صرف اپنے ہیروں سے غرض ہوگی۔ یہ سوچ کر اس کی ہمت بڑھی۔ یوں بھی اس کی جیب میں موجود پستول کے باعث اسے حوصلہ تھا۔

قبرستان کے پرہیبت ماحول میں اس نے بڑی مشکلوں سے اپنے اعصاب پر قابو پا رکھا تھا۔ اسی طرح چلتے ہوئے تھوڑی دیر بعد ہی وہ جنوبی دیوار کے قریب پہنچ کر رکا تو اسے چند قدموں کے فاصلے پر کیکر کے جھنڈ کے قریب ایک پرانے کنوئیں کی شکستہ منڈیر بھی دکھائی دی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہی وہ پرانی باؤلی تھی جس کے قریب پہنچنے کا اس گمنام قاتل نے حکم دے رکھا تھا۔

اچانک اس کی نظر سامنے پرانی باؤلی کے قریب ایک پیڑ کے عقب سے نمودار ہوتے ہوئے ایک سائے پر پڑی۔ اس کا دل یکبارگی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔ وہ قدرے ٹھٹک کر بہ غور اس پُراسرار سائے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ سایہ موٹی سی سیاہ چادر میں تاریکی کا ہی حصہ معلوم ہوتا تھا جو دھیرے دھیرے اس کے قریب آرہا تھا۔ خضر اپنی..... کیفیات پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ جان تو گیا تھا کہ یہی وہ گمنام قاتل ہے جس نے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اب اس پر دھیرے دھیرے خوف کی کیفیت ماند پڑ رہی تھی اور اس کی جگہ حیرت انگیز طور پر ایک جارحانہ سا جوش غالب آتا جارہا تھا۔ وہ اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا تاکہ نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے پستول نکال کر اس کا ادھر ہی کام تمام کر ڈالے مگر جب اس نے دیکھا کہ چادر پوش سائے کے ہاتھ میں بھی ایک خوفناک پستول موجود ہے تو وہ پریشان ہوگیا۔ تاہم اسے یہ تو اطمینان تھا ہی کہ منصوبے کے مطابق طفیل اس کے آس پاس ہی ہوگا اور وہ چھپ کے ان پر محتاط نظر رکھے ہوئے ہوگا۔ وہ کسی وقت بھی اپنے پستول سے اس گمنام قاتل کے جسم میں گولی اتار دے گا۔

"ہیرے لائے ہو؟" چادر پوش نے پستول کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے غراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں، یہ لو۔" خضر حیات نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مخملی سی پوٹلی اس کے سامنے کردی۔ ساتھ ہی وہ چادر پوش کا چہرہ دیکھنے کی کوشش بھی کرنے لگا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔

"ہیروں کی یہ پوٹلی زمین پر رکھ دو اور اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کرکے دوسری طرف منہ پھیر لو۔" چادر پوش نے تحکمانہ کہا۔

خضر نے لرزیدہ ہاتھوں سے جھک کر پوٹلی زمین پر رکھ دی اور اپنے دونوں ہاتھ بلند کرکے دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑا ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ اب کسی وقت بھی طفیل، اس چادر پوش کو اپنے پستول کی گولی سے بہ آسانی نشانہ بنا سکتا ہے۔ شکار اتنا آسان ثابت ہوگا، یہ خضر نے سوچا بھی نہیں تھا اور اس کی تھمی ہوئی دم بہ خود سماعتیں کسی بھی لمحے گولی چلنے کے دھماکے کی منتظر تھیں اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ اس گمنام قاتل کو زمین پر تڑپتا دیکھ رہا ہوگا، لیکن خضر حیات کی یہ خوش فہمی اس وقت تشویشناک پریشانی اور خوف میں بدل گئی جب کافی وقت گزرنے کے باوجود نہ گولی چلنے کا دھماکا ہوا، نہ اس نے گمنام قاتل، سیاہ پوش کی چیخ سنی۔ اب اسے اپنی فکر لاحق ہوئی کیونکہ پوٹلی میں اصلی ہیرے نہیں تھے۔ لہٰذا سفاک... قاتل کسی وقت بھی وہ پوٹلی اٹھا کر اس کے اندر ہیروں کے بجائے محض کانچ کے ٹکڑے دیکھ کر یک دم چراغ پا ہوکے اسے نشانہ بنا سکتا تھا۔ وہ سوچتا رہ گیا کہ طفیل نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا یا پھر خود اس کے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آگیا تھا؟ آخر وہ کہاں رہ گیا تھا؟ کیا نہیں جانتا تھا کہ میں کس قدر شدید خطرے کی زد میں ہوں؟ خضر دوسری طرف منہ کیے ہونٹ بھینچے یہی سوچنے لگا۔ اسے اب اپنی موت صاف اور چند لمحے کے فاصلے پر محسوس ہورہی تھی۔ وہ پراسرار سفاک قاتل، کسی بھی وقت اسے مشتعل ہوکے گولی مارنے والا تھا۔ طفیل کی متوقع مداخلت سے اب وہ قطعاً مایوس ہوچکا تھا۔

اب اسے اپنی جان بچانے کے لیے خود ہی کچھ کرنا تھا۔ اتنی آسانی سے وہ خود کو اس..... سفاک قاتل کے ہاتھوں مرنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ موت سر پر منڈلا رہی تھی۔ تب پھر اس پر داؤ پر لگی زندگی بچانے کا جذبہ اس قدر شدت کے ساتھ غالب آیا کہ اس نے پل کے پل ایک جارحانہ مگر

خطرناک فیصلہ کیا اور پھر تیزی کے ساتھ جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پستول نکال کے گمنام قاتل کی جانب گھوما اور اس سے پہلے کہ وہ اس پر گولی چلاتا، اچانک رات کے سناٹے میں گولی چلنے کی آواز ابھری اور ساتھ ہی خضر کے حلق سے بھیانک چیخ خارج ہوئی۔ اس کے پستول والا ہاتھ لہولہان ہو گیا تھا اور پستول ہاتھ سے نکل کر دور تاریکی میں جا گرا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سیاہ پوش کی حرکت تھی مگر ادھر سیاہ پوش خود بھی گولی چلنے پر بری طرح چونکا تھا۔ وہ دونوں ہکا بکا سے رہ گئے جبکہ خضر کو یقین تھا کہ گولی سیاہ پوش نے ہی چلائی تھی۔

ٹھیک اسی لمحے ایک غراتی ہوئی تیز آواز ابھری۔

''مسٹر سیاہ پوش! اپنا پستول پھینک دو، تم ہمارے نشانے پر ہو، ورنہ...''

مجبوراً سیاہ پوش کو اپنا پستول زمین پر پھینکنا پڑا۔ تب پھر اچانک ایک تاریک گوشے سے دو افراد طفیل کو گن پوائنٹ پر لیے نمودار ہوئے۔ خضر پھٹی پھٹی نظروں سے طفیل اور کبھی ان دونوں افراد کی طرف دیکھنے لگا جنہوں نے طفیل کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ یہ دونوں عدنان اور مائرہ تھے۔ مائرہ کے پستول کا رخ البتہ سیاہ پوش کی طرف تھا۔

''چادر اتار دو اپنی، مسٹر سیاہ پوش! ورنہ گولی مار دوں گا۔''

عدنان نے درشتی سے کہا۔ بالآخر چادر پوش نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور پھر جیسے ہی اس نے اپنی چادر اتار کر پھینکی تو عدنان اور مائرہ بُری طرح چونک اٹھے...... انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسے دیکھ رہے ہیں۔

''تم...؟'' عدنان اور مائرہ کے منہ سے بے اختیار اور بیک وقت نکلا۔ ان کے سامنے خفیہ پولیس کا انسپکٹر شکیل کھڑا تھا۔

طفیل اور خضر... بھی اسے دیکھ کر بری طرح چونکے تھے اور اب خاصے پریشان بھی نظر آ رہے تھے۔

''کیا میں اپنا سروس پستول اُٹھا لوں؟'' شکیل نے ان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر تم یہاں کیسے؟'' مائرہ نے متحیر لہجے میں کہا۔

''ٹیک اٹ ایزی۔'' شکیل نے مسکرا کر کہا۔ ''سب معلوم ہو جائے گا۔ ابھی اصل مجرم پردے میں ہے مگر وہ یہاں پہنچنے والا ہے اور ہمیں اس کی تاک میں بیٹھنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے جھک کر اپنا پستول اٹھا لیا۔ عدنان تذبذب کا شکار تھا، مائرہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔

شکیل نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور پھر انہیں ادھر ہی ٹھہرنے کا کہا اور پلٹ کر تاریکی میں گم ہو گیا پھر ذرا دیر بعد ہی واپس لوٹا اور بولا۔

''شاید اسے آنے میں کچھ دیر ہو گئی ہے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وہ آئے گا ضرور۔''

''آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ ہمیں بھی تو بتاؤ؟'' عدنان نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''سب بتا دوں گا، ابھی وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ ورنہ اصل مجرم نکل جائے گا۔'' شکیل نے گہری متانت سے کہا۔ پھر خضر حیات سے درشت لہجے میں بولا۔ ''تم ادھر ہی کھڑے رہنا، اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔''

یہ حکم دینے کے بعد شکیل نے پوٹلی کے اندر سے کانچ کے ٹکڑے نکال کر اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ان کا جائزہ لیا، اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی پھر انہیں واپس پوٹلی میں ڈال دیا۔

عدنان نے اپنا احسان جتانے کی غرض سے شکیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

''شکر کرو ہم بروقت یہاں پہنچ گئے ورنہ طفیل تمہیں گولی مارنے والا تھا۔''

''ہاں، شاید۔'' شکیل نے ہولے سے کہا اور اس کا شکریہ ادا کیا پھر بولا۔

''اب جلدی سے تم لوگ چھپ جاؤ، اصل مجرم کسی وقت بھی یہاں پہنچنے والا ہے۔''

''مگر ان دونوں نے تمہیں بھی دھوکے سے مارنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ یہ تمہیں اپنا وہی گمنام دشمن سمجھ رہے تھے، جس نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ آخر تم نے یہ خطرناک قدم کیوں اٹھایا؟ مجرم کا بھیس بھرنے کی تمہیں کیا ضرورت تھی؟'' عدنان کے لہجے میں تفکر بھی تھا اور استفسار بھی۔ بے شک وہ ایک دوسرے کو کم ہی سہتے تھے مگر جہاں ایک نیک مقصد اور مشن کی بات ہوتی تو وہ دونوں ایسے نازک مراحل میں ذاتی چپقلش فراموش کر دیتے تھے۔

شکیل نے مسکرا کے کہا۔ ''بس تھوڑا انتظار اور کر لو۔ میرا وعدہ ہے، کچھ نہیں چھپاؤں گا تم دونوں سے۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''مگر تم دونوں اچانک یہاں کیسے آ گئے؟ اور یہ طفیل؟''

عدنان ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''اگر تم نے ہم سے کچھ نہ چھپانے کا وعدہ کر ہی لیا ہے تو ہماری بھی سن لو۔ ہمیں خضر اور طفیل پر ''اسلم مرڈر کیس'' کے سلسلے میں شبہ تھا

اور یوں میں نے اور مائرہ نے ان دونوں کی کڑی نگرانی شروع کر دی تھی۔ اس وقت بھی جب یہ دونوں اپنی کار میں سوار ہو کے کہیں جانے کے لیے نکلے تو ہم ان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے۔ کیونکہ یہ بات ہمیں معلوم ہو چکی تھی کہ ہیروں کے لیے ان چاروں کے پیچھے ان کا کوئی پراسرار اور گمنام دشمن بھی پڑ چکا ہے۔''

عدنان نے دانستہ یہ ذکر گول کر دیا تھا کہ خود شکیل نے ہی مائرہ کے سامنے یہ بات اگلی تھی۔

''مگر تمہیں ان دونوں پر شبہ کیسے ہوا؟'' شکیل نے بالآخر وہ سوال کر ہی ڈالا جس کی عدنان کو توقع تھی مگر عدنان بھی جواب سوچ چکا تھا، جواباً اس نے ہوٹل ریڈ کارپٹ کے ہیڈ ویٹر پرویز کا ذکر کر دیا اور اس سے حاصل ہونے والی نئی معلومات کے بارے میں بھی بتا دیا۔

ان لوگوں کی آپس کی گفتگو سے خضر حیات اور طفیل از حد پریشان اور متفکر نظر آنے لگے تھے۔ ان کے تو سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کا بھیانک جرم بے نقاب ہو چکا ہے۔ اس بات پر وہ تشویش زدہ تھے۔ شکیل اور عدنان نے ان کی بے چینی کو بھانپ لیا تھا اور یہی سبب تھا کہ وہ ان دونوں سے ایک لمحے کو بھی غافل نہیں ہوئے تھے۔ تاہم طفیل کی جامہ تلاشی لے کر شکیل نے اپنی جیب سے نائیلون کی ایک مضبوط ڈوری نکال کر اسے اچھی طرح سے باندھ دیا تھا۔ البتہ اس کی تلاشی کے دوران اس کے پاس سے ایک پستول برآمد ہوا تھا جسے اس نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

''اس کا کیا کریں؟'' عدنان نے خضر کی طرف دیکھ کر شکیل سے پوچھا۔

''اسے چارے کے طور پر استعمال کرنا پڑے گا۔'' شکیل نے اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ پھر پوٹلی میں سے کانچ کے ٹکڑے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ان کا جائزہ لیا اور عدنان اور مائرہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یہ دونوں بھی اس گمنام پراسرار قاتل کو دھوکے سے ہلاک کرنے کی نیت سے ہی یہاں آئے تھے۔ اس نے ان سے پچیس کروڑ کے ہیروں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا اور یہ اسے ٹریپ کرنے کے لیے ہیروں کے بجائے کانچ کے یہ معمولی ٹکڑے لے کر یہاں پہنچے ہیں۔''

''عدنان! تم ایسا کرو کہ تم، مائرہ اور طفیل کو لے جا کر تاریک جھاڑیوں میں چھپ جاؤ۔''

یہ کہہ کر شکیل، خضر سے تحکمانہ درشتی سے بولا۔ ''اب تم

اپنا وہی کھیل جاری رکھو گے... اور یاد رکھنا، میری خاص طور پر تم پر نظر ہوگی۔ اگر ذرا سی بھی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو بے موت مارے جاؤ گے، سمجھے تم؟" یہ کہہ کر شکیل نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کانچ کے ٹکڑوں سے بھری پوٹلی خضر کو..... تھما دی۔ پھر شکیل خود بھی پستول سنبھالتا ہوا جھاڑیوں میں جا دبکا۔

پرانی باؤلی کے قریب اب صرف خضر کھڑا رہ گیا تھا۔

فضا ساکت تھی۔ ماحول پر آسیبی سناٹا طاری تھا۔

اچانک ایک سایہ ٹوٹی ہوئی دیوار سے اندر داخل ہوا۔ وہ خاصا عجلت میں تھا۔ پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا پرانی باؤلی کے قریب آ کر رک گیا۔

ایک تاریک گوشے میں چھپے ان سب کی نظریں اس سائے پر جمی ہوئی تھیں۔ دیکھنے والی آنکھوں کو سنسنی خیزی لیے ہوئے اس بات کا پورا اندازہ ہو چکا تھا کہ اب وہ ذرا ہی دیر بعد اس گمنام قاتل کو بے نقاب کرنے والے ہیں جس نے بڑی ہوشیاری اور مہارت کے ساتھ ظہیر اور جابر کا قتل کیا تھا۔

اس پراسرار سائے نے گہرے رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے شاید قریب کھڑے خضر کو دیکھ لیا تھا اس لیے اب وہ سیدھا اسی کی طرف آ رہا تھا جبکہ خضر کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا اور اسے اپنی کنپٹیوں پر سائیں سائیں ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بیک وقت عجیب صورتِ حال کا شکار تھا۔

ادھر جیسے ہی وہ پراسرار سایہ قریب پہنچ کر رکا، شکیل اور عدنان نہایت تیزی کے ساتھ قریب کی جھاڑیوں سے ہاتھ میں پستول لیے نمودار ہوئے۔ سایہ ایک لمحے کو بُری طرح ٹھٹکا۔

"خبردار! ہلنا مت ورنہ گولی مار دی جائے گی۔ تم پولیس کے نرغے میں آچکے ہو۔" شکیل نے گرج دار آواز میں کہا اور ساتھ ہی اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی پراسرار سائے کے چہرے پر پھینکی۔ اس کے چہرے پر چادر کا نقاب تھا مگر اس کی آنکھوں کے نسوانی پن سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ ایک حسین عورت کی آنکھیں تھیں۔ پھر شکیل نے اس پر اپنا پستول تانتے ہوئے اس کی طرف پیش قدمی کی۔ وہ نہایت محتاط تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے چادر کھینچ لی۔

اس اثنا میں مائرہ، رسن بستہ طفیل کو بھی تاریک گوشے سے لیے سامنے آگئی۔

"ب.... ب.... بازغہ بھابی.... یہ.... یہ.... تم ہو؟" دفعتاً خضر کے منہ سے یہ الفاظ برآمد ہوئے، اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ناقابلِ یقین تاثرات تھے۔

"یہ.... یہ.... طفیل کی بیوی ہے۔" خضر نے ہذیانی انداز میں چلا کر گویا اعلان کیا۔

شکیل نے اپنی جیب سے ہتھکڑی نکال کر حیران پریشان کھڑی اس عورت کے دونوں ہاتھوں میں پہنا دی۔

بازغہ سمیت اس کے شوہر طفیل اور خضر کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ چونکہ یہ گرفتاریاں "رنگے ہاتھوں" عمل میں آئی تھیں اس لیے بازغہ اور طفیل احمد کو ظہیر خان اور جابر خان کے قتل کے جرم کا تو اعتراف کرنا ہی پڑا تھا کیونکہ دونوں میاں بیوی نے اسلم خان کی بے چین روح بن کر یہ ڈراما کھیلا تھا جس کی ماسٹر مائنڈ بازغہ تھی اور اپنے ہی ساتھیوں کے گرد موت کی بساط بچھانے والا طفیل تھا۔ یہی نہیں بلکہ طفیل اور خضر کو ہیروں کے تاجر اسلم خان کے قتل کا بھی اعتراف کرنا پڑا تھا کہ کس طرح ان چاروں یعنی ظہیر خان، جابر خان، طفیل احمد اور خضر حیات نے مشترکہ منصوبہ بندی کے تحت ہوٹل ریڈ کارپٹ میں اسلم خان کا قتل کیا اور اس کے بیش قیمت ہیرے لے اڑے تھے۔ اس ضمن میں عدنان اور مائرہ نے قانون کی مدد کرتے ہوئے، مذکورہ ہوٹل کے ہیڈ ویٹر پرویز کو بھی تفتیش میں شامل کر لیا تھا تاکہ طفیل اور خضر کے خلاف اسلم خان مرڈر کیس کا پھندا دونوں کی گردنوں میں پوری طرح کسا جا سکے۔

جبکہ بازغہ کا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ وہ مقتول بے گناہ اسلم خان کی بیوہ تھی تاہم منتقم مزاجی کے باعث قانون کو اس نے بھی ہاتھ میں لیا تھا اس لیے وہ... سزا کی مستحق تھی۔

☆☆☆

شکیل نے عدنان اور مائرہ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ بازغہ سے تفصیلی پوچھ گچھ کے بعد انہیں اس سنسنی خیز ڈرامے کی تفصیلات سے ضرور آگاہ کرے گا۔

چنانچہ اپنے وعدے کے مطابق شکیل نے اگلے دن ہی عدنان اور مائرہ کو اپنے اپارٹمنٹ میں شام کی چائے پر مدعو کر لیا۔

"بازغہ... درحقیقت اسلم خان کی بیوی تھی۔" شکیل نے انہیں بتانا شروع کیا۔

"وہ ایک ترکی نژاد عورت ہے اور اپنے تاجر باپ تاجک الحریری کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ الحریری ہیروں کا بہت بڑا تاجر تھا جو اپنی لاڈلی بیٹی کے ساتھ ساؤتھ افریقا میں سکونت پذیر تھا۔ اسلم خان کی

بازغہ سے وہیں ملاقات ہوئی تھی اور یہ ملاقات دونوں کو ایک دوسرے کا جیون ساتھی بنانے کا سبب بنی۔ بعد میں بازغہ کے باپ کا اچانک ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔

"اس سنسنی خیز ڈرامے کی اصل کہانی اسلم خان کے قتل کے بعد شروع ہوئی تھی۔ اسلم خان کی بدقسمتی اس دن شروع ہوئی تھی جب اس کے ہیروں کی امپورٹ ایکسپورٹ کے سلسلے میں ظہیر خان سے کاروباری مراسم پیدا ہوئے۔ اسلم خان موٹی اسامی تھی جبکہ ظہیر خان کے لیے یہ اسامی موٹی ہی نہیں بھاری بھی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود ایک بڑے مالی بحران سے گزر رہا تھا۔ اکیلے، اس اسامی کو سنبھالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے اس نے بعد میں، اپنے تینوں دوستوں طفیل احمد، جابر خان اور خضر حیات کو بھی اس بڑی ڈیل میں شامل کر لیا۔ یہ تینوں بھی کسی نہ کسی وجہ سے اپنے گرتے کاروبار کو سنبھالا دینے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

"اسلم خان کی صورت میں ان چاروں کو اپنے مسئلے کا حل نظر آ رہا تھا مگر انسان کی فطرت میں لالچ کو کیا کہا جائے کہ اسلم خان کے ساتھ کاروباری لین دین کرنے کے دوران ہی ان چاروں کی نیتوں میں فتور آ گیا۔ اگرچہ اسلم خان ان کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی ثابت ہو رہا تھا مگر یہ چاروں لالچ میں آ کر اسے ذبح کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔

"جس رات یہ چاروں، اسلم خان سے ملنے پہنچے تو ان کے علم میں یہ بات تھی کہ اسلم خان کے پاس اس وقت پچیس کروڑ کے ہیرے موجود ہیں۔ قصہ مختصر، ان چاروں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مل کر اسلم خان کا خاتمہ کر ڈالا اور کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے لے اڑے۔ پھر پولیس کی متوقع تفتیش کے خوف سے ان چاروں نے ایک معاہدے کے تحت ان ہیروں کو ایک خفیہ جگہ پر دفن کر دیا کہ حالات سازگار ہوتے ہی یہ ہیرے آپس میں برابر تقسیم کر لیے جائیں گے مگر بعد میں اس معاہدے میں ترمیم کر کے اس کا حل یہ نکالا گیا کہ یہ ہیرے ان میں سے کسی ایک کی تحویل میں دے دیے جائیں۔ اس طرح یہ محفوظ بھی رہیں گے چونکہ اس گھناؤنے کھیل کا ماسٹر مائنڈ طفیل احمد تھا، اس لیے ہیرے اس کی تحویل میں دے دیے گئے۔ ایک تحریر کے ساتھ جسے اعتراف نامہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، اس معاہدے کی ایک ایک کاپی ظہیر خان، جابر خان اور خضر حیات نے اپنے اپنے پاس رکھ لیں تاکہ بعد میں طفیل کی نیت میں کسی قسم کا فتور نہ آ سکے۔ اس تحریری معاہدے کی رو سے طفیل کے پاس ہیرے موجود تھے۔ نیز اسلم خان کا قتل بھی اس کے سر جاتا تھا۔ اس پر طفیل نے یہ اعتراض اٹھایا کہ خدانخواستہ ان تینوں میں سے کسی ایک کی اتفاقیہ موت پر وہ خط یا اعتراف نامہ کسی دوسرے کے ہاتھ لگ جانے پر پھانسی کا پھندا طفیل احمد کا مقدر بنتا۔ تب باہمی سوچ بچار کے بعد ان چاروں نے اس کا حل یہ نکالا کہ وہ تینوں یعنی ظہیر خان، جابر خان اور خضر حیات معاہدہ نما یہ اعتراف نامہ اپنی رہائش گاہ کے بجائے کسی ایسی جگہ پر چھپا دیں گے جس کے بارے میں فردِ واحد کو ہی اس کا علم ہوگا۔ اس کی اتفاقیہ موت کے بعد وہ کسی کے ہاتھ نہ لگ سکے، پھر جب ہیرے فروخت کر کے رقم مساوی تقسیم کر لی جائے تو وہ تینوں اس اعتراف نامے کو طفیل کے حوالے کر دیں گے۔"

شکیل ذرا سانس لینے کو رکا۔ عدنان اور مائرہ بہ غور اس کی بات سن رہے تھے۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"اسلم خان کی بیوہ بازغہ کو جیسے ہی اپنے شوہر کی ہلاکت کا علم ہوا، وہ بے چاری ساؤتھ افریقا سے پاکستان آگئی۔ اسے شاید اس خبر پر یقین نہیں آیا تھا یا پھر یہ وہ محبت تھی جو ان کے درمیان ایک دوسرے کا جیون ساتھی بننے کا سبب بنی تھی۔ بعد میں اس کے آنے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آئی تھی۔ چونکہ اسلم خان پاکستان میں ہی پیدا ہوا تھا اور اس نے یہ وصیت کر رکھی تھی کہ اس کی موت کے بعد اسے پاکستان میں ہی دفن کیا جائے، چنانچہ بازغہ نے اس کی تدفین وغیرہ کی رسم پاکستان میں ادا کی۔ چونکہ یہ قتل کا کیس تھا اور بازغہ کیسے یہ برداشت کرتی کہ اس کے محبوب شوہر کے قاتل اسی سرزمین میں دندناتے پھریں جہاں اس کے شوہر کو نہایت بیدردی سے قتل کر دیا گیا تھا لہٰذا رسمی طور پر بازغہ نے پولیس سے اپنے شوہر کے قاتلوں کو بے نقاب کرنے کے لیے مدد بھی لی تھی۔"

"رسمی طور پر؟" عدنان نے الجھ کر درمیان میں استفساریہ کہا۔

"ہاں، رسمی طور پر۔" شکیل نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "آگے سنو۔"

"درحقیقت اپنے ہر کلائنٹ یا کسٹمر پر شبہ کرنا اس کی فطرت تھی یا پھر اس کے کاروبار کی مجبوری مگر وہ اسے "احتیاط" کا نام دیتا تھا اور یہ بھی اس کی عادت یا مجبوری ہی کا ایک حصہ تھا کہ وہ اس قسم کی ڈیل جو انفرادی یا ذاتی

نوعیت کی ہوتی تھی، پہلے اور بعد میں اس کی تفصیل اپنی ڈائری میں لکھ دیا کرتا تھا۔"

"تم اب کیا ہمیں یہ بتانے والے ہو کہ اسلم خان نے اپنے مرنے کے بعد ڈائری میں اپنے قاتلوں کے نام لکھ ڈالے؟" عدنان نے طنزیہ انداز میں اسے ٹوکا۔ شکیل نے اس بار تیز لہجے میں اس سے کہا۔

"برائے کرم پہلے میری پوری بات سن لو۔ جس وقت اسلم خان، ظہیر خان وغیرہ سے اپنے ان پچیس کروڑ کے ہیروں کی ڈیل کرنے والا تھا تو اس نے حفظِ ماتقدم کے پیشِ نظر ہیڈ ویٹر پرویز کو بھی اس "احتیاط" میں شامل کیا جس کی تفصیل سے تم دونوں بھی پرویز ہی کی زبانی آگاہ ہو چکے ہو مگر باوجود اس کے اسلم خان نے اپنی ایک چھوٹی سی ڈائری میں بھی اس ہونے والی اہم ڈیلنگ کی اس حد تک تفصیل لکھ دی تھی کہ اس کے پاس جو چار افراد یعنی ظہیر خان، جابر خان، طفیل احمد اور خضر حیات آنے والے تھے، ان کے نام درج کر دیے تھے اور متوقع وقت اور دن، ہوٹل کا نام حتیٰ کہ کمرا نمبر تک لکھ ڈالا تھا۔ یہ مکمل تفصیل تو نہیں تھی مگر تفصیل کا پہلا حصہ ضرور کہی جاسکتی تھی۔

"اسلم خان، ظہیر اور اس کے تینوں دوستوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ پولیس نے رسمی طور پر ضابطے کی کارروائی نمٹائی۔ کسی کا بھی دھیان اس ڈائری کی طرف نہیں گیا اور گیا بھی تھا تو اسے محض ایک معروف کاروباری شخص کی حساب کتاب والی ڈائری ہی سمجھا گیا ہو یا پھر کوئی روزنامچہ وغیرہ... بہرطور... یہ ڈائری مقتول اسلم خان کی بیوہ بازغہ کے ہاتھ ضرور لگ گئی جسے پڑھ کر اسے پورا یقین ہو گیا کہ یہ چاروں دوست ہی اس کے شوہر کے قتل میں برابر کے شریک ہوں گے کیونکہ ڈائری میں دن، تاریخ اور وقت تک وہی درج تھا پھر ہیرے بھی غائب تھے۔

"بازغہ نے پہلے تو سوچا کہ اس ڈائری کے حوالے سے پولیس سے مدد لے مگر وہ پہلے ہی پولیس کی کارکردگی دیکھ چکی تھی لہٰذا اس نے خود ہی ان چاروں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا عزم کیا۔ وہ نہ صرف اپنے شوہر کے قتل کا انتقام لینا چاہتی تھی بلکہ اپنے مقتول شوہر کے ہیرے بھی قاتلوں کے قبضے سے حاصل کرنا چاہتی تھی۔

"چنانچہ ایک طویل منصوبہ بندی کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ کچھ روز پاکستان میں رہنے کے بعد واپس ساؤتھ افریقا چلی گئی اور کچھ عرصے بعد وہ دوبارہ پاکستان آ گئی۔ اس نے پہلے بھی خود کو غیر معروف رکھنے کی کوشش کی تھی، اب بھی وہ اس حیثیت سے رہنے لگی۔ اس سے پہلے پولیس سے اس کا واجبی رابطہ تھا مگر دوسری بار پاکستان آنے کے بعد اس نے وہ رابطہ بھی منقطع کر دیا پھر وہ جلد ہی یہاں کے کاروباری حلقوں میں اپنی مسحور کن شخصیت کی بنا پر جانی پہچانی جانے لگی اور یوں سب سے پہلے اس نے طفیل کو ٹارگٹ بنایا کیونکہ ایک تو وہ فطرتاً حسن پرست تھا، دوسرے وہ ایک عرصے سے تجرد کی زندگی بھی گزار رہا تھا۔ بہت جلد ہی بازغہ نے اسے اپنا اسیر بنا لیا پھر دونوں نے شادی کر لی۔

"بازغہ نے بظاہر یہ راز ہی میں رکھنے کی کوشش کی تھی کہ وہ مقتول اسلم خان کی بیوہ ہے۔ ادھر طفیل کی عقل خبط ہو چکی تھی کیونکہ بازغہ کو ایسے عیاش فطرت مردوں کو ہینڈل کرنا آتا تھا۔ پھر نہ جانے کس طرح اس نے تھوڑے ہی عرصے میں اس کے منہ سے اپنے شوہر اسلم خان کے قتل کی داستان اور پچیس کروڑ کے ہیروں کے متعلق راز اگلوا ہی لیا۔ یوں بازغہ کا منصوبہ مزید آسان ہو گیا اور اس نے چاروں سے انتقام لینے کا منصوبہ بنایا۔ سب سے پہلے طفیل کو ان پچیس کروڑ کے ہیروں پر تنہا قبضہ جمانے کے لیے اکسایا جبکہ طفیل تو پہلے ہی اس ادھیڑ بن میں تھا کہ اس کے پاس جو امانتاً پچیس کروڑ کے ہیرے رکھوائے گئے ہیں، کیوں نہ وہ خود تنہا ہی اس پر قبضہ جما لے۔ پھر بازغہ نے بھی اسے مزید اکساتے ہوئے اپنا منصوبہ سمجھایا کہ کس طرح "اسلم خان کی بے چین روح" کا ڈراما رچا کے باری باری جابر خان، ظہیر خان اور خضر حیات کا خاتمہ کر دے مگر ساتھ ہی ان سے پچیس کروڑ کے ہیروں کی واپسی کا تقاضا بھی ضرور کرے، ورنہ ان تینوں کو اس پر شبہ ہو جائے گا کیونکہ بہرحال پچیس کروڑ کے ہیرے... ایک عجیب وغریب تحریری معاہدے کے طور پر طفیل کے پاس ہی موجود تھے اور باوجود اس کے ہیروں کی واپسی کا تقاضا کرنے سے وہ تینوں بہرحال طفیل کو شبے کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے اور اسے بھی اپنی طرح ایک کشتی کا سوار سمجھیں گے۔

"طفیل احمد کے ہاتھوں ہی ان تینوں کا قتل کروانے کے بعد بازغہ کے لیے پچیس کروڑ کے ہیرے لے اڑنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی اور آخر میں اس کے لیے طفیل کو ہلاک کرنا کیا مشکل ہوتا۔

آگے کی کہانی تمہارے علم میں ہے ہی۔"

شکیل نے اپنی بات ختم کر دی۔ عدنان اور مائرہ، شکیل کی بات ختم ہونے پر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

☆